شہید انسانیت

سلسلۂ اشاعت سید العلماء اکادمی - ۲

مصنفہ:

آیت اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا

السید علی نقی النقوی مجتہد

طاب ثراہ

جملہ حقوق محفوظ

○ نام کتاب : شہید انسانیت

○ مصنف : آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولینا السید علی نقی النقوی طاب ثراہ

○ تعداد اشاعت : ایک ہزار

○ سن اشاعت : (تیسرا ایڈیشن) محرم ۱۴۰۹ھ - اگست ۱۹۸۸ء

○ طباعت : ہندستان پرنٹنگ پریس لکھنؤ

○ سرور... طاہر۔ ڈیزائن ہاؤس خریجی، دہلی

○ ناشر ... سید العلماء اکادمی (الہند)

پینتیس ۳۵ روپے

سید العلماء اکادمی (الہند)

صدر دفتر :-
آرام گاہ سید العلماء۔ عبد العزیز روڈ
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳ یوپی (انڈیا)

شاخ :
نیشنل کالونی۔ امیر نشان
علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ یوپی (انڈیا)

شہیدِ انسانیت

مندرجات

پیش لفظ

بفضل الٰہی اب اُس کی توفیق سے وہ ہنگام آگیا کہ "شہید انسانیت" اصل کتاب کی شکل میں منظر عام پر لائی جا سکے۔ کتاب کے "مسودہ" کی بغرض استصواب اشاعت کے بعد جن افراد نے نرم و گرم مختلف لہجوں، اور تعمیری و تخریبی مختلف صورتوں سے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا وہ سب ہی شکریہ کے مستحق ہیں اور اس ایڈیشن میں اصل مقاصد کتاب اور نشر حیثیت کے اہم مفادات کا تحفظ کرتے ہوئے جہاں تک ممکن تھا اُن سب کا لحاظ کیا گیا ہے۔ والسّلام

علی نقی النقوی عفی عنہ

عرضِ ناشر

کتاب "شہیدِ انسانیت" آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا السید علی نقی النقوی طاب ثراہ کے شاہکاروں میں سے ایک ہے۔ اس سے قبل واقعۂ کربلا، اس کے اسباب و نتائج اور سیرت امام حسین علیہ السلام پر اس سے زیادہ جامع اور مبسوط کتاب آج تک دنیا کی کسی دوسری زبان میں نہیں لکھی گئی۔ یوں تو صدیوں سے واقعۂ کربلا پر لکھا جا رہا ہے۔ دنیا کی سبھی ترقی یافتہ زبانیں ان خونچکاں لیکن فکر انگیز انقلاب آگیں واقعات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں لیکن "شہیدِ انسانیت" پہلی کتاب ہے جس میں دنیا کی اس عظیم ترین قربانی کو صرف عقائد کی روشنی میں نہیں بلکہ عقل اور تاریخ کی کسوٹی پر بھی کس کے دیکھا گیا ہے۔

آیۃ اللہ العظمیٰ علی نقی طاب ثراہ نے ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۴۲ء میں تیرہ سو سالہ یادگارِ حسینی تقریبات کے موقع پر یہ کتاب لکھ کر وقت کی اہم ترین ضرورت کو پورا کیا لیکن اس بے نظیر کتاب کو متنازعہ بنانے اور اس ذیل میں مصنف کتاب کی کردار کشی کرنے کی جو ناپاک کوششیں ہوئیں وہ دنیائے علم اور مقصد حسینیت کی نشر و اشاعت کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہیں۔

اظہارِ تشکر اس کتاب کے سابق ۲ ایڈیشن کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ نے شائع کیے تھے۔ ہم سید اظہر مسعود رضوی صاحب مالک کتاب نگر کے ممنون ہیں جنھوں نے کتاب شہیدِ انسانیت کے جملہ حقوق اشاعت سید العلماء اکادمی کو مرحمت فرما دیے۔

ہم جناب سید مشرف نقی صاحب نصیر آبادی کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنے والد علام جناب ڈاکٹر سید محمد وصی صاحب نصیر آبادی اعلی اللہ مقامہ کے ایصال ثواب کی غرض سے اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن کی طباعت کے جملہ مصارف برداشت کیے۔

سکریٹری سید العلماء اکادمی لکھنؤ

تمہید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی سید المرسلین وآلہ الطاہرین

دنیا میں کوئی تعلیم یافتہ ایسا نہ ہو گا جس نے "عرب" کا نام نہ سنا ہو "عرب" ایک بڑا ریگستانی ملک ہے جو ایشیا کی مغربی سرحد پر واقع ہے اور جس کے ساحل پر بحر احمر لہریں مار رہا ہے۔ اسی ملک سے ساتویں صدی عیسوی شروع ہونے کے بعد ایک انقلاب کی لہر اٹھی جس کا نام ہے "اسلام"۔ اس انقلاب کے بانی حضرت محمدؐ بن عبداللہ تھے جنھوں نے اپنی پیغمبری کا اعلان کرتے ہوئے دنیا کو کامل توحید کا پیغام پہونچایا اور بت پرستی، اقتدار پرستی، سرمایہ پرستی "غرض کہ غیر اللہ کی ہر طرح کی پرستش کی مخالفت کی۔ اس سے ان لوگوں کو مخاصمت پیدا ہو گئی جن کے اقتدار کو اس تعلیم سے نقصان پہونچتا تھا۔ انھوں نے اس انقلاب کو روکنے کی کوشش کی اور ان کے ہاتھوں پیغمبر کو بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔

اس مخالفت میں بنی امیہ پیش پیش تھے۔ اس لیے کہ اگرچہ پیغمبر اسلام کی تعلیم براہ راست کسی خاندان کی بلندی اور کسی خاندان کی پستی کی حمایت نہیں کرتی تھی مگر آپ کی تعلیم میں بلندی اور عزت کا جو معیار قرار دیا گیا تھا وہ صرف کردار کی خوبی، فرائض انسانی کی بجا آوری تھی۔ اس معیار پر بنی امیہ کے اکثر

افراد پورے نہ اُترتے تھے چنانچہ اُمیّہ کے پوتے ابو سُفیان بن حرب نے اسلام کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ عرب کے ہٹ دھرم اور جاہل بُت پرست اس علم کے نیچے جمع ہو گئے اور حضرت محمد مصطفےٰؐ کو ستانے اور تبلیغ اسلام میں روڑے اٹکانے لگے۔ پہلے تو آپ مصیبتیں اور سختیاں جھیلتے رہے مگر جب اُن لوگوں نے ایکا کر کے آپ کو قتل کر دینے کا فیصلہ کر لیا تو مجبوراً آپ اپنے وطن مکّہ کو چھوڑ کر مدینہ میں جا بسے جہاں کے لوگوں نے آپ کی تعلیم کو قبول کیا تھا اور پہلے سے آپ کی نصرت کا وعدہ کر چکے تھے۔ اسی واقعہ کو "ہجرت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اسی سے مسلمانوں کے سنہ ہجری کی ابتدا ہوئی ہے۔

دشمنوں نے ہجرت کے بعد بھی آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دیا اور کئی مرتبہ چڑھائی کر کے آپ کو قتل کرنے آئے۔ مجبوراً آپ کو کئی لڑائیاں لڑنا پڑیں جن میں بدر، اُحد اور احزاب بہت مشہور ہیں۔ مگر ان تمام لڑائیوں میں ابو سُفیان کو ہر مرتبہ شکست ہوئی اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حامیوں کی تعداد اور اُن کی طاقت برابر بڑھتی رہی۔ آخر بنی اُمیّہ کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اور اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے اُنھوں نے بھی قبولِ اسلام کی نقاب ڈال لی مگر موقع کے منتظر رہے کہ اسلام کی طاقت کچھ بھی کمزور ہو تو اُنھیں اپنے گئے ہوئے اقتدار کو واپس لانے کا موقع ملے۔

حضرت محمد مصطفےٰؐ کی زندگی میں اُن کی اس آرزو کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا مگر اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حضرت کی وفات ہو گئی اور مسلمانوں کے نظام میں ابتری پیدا ہو گئی۔ سلطنت وقت کے دنیوی مصالح نے بنی اُمیّہ کو شام میں اپنی حکومت قائم کر لینے کا موقع دے دیا جو شروع میں صرف ایک صوبہ دار یا گورنر کی حیثیت سے تھی مگر رفتہ رفتہ اُس کے اقتدار اور قوت

میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ آخر میں اُس نے خود مختار سلطنت کی حیثیت حاصل کرلی۔

ان لوگوں نے شام کے ملک میں اپنا قبضہ جماتے ہی حضرت محمد مصطفےٰ ص کے رائج کیے ہوئے طریقوں اور اسلام کی پھیلائی ہوئی مساوات کو مٹانا شروع کردیا اور آخر میں تو یہ حالت ہوئی کہ قرآنی احکام کی علانیہ مخالفت ہونے لگی!

حضرت رسولؐ کے حقیقی جانشین جو اسلامی تمدن و تہذیب کے محافظ تھے اس کو کسی طرح برداشت نہ کرسکتے تھے۔ جب علی ابن ابی طالبؑ جو رسولؐ کے چچا زاد بھائی، اُن کی آواز پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے اور شروع سے آخر تک اسلام کی اشاعت میں اُن کے دست و بازو تھے مسلمانوں کے تخت حکومت پر آئے تو اُنھیں حکومت شام سے مقابلہ کرنا پڑا اور صفین کی خوں ریز لڑائی ہوئی مگر ابھی حضرت علیؑ کا ارادہ اور کام مکمل نہیں ہوا تھا کہ مسجد کوفہ میں عین حالت سجدہ میں حضرت کے سر پر تلوار لگائی گئی جس سے آپ نے شہادت پائی۔ حضرت علیؑ کے بعد آپ کے بڑے فرزند امام حسنؑ نے کچھ شرائط کا پابند کرنے کے بعد حکومت شام سے صلح کرلی مگر حکومت شام نے اُن شرائط کی پابندی نہیں کی اور خفیہ طور پر زہر دلوا کر اُن کی زندگی کا خاتمہ کردیا۔ اب پیغمبر کے خاندان میں اصول اسلام کے تحفظ کی پوری ذمہ داری حسینؑ پر تھی جو حضرت محمد مصطفےٰ ص کے دوسرے نواسے اور حضرت علیؑ کے چھوٹے بیٹے تھے۔

حکومتِ شام کے تخت پر ابوسُفیان کا پوتا، یزید بن معاویہ بیٹھا جو بڑا ہی شراب خوار اور بدکردار تھا اور ایسے اخلاقی جرائم کا مرتکب ہوتا تھا جن کا تذکرہ بھی تہذیب اور شائستگی کے خلاف ہے۔ اس کے باوجود اتنے دن کے مضبوط اموی اقتدار کی ہیبت سے عوام کو دم مارنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ حکومت کے ظلم و ستم سے اتنا ڈر گئے تھے کہ خوف خدا کا احساس باقی نہ رہا تھا مگر یزید جانتا تھا کہ حجاز

کے ملک میں شہر مدینہ کے محلۂ بنی ہاشم کے اندر ایک انسان ہے جو مجھ سے نہیں ڈرتا، صرف خدا سے ڈرتا ہے اور وہ اصول اسلام کا حقیقی محافظ، رسول کا نواسا ہے۔ وہ خاموش سہی مگر کیا معلوم کس دن دنیا کی آنکھوں سے غفلت کے پردے ہٹ جائیں اور وہ سچائی کی طرف کھنچ جائے۔ اس بنا پر یزید کو فکر لاحق ہوئی کہ کسی نہ کسی طرح وہ حسینؑ سے بیعت حاصل کرے۔ چنانچہ اُس نے مدینہ کے حاکم ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو حکم بھیجا کہ حسینؑ سے بیعت حاصل کرو اور اس معاملہ میں کسی مراعات سے کام نہ لو۔ حضرت امام حسینؑ نے اس پیغام کے معنی سمجھ لیے اور آپ اُسے پہلے ہی سے سمجھے ہوئے تھے۔

اصولاً آپ کے لیے یزید کی بیعت کرنا غیر ممکن تھا۔ سر کا قلم ہونا بیشک آسان تھا مگر حفاظت خود اختیاری کے فرض کو انجام دینے کے بعد جو اسلامی شریعت کا ایک بنیادی حکم ہے۔

اس کے لیے حسینؑ نے ترک وطن کا فیصلہ کر لیا۔ آپ نے اپنے تمام متعلقین کو جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے اپنے ساتھ لیا اور مکہ میں جا کر پناہ لی۔ اس طرح آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ آپ کسی سے جنگ کرنا اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی کو معرض خطر میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ بشرطیکہ آپ کو بیعت یزید پر مجبور نہ کیا جاتا۔

مکہ عرب کے بین الاقوامی قانون اور پھر اسلام کے رو سے ایک ایسا امن کا مقام تھا جہاں کسی متنفس کے لیے خطرہ نہ ہونا چاہیے مگر فرزند رسولؐ کو یہاں بھی اپنے قتل کا سامان دکھائی دیا۔ آخر ایام حج میں کہ جب تمام عالم اسلامی مکہ کی طرف کھنچا چلا آرہا تھا حسینؑ کو مکہ سے رخصت ہونا پڑا اور آپ کوفہ کی طرف روانہ ہوئے جہاں کے لوگ آپ کو اصرار کے ساتھ بلا رہے تھے اور آپ سے مذہبی رہنمائی کے طالب تھے اور آپ اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو وہاں کے حالات کا

مشاہدہ کرنے کے لیے بھیج بھی چکے تھے مگر اس دوران میں کوفہ کی حالت دگرگوں ہوگئی وہاں سنگدل حاکم عبیداللہ بن زیاد کا اقتدار قائم ہوگیا اور مسلم بن عقیل شہید کر ڈالے گئے۔ اس کے بعد کوفہ جانے کا بظاہر کوئی موقعہ نہیں تھا مگر مکہ اور مدینہ واپس جانے کا بھی امکان نہ تھا۔ اُدھر کوفہ سے آپ کو گرفتار کرنے کے لیے فوج بھیجدی گئی جس نے آپ کو آگے بڑھنے یا واپس جانے سے روکا۔ مجبوراً آپ کربلا کی سرزمین پر اُتر پڑے دوسرے ہی دن سے یزید کا ٹڈی دل لشکر کربلا کے میدان میں آنا شروع ہوگیا تمام راستے بند کر دیئے گئے اور امام حسینؑ کو گھیر کر یزید کی بیعت پر اصرار کیا جانے لگا۔

حضرت امام حسینؑ کے ساتھ صرف آپ کے سترہ عزیز، چند غلام اور سو دیڑھ سو کے قریب وہ خاص دوست تھے جو کوفہ یا بعض دوسرے مقامات سے باوجود راستوں کے بند ہونے کے کسی نہ کسی طرح آپ تک پہنچ سکے تھے۔

ساتویں محرم سے آپ پر اور آپ کے تمام ساتھیوں یہاں تک کہ چھوٹے بچوں پر بھی پانی بند کر دیا گیا مگر چونکہ امن پسندی حقیقی معنی میں آپ کا شعار زندگی تھا، لہذا اتمام حجت کے طور پر آپ نے یزیدی فوج کے افسر عمر بن سعد کے سامنے ایسے شرائط پیش کیے جن سے معاملات روبہ اصلاح ہو جائیں اور جنگ کی نوبت نہ آئے۔ آپ کا طریقہ کار اتنا سلجھا ہوا تھا کہ عمر بن سعد کو بھی اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ حسینؑ صلح کے راستے پر گام زن ہیں چنانچہ اُس نے کوفہ کے حاکم عبیداللہ بن زیاد کے پاس اسی مضمون پر مشتمل ایک خط بھیجا مگر ابن زیاد کو حکومت کا غرور اور سلطنت کا نشہ تھا۔ اُس نے حسینؑ کو پہچانا بھی نہ تھا کہ وہ مشکلات کا کہاں تک مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اُس نے آپ کی صلح پسندی کو کمزوری اور عاجزی کا نتیجہ خیال کرتے ہوئے عمر بن سعد کو لکھ بھیجا کہ حسینؑ غیر مشروط طریقہ پر اطاعت کریں جب ہی ان کی جان بچ سکتی ہے۔ غیرت دار اور فرض شناس امام حسینؑ کے لیے

ایسا ممکن نہ تھا۔

نویں محرم کی شام کو اس بڑے لشکر نے آپ پر حملہ کر دیا مگر آپ نے ایک شب کے لیے التوائے جنگ کی خواہش فرمائی جو بمشکل منظور کی گئی۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ آخری مرتبہ یہ پوری رات عبادت خدا میں بسر کر لیں۔ اس کے علاوہ دوست اور دشمن دونوں کو جنگ کے قطعی طور پر طے ہو جانے کے بعد سوچنے کا موقع دے دیں۔ دشمنوں پر اتمام حجت ہو جائے اور ساتھیوں میں سے کوئی ساتھ چھوڑ کر جانا چاہتا ہو تو چلا جائے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے صاف طور پر بتا دیا کہ کل ہماری زندگی کا فیصلہ ہے۔ میں تم سے اپنی بیعت کی ذمہ داری ہٹائے لیتا ہوں۔ تم اس رات کے پردے میں جدھر چاہو چلے جاؤ مگر ان جانبازوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہا اور یک زبان ہو کر کہا کہ ہم آپ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑیں گے۔ ان لوگوں نے جو کہا تھا وہی کر دکھایا۔

سامنے فوجوں کا سمندر لہریں مار رہا تھا۔ گرد و پیش ویرانی اور بربادی کے سوا کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔ عزیزوں، بھائیوں، بھتیجوں اور اولاد کے خوبصورت چہرے امام کے سامنے تھے اور آپ کے ساتھ پردہ دار عورتیں اور چھوٹے بچے بھی موجود تھے۔ دریا پر فوج کا پہرہ بیٹھا ہوا تھا اور حسینؑ اور ان کے ساتھیوں تک ایک قطرۂ آب کے پہنچنے کی اجازت نہ تھی۔ بے زبان بچے پیاس کی شدت سے بے تاب نظر آ رہے تھے مگر طاقت کی تمام نمائشیں اور ایذا رسانی کی تمام صورتیں امام حسینؑ اور آپ کے ساتھیوں کو مجبور نہ کر سکیں کہ ایک فاسق و فاجر کو جائز حکمراں تسلیم کریں۔

دسویں محرم کو صبح سے دوپہر کے بعد تک امام حسینؑ کے جاں باز ساتھی جو آپ سے خاندانی تعلق نہ رکھتے تھے برابر اپنی جانیں حسینؑ اور آپ کے اصول کی خاطر

قربان کرتے رہے جب اُن میں سے کوئی باقی نہ رہا تو عزیزوں کی نوبت آئی اس موقع پر آپ کے لیے آسان ہوتا کہ آپ خود آگے بڑھ کر راہ حق میں اپنے سر کا ہدیہ پیش کر دیتے مگر آپ کو اپنی قوت برداشت کا پورا امتحان دینا تھا چنانچہ اس کے بعد آپ کے عزیز آپ سے جدا ہونے لگے۔ سب سے پہلے آپ نے اپنے جوان بیٹے علی اکبر کو جو شبیہ پیغمبر بھی تھے مرنے کے لیے بھیجا۔ ماں خیمہ میں تھیں اور باپ خیمہ کے دروازے پر اور اُن کا چاند فوج مخالف کی گھٹا میں چھپا تو باپ نے دیکھا اور ماں نے سُن لیا کہ علی اکبر تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے مگر صبر و سکون میں فرق نہ آیا۔ اس کے بعد دوسرے عزیز بھی ایک ایک کر کے رخصت ہوئے اور راہ حق میں نثار ہو گئے۔ سب سے آخر میں آپ کے جاں باز بھائی عباسؑ ابن علی آپ سے رخصت ہوئے۔ یہ حسینی جماعت کے علمدار تھے جن کے قتل ہونے سے حسینؑ کی کمر ٹوٹ گئی مگر ہمت شکستہ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد آپ کے پاس کوئی سرمایہ حق کی بارگاہ میں نذر دینے کے لیے نہ تھا۔ مگر سب سے آخر میں آپ نے ایک ایسا معصوم ہدیہ پیش کر دیا جس پر کسی تجویز از رقانون کی رو سے مجرم ہونے کا الزام نہ آسکتا تھا۔ وہ شیر خوار بچہ جو اپنی ماں کی گود میں پیاس سے سسکیاں لے رہا تھا حسینؑ نے اُس کی حالت دیکھی اور دشمن کی فوج کے سامنے اپنے ہاتھوں پر لیا۔ یہ تھا حسینؑ کا سب سے آخری فدیہ۔ انسانیت کے ہاتھ پیروں میں لرزہ پڑ گیا اور رحم و کرم کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا جب اس دشمن فوج کے ایک سپاہی نے تیر چلۂ کمان میں جوڑا اور بچہ کی گردن کو نشانہ بنا لیا۔ حسینؑ کا یہ آخری تحفہ بھی قبول ہو گیا اب کیا تھا؟! بذات خود حضرت کو حق کی حمایت میں جہاد کا فرض انجام دینا تھا اور اپنی جان کی قربانی پیش کرنا تھی۔ چنانچہ آپ نے اس تشنگی اور بے کسی

کے عالم میں تلوار نیام سے نکالی اور حتماً قانون اسلام کے رو سے آپ کو اپنا فریضہ محسوس ہوتا تھا اس حد تک انتہائی شدید مقابلہ کیا وہ مقابلہ جو ایسے حالات میں عام انسانوں کی طاقت سے یقیناً بالاتر ہے۔ مگر کہاں ایک انسانی جسم اور کہاں فولادی تلواروں کا سیلاب! جسم زخموں سے چور ہو گیا، آپ گھوڑے سے زمین پر گرے اور وہ مرحلہ جو آپ کے لیے پہلے ہی آسان تھا اب زیادہ آسان ہو گیا۔ آپ کا سر قلم کر کے نیزے پر بلند کیا گیا۔ شہیدوں کی لاشیں گھوڑوں سے پامال کی گئیں۔ مال و اسباب لوٹا گیا۔ خاندان رسالت کی مقدس خواتین کے سروں سے چادریں اُتاری گئیں۔ خیموں میں آگ لگائی گئی۔ مردوں میں ایک بیمار و ناتواں علی بن الحسین ع باقی رہ گئے تھے جنھیں طوق و زنجیر پہنایا گیا اور عرب کے شریف ترین خاندان کی غیرت مند بی بیاں اسیر کر کے شہر بشہر پھرائی گئیں۔

یہ ہے دنیائے تاریخ کا وہ بڑا حادثہ جو "واقعۂ کربلا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یوں تو عالم کا ہر واقعہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے کسی خاص جگہ، کسی خاص قوم اور کسی خاص طبقہ سے متعلق ہوتا ہے اور اس لحاظ سے واقعۂ کربلا بھی عراق کی سرزمین، عرب کے ملک، ہاشم کی نسل اور مسلمانوں کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا مگر واقعات میں ہمہ گیری اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے اُن خصوصیات اور اُن نتائج کے لحاظ سے جو کل نوع انسانی سے وابستہ ہوں اور جن میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہ ہو۔ اس حیثیت سے دیکھا جاتا ہے تو واقعۂ کربلا متعدد وجوہ سے تمام نوع انسانی کے تعلق کا مرکز ہے۔

اوّل یہ کہ ظالم سے نفرت اور مظلوم کے ساتھ ہمدردی فطرت بشری میں داخل ہے اگر کوئی قصہ ہمارے سامنے پیش ہو جس میں ایک طرف ظلم کا مظاہرہ ہو اور دوسری طرف مظلومیت تو چاہے اُس واقعہ سے متعلق شخصیتوں کے ہم بالکل

واقف نہ ہوں تب بھی ظالم سے نفرت اور مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو جائے گی اور اس میں کسی مذہب و خیال کا امتیاز نہ ہو گا۔ حضرت امام حسینؑ پر جو مظالم کربلا میں واقع ہوئے اُن کی مثال تاریخ عالم میں نا پید ہے۔ یوں تو اکثر انبیاؑ و مقربین ابنائے زمانہ کے ہاتھوں مظالم کا شکار ہوئے، بہت سے بے گناہ افراد قتل کیے گئے بہتوں کا مال و اسباب لوٹا گیا اور بہت سے لوگ قید ہوئے مگر بحیثیت مجموعی وہ تمام مصائب جن کا سامنا فرداً فرداً بہت سے اشخاص کو کرنا پڑا، حضرت امام حسینؑ کی ذات میں اکٹھا ہو گئے اور اُن کے بوقت واحد جمع ہو جانے سے آپ کی ذات مظلومیت میں اپنی آپ مثال قرار پا گئی۔

لہٰذا جس قدر حضرت امام حسینؑ کی مظلومیت کا درجہ بلند اور ظالم کے ظلم کا درجہ شدید ہے اُسی قدر وہ ہمدردی بھی کہ جو امام حسینؑ کے ساتھ بحیثیت مظلوم کے ہونا چاہیے، ہر دوسرے مظلوم سے زیادہ ہے اور وہ نفرت بھی کہ جو آپ کے دشمنوں سے بحیثیت ظالم ہونا چاہیے تمام دنیا کے ستمگاروں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

دوسرے یہ کہ حضرت امام حسینؑ کی مظلومیت بے بسی کی مظلومیت نہ تھی۔ جس طرح کسی شخص پر اکیلے جنگل میں ڈاکو حملہ کر دیں اور اُس کے مال و اسباب کو لوٹ لیں یا اُسے قتل کر ڈالیں۔ مظلوم یہ بھی ہے اور ہمدردی اس کے ساتھ بھی ہو گی۔ مگر یہ مظلومیت غیر اختیاری طور پر ہے اس کے ساتھ کوئی عمل ایسا شریک نہیں ہے جو اخلاقی نقطۂ نظر سے قابل مدح ہو۔ حضرت امام حسینؑ کی مظلومیت اس نوع کی نہیں ہے۔ آپ نے ایک مسلک حق کی حمایت اور ایک صحیح اصول کی کی حفاظت کے لیے اُن تمام مصائب کو برداشت کیا۔ اس کا نام قربانی ہے۔

یوں تو قربانی کے بہت سے اقسام ہو سکتے ہیں مگر سب میں بلند جان کی قربانی ہے اور اگر اس فرض کے عائد ہونے پر کوئی اس منزل میں ثابت قدم نظر آئے تو تمام

افرادِ انسانی کے نزدیک زیادہ عزت و احترام کا مستحق ہوگا اور جس قدر مقصد عزت دار اور شریف ہوگا اُتنی ہی قربانی اہم اور قابل عزت سمجھی جائے گی۔ کربلا کی سرزمین پر حضرت حسینؑ بن علیؑ نے جو قربانی پیش کی وہ انسانی تاریخ کا ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ حق پرستی اور حق پروری کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں اور غلبہ و اقتدار انسانی آزادی کا سر کچل کر اپنی غلامی کا اقرار لے رہا تھا اُس نازک موقع پر حسینؑ نے اپنے کو اور اپنے عزیزوں بلکہ بچوں تک کو میدان میں لا کر جبر و استبداد کا پردہ فاش کر دیا اور ثبات و استقلال، ضبط و صبر، ایثار و قربانی حق پروری اور راست کرداری کا بہت بلند نمونہ پیش کیا۔ اس لحاظ سے حضرت امام حسینؑ کسی قوم اور مذہب سے مخصوص نہیں سمجھے جا سکتے۔ حسینؑ کا تعلق تمام دنیائے انسانیت سے ہے۔ آپ نے وہ کام کیا جس نے انسانیت کے مٹتے ہوئے نقوش کو پھر سے اُبھار دیا اور دم توڑتی ہوئی انسانیت کو نئے سرے سے زندہ کر دیا۔ آپ نے دنیائے انسانیت کو وہ پیغام دیا جو زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا آپ نے دُنیا کو سچائی اور راست بازی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرایا اور اُس موت کے معنی سمجھائے جس میں دوامی زندگی کی حقیقت مضمر ہے اس لیے تمام اقوامِ عالم جو قربانی کی عزت کرتے ہیں مجبور ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کو انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں۔

تیسرے یہ کہ حضرت امام حسینؑ کا مقصد اپنی قربانی سے کوئی ایسا امر نہ جو مختلف مذاہب کے نقطۂ نظر سے محلِ اختلاف ہو۔ انسانی اوصاف و اخلاق کی ایک منزل وہ ہے جہاں تمام مذاہب متفق ہو جاتے ہیں۔ تمام مذاہب کی اصل اساس جس پر اُن کی عمارت بلند کی گئی ہے اخلاقِ انسانی کو نقطۂ ارتقا تک پہنچانا۔ یہ اور بات ہے کہ زمانہ کے اختلاف سے کچھ احکام میں عمداً تبدیلیاں کی گئی ہوں

اور بعض مذاہب کے اصول میں بعد کی آنے والی نسلوں کی ناسمجھی سے کچھ زیادتی یا کمی ہوئی ہو مگر اصلی محور سب کا تہذیب اخلاق اور تکمیل بشریت ہے۔ حضرت امام حسینؑ کا مقصد یہی نقطۂ مشترک تھا یقیناً اگر حضرت امام حسینؑ کا مقابلہ کسی دوسرے دین و ملت افراد سے ہوا ہوتا یعنی کوئی غیر مسلم جماعت آپ کے سامنے ہوتی تو چاہے آپ کی قربانی کتنی ہی حقانیت پر مبنی ہوتی اور آپ کو کتنے ہی ظلم کے ساتھ شہید کیا گیا ہوتا مگر وہ مذہبی جماعت جس کے مقابلہ میں آپ تھے اور جس کے ہاتھوں آپ کو یہ مظالم برداشت کرنا پڑے تھے کسی حد تک، آپ کے نام اور آپ کے کام سے بنائے مخاصمت ضرور محسوس کرتی اور واقعہ کربلا کے ساتھ ہمدردی میں عمومیت پیدا نہ ہوتی لیکن حضرت امام حسینؑ کی قربانی رسمی طور پر کسی ایک مذہب کو مٹانے اور دوسرے مذہب کو قائم کرنے کے لیے نہیں تھی بلکہ ایک ہی مذہب کے لوگوں میں برائیوں کو مٹانے اور اچھائیوں کے قائم کرنے کے لیے عمل میں لائی گئی تھی اور چونکہ برائی اور اچھائی کے متعلق اصولی حیثیت سے مذاہب میں کوئی اختلاف پایا نہیں جاتا یعنی ہر مذہب کے نزدیک برائیاں مٹانے کے قابل اور اچھائیاں قائم کرنے کی مستحق ہیں اس لیے ہر مذہب کے لوگوں کو حسینؑ کے مقصد سے اتفاق ہوگا اور وہ آپ کی قربانی کو عزت و احترام کا مستحق سمجھیں گے۔

چوتھے حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے واقعۂ کربلا کے دوران میں مختلف اخلاق و اوصاف کاملہ کی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ عامۂ خلائق کے لئے ایک دائمی درس عمل کی حیثیت رکھتی ہیں جس سے تمام افراد بشر یکساں طور پر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ان ہی تمام وجوہ کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا نے واقعۂ کربلا کے ساتھ باہمی تفرقہ اور جذبات کی کشمکش کے باوجود یگانگی کا برتاؤ کیا اور اقوام نے یکساں طور پر اس کی اہمیت کا اعتراف و اقرار کیا اور صدیاں گزرنے کے

ساتھ اُن کی دلچسپی اس اہم حادثہ سے نہ صرف قائم رہی بلکہ مختلف اوقات میں اُ
میں اضافہ ہوتا رہا۔

اگر کوئی سیاح محرّم کے زمانہ میں شرق و غرب عالم کی سیاحت کرے او
ہر مرتبہ محرّم کے پہلے دنوں دن ایک نئے خطۂ زمین پر گزارے تو وہ دیکھے گا کہ
جگہ اپنے اپنے معیارِ زندگی اور طرزِ معاشرت کے اعتبار سے کسی نہ کسی طرح کر
کے شہید کو یاد کیا جاتا ہے۔

یہ سالانہ یادگار جو عزاداری کے مختلف مراسم کی شکل میں منائی جاتی ہے کر
کے واقعہ کے بعد پہلی ہی صدی میں مسلمانوں نے قائم کر لی تھی اور اُس کے حلق
اشاعت میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا۔

حالانکہ انسان فطرۃً خوشی کو پسند کرتا ہے اور رنج و غم سے بھاگتا ہے اس
لیے اگر حوادثِ زمانہ کے ماتحت غم کے اسباب پیدا بھی ہوتے ہیں تو اُن کو بھلا
کی کوشش کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اقوامِ عالم میں جتنے تہوار ہیں وہ سب خوشی
یادگاریں ہیں۔ غم کی یادگاریں کبھی قائم نہیں کی گئیں۔ یہ صرف حسینؑ مظلوم کی شہا
ہے جس کی یادگار غم کی صورت میں صدہا سال سے برابر قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ فط
انسانی کسی بار کو عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی۔ اس غم کی یادگار کا اس طرح بر
رہنا اس کی دلیل ہے کہ واقعۂ کربلا کی یاد میں انسانی زندگی کے لیے نفع بخ
عناصر مضمر ہیں۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمیشہ حال کا نقش ماضی کو فراموش
اُس کے اثر کو ختم کر دیتا ہے لیکن اس کے برخلاف واقعہ کربلا کی یادگار کا
شدت کے ساتھ قائم رہنا کہ حال کا کوئی واقعہ اُس پر اثر انداز نہ ہو سکے یہ
یہ مجبور کرتا ہے کہ تاریخ عالم اُس کے بعد سے اس وقت تک کوئی نظیر اس کی پیش نہ

باوجودیکہ واقعۂ کربلا کے بعد کتنے ہی انقلاب ہوئے۔ تمدن نے کتنی ہی کروٹیں بدلیں۔ معیار اخلاق میں کتنے ہی تغیرات ہوئے مگر حسینی قربانی کی یاد مسلسل تیرہ سو برس سے یکساں عزت و احترام کے ساتھ قائم ہے۔ ماننا پڑے گا کہ وہ قربانی ایسے مشترک انسانی اصول کی حفاظت کے لئے کی گئی ہے کہ جب تک دنیا میں انسانیت قائم ہے اس اصول کی بھی قدر و منزلت ہے اور اس یادگار قربانی کی یاد بھی برقرار ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جتنا کوئی موضوع اہم ہوگا اور تاریخی حیثیت سے جس قدر کسی واقعہ میں ندرت اور اہمیت زیادہ ہوگی اُسی قدر اہل فکر و قلم طبع آزمائی زیادہ کریں گے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں کربلا کے واقعہ سے بڑھ کر کسی واقعہ سے متعلق نظم و نثر کا ذخیرہ فراہم نہیں ہوا۔

کربلا کی زمین پر ابھی خونِ شہیداں کی تری خشک نہ ہونے پائی تھی کہ شاعروں کی زبان سے اس واقعہ کے متعلق اشعار تراوش کرنے لگے اور نثر میں اُن خطبوں سے قطع نظر کرتے ہوئے جو اہلبیتِ حسینؑ کی زبان یا دوسرے مقررین کے دہن سے ہنگامی حالات کے ماتحت نکلے ہیں خصوصاً اُن اقدامات کے ذیل میں جو امام حسینؑ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے سُلیمان بن صُرَدِ خُزاعی اور پھر مختار کی جانب سے ہوئے تھے جن کا مقصد ہی یہ تھا کہ لوگوں کو واقعہ کربلا کی اہمیت سے متاثر بنایا جائے۔ مستقل طور سے اِس واقعہ پر تصانیف کی ابتدا پہلی صدی ہجری کے اواخر سے ہوئی اور اس کے بعد برابر مورخین واقعہ کربلا پر مقاتل لکھتے رہے اور تصانیف کا سلسلہ جاری ہو گیا اور یہ واقعہ ہے کہ دنیا کے کسی دوسرے موضوع پر اتنا نہیں لکھا اور کہا گیا ہے جتنا واقعہ کربلا کے متعلق لکھا اور کہا جا چکا ہے پھر بھی موضوع تشنہ ہے اور بہت کچھ سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت باقی ہے۔ اس کے علاوہ اب تک

جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں اُن کا انداز بیان زیادہ تر مذہبی معتقدات[۱] سے وابستگی رکھنے
والے افراد کے مذاق سے مطابق ہے جس سے اکثر غیر مذاہب کے افراد اجنبیت محسوس
کرتے ہیں۔ کوئی ناواقف اور اجنبی شخص اگر واقعۂ کربلا اور امام حسینؑ کی شخصیت
کو عالم اسباب کی تاریخی رفتار اور اُس کے نتائج اور اُن کے ضروری تفصیلات
کے ساتھ جاننا چاہے تو اُس کی تشنگی دور کرنے کے لیے کوئی ایک کتاب ایسی جامع
نہیں ہے جس کا پتہ دیا جاسکے۔ زیر نظر کتاب اس ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھی جارہی
ہے اور اس موقع پر جب کہ دنیائے انسانیت کے اس عظیم واقعہ کو پورے تیرہ سو
برس ہو گئے ہیں اور ہر مذہب وملت کے افراد نے متفق ہو کر حسینؑ بن علیؑ کی سیزدہ
صد سالہ یادگار قائم کی ہے یہ کتاب اس صدی کی یادگار کے طور پر، حق، انصاف اور
سچائی کی بارگاہ میں، حریت، مساوات اور ایثار کی بارگاہ ہیں۔ انسانی دل، دماغ
اور ضمیر کی بارگاہ میں۔ انسانی جذبات، احساسات اور شریفانہ خیالات کی
بارگاہ میں۔ انسانی وقار، عزت اور افتخار کی بارگاہ میں۔ انسانی فکر، نظر اور کردار کی
بارگاہ میں اور ان سب کے ذریعہ سے ان کے پروردگار کی بارگاہ میں پیش کی جاتی ہے۔

حسینؑ بن علیؑ کے کارنامۂ جاوید کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ تو الفاظ کی محدود دنیا
کے بس سے باہر ہے لیکن اگر اس پوری کتاب میں ایک جملہ بھی اس ایثار و قربانی کی تصویر
کا کوئی رُخ آنکھوں کے سامنے لاسکے تو یہی اس خدمت کا پورا ماحصل ہو گا۔

علی نقی النقوی

---

(۱) امام کی شان کیا ہوتی ہے؟ اس بارے میں جو شخص مذہب شیعہ کے معتقدات معلوم کرنا
چاہے اُسے عربی میں اصول کافی اور اُس کی شروح، فارسی میں حق الیقین علامۂ مجلسی (متوفی ۱۱۱۱ھ)
اور حدیقۂ سلطانیہ مصنفۂ جناب سید العلما، سید حسین (متوفی ۱۲۷۳ھ) اور اُردو میں مذکورہ
کتابوں کے تراجم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ مختصر طور پر اصول مذہب شیعہ کے سمجھنے کے لیے خود
میرے وہ تصانیف دیکھنا مناسب ہوں گے جو امامیہ مشن سے شائع ہوئے ہیں۔

پہلا باب

نسبی خصوصیات، خاندان اور اس کی شاندار روایات

نظام اخلاق کی تشکیل میں آبا ؤ اجداد کا بڑا حصہ ہوتا ہے "توارث صفات" اور خاندانی احساسات کے لحاظ سے بھی اور اس لیے بھی کہ بچپن سے کان میں پڑے ہوئے ماضی کے تذکروں سے قوائے ادراک و شعور کی اسی طرح پرورش ہوتی ہے جس طرح دودھ سے بچہ کی جسمانی پرورش اور جس طرح دودھ خون کی شکل میں تبدیل ہو کر رگوں میں دوڑتا ہے یوں ہی بچپن کے سنتے ہوئے تذکرے بجلی کی سی رو کے ساتھ انسان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اترتے اور نفس کے تحت الشعوری طبقوں میں راسخ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے مذہبی معتقدات سے قطع نظر کرتے ہوئے انسانی حیثیت سے حسینؑ کو سمجھنے کے لیے ان کے آبا ؤ اجداد کے کارناموں پر نظر ڈالنا ضروری ہے

حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی ذات بڑی حد تک بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے یعنی یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب ان کو مانتے ہیں اور وہ مذہبی طور پر مسلمانوں کے مورث اعلیٰ کہے جا سکتے ہیں کیونکہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق حضرت محمد مصطفےٰ نے اپنے کو ملت ابراہیم کا رہبر بتایا اور حضرت ابراہیم ہی نے اس جماعت کا، جو راہ حق میں ان کے پیچھے آئی سب سے پہلے نام "مسلم" رکھا اور ابراہیم کی زبانی اپنے پروردگار کی بارگاہ میں یہ دعا بھی مذکور ہے کہ خداوندا ہم کو "مسلم" قرار دے

اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک "اُمّت مسلمہ" قرار دے۔ اس طرح مسلمانوں کی قومی زندگی اور پیغمبر اسلام کی بعثت گویا دعائے ابراہیم کا نتیجہ تھی اس لیے حضرت ابراہیم کے روایات زندگی ابنائے اسلام کے لیے ایک موروثی ترکہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور فرزندان اسلام کے عناصر اخلاق کی تشکیل میں اُن کا بڑا حصّہ ہے۔

حضرت ابراہیم کے دو بیٹے تھے اِسحاق اور اِسمٰعیل۔ حضرت اسحٰق سلسلۂ بنی اسرائیل کے اور حضرت اسمٰعیل پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰؐ کے مورث اعلیٰ ہیں۔ بعض مصالح کی بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند اسمٰعیل کو شیر خوارگی کے عالم میں آپ کی والدۂ گرامی ہاجرہ کے ساتھ مکہ کی سرزمین پر پہنچا دیا جس پر خانۂ کعبہ واقع ہے۔ خانۂ کعبہ کی تعمیر کا کام انھیں باپ بیٹے ابراہیم و اسمٰعیل نے انجام دیا جو مذہبی طور پر تمام خلق خدا کا محل اجتماع قرار پایا اور یہ آل ابراہیم کی مرکزیت کا احساس عامۂ خلائق کو پیدا ہونے کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا۔

ان دونوں بزرگواروں کی نسبت اسلامی تاریخ کا یہ واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ حضرت ابراہیم من جانب اللہ مامور ہوئے کہ اپنے فرزند حضرت اسمٰعیل کو اپنے ہاتھ سے ذبح کریں اور آپ نے بڑی ثابت قدمی اور پُرجگری کے ساتھ حکم ربانی کی تکمیل کو عمل کے آخری درجہ تک پہنچا دیا۔ اگرچہ وقت پر پروردگار عالم کی طرف سے بجائے انسان کے جانور کی قربانی کے عمل میں آنے کا انتظام ہو گیا مگر اس اعلان کے ساتھ کہ آیندہ اس کا معاوضہ راہ خدا میں ایک بڑی قربانی کے ساتھ ہونا ضروری ہے (وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ)[1] اس واقعہ کو اسلام نے بڑی اہمیت دی اور عید قرباں کی شکل میں اُس کی مستقل یادگار قائم کر دی۔

---

(۱) قرآن مجید سورۂ صافات آیت ۱۰۷

اسمٰعیلؑ کے بارہ فرزند تھے۔ ان میں سے نابت اور قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اور بہت پھیلی۔ قیدار کی اولاد میں 'عدنان' بہت مشہور ہیں اور پیغمبر اسلام انھیں کی اولاد میں سے تھے۔[1]

حضرتؐ کا نسب نامہ آپ کی ذات سے لے کر عدنان تک متفقہ طور سے تواریخ و سیر میں موجود ہے۔ اس طرح:-

عدنان۔ معد۔ نزار۔ مضر۔ الیاس۔ مدرکہ۔ خزیمہ۔ کنانہ۔ نضر۔ مالک۔ فہر۔ غالب۔ لوی۔ کعب۔ مرہ۔ کلاب۔ قصی۔ عبدمناف ہاشم۔ عبدالمطلب۔ عبداللہ جو حضرت محمد مصطفیٰؐ کے والد بزرگوار تھے۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؐ سے عدنان تک اکیس پشتیں ہیں اور اگر ہر نسل کا اوسط تیس سال قرار دیا جائے تو کل پشتوں کی مدت ۶۳۰ برس ہوئی۔ قریش کا لقب ان اکیس آدمیوں میں سے کس کو ملا۔ اس میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قریش کا لقب سب سے پہلے نضر بن کنانہ کو ملا۔ بعض کے نزدیک فہر کو اور بعض کے نزدیک قصی بن کلاب کو۔ وجہ تسمیہ میں بھی کئی قول ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ تقرش سے ماخوذ ہے تجارت اور کسب معاش کے معنی میں۔ چونکہ یہ لوگ اپنی محنت و مشقت اور قوت بازو کی کمائی کو معیار عزت سمجھتے تھے اور عملی طور پر اس کے پابند تھے، اس لیے قریش کہلائے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ وہ تقرش بمعنی اجتماع سے ماخوذ ہے۔ چونکہ ان لوگوں نے متفرق ہونے کے بعد اجتماعی شکل اختیار کی اس لیے قریش کہے جانے لگے۔ (۳)

---

(۲) الامم والملوک للطبری ج ۲ ص ۱۹۱-۱۹۳ (۲) سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۔ طبقات ابن سعد طبع لیدن ج ۱ ص ۲۷-۲۸۔ (۳) سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۰-۶۱

چونکہ قصی کے وقت تک نسل عدنان کے لوگ مکہ کے پہاڑوں اور وادیوں میں منتشر تھے۔ قصی نے ان سب کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس مکانوں میں آباد کیا اسی لیے خود قصی کو مُجَمِّع کے لقب سے یاد کیا جانے لگا جیسا کہ عرب کے شاعر نے کہا ہے۔

ابوکم قصی کان یدعی مُجَمِّعاً   بہ جمع اللہ القبائل من فہر

(یعنی، تمہارے مورث اعلیٰ قصی وہ ہیں کہ جو "مجمع" کہلاتے تھے۔ انہی کے ذریعہ سے اللہ نے قبیلۂ فہر کی مختلف شاخوں کو ایک جگہ جمع کیا (۱)

نابت بن اسمٰعیلؑ کے بعد خانہ کعبہ کی تولیت جرہمی خاندان کی طرف جو اُن کے ننھیال والے تھے منتقل ہو گئی تھی اور اس طرح یہ لوگ دنیوی اور مذہبی اقتدار دونوں کے مالک بنے ہوئے تھے۔ عرصہ تک قابض رہنے کے بعد انھوں نے کعبہ کے اموال میں تغلب و تصرف اور حج کو آنے والے پردیسیوں پر ظلم وستم اور حرم مکہ کی حرمتوں کو برباد کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں بنی خُزاعہ نے یمن سے نکل کر اُن پر حملہ کر دیا اور انھیں مکہ سے نکال کر خود قابض ہو گئے۔ یہ خاندان تقریباً دو سو برس تک کعبہ کا مالک بنا رہا۔ قصی نے انھیں میں شادی کی اور جب اُن کا اثر و رسوخ حجاز میں بڑھ گیا تو انھوں نے نضر بن کنانہ کی تمام اولاد کو جمع کر کے انھیں خانۂ کعبہ کی حمایت و تولیت کی ذمہ داری یاد دلائی اور آخر متفقہ طاقت کے ساتھ خزاعیوں کو شکست دے کے مکہ پر خود قابض ہوئے۔ انھوں نے مکہ معظمہ کے مکانات کی از سر نو تعمیر کی اور دار الندوہ (محلِّ مشاورت) کے نام سے ایک عمارت تیار کرائی جس میں جمہور کے کام انجام دیے جاتے تھے۔ اُن کے لیے معاشرت کے قوانین منضبط کیے اور خراج کی وصولیابی اور حاجیوں کے خورد و نوش کا بھی انتظام کرایا۔ (۲)

---

(۱) طبری ج ۲ ص ۱۸۲ (۲) سیرت ابن ہشام ج ا ص ۷۱-۷۹

اُنھوں نے شراب خواری کی مذمت اور اس کی مضرتوں کا اعلان بھی کیا۔[1]

قصی کے فرزندوں میں عبد مناف اوصاف و کمالات میں اپنے بزرگوں کے حقیقی جانشین تھے۔ اس لیے اپنے باپ کی زندگی ہی میں اُنھوں نے ملک عرب میں شہرت و امتیاز کا درجہ حاصل کر لیا۔[2]

عبد مناف کے فرزندوں میں ہاشم جن کا اصلی نام عمرو تھا نہایت بااثر اور ممتاز تھے۔ کعبہ کی معزز خدمتیں حاجیوں کی سیرابی اور ضیافت ان کو سپرد کی گئیں جو اُنھوں نے بہت قابلیت سے انجام دیں۔ اُنھوں نے سلطنت روم سے خط و کتابت کر کے کچھ خاص حقوق عرب تجار کے واسطے حاصل کیے تھے۔[3] "ہاشم" ان کا لقب اس وجہ سے ہوا کہ اُنھوں نے سب سے پہلے اہل مکہ کو روٹیوں کے ٹکڑے شوربے میں بھگو کے کھلائے۔[4] (عربی میں ہشم چورا کرنے کو کہتے ہیں)

ہاشم کی وفات کے بعد اُن کے بھائی مُطّلِب جانشین ہوئے اس لیے کہ ہاشم کے فرزند شیبہ اُس وقت نہایت کمسن تھے۔ جب مطلب کی وفات ہوئی تو اُن کی جگہ اُن کے بھتیجے شیبہ نے حاصل کی جو عبد المطّلب کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ شرف عظمت اور شہرت میں اپنے بزرگوں پر بھی فوقیت لے گئے[5] اور "سید البطحاء" کے خطاب سے مشہور ہوئے جو اُن کی اولا میں باقی رہ گیا چنانچہ وہ آج تک "سادات" کہے جاتے ہیں۔ عبد المطلب کا توکل اور اعتماد خدا پر اُس وقت پورے طور پر ظاہر ہوا جب ابرہہ نے یمن سے بڑھ کر کعبہ کو ڈھانے کے ارادے سے مکہ پر چڑھائی کی۔ مکہ والوں کے پاس کوئی ایسی فوجی طاقت نہ تھی جس سے وہ غنیم کا مقابلہ کرتے مگر

---

(۱) الامالی للصدوق صـ۴ـ۔ (۲) سیرت ابن ہشام ج ۱ صـ۵۱ـ۔ (۳) طبری ج ۲ صـ۱۸۰
(۴) ابن ہشام ج ۱ صـ۵۴ـ طبری ج ۲ صـ۱۷۹ـ (۵) ابن ہشام ج ۱ صـ۸۶ـ۔

عبدالمطلب خداوندی امداد پر بھروسا رکھتے تھے۔ آخر غیبی طاقت ہی نے اصحاب فیل کو تباہ و برباد کر دیا[۱]۔ عبدالمُطّلب کے دسؔ بیٹوں میں سے دوؔ بیٹے عبداللہ اور ابوطالب تھے۔

عبداللہ بن عبدالمطلب کی قربانی کا واقعہ بھی کتب تواریخ میں مذکور ہے اور مشہور ہے کہ عبدالمطلب اپنے فرزند عبداللہ کی قربانی پر تیار تھے مگر اُن کے ننھیال والوں کے اصرار پر قرعہ ڈالا گیا اور سَو اونٹوں کی قربانی کے بدلے میں عبداللہ کی جان بچی[۲]۔

چونکہ عبداللہ کا انتقال باپ کے سامنے ہو گیا اس لیے عبدالمطلب کے تمام امتیازات و اختیارات ابو طالب کو حاصل ہوئے۔ "شیخ البطحیٰ" اور "سید القریش" کے خطابوں سے مشہور ہوئے اور اُن امانتوں کے ساتھ ساتھ جو ابراہیم و اسمٰعیل کی متروکہ تھیں۔ ایک سب سے بڑی امانت جو اُن کی حفاظت میں آئی وہ عبداللہ کے یتیم فرزند محمدؐ کی ذات تھی۔

حضرت محمد مصطفےٰؐ کی عمر نوجوانی کی منزل میں تھی کہ آپ کی راستبازی اور امانت داری کو تمام عرب نے تسلیم کرتے ہوئے آپ کو "امین" کا لقب دے دیا[۳]۔ اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھوانا شروع کر دیں۔ اہم معاملات میں آپ کے تصفیہ کو قابل قبول سمجھنے لگے۔ جب آپ کی عمر بیس برس کی تھی تو قریش میں "حلف الفضول" کا عہد نامہ ہوا[۴] جو بے نظیر شریفانہ اُصول پر مبنی تھا اور اس کی تحریک کا سہرا بنی ہاشم ہی کے سر رہا اس لیے کہ زبیر بن عبدالمطلب اس کے داعی تھے۔

واقعہ یہ تھا کہ عبدالمطلب کے انتقال کے بعد عرب میں مطلق العنانی اور

---

(۱) اصول کافی طبع لکھنؤ صفحہ ۲۸۳۔ سیرت ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۳۲-۳۳۔ طبری ج ۲ صفحہ ۱۴۲-۱۴۳۔ (۲) ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۹۳-۹۷۔ (۳) طبقات ابن سعد ج ۱ صفحہ ۷۵۔ (۴) ابن سعد ج ۱ صفحہ ۸۲۔

بے آئینی کا دور دورہ ہو گیا۔ رشتہ داریوں کے لحاظ سے آپس میں کشت و خون تو نہیں ہونے پایا مگر اجنبی لوگوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا تھا چنانچہ قبیلہ زبید کے ایک یمنی شخص نے جس سے کہ عاص بن وائل سہمی نے کوئی بیش قیمت چیز خرید کر قیمت ادا نہیں کی تھی تمام آل فہر کو مخاطب کر کے مؤثر انداز میں اس ظلم و ستم کا شکوہ بھی کیا۔

انہی واقعات سے متاثر ہو کر بنی ہاشم، زہرہ اور اسد بن عبد العزیٰ کے قبیلے عبد اللہ بن جدعان کے مکان میں جمع ہوئے اور متفقہ طور پر عہد کیا کہ ہم ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دیں گے اور اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک اس کا حق ادا نہ ہو جائے۔ اس معاہدہ کا نام حلف الفضول رکھا گیا۔ یہ نام جرہمیتین کی ایک قدیم انجمن کے نام کی یادگار میں رکھا گیا جس میں فضل، فضال مفضل اور فضیل شامل تھے اور اس لیے اس کا نام فضول قرار پا گیا تھا۔ حضرت محمد مصطفےٰ اس معاہدہ میں شریک تھے اور ہمیشہ اس پر آپ نازاں رہے بلکہ بعثت کے بعد جبکہ عرب کے تمام قدیم معاہدات اور مخاصمات کالعدم قرار دے دیے گئے تھے آپ اپنے کو اس معاہدہ کا پابند سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ آج بھی اگر کوئی مجھے اس معاہدہ کی بنا پر آواز دے تو میں اس کی صدا پر لبیک کہوں گا۔[1]

اگر آپ نے عرب کی تاریخ پڑھی ہے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ معاہدہ اس قوم کی عام ذہنیت کے بالکل خلاف تھا وہاں تو یہ تھا کہ ہم کو اپنے قبیلہ والے کی مدد کرنا چاہیے خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ اس قبائلی تعصب کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک شخص کی ذاتی جنگ قبائلی جنگ بن جاتی تھی جو چالیس چالیس برس جاری رہتی تھی۔ اس غلط ذہنیت کی سب سے پہلے مخالفت کرنے والے بنی ہاشم تھے جو دنیا کو حق و انصاف

---

(۱) ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۔ ابن سعد ج ۱ صفحہ

کی قدر و قیمت کا اندازہ کرا رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ اس کے مقابلہ میں قومیت یا برادری کوئی چیز نہیں ہے۔

جب حضرت محمد مصطفےٰ ؐ کی عمر تیس برس کی تھی ابو طالب کے یہاں علیؑ کی ولادت ہوئی [1] اور ابھی علیؑ ابن ابی طالب چند ہی سال کے تھے کہ مکہ میں قحط پڑا اور ابو طالب اقتصادی تکالیف میں مبتلا ہو گئے۔ آپ کے بار کو کم کرنے کے لئے محمد مصطفےٰ ؐ نے علیؑ کی پرورش اپنے متعلق کر لی۔ اس طرح علیؑ محمدؐ کے آغوش تربیت میں آ گئے [2]۔

یہاں ایک مرتبہ اس پر نظر ڈال لیجیے کہ اس خاندان کی زمین شرف کس آسمان تک پہنچ چکی تھی اور اُس کے قدیم روایات کس درجہ شاندار ہیں

(۱) کعبہ جو تمام عرب کے مذہبی اجتماع کا مرکز ہے وہ تعمیر کیا ہوا ہے ان کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم کا۔

(۲) ان کے دادا حضرت اسمٰعیلؑ، اللہ کی بارگاہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے "ذبیح خدا" کہلائے۔ پھر عبد المطلب اور اُن کے فرزند عبد اللہ نے اُسی سبق کو دہرا کر ثابت کر دیا کہ یہ قربانی کا جذبہ اس خاندان کا ورثہ ہے جو دنیا کو برابر یاد رہا چنانچہ ان دونوں طے شدہ قربانیوں کی بنا پر حضرت محمد مصطفےٰ ؐ کو "ابن الذبیحین" کے لقب سے یاد کیا گیا [3]۔ ؏

---

(۱) آپ مکہ معظمہ میں خاص کعبہ کے اندر ۱۳ رجب ۳۰؁ عام الفیل کو (کعبہ پر ہاتھیوں کے حملہ سے تیس برس بعد) پیدا ہوئے (مروج الذہب مسعودی۔ مستدرک حاکم۔ ارشاد شیخ مفید)۔ (۲) ابن ہشام ج ا ص ۱۸۳ (۳) طبری ج ا ص ۱۳۵۔ ؏ شریعت اسلامیہ میں یہ طریقہ، قربانی کہ اپنے ہاتھ سے اللہ کی رضا کے لیے اپنایا کسی اپنے سے متعلق انسان کا خون بہایا جائے منسوخ کر دیا گیا مگر راہ خدا میں جب ضرورت ہو تو دشمنوں سے جہاد کر کے اپنی جان قربان کرنے کا اُصول قائم رہا اور آل رسول نے عملی طور پر اسی کی مثالیں پیش کیں۔

(۳) تمام قبائلِ مضر کی شیرازہ بندی کا فخر انھیں کو حاصل ہے۔

(۴) خانۂ کعبہ کے محافظ اور موسم حج کے منتظم ہونے کی حیثیت سے انھیں تمام عرب کی مرکزیت حاصل ہے۔

(۵) تمام اندرونی اور بیرونی معاملات میں عرب قوم کی قیادت اور نمائندگی ان کا حصّہ ہے۔

(۶) وہ غریبوں کے دستگیر اور قحط سالی وغیرہ کے سخت اوقات میں مسکینوں کی خبرگیری کرنے والے ہیں۔

(۷) وہ اسم اور مسمّیٰ دونوں حیثیتوں سے سیّد (سردار) مانے جاتے ہیں۔

(۸) وہ ایک ہی وقت میں میدان جنگ کے شہسوار اور عالمِ روحانی کے رازدار ہیں جس کا گواہ اصحابِ فیل کے مقابلہ میں عبد المطلب کا طریقۂ بیکار ہے۔

(۹) اُنھوں نے مظلوموں کی حمایت اور حق کی طرفداری کا بیڑا اٹھایا اور اس بارے میں تمام قریش کی رہنمائی کی تھی۔

یہ ہیں وہ نمایاں خصوصیات جو تاریخی اسناد کے ساتھ اس خاندان کے لیے ابھی تک ثابت تھے مگر اب اسی مشرق سے وہ آفتاب چمکتا ہے جس کی شعاعیں دنیائے انسانیت کو صبحِ قیامت تک روشن رکھیں گی۔

ساتویں صدی عیسوی کے شروع ہونے پر جبکہ دنیا تاریکی کے عظیم دور سے گزر رہی تھی۔ جزیرہ نمائے عرب سے یہ آفتاب طالع ہوا جس کی ابتدائی کرنیں اگرچہ حجاز کی سرزمین مکہ سے ظاہر ہوئی تھیں مگر رفتہ رفتہ اُس کی روشنی شرق و غرب میں پھیل گئی اور دنیا کو روشن کر دیا۔ یہ عالمگیر مذہب اسلام تھا اور اس خداوندی پیغام کے پہنچانے کے لئے محمد مصطفٰےؐ منتخب ہوئے جن کے ذریعہ سے کائنات کو ایک خدائے توانا کے سامنے سر جھکانے کی تعلیم دی گئی اور غیر اللہ کی پرستش کو مٹانے

کا اعلان کیا گیا۔ خواہ وہ سونے چاندی پتھر کے بت ہوں یا گوشت پوست سے بنا ہوا انسان ہو اور ہی اقتدار کے سامنے اپنی سطوت و ہیبت کا سکہ جمانا چاہتا ہو اور خلق خدا کو اپنے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کرے۔

اس وقت حضرت علی بن ابی طالبؑ کی عمر دس برس کی تھی اور چونکہ علیؑ پہلے سے رسولؐ کی آغوش تربیت میں تھے[1] اس لیے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ علیؑ اور اسلام میں وہی وابستگی پیدا ہوئی جو ایک آغوش میں رہنے والے دو بچوں میں آپس میں ہونا چاہیے۔

چند سال تک رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ کو ادا کیا گیا[2]۔ اس کے بعد حکم آ گیا وانذر عشیرتک الاقربین (یعنی) اپنے قریبی رشتہ داروں کو تبلیغ کرو[3]۔ حضرتؐ نے اس حکم کی تعمیل میں دعوت کا انتظام کر دیا اور تمام اولاد عبدالمطلب کو جمع کر کے اپنی رسالت کا اعلان کیا اور توحید الٰہی کا پیغام پہنچایا۔ پھر فرمایا کہ تم میں سے کون شخص اس دین کی اشاعت میں میرا دست و بازو بننے کے لیے تیار ہے اس وعدہ پر کہ وہی میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین قرار پائے گا۔ مجمع تمام خاموش تھا۔ حضرت علیؑ اگرچہ سب سے زیادہ کمسن تھے مگر آپ کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں آپ کا اس مہم میں ہر طرح سے مددگار رہوں گا۔ حضرتؐ نے علیؑ کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا بس یہ میرا بھائی۔ میرا وصی اور میرا جانشین ہے۔ تم سب کو اس کی اطاعت لازم ہے[4]۔

---

(۱) طبری ج ۲ صفحہ ۲۱۳ ۔ (۲) طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۳۲ ۔ طبری ج ۲ صفحہ ۲۱۸-۲۱۴

ارشاد ص ۱۷ ۔ (۳) قرآن سورۂ شعراء آیت ۲۱۴

(۴) طبری ج ۲ ص ۲۱۷

اب علانیہ بت پرستی کی مذمت ہونے لگی جس سے قریش آپ کی مخالفت پر کمربستہ اور ایذا رسانی پر آمادہ ہوگئے مگر آپ کے چچا جناب ابوطالب کی شخصیت آپ کے سامنے سینہ سپر تھی جس کی وجہ سے ان لوگوں کو کچھ بن نہ پڑتا تھا آخرکار قریش کا ایک وفد ابوطالب کے پاس آیا۔ اس میں عتبہ، شیبہ، ابوسفیان، عاص بن ہشام، ابوجہل، ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل وغیرہ شریک تھے۔ ان لوگوں نے ابوطالب سے کہا کہ تمھارا بھتیجا ہمارے معبودوں کو برا کہتا ہے، ہمارے مذہب کی مذمت کرتا ہے ہم کو احمق ٹھہراتا ہے اور ہمارے آباؤاجداد کو گمراہ بتاتا ہے اس لیے یا تو تم اسے ان باتوں سے روک دو یا اسے ہمارے سپرد کردو۔ پہلی بار ابوطالب نے نرمی سے ان کو ٹال دیا مگر کچھ عرصہ کے بعد جب یہ وفد پھر آیا تو اس نے نہایت سختی سے کہا کہ اب ہم اس صورت حال کو برداشت نہیں کرسکتے۔ یا تو تم انھیں روکو اور یا ہمارے تمھارے درمیان جنگ ہو کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے۔ ابوطالب نے مناسب سمجھا کہ رسول اللہؐ سے اس کا تذکرہ کر دیں حضرت نے پورا واقعہ سنا تو فرمایا " خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لاکر دے دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔ خدا اس کام کو پورا کرے گا یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا" اور یہ کہتے کہتے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ دیکھنا تھا کہ ابوطالب کا دل ہل گیا۔ انھوں نے کہا کہ اچھا تم اپنے فرض کو انجام دیتے رہو۔ میں آخر دم تک تمھارا ساتھ دوں گا۔[1]

چنانچہ ابوطالب نے حضرت محمد مصطفیٰ کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور جب تک زندہ رہے رسول کے سامنے سینہ سپر رہے۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۴۲-۱۴۳ - طبری ج ۲ ص ۲۱۹-۲۲۰

مگر حضرت ابوطالب اور خدیجۂ کبریٰ کی وفات کے بعد اہل مکہ کی ایذا رسانی حضرت رسولؐ کے خلاف بہت بڑھ گئی اور آپ نے اُن کے راہ راست پر آنے سے بظاہر اسباب نا اُمید ہو جانے کی وجہ سے یہ طے کر لیا کہ اب مکہ معظمہ کو جو آپ کا آبائی وطن تھا ترک فرما دیں چنانچہ رفتہ رفتہ اپنے متبعین کو مدینہ کی طرف جہاں کے کچھ لوگوں نے آپ کی پیروی قبول کر لی تھی روانہ فرمانے لگے۔ یہ دیکھ کر مکہ والے سب آپ کی جان لینے کے درپے ہو گئے اور ایکا ہوا کہ رات کے وقت آپ کے گھر کو گھیر کر آپ کو قتل کر ڈالیں۔ آپ اپنے چچا زاد بھائی علی بن ابیطالبؑ کو یہ ہدایت فرما کر کہ وہ آپ کے بستر پر آپ کی چادر اوڑھ کر سو رہیں خود مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ حضرت علیؑ نے دشمنوں کی کھنچی ہوئی تلواروں کے اندر رسول کے بستر پر آپ کی چادر اوڑھ کر آرام کیا۔[1]

پھر مدینہ پہنچنے کے بعد جب مخالفین اسلام نے فوجی طاقتوں کے ساتھ مسلمانوں پر چڑھائی کی اور بدر و اُحد اور خندق وغیرہ کی لڑائیاں ہوئیں تو ان لڑائیوں میں حق و صداقت کی روحانی طاقت کے ساتھ حضرت علی مرتضیٰ کی تلوار ہر موقع پر اسلام کی فتح مندی کا سبب بنتی رہی۔

حضرت محمد مصطفیٰؐ کی ایک بیٹی تھیں فاطمہ زہرا جن کی اُن کے بلند اوصاف کی بنا پر آپ اتنی عزت کرتے تھے کہ جب وہ آپ کے پاس آتی تھیں تو آپ تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔[2] اور بکثرت حدیثیں آپ نے اُن کی فضیلت کے بارے میں ارشاد کیں جن میں ایک یہ تھی کہ وہ سردار زنان جنت اور سردار زنان اہل ایمان ہیں۔[3] اور فرمایا

---

(۱) طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۵۳۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۸۹ تا ۲۹۰۔ طبری ج ۱ ص ۲۴۲۔ (۲) استیعاب ج ۲ ص ۷۴۲۔ اعلام الوریٰ ص ۹۵۶۔ (۳) صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۷۳۔ ۱۸۵۔ ۱۸۹۔ صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۹۰۔

کہ فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّی (یعنی) فاطمہ میرا ایک ٹکڑا ہے[1]۔

ظاہر ہے کہ ایسی بیٹی کے لیے رسول ایسے ہی صاحب اوصاف موزوں ترین کفو کو منتخب فرما سکتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بہت سے پیغام اور نسبتیں آئیں مگر سب مسترد کر دی گئیں اور صرف علیؑ ہی کی ایک ذات جس کے لیے رسول کا قول تھا کہ میں اور علی ایک ہی نور سے ہوں[2] اس رشتہ کے لیے موزوں سمجھی گئی اور رسول خدا نے فرمایا کہ یہ میرا ہی نہیں بلکہ اللہ کا انتخاب ہے[3]۔

انہی دونوں مقدس اور بزرگ مرتبہ ماں باپ سے دو فرزند پیدا ہوئے ایک حسنؑ اور دوسرے حسینؑ۔

اب کیا حسینؑ بھلا سکتے تھے اپنے خاندانی خصوصیات اور قدیم روایات کو؟! بقول مولانا ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری۔ "حسین جس نسل کی یادگار تھے وہ صدیوں سے قربانی و فداکاری کی ایک مسلسل تاریخ تیار کر رہی تھی" حسینؑ نے دیکھا نہیں مگر کانوں سے سنتے تو رہے کہ ہمارے مورث اعلیٰ ابراہیم خدا کی رضا کے لیے بیٹے کے ذبح پر تیار ہو گئے۔ ہمارے پردادا عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کو قربان گاہ عبودیت میں پیش کیا۔ ہمارے جد بزرگوار ہاشم نے اپنے مال و دولت اور اثر کو ہمیشہ خلق خدا کی خدمت میں صرف کیا۔ ہمارے خاندان نے مظلوموں کی امداد اور ظالموں سے مقابلہ کا حلف اٹھایا ہے اس لیے اگر خلق خدا کسی ظالم کے ہاتھ سے پریشان ہو تو ہمارا فرض ہے کہ ہم مظلوموں کی دستگیری کے لئے آگے بڑھ جائیں[4]۔

---

(۱) بخاری ج ۲ صفحہ ۱۸۵ و ۱۸۹ (۲) فردوس الاخبار دیلمی و تذکرہ سبط ابن جوزی وغیرہ (۳) صواعق محرقہ صفحہ ۹۶

(۴) حلف الفضول کو حضرت امام حسینؑ اپنے پیش نظر رکھتے تھے اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک موقع پر جب ولید بن عقبہ حاکم مدینہ نے آپ کے ساتھ ظلم و تعدی سے کام لیا تو آپ نے حلف الفضول کا حوالہ دیا تھا اور اس کی پابندی کی طرف سب کو توجہ دلائی تھی جس کے نتیجہ میں عبداللہ بن زبیر مسور بن مخرمہ بن نوفل زہری اور عبدالرحمٰن (بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

حسینؑ کو معلوم ہوا کہ سچائی کی خاطر پتھر کھائے اور مصیبتیں اُٹھائیں میرے نانا رسول اللہؐ نے اور پیغمبر اسلام کی حفاظت کے لیے سینہ سپر رہے میرے دادا ابو طالب اور جب اسلام کی حفاظت کا مسئلہ درپیش تھا تو سب سے پہلے عہدوفاداری کرنے والے اور پھر تلواروں کے حصار میں بسترِ رسول پر لیٹنے والے اور پھر ہر سخت موقع پر سچائی کے لئے جہاد کرنے والے میرے باپ علیؑ بن ابی طالب تھے۔

یہ عام قاعدہ ہے کہ بچے جب اپنے بزرگوں کے حالات سنتے ہیں تو ان میں بچپن ہی سے ولولہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں بھی کوئی موقع ایسے کارنامے پیش کرنے کا مل جائے۔ اس لیے عام فطرت کے تقاضوں اور ظاہری اسباب کے لحاظ سے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ امام حسینؑ کے لیے علاوہ منصبی ذمہ داری کے، خاندانی روایات اور بلند فطرت کا تقاضا ہی تھا کہ بچپن سے منتظر ہوں اور مشتاق رہیں کہ سچائی کی خدمت، غریبوں کی دستگیری اور مظلوموں سے ہمدردی کا کوئی موقع پیش آئے اور آپ بھی حق کی حمایت میں اپنے فریضہ کو انجام دے کر اپنے خاندانی روایات کو زندہ اور برقرار رکھیں۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۹) بن عثمان بن عبیداللہ تیمی متعدد اشخاص نے یہ اعلان کیا کہ اگر حسینؑ بن علیؑ اس معاہدہ کی بنا پر اپنے حق کو طلب کرنے کے لیے کھڑے ہوں تو ہم ساتھ ہوں گے۔ آخر ولید نے سلسلہ ختم کردیا اور حضرت کے مطالبہ کو منظور کیا۔ (سیرت ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۸۴)

شجرۂ نسب آلِ عدنان

عہ ماخوذ از سیرۃ النبی للشیخ ابی محمد عبد الملک بن ہشام ج ا ط مصر سلہ حضرت محمد مصطفیٰؐ کی والدہ آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ تھیں (طبقات ابن سعد ط لیدن ج ا ص ۳۱ - ابن ہشام ج ا ص ۷۹ - اصول کافی ط لکھنؤ ص ۲۸۹ - سلہ حضرت علی مرتضیٰؑ کی والدہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم تھیں۔ اسی لیے آپ کے خصوصیات میں سے ہے "اول ہاشمی ولدہ ہاشم مرتین" یعنی پہلے وہ شخص ہیں جو ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے ہاشمی النسل تھے (اصول کافی ط لکھنؤ ص ۲۸۷ - الارشاد للمفید ط ایران ص ۳)

دوسرا باب

بنی ہاشم اور بنی اُمیہ

بنی ہاشم کے بالمقابل تاریخ میں جو نام نظر آتا ہے وہ "بنی اُمیہ" ہے۔ اس قبیلہ کی بنی ہاشم سے رقابت اور مخالفت کے لیے یہ حکایت بیان کی گئی ہے کہ اُمیہ کا باپ عبدالشمس اور بنی ہاشم کے مورث اعلیٰ حضرت ہاشم یہ دونوں ماں کے پیٹ سے جڑواں پیدا ہوئے تھے اس طرح کہ انگلی ایک کی دوسرے کی پیشانی سے چسپاں تھی۔ مجبوراً ان کو کاٹ کر الگ الگ کیا گیا جس سے خون بہنے لگا۔ اُس وقت لوگوں نے اسے بدشگونی مان کر کہا کہ ان میں آپس میں خونریزیاں ہوتی رہیں گی[1]۔ یہ حکایت درست ہو یا نہ ہو لیکن اس سے یہ تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں کی جنگ نے کتنی جڑ پکڑ لی تھی کہ لوگ اس کو ایک ناگزیر اور قدرتی چیز سمجھنے لگے تھے۔ مگر ہم جہاں تک تاریخ کے واقعات کی چھان بین کرتے ہیں ہمیں خود عبدالشمس اور ہاشم میں جنگ یا منازعت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بے شک عبدالشمس کے بعد اُمیہ کی طرف سے مخاصمت کی ابتدا نظر آتی ہے جبکہ وہ حضرت ہاشم سے مقابلہ کی کوشش میں ناکام ہوا اور اس وقت سے اُس نے ایک شکست خوردہ حریف کی طرح انتقامی تصادم کا سلسلہ جاری رکھا۔ واقعہ یہ تھا کہ مکہ میں قحط پڑا جس میں قریش بہت تباہ

---

(۱) طبری ج ۲ ص ۱۸۰۔

حال ہو گئے۔ حضرت ہاشم شام کی جانب گئے اور وہاں اُنھوں نے بہت زیادہ مقدار میں آٹا فراہم کر کے اُس کی روٹیاں پکوائیں اور اُنھیں اونٹوں پر بار کر کے مکہ لائے۔ اُن روٹیوں کو اُنھوں نے چورا کرایا اور اُن اونٹوں کو نحر کر کے شوربا تیار کرایا اور بڑی بڑی دیگوں میں اُنڈلوا کر وہ تمام روٹیوں کا چورا ان دیگوں میں ڈلوا دیا۔ اس کھانے کو عرب میں "ثرید" کہتے تھے۔ اس طرح اُنھوں نے تمام مکہ کے لوگوں کو کھانے سے سیر کیا۔ اتفاق سے اسی کے بعد ابر آیا۔ پانی برسا اور قحط سالی دور ہو گئی۔ ہر شخص کہنے لگا کہ اب کی پہلا بارانِ رحمت کا چھینٹا وہ تھا جو "ہاشم" کے ذریعہ سے برسا۔ "ہاشم" کے معنی ہیں روٹیوں کا چورا کرنے والا۔ شاعروں نے اس واقعہ کو خاص الفاظ میں نظم کیا۔ ایک شاعر نے کہا ہے۔

عمرو الذی ھشم الثرید لقومہٖ قوم بمکۃ مسنتین عجاف

عمرو (یہ ہاشم کا اصلی نام ہے) جنھوں نے اپنی قوم کے لیے روٹی کے ٹکڑے کر کے اُنھیں کھانا کھلایا وہ قوم جو مکہ میں قحط سے بھوکی اور تباہ حال ہو رہی تھی۔[1]

اُمیہ دولت مند آدمی تھا۔ اُس نے جو دیکھا کہ حضرت ہاشم نے یہ کیا تو اُسے حسد دامنگیر ہوا اور خواہ مخواہ بغرض مقابلہ اُس نے بھی ہاشم کی نقل اُتارنے کی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا اور یہ امر قریش میں اُس کی رسوائی اور بدنامی کا باعث بن گیا۔ اس بارے میں ہاشم کا کوئی قصور نہیں تھا مگر لوگوں کے طعنوں تشنیعوں سے کھسیانے ہو کر وہ ہاشم کو بُرا بھلا کہنے لگا اور اُس نے ہاشم کو "منافرت" کی دعوت دی۔ یہ ایک طرح کا مقابلہ عربوں میں رائج تھا کہ دو شخص اپنے اپنے کارناموں کو پیش کر کے کسی ثالث کو حکم بناتے تھے کہ وہ فیصلہ کر دے کہ کون ان میں زیادہ صاحب فخر دلائق عظمت ہے۔ اس ثالثی کے لیے زیادہ تر کاہن منتخب کیے جاتے تھے جو علم قیافہ اور نجوم میں بڑے ماہر ہوتے تھے۔ حضرت ہاشم نے اپنی عمر کی بزرگی اور اپنے رتبہ

---

(۱) سیرت ابن ہشام ج ۱ صـ ۸۵

کی بلندی کے لحاظ سے اُمیہ کے ساتھ مُقابلہ سے انکار کیا مگر قریش کے عام افراد نے حضرت ہاشم کو مجبور کیا۔ آخر آپ بھی آمادہ ہو گئے اور کہا کہ میں اس شرط پہ مقابلہ کرتا ہوں کہ شکست خوردہ فریق اپنے مقابل کو ۵۰ اونٹ سیاہ آنکھوں والے سپرد کرے جو سرزمین مکہ میں نحر کیے جائیں۔ اور دس برس کے لئے وہ مکہ سے جلا وطن ہو جائے۔ اُمیہ اس شرط پہ رضا مند ہو گیا چنانچہ قبیلہ خزاعہ کے کاہن کو حکم مقرر کیا گیا۔ اُس نے فیصلہ ہاشم کے حق میں اور اُمیہ کے خلاف دیا۔ حضرت ہاشم نے قرارداد کے مطابق ۵۰ اونٹ حاصل کیے اور انھیں نحر کرا کے پھر تمام اہل مکہ کی دعوت کر دی اور اُمیہ کو دس برس کے لیے مکہ سے جلا وطن ہونا پڑا اور وہ اس مدت تک شام میں قیام پذیر رہا۔ یہ پہلی عداوت تھی[1] جو اُمیہ کی اولاد کو بنی ہاشم کے مقابلہ میں نسل در نسل برقرار رہی۔ اسی کے ساتھ پے در پے شکست کھانے کے لازمی نتیجہ کے طور پہ بنی اُمیہ عربی خون کی بہت سی لطافتیں کھوتے گئے اور اُن میں دناءت، فریب، احساس کمتری اور دوسرے اسی طرح کے اوصاف پیدا ہوتے گئے جو مسلسل شکست کھانے والوں کی خاصیت ہوا کرتے ہیں۔

یہاں تک کہ بنی ہاشم اور بنی اُمیہ کے درمیان عام افراد عرب کی نگاہوں میں اتنا تفرقہ پیدا ہوتا گیا کہ یہ چیز قابل غور بن گئی کہ یہ دونوں ایک ہی نسل کی دو[2] شاخیں ہیں بھی یا نہیں۔ عرب قوم کے یہ تاثرات دیکھ کر بنی اُمیہ، بنی ہاشم کے خلاف ضربیں لگاتے تھے مگر ہر مرتبہ انھیں ناکامی ہی ہوتی تھی۔ حضرت محمد مصطفیٰ بھی اُٹھے تو بنی ہاشم ہی کے یہاں سے۔ یہ آخری بڑی تقدیر کی شکست تھی جسے بنی اُمیہ آسانی سے سہہ نہ سکتے تھے شبلی نعمانی سیرۃ النبی جلد اول میں صفحہ ۱۵۸ پہ لکھتے ہیں کہ "آنحضرت کی نبوت کو خاندان بنی اُمیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا۔ اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلے نے آنحضرت کی مخالفت کی"۔

---

(۱) طبقات ابن سعد مطبوعہ لیدن (ہالینڈ) ج ۱ قسم ۱ صفحہ ۴۳ و ۴۴ طبری ج ۲ صفحہ ۱۸

تیسرا باب

اِسلام اور اُس کا پیغام

ظہورِ اسلام سے قبل کا زمانہ "ایام جاہلیت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق یہ خیال درست نہیں ہے کہ عرب اُس میں وحشت اور بربریت کے دور سے گزر رہے تھے اور تمدن و تہذیب سے واقف نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ جس طرح ڈاکٹر وحید مرزا صاحب نے لکھا ہے واقعہ یہ ہے کہ جنوبی عرب اسلام سے صدیوں قبل ایک بڑی تہذیب کا گہوارہ اور کاروبار تجارت کا ایک خوشحال مرکز تھا۔ حمیری بادشاہوں کے آثارِ قدیمہ، سدِ مارب، باغِ شداد اور تختِ بلقیس ملکۂ سبا وغیرہ کے تذکروں میں اس کا مکمل ثبوت موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایام جاہلیت کی شاعری جو کہ ادب کا بہترین نمونہ ہے۔ اُسی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایام جاہلیت کے عرب بہت سی خوبیوں کے حامل تھے، مثلاً بہادری، سخاوت، مہمان نوازی، وفاداری شوہری محبت اور برادری اُنس وغیرہ، خلاصہ یہ کہ شاعری اُن کے اخلاقیات کا دفتر ہے اور اُس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شرافت کا کافی عنصر رکھتے تھے۔ اُن کی شاعری بالخصوص، اُن میں سے چند کی، اس بات کو بھی ظاہر کر دے گی کہ اگرچہ وہ اُس زمانے کے الہامی مذہب کو نہ ماننے کے باعث مشرک تھے اور بُت پرستی بھی کیا کرتے تھے تاہم وہ مذہب کے خاص خاص عقائد سے بالکل ناواقف و بیگانہ نہ تھے۔ وہ اپنی بت پرستی کی یہ تاویل کرتے تھے کہ ان بتوں کے ذریعے ہم

خدائے واحد (اللہ) کی بارگاہ میں قرب حاصل کرتے ہیں پھر یہ کہ عربوں کی ایک بڑی تعداد جناب اسمٰعیل کی نسل سے تعلق رکھتی تھی اور یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے آباواجداد کے تعلیمات سے قطعاً بیگانہ ہو گئے ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تمدنی حیثیت سے اسلام سے قبل کے زمانہ میں عرب کی جماعت ترقی کے بعد تنزل کی طرف جا رہی تھی۔ اب اُس میں کچھ عمدہ قدیم خوبیوں کا شائبہ تو موجود تھا لیکن زیادہ تر اس میں بُری عادتیں داخل ہو گئی تھیں۔ وہ ہر سال مکہ میں بغرض حج جمع ہوتے تھے لیکن اس مقدس فرض کی اہمیت اُن کے دلوں سے محو ہو چکی تھی۔ اُن کے کارواں حجاز اور عراق اور شام میں اب بھی اسباب سے لدے ہوئے جاتے تھے لیکن اب اُن میں صنعت و تجارت کا جوش سرد ہو چکا تھا اور انتہائی غربت نے انھیں حریص بنا دیا تھا۔ انھیں اللہ کا ایک دھندلا اور مدھم تصور موجود تھا لیکن اُن کے بُت اُن کے نزدیک زیادہ مقدس تھے۔ وہ صلح پسند اور مطمئن زندگی کے فوائد سے واقف تھے اور جنگ سے متنفر رہنا چاہتے تھے جسے وہ "شعلہ در آگ" یا اُس منحوس جانور سے جس کے یہاں کثرت سے توام بچے پیدا ہوتے ہیں تشبیہ دیا کرتے تھے لیکن اُن کی خود غرضی اور غربت اُن کو آمادہ کرتی تھی کہ وہ اپنے ہمسایہ کے مال پر دست تطاول دراز کریں۔ وہ اپنے مردوں کا خوب ماتم کرتے تھے لیکن انتقام کشی سے اپنے کو باز نہ رکھ سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ نسلاً بعد نسلٍ برابر خوں ریز جنگیں جاری رہتی تھیں۔ وہ اپنے بچوں سے محبت کرتے تھے اس لیے کہ وہ ان کے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ جو زمین پر چلتے پھرتے ہیں لیکن ان ہی میں سے بعض کو اپنی عزت کا اتنا پاس رہتا تھا کہ وہ اس خیال کو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ اُن کی لڑکیاں کسی ظالم بھائی یا چچا کی کنیزی میں چلی جائیں، یا اُن کے رحم و کرم پر پڑ جائیں اور اس لیے وہ اُن کی ہلاکت کو اپنی عزت کے برقرار رکھنے کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے۔

یہی حالت وہ ہوتی ہے جس کی اصلاح نہایت دشوار ہے۔ کیونکہ دور بربریت و وحشت سے گزرتی ہوی قومیں سادہ لوح ہوتی ہیں۔ اُن کے دلوں پر جیسا نقش بٹھلایا جائے وہ آسانی سے اُتر آتا ہے اس لیے کہ اس کے خلاف کوئی نقش جما ہوا نہیں ہے مگر عربوں کی تمدنی خرابیاں وہ تھیں جو خالص مادی ساخت کے تمدن اور ہوس اقتدار کی پیداوار ہوتی ہیں۔ اُنھوں نے عربوں کی افتاد طبع کے ساتھ مل کر سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔

احساس برتری قومیت سے منتقل ہو کر جب انفرادیت کی طرف آتا ہے تو اُس کا نتیجہ ہوتا ہے باہمی رقابت اور آپس کی خانہ جنگی یہ بات عربوں میں انتہا درجہ پر پہنچ گئی تھی۔ پھر اسی کا نتیجہ تھا کہ مساوات انسانی کوئی چیز نہ رہی تھی اور غلبہ، طاقت اور اقتدار سب کچھ تھا۔ اس کی ایک ادنی مثال یہ ہے کہ ایک بڑے آدمی کے قتل ہو جانے پر صرف اُس کے قاتل کو قتل نہ کیا جاتا تھا بلکہ اس کے قبیلہ کے سیکڑوں بے گناہ آدمیوں کو مار ڈالا جاتا تب کہیں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اُس کے خون کا بدلہ ہوا۔ اس کے برخلاف اگر بڑے آدمی کے ہاتھ سے کوئی چھوٹا آدمی قتل ہوتا تھا تو اُس کا خون قصاص کا مستحق نہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ بڑے اور چھوٹے کی تفریق ہزاروں تمدنی گناہوں کا سرچشمہ تھی اور انسانیت کے پرخچے اُڑا رہی تھی۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ اُنھوں نے مادیت کو سب کچھ سمجھ لیا تھا، ماوراء المادہ کا تخیل باقی نہ رہا تھا اِس لیے مادی طاقت ہی کی بنا پر وہ امتیازات قائم کرتے تھے۔ یہی حالت کم و بیش عرب کے علاوہ دوسرے ملکوں کی بھی تھی۔

مذہبی حیثیت سے عرب نہایت پستی میں تھے۔ اُن میں کوئی ایک مذہب مشترک نہ تھا بلکہ وہاں متعدد مذاہب کے افراد رہتے تھے اور بڑی جماعت بت پرستی اور ستاروں کی پرستش کو اپنا شعار بنائے ہوے تھی چنانچہ کعبہ ہی میں تین سو ساٹھ

بُت رکھے ہوئے تھے جن میں سے ایک ایک کی پرستش سال کے ایک ایک دن کی جاتی تھی کیونکہ عربی سال ۳۶۰ ہی دنوں کا ہوتا ہے۔ جو مذاہب رائج تھے جیسے یہود، مجوس، اور نصاریٰ وہ بھی پستی کی طرف مائل نظر آرہے تھے۔ اُن کے اعمال ناشائستہ، اُن کی دوسری جماعتوں سے نفرت ان میں رواداری کا مفقود ہونا اور آپس کی خوں ریزی اور ایسی ہی بہت سی خرابیاں ان میں واضح طور پر موجود تھیں اور اس لئے فطرت انسانی کسی ایسی منتخب ہستی کی خواہاں تھی جو دنیا کو اس مصیبت سے نجات دلائے۔

ایسے وقت میں محمدؐ بن عبداللہ اسلام کا زلزلہ افگن پیغام انقلاب لے کر دنیا کے سامنے آگئے اور مردہ انسانیت کو زندگی کا مژدہ سنایا۔ جیسا کہ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب نے لکھا ہے "حضرت کا کام یقیناً دشوار تھا اس لیے کہ آپ محض وحشی لوگوں کو متمدن نہیں بنا رہے تھے بلکہ بگڑی ہوی سماجی کیفیت کو سُدھارنا چاہتے تھے۔ آپ کا کام اُن تمام عقائد و توہمات، روایات و مراسم کا عربوں کے دلوں سے محو کرنا تھا جو اُن کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھیں رسول اُن لوگوں کو بُردباری، خاکساری، عفو کا سبق پڑھانا چاہتے تھے جن کے نزدیک معاف کر دینا کمزوری کی دلیل اور انتقام نہ لینا ذلت اور بزدلی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ رسول اُن لوگوں کو مساوات اور اُخوت کی تعلیم دینا چاہتے تھے جو کہ اپنے خاندانی شرف پر فخر کیا کرتے تھے اور اپنے آباؤ اجداد کے پورے شجرہ کو نہایت سختی کے ساتھ محفوظ رکھا کرتے تھے۔ ان چیزوں کے علاوہ اسلام کو عربوں کے اور بہت سے دوسرے رجحانات سے برسرپیکار ہونا پڑا۔ مثلاً اُس نے شراب کی مخالفت کر دی جس کے وہ عادی ہو چکے تھے اور جس کا استعمال وہ سخاوت کی دلیل سمجھتے تھے۔ اُس نے قماربازی بند کر دی جو

کہ عربوں کے نزدیک بذل وجود کی ایک قطعی علامت تھی اور بہت سی مخرب اخلاق عادتوں کو ممنوع قرار دیا، عرب اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ سب سے زیادہ مقدس انسان کیونکر خدا کی بارگاہ میں سب سے زیادہ معزز ہو سکتا ہے یا اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی پست انسان کیونکر عرب کے شریف ترین خاندانوں کے اشخاص سے برتری کا دعویٰ کر سکتا ہے"۔

خواجہ غلام السیدین صاحب نے اسے بہت اچھی لفظوں میں لکھا ہے کہ "اسلام ایک ایسی دنیا کے لیے جو پجاریوں کے قبضہ اقتدار اور دولتمندوں کے زیر حکومت مصیبت کے دن کاٹ رہی تھی، پیغام آزادی لے آیا۔ آزادی پجاریوں کی قید سے جو عبد و معبود کے درمیان واسطہ بننے کے دعویدار تھے آزادی گروہ اُمرا کی حکومت سے جو نہ کسی خدائی قانون کی پروا کرتے تھے اور نہ کسی انسانی قانون کی، بلکہ بغیر روک ٹوک کے حریصانہ طریقہ پر دوسروں کی محنت و مشقت کے پھلوں سے خود لطف اندوز ہو رہے تھے۔ آزادی غلاموں اور نیچ ذاتوں کے لیے اُن کے مالکوں کے مظالم اور خلاف انسانیت بیرحمانہ سلوک سے۔ آزادی طبقہ نسواں کے لیے اُس عملی غلامی سے جس میں وہ انسانی حقوق کے ابتدائی منازل سے بھی محروم کر دی گئی تھیں۔ آزادی عام انسانوں کے لیے اُن قیود سے جن میں وہ ذات پات، رنگ اور قوم کی تنگ نظری کی بندشوں میں مبتلا تھے جس سے اُن کی حیات اجتماعی فنا ہو رہی تھی اور وہ متخاصمین کے گروہ میں منقسم ہو رہے تھے۔ گروہ انسانی اس طرح اپنی خود ساختہ ظالمانہ قیدوں میں مقید ہو رہا تھا۔ ہندوستان کے مشہور شاعر اور فیلسوف اقبال نے اس منظر کی تصویر کشی ذیل کے اشعار میں کی ہے۔

بود انساں در جہاں انساں پرست — ناکس و نابود مانند زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش — بندہا در دست و پاؤ گردنش
کاہن و سلطاں و پاپا و امیر — بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
از غلامی فطرتِ او دوں شدہ — نغمہ ہا اندر نے او خوں شدہ

اسلام نے اُسے ایک پیغام آزادی سُنایا، حُریّت و مساوات اور انسانی برادری کی تلقین کی اور تواریخ انسانی میں پہلے پہل شہری اور انسانی حقوق پورے طور پر عام انسانوں کو بالعموم عطا کیے جس سے وہ بہ سبب قومیت، رنگ یہ جنس کے یا بہ سبب غربت و فلاکت کے محروم تھے۔ غربا، مظلوم اور عام انسانوں کے عام طبقہ کو جواب تک بڑی بے دردی سے پیسا جا رہا تھا۔ نئی اُمیدوں اور اپنے کار آمد ہونے کا نیا احساس عطا کیا :۔

تا امینے حق بہ حقداراں سپرد — بندگاں را مسند خاقاں سپرد
اعتبار کار بنداں را فزود — خواجگی از کار فرمایاں ربود
قوت او ہر کہن پیکر شکست — نوع انساں را حصارے تازہ بست
تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید — بندہ را باز از خداونداں خرید
حریّت زاد از ضمیر پاکِ او — ایں مئے نوشیں چکید از تاکِ او
ناشکیبِ امتیازات آمدہ — در نہاد او مساوات آمدہ
عصرِ نو کیں صد چراغ آوردہ است — چشم در آغوشِ او وا کردہ است

یہ قیمتی خیالات تھے جن کو اسلام عربوں کی زندگی میں داخل کرنا چاہتا تھا اور عربوں کی وساطت سے تمام انسانوں میں پہنچانا چاہتا تھا"

اسلام نے اس ذہنی انقلاب کے پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلے اصلی سبب کو دور کرتے ہوے لوگوں کی نگاہ کو مادیت کے احاطہ سے نکال کر ایک

غیبی طاقت کی جانب متوجہ کیا جس کے لحاظ سے تمام افراد انسانی یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے سوا مساوات قائم کرنے کا کوئی دوسرا طریقہ نہ تھا۔ دولت ایک خارجی شئے ہے۔ ممکن ہے مساوات قائم کرنے کے لیے دولت کو برابر تقسیم کردیا جائے لیکن بازوؤں کی طاقت، موروثی وجاہت، قوم و قبیلہ کی تقسیم کس طرح کی جا سکتی ہے؟ اسلام جانتا تھا کہ خارجی مساوات ممکن نہیں اس لیے اُس نے ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ اس ذہنی تبدیلی کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان کو برابر سمجھے۔ اُس نے صحیح طور پر سمجھا کہ برادری اور برابری کی اصل کنجی کیا ہے؟ احساس اُخوت و مساوات کی واحد بنیاد یہ ہے کہ جب کوئی کثرت کسی وحدت کی طرف مستند ہو جائے گی تو اُس کے اجزاء میں برادری اور برابری کا احساس پیدا ہو جانا فطری ہے۔ دو بھائی کیوں ایک دوسرے کے ساتھ برابری کا دعویٰ رکھتے ہیں؟ اس لیے کہ ایک باپ کے بیٹے ہیں، ایک خاندان کے آدمی کیوں آپس میں برادری اور برابری کا تصوّر رکھتے ہیں؟ اس لیے کہ ایک مورثِ اعلیٰ کی نسل سے ہیں، ایک ملک کے لوگ آپس میں کیوں رابطۂ اُخوت محسوس کرتے ہیں اور کیوں حقوق میں برابری کے طالب ہوتے ہیں؟ اس لیے کہ ایک سرزمین کے باشندہ ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مشرق والے آپس میں یگانگی اور مغرب والے آپس میں یکجہتی کیوں محسوس کرتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ آفتاب کے لحاظ سے ایک سمت کے رہنے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کثیر افراد میں اتحاد و مساوات کا احساس پیدا کرنے کا ذریعہ صرف وہ ایک وسیع نقطۂ واحد ہے جس کی طرف زیادہ سے زیادہ افراد یکساں طور پر منسوب ہو سکتے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں کلیّہ یہ ہوا کہ جب کوئی کثرت وحدت کی طرف منسوب ہو تو اُس کے اندر برابری اور برادری کا احساس پیدا ہو جائے گا۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ مذکورہ بالا

اتحادوں میں سے ہر اتحاد افتراق کا پیش خیمہ قرار پایا یعنی جب ایک باپ کے بیٹوں میں ایکا پیدا ہوا تو دوسرے باپ کے بیٹوں کے سامنے محاذ قائم ہوا اور جب ایک خاندان کے لوگوں میں ایکا قائم ہوا تو دوسرے خاندان والوں کے سامنے محاذ قائم ہوا اور جب ایک ملک والوں کے درمیان رابطۂ اتحاد قائم ہوا تو دوسرے ملک والوں کے سامنے محاذ قائم ہوا جس کا نتیجہ ہوا کرتا ہے قوموں کی جنگ اور ممالک کا باہمی تصادم اور فتح و شکست کا غیر متناہی سلسلہ جس کے کرشمے آج بھی نظر آ رہے ہیں اور جب ایک سمت والوں میں اتحاد ہوا تو دوسری سمت والوں کے سامنے محاذ قائم ہوا یہاں تک کہ یورپ والے ایک الگ قوم بن گئے اور ایشیا والے ایک الگ قوم اور جب اس کے ساتھ رنگ کے اتحاد نے اثر دکھایا تو گوروں اور کالوں کا ایسا افتراق پیدا ہوا کہ گوروں نے کالوں کو اپنے ساتھ ایک ہوٹل میں کھانا کھانے سے روکا بلکہ ایک عبادت گاہ میں عبادت کے لیے ایک ہی مذہب والوں کے لیے جمع ہونا تک ممنوع قرار دیا۔ یہ سب نتیجہ تھا اس کا کہ اتحاد کی دیواریں عالم انسانیت کے بیچ میں اُٹھائی گئی تھیں اس لیے ہر دیوار جو اُٹھی اُس نے ادھر والوں کو تو متحد کیا اور اُدھر والوں کو جدا کر دیا۔ اسلام نے اس اصل اصول کو لیتے ہوئے کہ اتحاد افراد کا راز اتحاد مرکزی میں مضمر ہے ضرورت سمجھی کہ ان تمام درمیانی دیواروں کو ڈھا دیا جائے اور بیچ کے ان تمام خطوط کو مٹا کر ان کے بجائے ایک وسیع احاطہ ایسا قائم کیا جائے جہاں نسل، زمانے، ملک اور قومیت کسی چیز کی تفریق نہ ہو۔ وہ احاطہ ایسا ہو جو تمام عالم انسانی کو اپنے گھیرے میں لے لے اور چونکہ اس احاطہ کے باہر پھر کچھ رہ نہیں جائے گا اسی لیے افتراق و امتیاز کا سوال ہی نہ پیدا ہو سکے گا۔ اس کے لیے کوئی مادی چیز نقطۂ مرکزی نہیں بن سکتی تھی کیونکہ جو مادی شے ہو گی وہ محدود ہو گی اور محدود ہونے

کے ساتھ اُس میں قرب و بعد نیز کمی اور زیادتی کے مدارج پیدا ہوں گے اس لیے ضرورت تھی کہ نگاہ کو تمام مادی چیزوں سے ہٹا کر اس غیر مادی بلند و بالاتر طاقت کی طرف موڑ دیا جائے جہاں حدود و اقدار قائم نہیں ہوتے اُس کا سب کے ساتھ یکساں تعلق ہے جو سب کا ہے اور سب اُس کے ہیں۔ یہ خالق کی ذات ہے جسے اسلام نے معبود برحق اور خدائے کل ثابت کرتے ہوئے سب کا قبلۂ مقصد قرار دے دیا ہے۔

اس احساس کے پیدا ہونے کے ساتھ کہ سب خدا کے بندے ہیں افراد انسانی میں احساس اخوت و مساوات پیدا ہونا لازمی ہے۔ جب ایک باپ کے بیٹے آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک مورث اعلیٰ کی اولاد میں برادری قائم ہو جاتی ہے اور ایک سرزمین کے رہنے والے اپنی مادر وطن کے لحاظ سے آپس میں اخوت محسوس کرتے ہیں اور ایک سمت کے رہنے والے اپنے میں یک جہتی کا تصور کرتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ایک خالق کے بندے سب آپس میں بھائی بھائی نہ بن جائیں، یہ تھا وہ عملی سبق جو اسلام کی توحید میں مضمر تھا۔

بعض مذاہب نے خالق کے تخیل میں بھی مغایرت برتی تھی۔ اُنھوں نے خدا کو اپنا قرار دے لیا تھا اور یہ کہتے تھے کہ ہم اُس کے بیٹے ہیں۔ اسلام نے ان لوگوں کے خیال یا زعم کو ذکر کرتے ہوئے ایک طنزیہ انداز میں اُس سے مخالفت کی اور اُس کے مقابلہ میں مسلمانوں کو یہ تلقین نہیں کیا کہ تم ہی اللہ کے سپوت ہو اور بس بلکہ مسلمانوں کو اقوام عالم کے مقابلہ میں یہ کہنے کی تعلیم دی کہ ھو ربنا و ربکم لنا اعمالنا ولکم اعمالکم (یعنی) وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال۔ اس طرح اسلام نے سب کو مساوات کا درجہ دیتے ہوئے ایک معیار امتیاز کا

بھی قائم کر دیا اور وہ انسانی کردار ہے۔ اب سالق کے تمام تفوق اور بلندی
کے امتیازات مٹ کر ایک نیا معیار امتیاز کا قائم ہو گیا اور وہ یہ کہ جو شخص
فرائض انسانی کو سب سے زیادہ انجام دیتا ہو وہ سب سے بہتر ہے (ان
اکرمکم عند اللہ اتقاکم) اس اصول کے ماتحت غلبہ، طاقت، اقتدا
قوم وقبیلہ کی زیادتی اور تعداد کی اکثریت یہ تمام باتیں کچھ نہ رہیں بلکہ یہ اصول
قائم ہو گیا کہ ایک انسان کو دوسرے انسان پر فقط احساس فرائض کی بنا پر
فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے ماتحت اخلاق پر بہت زور دے دیا گیا
یہاں تک کہ بانی اسلام نے اپنا مقصد رسالت ہی یہی قرار دیا اور اعلان کیا انما
بعثت لا تمم صالح الاخلاق۔ دوسری لفظوں میں انما بعثت لا تمم
حسن الاخلاق یعنی "میری بعثت محض انسان سدھار اور اچھے اخلاق
کی تکمیل کی غرض سے ہے"[1] مسلمانوں سے صاف کہہ دیا گیا کہ یہ خیال نہ کرنا کہ
تمھیں تمھارے اعمال کی سزا نہ ملے گی بلکہ جو جیسے اعمال کرے گا ویسا ہی پائے
گا۔ مسلمان وہ ہے جو احکام خدا کے آگے سرنگوں ہو جائے۔ سرکشی مسلم کی شان
نہیں ہے تم اللہ کے دوست جب ہی کہلائے جا سکتے ہو جب اُس کے احکام کی
تعمیل کرو ورنہ اُس کی رحمت کے حقدار نہیں اور نہ اُمت مرحومہ میں شامل ہو
کے قابل۔

معاشرت کے باب میں اس بات پر زور دیا گیا کہ سب انسان ذات او
اصلیت کے لحاظ سے ایک ہی ہیں (خلقکم من نفس واحدۃ)[2] قبائل او
اقوام میں اُن کی تقسیم صرف تعارف اور شناخت کے لیے ہے (وجعلنا کم

---

(۱) طبقات ابن سعد ج ا ص ۱۳۸ - (۲) اُس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا ہے۔

شعوبا وقبائل لتعارفوا)(۱) مگر فضیلت و بلندی کا تعلق ذات اور قومیت سے بالکل نہیں ہے (لا فخر للقرشی علی غیر القرشی ولا للعربی علی غیر العربی)(۲)۔ فضیلت و بزرگی صرف پرہیزگاری اور تقویٰ یعنی انسانی اعمال اور فرائض کی بجا آوری کے ساتھ وابستہ ہے۔ (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم)(۳) اس کو پیغمبر نے صرف قولاً نہیں بلکہ عملاً بھی دکھایا۔ آپ نے موذن اپنا بلال حبشی کو قرار دیا اور جب کسی نے اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا "یہ کالے رنگ کا غلام بھی بھلا اس قابل ہے کہ اذان دے!" تو قرآن کی آیت اتری (یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ) یعنی سب آدمی یکساں ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں(۴)۔ جیسا کہ عبدالحامد صاحب بدایونی نے کہا ہے "اسلام دراصل حکومت الٰہیہ کا قیام چاہتا ہے۔ اسلامی حکومت کا دارومدار عدل و انصاف قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس بارے میں فرمایا ہے واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان اللہ نعما یعظکم بہ (سورۂ نسا)۔ ولا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ واتقوا اللہ (مائدہ) یعنی اگر تو غیر مسلمین کے بارے میں فیصلہ کرے تو انصاف سے فیصلہ کر۔ بے شک خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اسلامی قانون میں شاہ و گدا یکساں حیثیت رکھتے

---

(۱) ہم نے تمھیں مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں اس لیے قرار دیا ہے کہ آپس میں شناسائی پیدا ہو۔

(۲) قرشی کو غیر قرشی اور عرب کو غیر عرب پر کوئی فخر نہیں۔ (۳) تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار رہو۔

(۴) اتقان سیوطی مطبوعہ دہلی صہ ۱۴۸۔

ہیں۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لیس لاحد علی احد فضل الا بدین وتقویٰ۔ مشکوۃ۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام میں سیاست "حصول اقتدار کے کامیاب ذرائع کے استعمال" کا نام نہیں ہے بلکہ سیاست ملک وملت کے صحیح نظم وضبط اور اُمور خلق کے بہترین طریقہ پر چلانے کا نام ہے اس لحاظ سے سیاسی حکومت مذہبی قیادت سے الگ نہیں ہو سکتی۔ اور اس کی مثال خود حضرت پیغمبرؐ کی ذات گرامی ہے۔

مگر یاد رکھنے کی بات ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ نے اُس مکمل اقتدار کے باوجود جس کے ماتحت اعلان کر دیا گیا کہ "اُن کو ہر شخص پر خود اُس کی ذات سے زیادہ حق اور اختیار ہے"۔ کبھی اپنے کو بادشاہ کہا یا سمجھا جانا پسند نہیں کیا بلکہ اس سے انکار فرمایا چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا جوں ہی آپ کے سامنے کھڑا ہوا رعب سے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا "اپنے آپے میں آؤ۔ میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو شوربے میں روٹی بھگو کر (غریبانہ کھانا) کھاتی تھی(۱)۔

یہ اس لئے تھا کہ مسلمانوں میں شریعت الٰہیہ کی رہبری سے الگ حکمراں کا تخیل پیدا نہ ہو اور سوائے خداوندی اقتدار کے کسی اقتدار کے آگے مسلمانوں کی گردنیں نہ جھکیں۔

---

(۱) طبقات ابن سعد ج ۱ قسم ۱ ص ۴

چوتھا باب

اسلام کا مزاحم طاقتوں سے تصادم

جہاں تک کہ آئین اور نظام کی تشکیل کا تعلق ہے پیغمبر اسلام کی زندگی میں یہ مقصد حاصل ہو گیا اور لاکھوں آدمی اُس کے تسلیم کرنے والے اور اُس کو حق کہنے والے ہو گیے اور یہ ایک انقلاب کی کوئی کم کامیابی نہیں ہے۔ مگر اس انقلاب پیدا کرنے میں رسول کو کتنی دقتیں درپیش ہوئیں اور کن طاقتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ یوں تو کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو جذبات کے لحاظ سے ہر قدیم شے کے ساتھ الفت رکھتے ہیں اس لئے اُنھیں ہر انقلاب کے محرک سے "بغض للّٰہی" ہوتا ہے "بغض للّٰہی" کا مطلب یہ ہے کہ چاہے اُس انقلاب کا اُن کی ذات سے کوئی تعلق نہ ہو اور اُنھیں اُس سے کوئی نقصان بھی نہ پہنچتا ہو مگر وہ انقلاب سے صرف اس لیے دشمنی رکھتے ہیں کہ وہ انقلاب ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے خود غرضانہ مفاد قدیم رسم و رواج کے ساتھ وابستہ ہیں اور اُنھیں اس انقلاب سے اپنے منافع کا خون ہوتے ہوے نظر آتا ہے۔ چنانچہ اسلام جو انقلاب لے کر آیا تھا اور اُس نے زندگی کے ہر شعبہ میں جو تبدیلیاں کر دی تھیں، اُن سے بہت سی قسم کے لوگوں کو ذاتی نقصانات پہنچ رہے تھے۔ یہ نقصانات مالی بھی تھے اور وجاہت و اقتدار کے بھی۔ مثال کے طور پر اسلام کی معاشی تعلیم

کہ سود خواری ممنوع ہے، اس سے کیا تمام عرب کے اُن مہاجنوں کا دیوالہ نہیں نکل گیا
جن کی زندگی ہی حاجت مند مخلوق کا خون چوس کر اپنی ہوس دولت مندی کے پورا کرنے
پر تھی۔ پھر اگر صرف یہ ہوتا کہ سود لو نہیں تو یہ ممکن تھا کہ یہ لوگ اسلام نہ قبول کر کے اپنے
کو اس حکم کی پابندی سے محفوظ رکھتے مگر وہاں تو یہ تھا کہ نہ سود لو اور نہ سود دو۔
اور ظاہر ہے کہ سود دینا کام ہوتا ہے کم حیثیت ہی لوگوں کا جو مقناطیسی کشش کے
ساتھ اسلام کے غریب پرور تعلیمات کی طرف کھنچے چلے جا رہے تھے۔ اب اگر سرمایہ دار
لوگ خود اسلام نہ بھی قبول کریں تو کیا فائدہ جب کہ اُن کی زندگی کا دارومدار جن
لوگوں کے روپیہ پر تھا۔ انھوں نے اسلامی تعلیم پر عمل پیرا ہو کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور
وہ اب ایک پیسہ سود کے نام سے دینے پر تیار نہیں۔ اس کے علاوہ اسلام کی یہ تعلیم
کہ افراد انسانی میں امتیاز صرف اخلاق حسنہ و فرائض الٰہیہ کی بنا پر ہے۔ دوسری
کسی حیثیت سے فضیلت و تفوق حاصل نہیں ہو سکتا اُن لوگوں کے اقتدار پر کاری
ضرب تھی جو اس کے پہلے نسلی تفوق یا مال و دولت یا قوم و قبیلہ کی کثرت کی بنا پر
غلبہ و اقتدار کی جائداد پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ اسلام نے نظریۂ تفوق و امتیاز بدل
کر اس ملکیت میں داخل خارج کر دیا۔ اس طرح کے صاحبانِ اقتدار جتنے تھے وہ
چونکہ اسلامی معیار عزت کے لحاظ سے صفر کا درجہ رکھتے تھے اس لیے وہ کچھ نہ رہے
اور جو لوگ پردیسی یا محتاج یا اُن لوگوں کی نظر میں نیچ ذات ہونے کی وجہ سے نگاہ
اُٹھا کر بات کرنے کے قابل نہ سمجھے جاتے تھے وہ بڑے صاحب عزت ہو گئے۔ اس لیے
کہ وہ اِس کی کسوٹی پر پورے اُترتے تھے اور پرہیزگاری اور تقویٰ میں درجہ کمال
پر فائز تھے۔ یہ بات اُن لوگوں کو ٹھنڈے دل سے کیونکر گوارا ہو سکتی تھی جو اب تک
عزت کی مسندوں پر اطمینان کے ساتھ براجے رہے تھے اور جو خلق خدا کو خدا کے
بدلے خود اپنا غلام بنائے ہوئے تھے۔

بنی اُمیہ کے لیے ان تمام محرکات کے علاوہ اُن کی دیرینہ مخاصمت بنی ہاشم کے ساتھ اور ذاتی رشک و حسد بھی تھا جس کے ماتحت اُن کے سرگروہ ابوسفیان نے تقریباً تمام عرب کو حضرت محمد مصطفےٰ کے خلاف برانگیختہ کر دیا۔

آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جانے لگیں جسم پر پتھر مارے گئے، سر پر کوڑا پھینکا گیا، نجاستیں ڈالی گئیں اور قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ یہاں تک کہ جب خطرہ بہت بڑھ گیا تو حضرت کے چچا ابوطالب نے آپ کو اپنے ایک محفوظ مکان میں جو پہاڑ کی گھاٹی میں ایک قلعہ کی صورت پر تھا منتقل کر دیا۔ تمام قریش نے باہم ایک تحریری معاہدہ کیا کہ بنی ہاشم سے نہ صرف شادی بیاہ ترک کر دیا جائے بلکہ ان کے ساتھ خرید و فروخت بھی نہ کی جائے گی۔ اس کے ماتحت محصورین تک ضروریات زندگی پانی اور کھانا تک پہنچنا تقریباً غیر ممکن بنا دیا گیا تھا۔ یہ واقعہ بعثت کے ساتویں سال کا ہے جو تین برس تک قائم رہا۔ تین برس کی طویل مدت کے بعد یہ ترک موالات ختم ہوا اور یہ لوگ قلعہ سے باہر نکلے۔ اب کچھ دن تک مخالفتیں ٹھنڈی رہیں مگر پھر ایک ہی سال کے اندر ابوطالب اور خدیجہ دونوں کی وفات[1] کے بعد اس مخالفت نے اتنا زور پکڑا کہ آپ کو قتل کر دینے کا پورا منصوبہ تیار کر لیا گیا۔ جس کے بعد آپ کو اپنے دیس سے نکل کر پردیس کی زندگی اختیار کرنی پڑی۔

مدینہ میں آ کر بھی مخالفین نے چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ ایک طرف تو اُن لوگوں کو جو آپ پر ایمان لائے تھے اور مجبوراً مکہ میں رہ گئے تھے طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی جاتیں۔ دوسری طرف آپ کے جائے پناہ مدینہ منورہ پر فوج کشی کے انتظامات ہونے لگے۔ آپ کو اپنی حفاظت اور اپنے سے زیادہ اُن لوگوں کے گھربار کی حفاظت کے لیے جنھوں نے آپ کو پناہ دی تھی میدان مقابلہ میں نکل آنا پڑا۔

---

(۱) طبری ج ۱ ص ۲۲۹

سب سے پہلی جنگ جو مدینہ میں آکر ہوی بدر کی لڑائی تھی۔ اس موقع پر مسلمان بالکل تیار نہ تھے صرف تین سو تیرہ ۳۱۳ آدمی[1] جن کے پاس سوار ہونے کو صرف تین گھوڑے تھے[2] اور چند تلواریں۔ مگر بنی ہاشم کی تلوار نے مقابل والوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ حمزہ ابن عبد المطلب۔ عبیدہ بن حارث اور علی ابن ابیطالبؑ نے وہ کارہائے نمایاں دکھلائے کہ مخالفوں کی ہمت پست ہوگئی اگرچہ اسلام کو بالخصوص بنی ہاشم کو یہ بڑا نقصان پہنچا کہ عبیدہ اس جنگ میں شہید ہوگئے مگر مکہ والوں کو اور بالخصوص بنی امیہ کو بہت زیادہ نقصانات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اس میں ابوسفیان کو علی بن ابی طالبؑ کے ہاتھ سے محض اپنے بیٹے حنظلہ کے قتل ہی پر ماتم کرنا نہیں پڑا[3] بلکہ آپ نے اُس کے ایک دوسرے بیٹے عمرو کو قید بھی کیا[4]۔ اس کی بیوی ہند کو اس کے علاوہ اپنے باپ عتبہ اور اپنے چچا شیبہ اور بھائی ولید کا ماتم کرنا پڑا[5] اس کے بعد ابوسفیان نے عہد کیا کہ وہ اُس وقت تک نہائے گا نہیں جب تک کہ رسول پر چڑھائی نہ کرے مگر اب مشرکین میں عام طور پر مقابلہ کی ہمت نہ تھی مجبوراً ابوسفیان نے صرف برائے نام اپنی قسم کو پورا کرنے کے لیے دو سو سوار قریش کے اکٹھا کیے اور اُن کو لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔ مدینہ کے حدود میں پہنچ کر اس نے رسول کے دو پیروؤں کو قتل کر ڈالا اور کھجور کے درختوں کو تباہ کر دیا۔ حضرت مع اپنے پیروؤں کے جنگ کے لیے نکل آئے مگر ابوسفیان مع اپنے ساتھیوں کے خوف سے پہلے ہی فرار ہو چکا تھا اور سب بھاگنے کی جلدی میں اپنے سامان کے گٹھروں

---

(۱) طبری ج ۲ ص ۲۷۲۔ (۲) ابن ہشام ج ۱ ص ۲۰۷۔

(۳) ارشاد ص ۳۸۔ (۴) ابن ہشام ج ۱ ص ۳۹۷۔

(۵) ابن ہشام ج ۲ ص ۳ طبری ج ۲ ص ۲۷۹۔

کو راستے میں پھینکتے گئے تھے۔ اس میں زیادہ تر ستو بندھے ہوئے تھے جو مسلمانوں کو حاصل ہوئے۔ اسی وجہ سے اس کو "جنگ سویق" کہتے ہیں کیونکہ عربی میں سَوِیق کے معنی ستو کے ہیں۔[1]

ہجرت کے تیسرے سال وہ نہایت اہم لڑائی پیش آئی جس کو اُحُد کی جنگ کہتے ہیں[2] عکرمہ بن ابی جہل۔ ابوسفیان اور ہند کو اس وقت تک کہاں چین آ سکتا تھا جب تک کہ وہ مدینہ والوں سے انتقام نہ لیتے۔ مکہ والوں نے بڑی بڑی تیاریاں کی تھیں ان کی فوج میں قریشیوں کے علاوہ خاندان کنانہ اور باشندگان تہامہ بھی شامل تھے[3]۔ فوج میں تین ہزار مسلح سپاہی تھے[4]۔ جن میں سات سو زرہ پوش تھے۔ ان کے بالمقابل رسول خداؐ کے ساتھ سات سو آدمی تھے جن میں صرف سو زرہ پوش تھے اور فوج میں فقط دو گھوڑے تھے[5]۔ عکرمہ اور خالد بن ولید دونوں فوج کے افسر تھے اور خاص بات یہ تھی کہ فوج کے عقب میں ابوسفیان کی بیوی ہند مکہ کی دوسری عورتوں کے ساتھ میدان جنگ میں ڈھول بجا بجا کر سپاہیوں کی ہمت افزائی کر رہی تھی۔ ہند کے اشعار اس موقع کے جو وہ پڑھ رہی تھی کتب تاریخ میں محفوظ ہیں[6]۔

ہند کے انتقامی جذبات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُحد کی جنگ میں جب رسول کے چچا حضرت حمزہ شہید ہوئے تو ہند جذبۂ انتقام میں اپنی صنف بلکہ انسانیت کے حدود سے گزر گئی۔ اُس نے اس بربریّت کا ثبوت دیا کہ جناب حمزہ

---

(۱) ابن ہشام ج ۲ ص ۵۵ طبری ج ۲ ص ۲۹۹ (۲) ابن ہشام ج ۲ ص ۶۵۔
(۳) ابن ہشام ج ۲ ص ۶۸ (۴) ابن ہشام ج ۲ ص ۶۹
(۵) طبری ج ۳ ص ۱۲ (۶) طبری ج ۳ ص ۱۵ و ۱۶

کا پہلو چاک کرا کے اُن کا جگر نکلوایا اور اُسے مُنہ میں رکھ کر چبانے کی کوشش کی اور کشتوں کے کان اور ناک وغیرہ اعضائے جسم کا گلو بند اور سینہ بند بنایا۔[1] بلکہ بعض راویوں نے تو یہاں تک بیان کیا ہے کہ اُس نے حضرت حمزہ کے جگر کو بھون کر کھایا[2] اس سے اُس عناد اور دشمنی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو اس خاندان کے مردوں اور عورتوں کے دلوں میں بنی ہاشم، پیغمبر اسلام اور اسلام کے خلاف پایا جاتا تھا۔

اس جنگ میں اگرچہ عام طور پر مسلمانوں کی جماعت میں بڑی ابتری پیدا ہو گئی تھی مگر آخر میں بنی ہاشم اور بالخصوص علی بن ابی طالبؑ کی تلوار نے مخالف جماعت کو شکست دی اور وہ ہزیمت خوردہ صورت میں واپس گئے۔ اب ان کی انفرادی طاقت رسول کے مقابلہ میں ناکافی ثابت ہو چکی تھی۔ اس لیے ۵ ھ میں[3] آخری کوشش اُنھوں نے یہ کی کہ جتنی جماعتیں ملک عرب میں اسلام کے خلاف اُن کو مل سکتی تھیں۔ سب کو متحد کیا یہاں تک کہ یہود کو ساز باز کر کے اپنے ساتھ ملایا اور اجتماعی طاقت سے دس ہزار کے لشکر کے ساتھ وہ اُس جنگ کے لیے آئے جس کو اسی جتھہ بندی کی وجہ سے "جنگ احزاب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان کے مقابلہ میں مسلمان تین ہزار تھے مگر فوج مخالف کو اس مرتبہ بھی شکست کا روزِ بد دیکھنا نصیب ہوا اور اُن کا مایۂ ناز سورما عمرو بن عبدود ابن ابی قیس عامری علی بن ابی طالبؑ کے ہاتھ سے تلوار کے گھاٹ اُترا۔[4] ابوسفیان کو با حال خستہ و تباہ مکہ واپس جانا پڑا۔ اور اب ہمت مقابلہ و لشکر کشی ختم ہو گئی مگر دل میں ان شکستوں سے جو گھاؤ پڑے تھے وہ کبھی بھی بھر سکتے تھے۔

---

(۱) ابن ہشام ج ۲ ص ۸۴ طبری ج ۳ ص ۲۳ ۔ (۲) استیعاب ج ۲ ص ۷۸۶ طبری ج ۳ ص ۲۳
(۳) ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۱۵۵ ۔ (۴) ابن ہشام ج ۲ ص ۱۶۲ طبری ج ۳ ص ۴۸ ۔

پیغمبر اسلام نے جب کچھ عرصہ تک یہ دیکھا کہ اب مشرکین قریش کی طرف سے کوئی جنگی کارروائی نہیں ہوتی تو آپ نے ۶ھ میں خانۂ کعبہ کی زیارت (عمرہ) کا ارادہ کیا اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے[1]۔ آپ کے پاس بُدنے (قربانی کے اونٹ) تھے[2]۔ جس سے صاف ظاہر تھا کہ آپ لڑائی کے لیے نہیں جارہے ہیں۔ مگر جب قریش کو رسول کے آنے کی خبر پہنچی تو وہ خالد بن ولید کی قیادت میں "کراع الغمیم" مقام تک رسول کا راستہ روکنے کے لیے نکل آئے۔

ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی ہمتیں اس کے قبل کی حاصل شدہ پے در پے فتوحات سے بڑھی ہوئی ہیں اور سامنے وہی شکست خوردہ جماعت تھی جو اس وقت جنگ کے لیے کوئی تیاری بھی نہ کرسکی تھی اس لیے یہ بہت آسان تھا کہ آپ مقابلہ کا حکم دے دیتے اور فاتحانہ صورت سے مکہ میں داخل ہوتے مگر پیغمبر اسلام کو امن پسندی کا ثبوت دینا تھا۔ جونہی گرد وغبار اُٹھتا نظر آیا۔ آپ نے فرمایا اس راستے کو چھوڑ دو۔ کسی دوسرے راستے سے آگے نکل چلو۔ چنانچہ داہنی جانب کا رخ کیا گیا اور آپ "حمص" کی پشت پر سے "ثنیۃ المرار" ہوتے ہوئے حدیبیہ کو جو راستہ جاتا ہے ادھر متوجہ ہوئے[3]۔

آپ کی اس امن پسندی کے مظاہرہ کا جماعت مخالف کو اس حد تک احساس ہوا کہ وہ بھی واپس چلی گئی اور اُس نے اب نامہ وپیام کا سلسلہ شروع کیا چنانچہ عروہ بن مسعود ثقفی نے آکر گفتگوئے صلح کا آغاز کیا اور حضرت رسول خدا کی صلح پسندانہ باتوں سے ایسی خوشگوار فضا قائم ہوئی کہ سہیل بن عمرو قریش کا نمائندہ

---

(۱) ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۰ طبری ج ۳ ص ۷۱ (۲) طبری ج ۳ ص ۷۲
(۳) طبری ج ۳ ص ۷۲۔

بن کر مختتم گفتگوئے صلح کے لیے حضرت کے پاس بھیجا گیا اور اُس نے اپنی جماعت کے مطالبات پیش کر دیے۔ یہ مطالبات سب مشرکین کے حق میں تھے اور ان کے ذریعہ سے بظاہر پیغمبر اسلام کو دبایا جا رہا تھا مگر آپ نے ان سب باتوں کو منظور فرمالیا اور صلحنامہ مرتب ہو گیا۔ اس صلح نامہ کے شرائط حسب ذیل تھے۔

(۱) رسول اس سال مع اپنے متبعین کے بغیر زیارت کیے ہوئے واپس جائیں

(۲) دس سال تک آپس میں جنگ نہ ہو۔

(۳) جو شخص قریش میں سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر رسول اللہ کے پاس چلا جائے اُس کو آپ واپس کر دیں گے مگر جب آپ کے پاس سے کوئی نکل کر قریش کے پاس چلا جائے تو قریش واپس نہ کریں گے۔

(۴) جو قبیلہ رسول کا حلیف ہونا چاہے وہ آپ کے ساتھ معاہدہ دوستی کر لے اور جو قبیلہ قریش کے ساتھ معاہدۂ دوستی کرنا چاہے وہ اُن کے ساتھ ہو جائے۔

(۵) آئندہ سال مسلمان مکہ کی زیارت کے لیے آسکیں گے اس طرح کہ باشندگان مکہ تین دن کے لیے مکہ کو خالی کر دیں گے مگر مسلمانوں کو لازم ہوگا کہ تین دن کے اندر مکہ سے باہر نکل جائیں اور ایک آدمی بھی تین دن کے بعد مکہ میں رہنے نہ پائے۔

(۶) مسلمان اپنے ساتھ اُس طرح کے اسلحہ لا سکیں گے جیسے مسافر اپنے ساتھ رکھتے ہیں یعنی تلواریں نیام کے اندر رکھی ہوں۔(۱)

یہ ایسی غیر متوازن شرطیں تھیں کہ پیغمبر اسلام کے اکثر ساتھ والوں میں جو رسول

---

(۱) سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۶ ۔ طبری ج ۳ ص ۷۹

کے بلند مصالح کی تہ تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ شدید بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ تاریخ کے الفاظ یہاں تک ہیں کہ "لوگوں کے دلوں میں امرِ عظیم پیدا ہوا یہاں تک کہ قریب تھا کہ وہ ہلاکت میں مبتلا ہو جائیں"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے عقائد میں تزلزل ہو گیا ایسا کہ قریب تھا وہ اسلام سے منحرف ہی ہو جائیں۔(۱)

اسی کا نتیجہ تھا کہ جب پیغمبر خدا نے معاہدہ کی تکمیل کے بعد اصحاب سے فرمایا کہ اُٹھو، قربانیاں کرو اور پھر سروں کے بال منڈوا کر واپس چلو۔ تو عالم یہ تھا کہ رسول حکم دے رہے تھے اور مجمع کی اکثریت خاموش تھی۔ کوئی تعمیل کے لیے اٹھتا نہ تھا۔ یہاں تک کہ جب حضرت نے اُن کی طرف سے بے اعتنائی اختیار کر کے خود جا کر قربانی کی اور بال منڈوائے تو مجبوراً دوسرے لوگ بھی کھڑے ہوئے اور سروں کے بال مونڈنا یا ترشنا شروع کیے مگر رنج اور صدمہ کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا ایک دوسرے کو قتل کر رہا ہے۔(۲)

لیکن رسول نے اپنے ساتھیوں کے ان جذبات کا کوئی لحاظ نہ کیا اور کفار کے اُن جابرانہ شرائط کو منظور کر کے واپسی اختیار فرمائی اس خیال سے کہ اگر اس موقع پر جنگ کر کے مکہ کو فتح کیا جاتا تو کہنے کو ہو جاتا کہ رسول اسلام چڑھائی کر کے آئے۔ اس طرح جارحانہ حملہ کا الزام آپ پر عائد کیا جاتا۔ لہٰذا آپ نے اس کا موقع نہ دیا اور صلح کے شرائط کی پابندی اس حد تک فرمائی کہ ابھی یہ تحریر خشک ہونے پائی تھی کہ خود سہیل بن عمرو (جو مشرکین کی طرف سے نمائندہ صلح تھا) کا لڑکا جو پہلے سے مسلمان ہو چکا تھا اور اُسے صرف اسلام لانے کی وجہ سے گھر والوں نے لوہے میں جکڑ دیا تھا، اس وقت موقع پا کر پابہ زنجیر ہونے ہی کی حالت

---

(۱) طبری ج ۲ صہ ۷۹ - (۲) طبری ج ۲ صہ ۸۰

میں واحمداہ واحمداہ کہتا ہوا آیا اور اپنے کو رسول کے سامنے ڈال دیا۔سہیل نے جو یہ دیکھا تو وہ کھڑا ہوگیا، اُسے طمانچہ لگایا اور گریبان پکڑ کر کھینچتا ہوا لے چلا۔اُس نے پکار کر آواز دی "کیوں مسلمانو! کیا میں پھر مشرکین ہی کی طرف واپس کر دیا جاؤں گا کہ وہ مجھے دین سے منحرف کرنے کی کوشش کریں۔" مگر حضرت نے کوئی تعرض نہیں فرمایا اور کہا "اے ابو جندل! صبر کر یہ چند دن کی تکلیف ہے۔اللہ تیرے لیے اور تمام کمزور مسلمانوں کے لیے جو مشرکین کے پنجہ میں گرفتار ہیں کوئی کشائش کی صورت پیدا کرے گا۔اس وقت تو ہم نے اس قوم کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا ہے اور اس معاہدہ کی مخالفت ہم نہیں کریں گے۔"(۱)

غرض پیغمبر اسلام نے ان غیر مساویانہ شرائط پر صلح کر کے مکہ سے واپسی اختیار کی اور دوسرے سال معاہدہ کے مطابق مکہ کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے مشرکین نے تین دن کے لیے شہر خالی کر دیا اور رسول اپنے ساتھیوں سمیت مکہ میں داخل ہوئے مراسم زیارت بجالائے اور پھر حسب معاہدہ تین دن کے بعد مکہ کو چھوڑ دیا اور مدینہ واپس چلے گئے(۲) مگر مکہ والے اس کے بعد معاہدہ کے دوسرے دفعات عدم تعرض پر قائم نہیں رہے۔

معاہدہ میں قبائل کو جو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جس کے ساتھ چاہیں شریک ہو جائیں، اُس کے ماتحت قبیلہ خزاعہ پیغمبر اسلام کا حلیف ہوا تھا اور بنی بکر نے مشرکین کے ساتھ حلیف ہونے کا اعلان کیا تھا چونکہ ان دونوں قبیلوں میں قدیم عداوت تھی اس لیے دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف تیار رہتے تھے۔مگر اب جو

---

(۱) طبری ج ۲ صفحہ ۷۹-۸۰۔ (۲) ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۲۴۹-۲۵۰۔ طبری ج ۳ صفحہ ۱۰۰-۱۰۱۔ بخاری ج ۲ صفحہ ۳۶ مسلم ج ۲ صفحہ ۱۰۵۔

ان میں ہر ایک ایک جانب معاہدہ کے رو سے منسلک ہو گیا اور یہ طے پا گیا کہ دس برس تک جانبین میں جنگ نہ ہوگی تو خزاعہ کے لوگ مطمئن ہو گئے، انھوں نے اسلحہ جسم سے اُتار دیئے اور جنگ کی تیاریاں ترک کر دیں۔ بنی بکر نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور بنی خزاعہ پر اُس وقت جب کہ وہ ایک چشمہ کے کنارے مقیم تھے حملہ کر دیا اور بہت سے لوگوں کو قتل کر ڈالا[1]۔

قریش کے آدمیوں نے بھی علانیہ نہیں تو خفیہ بنی بکر کو مدد پہنچائی اور وہ بھی خزاعہ کی تباہی میں شریک ہوئے۔

مجبوراً قبیلہ خزاعہ کا ایک آدمی جس کا نام عمرو بن سالم تھا فریاد کرتا ہوا مدینہ گیا اور اُس وقت جب پیغمبر خدا اصحاب کے درمیان مسجد میں تشریف رکھتے تھے اُس نے انتہائی درد انگیز اشعار میں اپنے قبیلہ کی روئداد غم سنائی جس کے آخر میں حسب ذیل مضمون نظم تھا:۔

"اے خدا کے رسول آپ کو معلوم ہو کہ قریش نے آپ سے عہد شکنی کی۔ بنی بکر نے ہمارے قبیلہ پر چشمہ کے کنارے کمین گاہ سے حملہ کر دیا وہ سمجھتے تھے کہ ہمارا کوئی فریاد رس نہیں ہے۔ اگر ہم جنگ کے لیے تیار ہوتے تو اُن کی کیا مجال تھی کہ وہ ہم سے مقابلہ کرتے۔ وہ تعداد میں بھی کم اور طاقت میں بھی ہمارے مقابلہ میں ہمیشہ سبک ثابت ہوئے۔ مگر ہم تو نماز شب میں مصروف تھے اُنھوں نے رکوع و سجود کی حالت میں آکر ہم کو قتل کر دیا۔"

ان اشعار کے پڑھنے کے دوران میں آپ کی ہمدردی کے تاثرات اتنے شدید ہو گئے تھے کہ آپ نے جواب میں کوئی طویل کلام سننے کے انتظار کی زحمت بھی دینا

---

(۱) ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۳۹۰۔ طبری ج ۳ ص ۱۱۱۔

نہ چاہی اور اشعار ختم ہوتے ہی آپ کی زبان سے جو جملہ نکلا وہ یہ تھا کہ قد نصرت یا عمرو بن سالم "بس تمہاری مدد ہوگئی اے عمرو بن سالم" اور اسی کے بعد آپ مسلمانوں کو لے کر اپنے ہم قسم قبیلہ کی امداد کے لیے فوراً روانہ ہوگئے۔ اب بھی رُخ مکہ ہی کی طرف تھا مگر تیور بدلے ہوئے تھے۔ مشرکین میں طاقت مقابلہ تو اب تھی ہی نہیں۔ اُنھوں نے ہتھیار ڈال دینا مناسب سمجھے اور اسی مجبوری کے عالم میں ابوسفیان نے بھی ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا جس کا واقعہ یہ ہے کہ عباس بن عبدالمطلب اور ابوسفیان میں پرانے زمانے کی دوستی تھی اُس رات کو جب رسول مکہ کے قریب پہنچ چکے تھے اور مشرکین پر ہراس چھایا ہوا تھا ابوسفیان معہ چند آدمیوں کے رسول خداؐ کی نقل و حرکت کا حال معلوم کرنے کے لیے شہر سے باہر نکلا، اُسی وقت عباس اس فکر میں نکلے تھے کہ اگر قریش نے پیغمبر خداؐ کی مخالفت برقرار رکھی تو یہ سب آج مارے جائیں گے۔ ابوسفیان کو وہاں پاکر اُنھوں نے کہا کچھ خبر ہے رسول دس ہزار مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ آئے ہیں تم اُن کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتے۔ ابوسفیان نے کہا پھر آپ کی کیا رائے ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اُنھوں نے کہا آؤ میرے ساتھ اونٹ پر بیٹھ جاؤ اور رسول کے پاس چل کر امان حاصل کر لو۔ ورنہ اگر تم اُن کے ہاتھ آگئے تو بغیر قتل کیے نہ چھوڑیں گے، ابوسفیان کو یہ ذریعہ غنیمت معلوم ہوا وہ ناقہ پر پیچھے بیٹھ گیا اور عباس اُسے لیے ہوئے پیغمبر کے پاس حاضر ہوئے۔ رسول خدا سے اُس کے لیے امان چاہی پیغمبر نے فرمایا کہ اچھا اس وقت امان ہے۔ صبح کو انہیں پھر میرے پاس لائیے گا۔ حسب الحکم صبح کو عباس نے ابوسفیان کو حاضر کیا۔ حضرت نے اُس کو اسلام کی دعوت دی۔ وہ پس و پیش کرنے لگا۔ عباس نے کہا اسلام قبول کرو۔ نہیں تو جان کی خیر نہیں۔ یہ سُن کر ابوسفیان نے اسلام قبول کیا۔[1]

---

(۱) طبری ج ۳ ص ۱۱۶۔

بخاری کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوسفیان اور اُس کے ساتھی جب معلومات حاصل کرنے باہر نکلے تھے تو اتفاق سے لشکر اسلام کے پہرہ داروں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوگئے اور رسول کی خدمت میں حاضر کیے گیے۔ اس وقت ابوسفیان نے اسلام قبول کیا۔[۱]

پیغمبر خداؐ کی یہ وسعت قلب تھی کہ آپ نے ابوسفیان کی نہ صرف جاں بخشی فرمائی بلکہ اعلان کر دیا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے اُسے بھی امان ہے اور جو مسجد الحرام میں داخل ہوجائے اُسے امان ہے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے وہ بھی امان میں ہے۔[۲] دوسری روایت میں مسجد الحرام میں داخلہ کے بجائے یہ ہے کہ جو ہتھیار ڈال دے اُسے امان ہے۔[۳] اور مکہ میں داخل ہونے کے بعد تو آپ نے سب ہی کی جاں بخشی کر دی۔ آپ نے مکہ کے آدمیوں سے جو آپ کے سامنے تھے پوچھا کیوں تمہارا کیا خیال ہے۔ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ انھوں نے کہا ہمیں نیکی ہی کا گمان ہے۔ آپ ہمارے فیاض بھائی ہیں اور فیاض بھائی کے بیٹے ہیں۔ فرمایا۔ اذھبوا فانتم الطلقاء "جاؤ تم سب کو میں نے چھوڑ دیا۔"[۴]

اس کے بعد ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے بھی جس کے انتقامی جذبات کی تصویر جنگ اُحد میں سامنے آ چکی ہے اسلام قبول کیا اور جتنے سخت اور متعصب اکابر قریش اُس وقت باقی تھے سب ہی مسلمان ہوگئے۔[۵]

مگر مذکورہ واقعات سے ہر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ بے بس ہو جانے کے بعد آدمی سر جھکا سکتا ہے۔ ہاتھ روک سکتا ہے ہتھیار ڈال سکتا ہے۔ زبان بند کر سکتا ہے

---

(۱) بخاری ج ۲ صـ ۳۹ ـ (۲) طبری ج ۳ صـ ۱۱۶ ـ (۳) صحیح مسلم ج ۲ صـ ۱۰۴

(۴) طبری ج ۳ صـ ۱۲۰ ـ (۵) طبری ج ۳ صـ ۱۲۱ ـ

لیکن اپنے دل میں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا اپنے قلب میں یقین کی صفت پیدا نہیں کر سکتا اور اپنی نفرت کو محبت سے تبدیل نہیں کر سکتا۔ وہ نفرت و دشمنی جو اُن حدود تک پہنچ چکی تھی جن کا مظاہرہ گزشتہ واقعات سے ہو چکا ہے کیا اس سب کے بعد محبت و عقیدت سے تبدیل ہو سکتی ہے ؟ عام اصول فطرت اور واقعات کی رفتار کے مطابق یہ بات غیر ممکن معلوم ہوتی ہے۔ عام فطرت کے مطابق صرف اتنا سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ دشمن جو اب تک پھنکارے مارتے ہوئے اژدہے کی طرح سامنے موجود تھا اب مار آستین بن کر خفیہ ریشہ دوانیوں کے لیے آزاد ہو گیا اور کوئی شبہہ نہیں کہ دشمن موجودہ صورت میں پہلی صورت سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ یہی خیال تھا ان کے بارے میں اسلام کے نقاد حضرت علیؑ ابن ابیطالب کا۔ آپ نے فرمایا ہے ما اسلموا و لکن استسلموا "یہ لوگ حقیقۃً اسلام نہیں لائے تھے بلکہ اسلام کے سامنے اُنھوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور بس۔"

پانچواں باب

حسین بن علیؑ کی ولادت اور ابتدائی زندگی

سنہ ۳ھ۔ سنہ ۱۱ھ

حضرت محمد مصطفیٰؐ کو مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے ہوئے تیسرا برس تھا[1] کہ ۵ شعبان کو حسینؑ بن علیؑ کی ولادت ہوئی[2]۔

حضرت فاطمہ زہرا اپنے پدر بزرگوار رسالتمآبؐ کی خدمت میں مولود کو لے کر حاضر ہوئیں، حضرت نے حسینؑ نام رکھا اور ایک مینڈھے کی قربانی کے ساتھ عقیقہ کیا[3]

اب پیغمبر اسلام کی گود جو اسلام کی تربیت کا گہوارہ تھی، ان دو بچوں کی پرورش کا مرکز ہے ایک حسنؑ اور دوسرے حسینؑ۔

ان کی آنکھوں کے سامنے ایک طرف نانا کا اُسوۂ حسنہ تھا جو بانی اسلام تھے، دوسری طرف باپ جو مجاہد و محافظ اسلام تھے اور تیسری طرف ماں جو طبقۂ خواتین کے لیے تعلیمات پیغمبر کی عملی ترجمان بننے کے لیے پیدا ہوئی تھیں۔ بقول اقبالؔ

مزرع تسلیم را حاصل بتول　　　مادراں را اسوۂ کامل بتول

مسجد میں پانچوں وقت نماز جماعت، پیغمبر کے بصیرت آفریں مواعظ اور خطبے

---

(۱) کافی ج ۱ ص ۳۹۴ - (۲) مقاتل الطالبین ص ۵۴ ارشاد - (۳) ارشاد -

مسلمانوں کا ذوق وشوق اور جوش وخروش اور گھر میں رات دن عبادت وذکر الٰہی کی آوازیں، تکبیر کی صدائیں۔ وحی کی آیتیں۔ غزوات کے تذکرے۔ اسلام کو ترقی دینے کے مشورے اور یا پھر غریبوں کی خبر گیری، کمزوروں کی دستگیری اور مظلوموں کی دادرسی۔ بس ہر وقت یہی ذکر ہے۔ یہی فکر۔ یہی قصے ہیں اور یہی کہانیاں۔ ایک طرف فطرت کے مخصوص عطیے، دوسری جانب یہ نورانی اور روحانی ماحول، اور اس پر تربیت پیغمبر ایسے بلند معلم کی جن کا مقصد رسالت ہی قرآن کے اعلان کے مطابق تزکیۂ نفوس اور تعلیم کتاب وحکمت تھا[1] اور آپ نے خود بھی اعلان کیا تھا کہ مکارم اخلاق کی تکمیل میرا اصلی نصب العین ہے۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ رسول اپنے اہل بیت کی تربیت میں اُس فرض کو نظر انداز کر دیتے جو بحیثیت معلم اخلاق کے بحیثیت بزرگ خاندان کے اور بحیثیت ایک پیغمبر کے آپ پر عائد ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت نے اس کم سنی ہی کے عالم میں ان بچوں کو اپنے اخلاق واوصاف کا نمونہ بنا دیا اور ان آئینوں میں جو قدرت کی طرف سے کمال کا جوہر لے کر آئے تھے اپنی سیرت کا پورا عکس اُتار دیا۔

انہی ذات وصفات کی مخصوص بلندیوں کا یہ نتیجہ تھا کہ رسول ان اپنے نواسوں کے ساتھ غیر معمولی محبت رکھتے تھے جس کے مظاہرات تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں یکساں طور پر درج ہیں۔ اس کے علاوہ آپ دوسروں کو بھی ان سے محبت کی تاکید فرماتے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ جس نے حسن وحسین سے محبت رکھی اُس نے مجھ سے محبت رکھی اور جس نے ان کو دشمن رکھا اُس نے مجھے دشمن رکھا۔[2] آپ اللہ کو گواہ کرتے تھے کہ میں ان سے انتہائی محبت کرتا ہوں۔[3] مگر ان تمام باتوں کے

---

(۱) قرآن کریم سورۂ بقرہ آیت ۱۲۹ و ۱۵۱۔ آل عمران آیت ۱۶۵۔ جمعہ آیت ۲

(۲) سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۳۳۔ (۳) صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۸۲۔

ساتھ ساتھ حسینؑ اپنے نانا کی بلند سیرت، فرائض کے بارے میں اہتمام اور اسلام کے متعلق آپ کے انہماک کو دیکھ ہوئے یہ مشاہدہ کرتے تھے کہ رسول اللہؐ ہم کو بہت چاہتے ہیں مگر ہم سے زیادہ آپ اپنے دین یعنی اسلام اور اس کے آئین و شریعت کو چاہتے ہیں اس لیے اگر اس دین اور شریعت پر کوئی وقت پڑے تو پیغمبرؐ تیار ہوں گے کہ ہم کو اس پر نثار کر دیں۔

سنہ ۱۰ھ میں نجران (یمن) کے عیسائیوں کے ساتھ ایک طرح کے روحانی مقابلہ کا موقع آیا جس کا نام "مباہلہ" ہے یعنی دونوں فریق اللہ سے دعا کریں کہ جھوٹے پر عذاب نازل ہو، اس موقع پر رسول تشریف لے گئے تو اس طرح کہ ہاتھ میں علی ابن ابیطالبؑ کا ہاتھ تھا۔ حسنؑ و حسینؑ آگے آگے تھے اور فاطمہ زہراؑ پیچھے آرہی تھیں۔ نجران والے یہ نورانی منظر دیکھ کر مرعوب ہوئے اور خراج دینے کے لیے آمادہ ہو گئے[1] ظاہر ہے کہ پیغمبر خدا اس مہم کو تنہا سر کر سکتے تھے پھر قرآن کی تصریح[2] کے مطابق رسول اللہ اپنے اہل بیت کو ساتھ لے جانے پر کیوں مامور ہوئے؟ اس کا مقصد ایک طرف حق کے کامل نمایندوں کا خلق سے تعارف تھا۔ تو دوسری طرف تعلیم و تربیت کا انداز بھی تھا گویا ابھی سے خاندان رسول کی ان ہستیوں پر ذمہ داری کا بار ڈالا جا رہا تھا اور کار رسالت کی تکمیل میں عملی طور پر شریک کرتے ہوئے یہ ثابت کیا جا رہا تھا کہ ضرورت کے وقت حفاظت اسلام کی ان ہی سے امید ہے، رسول ان میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر کہہ رہے تھے کہ دیکھو آج تو میں خود موجود ہوں۔ میں تم کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں لیکن اگر کسی وقت میں میں موجود نہ ہوں تو تم اسی طرح حفاظت اسلام کے لیے نکل کھڑے

---

(۱) ارشاد صفحہ ۔ (۲) سورۂ آل عمران آیت ۶۱۔

ہونا جس طرح میں نکلا ہوں۔ آج کے اس عمل سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اسلام کی نصرت اور خدمت کے موقع پر مرد، عورت، جوان، بچہ کوئی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ اور ضرورت پر ہر ایک کو اس مقصد میں صرف ہونا لازم ہے۔ سب سے کم سن ۳۱، جماعت میں حسینؑ تھے اور ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے ان کا اس موقع پر ساتھ لانا قدرت کی طرف سے اس مستقبل کی تمہید ہے کہ انہی کو عملی طور پر دوبارہ اس مثال کے پیش کرنے کا موقع ملے گا جسے آج پیش کیا گیا ہے۔

حضرت محمد مصطفےٰؐ سے بڑھ کر کوئی شخص جوہر شناس نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ جانتے تھے کہ آپ کی تعلیمات کی حفاظت کن کے ذریعہ سے ہوگی۔ اس لیے مختلف صورتوں سے اپنی اُمت کو ہدایت کی کہ میرے اہل بیت کی پیروی کرتے رہنا کبھی فرمایا کہ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑتا ہوں۔ جب تک تم ان سے تمسک رکھو گے گمراہی سے محفوظ رہو گے۔ ان میں سے ایک قرآن ہے اور دوسرے میرے اہلبیت[1]۔ اور کبھی فرمایا کہ میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے جو اس کشتی پر سوار ہوا اُس نے نجات پائی اور جو روگرداں ہوا وہ دریائے ہلاکت میں غرق ہوا۔[2]

خصوصیت کے ساتھ اپنے دونوں نواسوں کے بارے میں کبھی فرمایا "حسن وحسین جوانان اہل بہشت کے سردار ہیں"[3]۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کا کردار اتنا بلند ہے اور رہے گا کہ ان کی سیرت زندگی کی عملی حیثیت سے تقلید ہی رضائے الٰہی کا سبب بن سکتی ہے اور کبھی فرمایا کہ "یہ دونوں میرے فرزند امام (واجب الاطاعت) ہیں خواہ کھڑے ہوں اور خواہ بیٹھے"[4]۔ آئے گا ایک مستقبل

(۱) مسند احمد بن حنبل۔ (۲) معارف ابن قتیبہ۔ (۳) ابن ماجہ ج ۱ صـ ۲۹
(۴) ارشاد صـ ۲۰۴۔

جب ایک ان میں سے صلح کر کے بیٹھا ہوگا اور ایک جہاد میں کھڑا ہوگا پیغمبر اسلامؐ کے ارشاد سے دونوں کے طرز عمل کے اپنی [illegible] ہونے پر روشنی پڑے گی۔

اس کے ساتھ خاص امام حسینؑ کے بارے میں جو حدیثیں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں (۱) یعنی میرا کام اور میرا نام دنیا میں حسینؑ کی بدولت قائم رہے گا۔ اس کے علاوہ بکثرت حدیثیں ہیں جو فضائل و مناقب کی کتابوں میں درج ہیں۔

افسوس کہ حسینؑ کے لئے اس لطف و محبت، بے پایان سکون اور اطمینان کی عمر طولانی نہیں ہوسکی۔ ابھی آپ کا سن سات برس کا بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ربیع الاول ۱۱ھ میں (۲) حضرت محمد مصطفےٰ کی وفات ہوگئی اور حسینؑ رسول اللہؐ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے۔

---

(۱) ابن ماجہ ج ۱ صہ ۳۳ (۲) الکافی ج ۱ صہ ۲۶۵ طبری ج ۳ صہ ۲۰۶
صہ ۵

چھٹا باب

امام حسین علیہ السلام کی زندگی کا دوسرا دور نانا کی وفات کے بعد باپ کی شہادت تک

سنہ ۱۱ھ — سنہ ۴۰ھ

حضرت رسولؐ کی وفات تمام خاندان کے لیے ایک بڑا روح فرسا حادثہ تھی آپ کے اخلاق و اوصاف نے دوست اور دشمن کے دل کو مسخر کر لیا تھا اس لیے آپ کے دنیا سے اٹھ جانے کا احساس ہر فرد بشر کو موجود تھا اور اسلامی گروہ کی کی ہر فرد جتنا تعلق پیغمبر سے رکھتی تھی اُس اعتبار سے غیر معمولی طور پر متاثر ہو رہی تھی۔ پھر خاص اہلبیت کے غم و الم کا اندازہ کہاں کیا جا سکتا ہے خصوصاً حسینؑ جنکے ساتھ پیغمبرؐ کی شفقت کا انداز ہی ایک نرالا تھا۔ وہ نانا جو اپنی گود میں بٹھاتا تھا۔ سینہ پر لٹاتا تھا اور کاندھے پر چڑھاتا تھا جو ذرا سی بھی خاطر شکنی حسینؑ کی گوارہ نہ کرتا تھا آج حسین آنکھیں پھرا پھرا کر چاروں طرف دیکھتے تھے اور وہ شفیق و مہربان نانا نظر نہ آتا تھا۔

یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ پیغمبرؐ کی حیات میں ان کی غیر معمولی محبتوں کو دیکھکر، نیز ان کے ان متواتر اعلانات کی وجہ سے کہ جو مجھ سے محبت رکھتا ہے اُسے حسینؑ سے نسبت کرنا چاہیے، عام مسلمان جو بھی رسولؐ کے ساتھ عقیدت اور محبت کا دم بھرتے تھے اور ان کے پسینے پر خون بہانے کا دعویٰ رکھتے تھے پیغمبرؐ کے سامنے اُن کے ان فرزندوں کے ساتھ انتہائی لطیف ترین جذبات محبت و نیاز مندی کا اظہار کرتے تھے اور اگر ذرا سا بھی اس میں کمی کا شائبہ پیدا ہوتا تھا تو پیغمبرؐ کی تیوریوں پر بل دکھائی

بنے لگتے تھے۔ ایک کھلا ہوا ثبوت اس کا اُس واقعہ سے ملتا ہے جب رسُول حسن مجتبیٰ کو کاندھے پر سوار کیے ہوئے تھے اور ایک صحابی نے کہہ دیا کہ "اے صاحبزادے کتنا اچھا مرکب ہے تمہارا"۔ رسولؐ نے فوراً ٹوک دیا اور فرمایا "یہ سوار بھی تو کتنا اچھا ہے؟"(۱) باتیں ایسی نہ تھیں جن کے بعد مزاج نبوت میں کچھ بھی درخور رکھنے والے مسلمان یا آپ کے چشم وابرو پر چلنے والے نیازمندان صاحبزادوں کی خاطر داری اور ان کے ساتھ اظہار محبت میں ذرا بھی فروگذاشت کرتے۔ اس طرح یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں ہے کہ اس دور میں حسینؑ ایک چراغ تھے جس کے گرد پروانے طواف کرتے تھے یا ایک آفتاب جس کے گرد ستارے چکر لگاتے تھے۔ عقیدت کی ایک دنیا ان کے قدموں پر نثار ہوتی تھی۔ اور محبت کا ایک آسمان تھا جو اُن کے سر پر سایہ افگن تھا مگر دنیا ایک حال پر نہیں رہتی وہ انقلابات کا مجموعہ ہے۔ آج وہ مرکز جس کی مقناطیسی کشش دنیا کو جذب کیے ہوئے تھی قبر میں پہونچ چکا تھا۔ وہ ایک کیا گیا کہ حسینؑ کی دنیا بالکل بدل گئی۔ وہ ماحول بھی بالکل تبدیل ہو گیا جو آپ کے سامنے رہا تھا۔ صبح ہوتی اور رسولؐ نے دروازہ پر آکر آواز دی(۲) الصّلوٰۃ، الصّلوٰۃ "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا" (یعنی) اُٹھو نماز کا وقت آگیا۔ اور پھر یہ قرآن کی آیت (۳) پڑھتے تھے (جو آیت تطہیر کے نام سے مشہور ہے یعنی) "اللہ کو منظور یہی ہے کہ اے اہل بیت تم سے ہر طرح کی نجاست کو دور رکھے اور تم کو پاک رکھے جو پاک رکھنے کا حق ہے"۔ سب فوراً اُٹھ بیٹھے باپ اور بھائی کی طرح حسینؑ نے بھی فوراً وضو کیا۔ مسجد میں پہونچے۔ مسلمانوں کا اجتماع ہوا۔ پیغمبرؐ نے نماز پڑھائی۔ ظہر۔ عصر۔ مغرب اور عشا ہر وقت یہی سماں۔ نمازوں کے بعد یا پہلے اور ضرورت کی صورت میں مختلف اوقات پر پیغمبرؐ کے خطبے۔ شریعت اسلام کی تعلیم حاصل کرنے والوں کا ہجوم۔ قبائل عرب

(۱) صواعق محرقہ ص ۸۳ (۲) استیعاب ج ۲ ص ۱۵۹ (۳) سورۂ احزاب آیت ۳۳

اور سلاطین دنیا کے وفود اور سفراء کا وُرُود۔ مختلف جماعتوں کی سرگرمیوں کا تذکرہ
اور اُس کے مدافعتی انتظامات۔ دیوانی اور فوجداری کے مقدمات کا پیش ہونا،
گواہوں کے بیانات، بحث اور جرح اور مقدمات کا فیصلہ۔ مجرموں کی سزائیں۔ زکوٰۃ
وخمس اور اموال غنیمت کا آنا اور مقررہ اصول و قواعد کے مطابق تقسیم۔ غرض یہ
کہ دین اور دنیا کے تمام مسائل اُس ایک نقطہ پر مجتمع نظر آتے تھے۔ حسینؑ اپنے
نانا کے پاس تقریباً ہر وقت موجود رہتے تھے اور آنکھ کھول کر اسی عالم سے روشناس
ہوئے تھے۔ اب پیغمبر کی وفات کے بعد یہ تمام سماں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ انقلاب اور
عظیم الشان انقلاب!

افسوس ہے کہ رسولؐ کی خلافت کا مسئلہ اتنا اختلافی بن گیا کہ آج تک اُس
پر شیعہ اور سنی کا تفرقہ قائم ہے۔ اس کتاب میں جو واقعہ کربلا کو غیر نزاعی طور پر دنیا کے سامنے پیش
کیے جانے کی جا رہی ہے اس پر بحث کرنا منظور نہیں ہے ۔ ان ناگوار واقعات کا کوئی مستقل
مقصود ہے۔ بہرحال یہ متفق علیہ تاریخی حقیقت ہے کہ رسول کے بعد کچھ افراد امت نے
متفق ہو کر سیاسی اقتدار خاندان رسول سے ہٹا دیا۔ اس انقلاب کا لازمی نتیجہ یہ
کہ سرکار رسالت کے بعد ڈیوڑھی کی چہل پہل اور رونق سناٹے سے تبدیل ہو گئی اور
ماحول جس میں حسینؑ زندگی بسر کر رہے تھے ایک دم بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔

حسینؑ ماں کے پاس جاتے تو یہ دیکھتے کہ سوائے اوقات نماز کے ہر وقت گریہ
وزاری سے کام ہے۔ کچھ دن تک تو گھر ہی پر رویا کرتی تھیں، پھر اہل مدینہ کی اس شکایت
پر کہ آپ کے نالہ و شیون نے ہم پر خواب و خور حرام کر دیا ہے، آپ جنۃ البقیع میں چلی جاتی
تھیں اور اُس قبرستان میں گریہ کرتی رہتی تھیں[1]، حسینؑ باپ کے پاس آتے تو یہ دیکھتے
کہ اُنھوں نے اہل زمانہ کی بے رخی کو دیکھتے ہوئے گھر سے نکلنا اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر

(۱) کشف الغمہ ص۱۴۵

ہے۔ آپ ہر وقت ایک گوشہ میں بیٹھے قرآنِ مجید کے متفرق اجزاء کو اصلی ترتیب اور شانِ نزول کے مطابق کتابی شکل میں مرتب کرتے رہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں نے عہد کیا ہے کہ عبا دوش پر نہ ڈالوں گا جب تک کہ قرآن جمع نہ کر لوں (۱) کیا اس صورت حال کو دیکھ کر حسینؑ کا دل نہ گھٹتا ہوگا۔ وہ سوچتے ہوں گے کہ اے خدا یہ کیسا اندھیرا ہے جو یک دم ہماری آنکھوں کے سامنے چھا گیا۔ بہرحال اپنے باپ کے طرزِ عمل میں یہ نصب العین نمایاں پایا کہ چاہے حالات کتنے ہی ناسازگار ہوں مگر ہمیں اسلام کی خدمت سے ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے ہمارا اور قرآن کا ساتھ ہے اس لیے قرآن کی حفاظت ہمارا فرض ہے اور اس فرض کو کسی وقت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حسینؑ نے یہ بھی دیکھا کہ لوگ میرے باپ کے پاس آتے ہیں اور وہ انہیں جوش دلانا چاہتے ہیں کہ آپ اسلامی حکومت کے حصول کے لیے کوشش کیجئے جو واقعی آپ کا حق ہے۔ اُٹھیے اور ہم آپ کی امداد کے لیے تیار ہیں۔ ان میں سچے دوست بھی ہیں۔ اور نمائشی بھی، ایک طرف رسولؐ کے چچا عباس بن عبد المطلب کہتے ہیں کہ اپنا ہاتھ بڑھاؤ۔ میں تمہاری بیعت کر لوں اس کا مسلمانوں پر بڑا اثر پڑیگا۔ اور وہ کہیں گے کہ پیغمبر کے چچا نے ان کے ابن عم کی بیعت کر لی، پھر کسی کو عذر نہ ہوگا۔ اور دوسری طرف بنی اُمیہ کا سردار ابو سفیان بن حرب ہے اور وہ آ کر کہتا ہے کہ کتنے غضب کی بات ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے عرب کے ایک ادنیٰ ترین خاندان نے غلبہ حاصل کر لیا خدا کی قسم اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی امداد کے لیے مدینہ کو سوار اور پیادوں سے بھر دوں۔ مگر چونکہ آپ کی ذات جذبات سے بلند اور نفسانیت کے لوث سے پاک تھی اور آپ اسلام کا حقیقی درد اپنے سینہ میں رکھتے تھے اس لیے آپ اپنا حق سمجھتے ہوئے بھی ان لوگوں کے کہنے میں نہیں آئے اور آپ نے ابو سفیان کو اس طرح ڈانٹ کر جواب دیا کہ "خدا کی قسم تم ہمیشہ اسلام اور اہل اسلام کے دشمن رہے ہو۔"(۲)

---

(۱) صواعق محرقہ صفحہ ۷۶ (۲) ارشاد صفحہ ۱۰ استیعاب جلد ۲ صفحہ ۱۰۰، صواعق محرقہ صفحہ ۳۰ ۔ تاریخ الخلفاء صفحہ ۴۵ طبری ج ۳ صفحہ ۲۰۲-۲۰۳

یہ اس کا عملی اظہار تھا کہ چاہے ہمارے حقوق ہاتھ سے جائیں، ہمارے شخصی مفاد
کو نقصان پہونچ جائے مگر ہم کو ہمیشہ اجتماعی اور اسلامی مفاد پر نظر رکھنا چاہیے اور اس
کیلئے ہر طرح کی قربانی کیلئے تیار رہنا چاہیے یہ نتیجہ بھی اس واقعہ سے ظاہر تھا کہ ابوسفیان اور اسکے خاندان کے
لوگوں کا اسلام صرف نمائشی حیثیت رکھتا ہے اور ان سے اسلام کے متعلق ہمیشہ نقصان پہونچانے
کا اندیشہ موجود ہے اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اسلام کو اس کے کھلے ہوئے دشمنوں کے
ہاتھوں اتنا نقصان نہیں پہونچ سکتا جتنا ان نمائشی دوستوں سے پہونچ سکتا ہے
اس لیے اگر اسلام کا تحفظ کرنا ہے تو ہمیشہ اس جماعت کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا چاہیے
اور کوئی موقع نہ آنے دینا چاہیے .... کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائیں

افسوس ہے کہ رسولؐ کی وفات سے چند ہی مہینوں کے بعد گوناگوں مصائب و
تکالیف اٹھانے کے ساتھ حسینؑ سے اُن کی بزرگ مرتبہ ماں بھی جدا ہوگئیں حضرت
فاطمہ زہراؑ کی وفات سے علی بن ابیطالبؑ اور بھی دل شکستہ ہوگئے اور حسنؑ و حسینؑ
کے لیے مہر و محبت کی دنیا بڑی حد تک ویران نظر آنے لگی۔ اب ان کے لیے گہوارہ
شفقت و تربیت صرف ایک تھا اور وہ اُن کے بزرگ مرتبہ باپ کی ذات۔ سات برس
کی عمر سے لے کر چھتیس سال کی عمر تک انتیس سال برابر حسینؑ، اپنے وہبی کمالات
کے ماورا، حضرت علیؑ بن ابی طالب ایسے حکیم الٰہی، عالم ربانی، معلم اخلاق انسانی
اور مجموعۂ فضائل نفسانی کے علمی اور عملی فیوض سے بہرہ یاب ہوتے رہے اور یہی وہ
زمانہ ہے جس میں عام نظام اسباب کے دنیا میں انسانیت کی حقیقی تعمیر ہوتی ہے۔ اس
عمر کے آغاز سے بلوغ کی مدت تک اوصاف و ملکات کی داغ بیلیں پڑتی ہیں، نوجوانی
کے زمانہ میں اُن پر دیواریں اٹھتی ہیں اور جوانی کے اختتام تک یہ عمارت مکمل ہوکر اس
پر نقش و نگار بن جاتے ہیں اور وہ ساز و سامان اور شیشہ آلات سے بھی آراستہ ہوجاتی
ہے۔ حسینؑ کے لیے ان تمام منازل کی ظاہری تکمیل علیؑ ابن طالب کی نگرانی میں ہوئی

حسینؑ نے دیکھا کہ ان کے والد بزرگوار علی بن ابیطالبؑ باوجودیکہ کو بے توجہی حق فراموشی اور بے دہری سے بیدہ خاطر ضرور تھے لیکن جب کسی علمی مسئلہ میں، کسی اہم کے متعلق مشورہ میں، کسی مقدمہ کے فیصلہ میں ان کی ضرورت پڑجاتی ہے اور ان سے امداد کی خواہش کی جاتی ہے تو وہ فوراً بلا عذر امداد کرنے کے لیئے تیار ہوجاتے ہیں۔ یہ جذباتی انسانوں کے روّیہ کے بالکل خلاف ہے وہ اگر کسی منصب کے حصول سے جس کے حقدار ہوں محروم کردیے جائیں تو وہ متعلقہ افراد سے خفا ہوکر الگ ہوجائیں گے اور اگر اس منصب سے تعلق رکھنے والے معاملات میں ان سے مدد طلب کیجائے تو وہ اپنی دلی رنجش کی بنا پر تعاون سے انکار کر دینگے۔ اس سے اہلبیت کی ہر فرد کے سامنے یہ نمونہ پیش ہو رہا تھا۔ کہ ہم چاہے مسلمانوں کے معاملات سے کتنے ہی غیر متعلق کردیئے جائیں مگر ہمیں کبھی اپنے کو غیر متعلق سمجھنا نہیں چاہیے۔ ہمیں ہر ایسے موقع کا منتظر رہنا چاہیئے کہ جس وقت ہمارے ذریعہ سے اسلامی مفاد کو حقیقی فائدہ پہونچ سکتا ہو تو اس موقع پر فوراً ہمیں اپنے فرض کو انجام دینا چاہیئے اور اسلام کی خدمت کو اپنا نصب العین سمجھنا چاہیے۔

تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے موقع پر وقت ایسا آیا کہ حضرت علی بن ابی طالبؑ تخت حکومت کو حاصل کر لیتے جبکہ خلیفۂ دوم نے اپنے انتقال کے وقت چھ آدمیوں کی کمیٹی بناکر خلافت کو اُن میں منحصر کردیا، اور ان میں سے ایک حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کو بھی قرار دیا تھا۔ تمام دوسرے ارکان حضرت علیؑ کو خلافت کے منصب پر نامزد کرنے کے لیئے تیار تھے۔ بشرطیکہ آپ کتاب اور سنت کے علاوہ شیخین (ابوبکر وعمر) کی سیرت پر عمل کا بھی عہد کریں[1]۔ مگر حسینؑ نے دیکھا کہ اُن کے حقیقت پرور، بلند ہمت اور مستغنی طبیعت باپ نے اس موقع کو اپنے ہاتھ سے دے دیا۔

---

(۱) طبری ج ۵ صفحہ

اس بنا پر کہ وہ کتاب اور سنت پر عمل کے علاوہ کسی دوسری شرط کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے جس کے نتیجہ میں وہ ظاہری خلافت کا ہما جو اُن کے سر ہمایوں پر چکر لگا رہا تھا ایک طویل عرصہ تک کے لیے اُن سے علیحدہ ہو گیا۔

حسینؑ نے اس میں ایک بڑے اہم سبق کا عملی نمونہ دیکھا جس پر اُن کے آئندہ اقدامات کی بنیاد قائم تھی اور وہ یہ کہ شریعت اور مسلمان حکمرانوں کی سیرت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ جو حکومتِ وقت کا آئین اور اُس کا عمل ہو اُس کو شریعت کی رو سے بھی صحیح ماننا پڑے بلکہ شریعت کے مستقل اصول ہیں جنھیں مقتدا ہونا چاہیے اور حکومت کے عمل کو اُن کا ماتحت ہونا چاہیے اور جب ایسا نہ ہو تو ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ شریعت کو تسلیم کرے اور حکام کے عمل کو تسلیم نہ کرے۔ اور اگر کسی وقت ایسا موقع پیش آئے کہ حکام کا عمل کھلم کھلا شریعت کے خلاف اور آئین مذہب میں بنیادی تبدیلی کا باعث ہو تو مسلمان کا فرض ہے کہ وہ شریعت کی حمایت میں کمربستہ ہو جائے اور اس کے لیے بشرطِ ضرورت کسی قربانی سے دریغ نہ کرے۔ اسی دور میں ۳۱ھ میں یزدجرد بادشاہ ایران کا سراسیمگی اور کس مپرسی کے عالم میں ایک ایرانی ہی کے ہاتھ سے خاتمہ ہوا (۱) جس کے بعد شاہزادیاں بحیثیت قیدی کے مدینہ بھیجی گئیں۔ اور اس موقع پر جبکہ غنیم ملک کی شاہزادیوں کو قید دیکھ کر بہت سے آدمی خوش ہو رہے ہوں گے حضرت علیؑ اور اُن کے عالی دماغ شاہزادہ حسینؑ نے انہیں کنیزی کی ذلت سے بچا ہی نہیں لیا بلکہ اُنہیں خاندان رسول کے گھر کی ملکہ کا تاج پہنا دیا چنانچہ وہ شاہزادی جن کا نام شہربانو یا شاہ زنان مشہور ہے۔ حسینؑ کے عقد میں آئیں اور اس طرح اُنھوں نے اسلام کی اُس تعلیم کو زندہ رکھا

---

(۱) طبری ج ۵ ص ۷۷

جو ملکی تفریق کو مٹا دینے کی علمبردار ہے۔
تیسرے خلیفہ عثمان کے دور کا آخری حصہ بڑی بے اطمینانی اور کشمکش میں
گزرا، مسلمانوں کو اُن سے شکایتیں پیدا ہوئیں اور آخر اقدامات کی حد تک پہونچیں
مگر حضرت علی ابن ابی طالبؑ اُن اقدامات کو تقویت پہونچانے کے بجائے پوری کوشش
کے ساتھ اُن کو روکنے کی کوشش فرمائی۔ کئی مرتبہ بیچ میں پڑ کر صلح کرائی مخالف
جماعت کے شکایات دور کرائے اور اُسے سمجھا بجھا کر منتشر کیا (۱) مگر مروان جو
اس دور میں کاتب (۲) کے عہدہ پر تھا اُسکی شرارتوں نے ان کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا اور آخر اس جماعت
نے حاکم وقت کے مکان کا محاصرہ کرلیا (۳) اس وقت بھی حضرت علی بن ابیطالبؑ
نے یہ ہمدردی کی کہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ محاصرہ کرنیوالوں نے پانی بند کردیا ہے
تو آپ نے حسنؑ اور حسینؑ اپنے دونوں فرزندوں کو کچھ مشکوں کے ساتھ روانہ
کیا اور ان دونوں صاحبزادوں نے اپنے کو خطرہ میں ڈال کر پانی قصر حکومت کے
اندر پہونچا دیا۔ بہرحال نظم حکومت کا پیمانہ لبریز تھا اور پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔
حملہ آور جماعت نے دار الحکومت کی سرزمین کو خلیفہ کے خون سے رنگین اور اُن کے
رشتۂ حیات کو قطع کردیا۔ حیرت کا امر ہے کہ اتنا بڑا مسلم الکثریت کا مسلم الثبوت
فرماں روا خود اپنے دار السلطنت میں ایک مہینہ انیس دن (۴) محصور رہا اور آخر میں تلوار
کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اُس دار السلطنت کے لوگوں میں جو پیغمبرؐ کا دار الہجرت
اور مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز تھا اور جہاں کے اہل حل و عقد خلیفہ گری کے کام کا
اپنے کو واحد ذمہ دار سمجھتے تھے کوئی جوش مقاومت پیدا نہ ہوا اس سے زیادہ

---

(۱) طبری ج ۵ ص ۹۴ ۹۷ - ۱۱۰ - ۱۱۷ و ۱۲۲
(۲) کاتب کا درجہ اُس دور میں "وزیر" کا سا ہوتا تھا۔ وہ حاکم کا رازدار مشیر کار اُس کی مہر کا امانتدار اور اُس کی طرف سے خط و کتابت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔
(۳) ابو داؤد کتاب ص ۱۴۰ - طبری ج ۵ ص ۱۱۱ - ۱۱۲ (۴) طبری ج ۵ ص ۱۲۲

تعجب کی یہ بات ہے کہ لاش ـــــــ تین دن تک بے گور و کفن رہی (۱) اور عامۂ مسلمین دفن کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ آخر میں راتی رات "حش کوکب" نام کے مقام پر جو مسلمانوں کے قبرستان سے الگ تھا۔ سپرد خاک کیے گئے (۲)

اس عبرت خیز مرقع سے ایک حساس انسان کس قدر اہم نتائج اخذ کرسکتا تھا سلطنت دنیا کی بے ثباتی۔ جمہور کی وفاداری پر عدم اعتماد۔ نیز مروان اور دوسرے بنی امیہ کے ہاتھوں اسلام کے شیرازہ کی ابتری یہ سب کچھ حسینؑ نے دیکھا اور اپنی آئندہ زندگی کے سب سے اہم کارنامہ کی بنیادوں کو مستحکم بنانے میں ان میں سے ہر ایک پہلو کا لحاظ رکھا جس کے سننے اور سمجھنے کے لیئے آپ کو مستقبل کا انتظار کرنا چاہیے۔

حالات بہت تیزی سے تبدیل ہوتے ہیں اور ان حالات کے لحاظ سے جمہور کے رجحانات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس ہنگامی انقلاب کے نتیجہ میں مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور ان کے انتخاب کی نگاہیں حضرت علیؑ بن ابیطالب کے چہرہ پر جم گئیں۔ اُنھوں نے آپ کے پاس آکر خلافت اسلامی کی ذمہ داری کو سنبھالنے کی درخواست کی۔ یہ بات حیرت میں ڈالنے والی تھی کہ حضرت علیؑ باوجودیکہ اس کے پہلے ہمیشہ خلق خدا کی ہدایت اور اُن کے نظم ونسق کی اصلاح کے لیئے بے چین اور خلافت رسولؐ کے لئے اپنے استحقاق کا اعلان فرماتے رہے تھے۔ آج مسلمانوں کی اس متفقہ ملتجیانہ پیشکش کو مسترد فرما رہے تھے (۳) اور اس کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھے، حسینؑ خوب جانتے تھے۔ کہ اس کا سبب کیا ہے؟ عمال حکومت کے رویہ کی بدولت مسلمانوں کی عادتیں بگڑ چکی تھیں اور زاویۂ نگاہ میں تبدیلی ہو چکی تھی۔ اسلامی حکومت بڑی حد تک دنیاوی اقتدار سلطنت کے قالب میں

---

(۱) طبری ج ۵ ص ۱۴۳ (۲) طبری ج ۵ ص ۱۴۳ و ص ۱۴۴ (۳) طبری ج ۵ ص ۱۵۲

ڈھل گئی تھی اور کسرویت و قیصریت کے آثار اُس میں نمودار ہو گئے تھے۔ یہ چیز کسی طرح اُس سادگی اور مساوات کے ساتھ سازگار نہ تھی جسے پیغمبر اسلامؐ نے دنیا میں پھیلایا تھا اور جس پر حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ نہایت سختی کیساتھ عامل تھے۔ آپ خوب جانتے تھے کہ اگر میں اس وقت حکومت کی باگ کو سنبھالوں تو یا تو مجھے زمانہ کے ساتھ ساز کر کے ہوا کے رخ پر چلنا پڑے گا۔ اور اس کے لیے میرا ضمیر مجھ کو اجازت نہیں دے سکتا اور یا میں زمانہ کے ساتھ جنگ کروں گا۔ بیشک اگر میں ذمہ داری اپنے سر لے لوں تو مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے مگر اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مملکت میں خلفشار رہے گا اور بحیثیت ایک حاکم کے میرا دور ناکامیاب سمجھا جائے گا۔ آپ نے پورے طور پر انکار کیا۔ مگر مسلمانوں کا اصرار اتمام حجت کی صورت اختیار کر گیا یعنی وہ علیؑ بن ابیطالب پر یہ ذمہ داری عائد کرنے لگے کہ دنیا آپ سے ہدایت و اصلاح کی طالب ہے اور آپ اس سے گریز کرتے ہیں، ایک داعی حق کو یہ بھی زیبا نہیں ہے کہ وہ خلق خدا پر بے اعتمادی کی آڑ پکڑ کر اُن کی درخواست کو ٹھکرا دے اور اُن کے ہدایت کی ذمہ داری کو پورا کر کے اُن پر حجت کو تمام نہ کرے۔ مجبوراً حضرت علیؑ بن ابیطالب کو یہ ذمہ داری کو قبول فرمانا پڑی۔ بے شک آپ نے دنیا کو دھوکے میں مبتلا نہ رکھنے کے لیے صاف اعلان کر دیا کہ دیکھو جب تم ذمہ داری کو میرے سپرد کر رہے ہو تو میں جو ٹھیک راستہ سمجھوں گا اُسی پر تمہیں چلاؤں گا اور کسی کے اعتراض اور نکتہ چینی کی پرواہ نہ کروں گا (۱)۔

لوگوں نے اس کا اقرار کر کے ذی الحجہ ۳۵ھ میں علی بن ابیطالبؑ کی بیعت کی اور آپ خلیفۃ المسلمین تسلیم کر لیے گئے۔ اس سے ایک طرف یہ ثابت کیا گیا کہ دنیا کی فضا اہلبیتؑ کے حکومت و اقتدار کے لیے موزوں نہیں ہے۔

---

(۱) طبری ج ۵ ص ۱۵۶

دوسری طرف یہ اگر اللہ کے بندے وفاداری کے عہد کے ساتھ رہنمائی کے طالب ہوں تو جب تک حجت اُن پر پورے طور سے تمام نہ ہو جائے ہمارا فرض ہے کہ ہم بظاہر اُن کے عہد و پیمان کو باور کریں اور اُن کی خواہش رہنمائی کی تکمیل کے لیے قدم آگے بڑھائیں۔

خلافت کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد ہی ہوا جو حضرت علیؑ بن ابیطالب پہلے سے سمجھے ہوئے تھے کہ دنیا آپ کے احکام کی پابندی اور آپ کے تعلیمات کی پیروی کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ کچھ لوگوں نے تو بیعت سے پہلو تہی کی جیسے اسامہ بن زید، حسان بن ثابت، عبداللہ بن عمر اور سعد بن ابی وقاص وغیرہ۔ حضرت علیؑ نے ان کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی حالانکہ تمام مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے آپ کی بیعت مکمل ہو چکی تھی اور اس لیے اُن کا بیعت سے انحراف اُن سب کے نزدیک غلط تھا۔ مگر جب تک وہ عملی طور سے کوئی مخالفت نہ کرتے اور اُس نظام میں خلل نہ ڈالتے، ضرورت ہی کیا تھی کہ اُن سے تعرض کیا جائے جبکہ اصول مذہب میں دستور یہ ہے کہ لا اکراہ فی الدین تو خلافت کے تسلیم کرانے میں اکراہ کے کیا معنی؟

لیکن بعض لوگوں کا یہ مشورہ کہ معاویہ اور جتنے عثمان کے زمانہ کے عامل ہیں اُن سب کو آپ برقرار رکھیں اور جب وہ مطمئن ہو جائیں اور آپ کی گرفت میں آجائیں تو پھر چاہے سب کو معزول کر دیں، اسے آپ نے منظور نہیں فرمایا اور آپ نے کہا اور مذہبی ذمہ داری کے لحاظ سے آپ اُس کے سوا کہہ ہی کیا سکتے تھے کہ سیاست دنیا کے لحاظ سے تو بیشک یہی بہتر ہے جو تم کہتے ہو مگر جب میں جانتا ہوں کہ وہ ظالم اور نااہل ہیں تو انہیں اپنی طرف سے حکومت کا پروانہ بھیج کر میں اُن کے مظالم میں شریک ہوں۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ (۲)

حاشیہ دوسرے صفحہ پر

بڑا دردرس واقعہ ہے۔ اگر علی بن ابیطالبؑ، اپنی ماتحتی میں معاویہ ایسے شخص کی حکومت کو دینی فریضہ کے ماتحت برداشت نہیں کر سکتے تھے تو اس کے بعد کبھی حسینؑ بیعت کر کے معاویہ سے بڑھ کر یزید ایسے شخص کی حکومت کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں؟!

پھر بھی حضرت علی بن ابی طالبؑ نے معاویہ کے نام جو خط لکھا اُس میں کوئی سختی و درشتی، لب و لہجہ کی تلخی اور جنگجویانہ انداز نہ تھا بلکہ ایک برسر اقتدار آنے والے حاکم اعلیٰ کو اپنے کسی عامل کو جس طرح کا خط لکھنا چاہیے ویسا ہی تھا۔ اس خط کا مضمون جو مشہور مؤرخ واقدی کی کتاب الجمل سے منقول ہے حسب ذیل ہے:۔

تم کو معلوم ہو گا کہ میں نے مسلمانوں کے معاملات میں اپنے دامن کو کس طرح صاف رکھا اور کس طرح تخت خلافت سے بے اعتنائی اختیار کرتا رہا یہاں تک کہ وہ ہوا جو ٹل نہ سکتا تھا (قتل عثمان) اور اس کے بعد میرے لیے چارۂ کار باقی نہ رہا۔ یہ واقعات بہت طولانی ہیں۔ بہر حال جو ہونا تھا وہ ہوا اور اب جو حالات پیش ہیں وہ آنکھوں کے سامنے ہیں اب تم وہاں کے لوگوں سے بیعت حاصل کرو اور اپنے یہاں کے آدمیوں کے ایک وفد کے ساتھ میرے پاس حاضر ہو (۳)

---

(۱) پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے کہ جو شخص مسلمانوں کی حکومت کا ذمہ دار ہو پھر وہ اپنی جانب سے کسی شخص کو والی قرار دے درانحالیکہ اُس سے بہتر شخص مسلمانوں کے مفاد کے لیے موجود ہو تو اُس نے خدا اور رسول سے خیانت کی۔ دوسری حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی آدمی کو کوئی منصب عطا کرے کسی جماعت کے اندر حالانکہ اُس جماعت میں اُس آدمی سے زیادہ پسندیدہ شخص موجود ہے تو اس نے خدا اور اُس کے رسول اور تمام مومنین کی خیانت کی (السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ للشیخ ابن تیمیہ ص۳)

(۲) طبری ج ۵ ص ۱۵۹-۱۶۰ (۳) نہج البلاغہ ج ۲ ص ۱۴

معاویہ اگر مخالفت پر پہلے سے تلے ہی ہوئے نہ ہوتے تو اس خط کے مضمون پر انھیں عمل کرنا چاہیے تھا مگر وہاں تو عناد و مخالفت کی چنگاریاں پہلے سے سلگ رہی تھیں آخر آپ کے مقابلہ میں قتل عثمان کا غلط الزام تراشا گیا اور اس بہانہ سے آپ کی مخالفت کا جھنڈا اونچا کیا گیا۔

معاویہ نے شام والوں کو حضرت علی بن ابیطالبؑ کے خلاف اس غلط تہمت کو اُن کے ذہن نشین کرکے پورے طور پر مشتعل کر دیا۔ مسجد جامع دمشق میں ماتمی جلسے کیے گئے۔ مقتول خلیفہ کا خون بھرا کرتا منبر پر ڈال دیا گیا اور عالم یہ تھا کہ پچاس ساٹھ ہزار کا مجمع اُسے دیکھ دیکھ کر نالہ وزاری کرتا اور اس جوش رقت میں اُن سے کہا جاتا تھا کہ اب تمہیں علیؑ سے اس خون کا بدلا لینا ہے (۱) اب حضرت علیؑ شام کی مہم کے تدارک کا سامان کرنا چاہ رہے تھے جو یک بیک یہ خبر آئی کہ طلحہ اور زبیر نے زوجہ رسولؐ عائشہ بنت ابی بکر کو آمادہ کرکے آپ کے خلاف محاذ تیار کر لیا ہے (۲)

وہ لوگ جو پچیس ۲۵ برس تک حضرت علیؑ کو میدان جنگ سے بالکل علیحدہ رہتے ہوئے خاموشی کی زندگی گزارتے دیکھ چکے تھے، انھیں یقین ہوگا کہ حضرت علیؑ کسی نہ کسی طرح اس قضیہ کو رفع دفع کر دینگے اور جنگ کی نوبت نہ آنے دینگے مگر انھوں نے دیکھ لیا کہ وہی علیؑ جو اپنی تلوار کو اتنے عرصہ تک نیام میں رکھ چکے تھے کہ جوانی گزر کے بڑھاپا آ گیا تھا، آج وہ ذمہ داری اپنے اوپر عائد ہو جانے کے بعد دین و اصول اور حق کی حفاظت کے لیے جنگ پر بالکل تیار ہیں۔ بے شک امام حسینؑ نے دیکھا کہ اُن کے پدر بزرگوار نے اس اصول کی سختی کے ساتھ پابندی فرمائی کہ جب تک فریق مخالف عملاً جنگ کی ابتدا نہ کر دے، اُس وقت تک تلوار نیام سے نہ نکالی جائے چنانچہ جمل (۳) کے میدان میں یہی ہوا کہ جب صفوف لشکر مرتب ہو چکے تو حضرت علی بن ابیطالبؑ نے ایک قرآن ہاتھ میں لے کر اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ کون ہے جو اس قرآن کو لے جا کر

---

(۱) طبری ج ۵ ص (۲) طبری ج ۵ ص ۱۶۳ (۳) جمل عربی میں اونٹ کو کہتے ہیں چونکہ اس جنگ میں زوجہ حضرت رسولؐ عائشہ کو ایک اونٹ پر محمل میں رکھ کے حضرت کے مقابلہ پر لایا گیا تھا اس لیے اُس کا نام جنگ جمل ہوا۔

انہیں اس پر عمل کرنے کی دعوت دے مگر یہ بتائے دیتا ہوں کہ وہ قتل کر دیا جائیگا
یہ سن کر اہل کوفہ میں سے ایک جوان جس کا نام مسلم تھا کھڑا ہو گیا۔ کہا میں جاؤنگا حضرت نے
سکوت فرمایا اور پھر بلند آواز سے کہا کون ہے جو اس قرآن کو لے جا کر انہیں اس پر عمل
کی دعوت دے مگر وہ قتل ہو جائیگا۔ پھر کھڑا ہوا تو وہی جوان۔ حضرت نے پھر سکوت
کیا اور پھر وہی الفاظ بلند آواز سے کہے۔ جب پھر وہی جوان کھڑا ہوا تو آپ نے وہ
قرآن اُسکے سپرد کیا وہ اُسے لیکر صفوف مخالف کے سامنے گیا ظالموں نے اُس کا
داہنا ہاتھ قطع کر دیا مگر اُس نے قرآن گرنے نہیں دیا۔ فوراً بائیں ہاتھ میں لے لیا اور
پھر دعوت دی۔ ان لوگوں نے اُس کا بایاں ہاتھ بھی قطع کر دیا تو اُس نے قرآن کو
دونوں کٹے ہوئے بازوؤں سے تھام کر سینہ سے لگا لیا اس حالت میں کہ خون کی اُسکے
کپڑوں پر بارش ہو رہی تھی —— اس کے بعد وہ قتل کر دیا گیا —— علی ابن ابیطالبؑ
پکارے کہ اب ان سے جنگ حلال ہو گئی (۱) اب دنیا نے دیکھا کہ وہی تلوار جو بدر، احد
خندق اور خیبر میں کسی وقت چمک چکی تھی جمل کے میدان میں چمکنے لگتی ہے، وہی ہاتھ
ہے اور ہاتھ کی صفائی۔ وہی دل ہے اور دل کی طاقت یہاں تک کہ جمل کا معرکہ فریق
مخالف کی شکست پر ختم ہوا اُس وقت حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے فریق مخالف کی
سرگروہ ام المومنین عائشہ کے ساتھ وہ شریفانہ اور باعزت برتاؤ کیا جیسا کہ کسی
فاتح نے اپنے مفتوح فریق کے ساتھ نہیں کیا ہوگا (۲) یہ معرکہ روز پنجشنبہ ۱۰ جمادی الثانیہ
۳۶ھ کو پیش ہوا۔ (۳)

ظاہر ہے کہ عام اسباب کے لحاظ سے اب جناب امیرؑ کا سن لڑائیوں کی امنگوں
کا متقاضی نہیں تھا۔ اُنسٹھ برس کی عمر تھی مگر آپ کا پچیس ۲۵ برس کی خاموشی کے بعد
اب میدان جنگ میں آ جانا۔ اعلان کر رہا تھا کہ حقیقۃً ہمارا حرکت و سکون سب فرض

(۱) طبری ج ۵ صفحہ ۲۰۵ - ۱۰۶ (۲) تفصیل کے لیے دیکھو طبری ج ۵ صفحہ ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۵۔
(۳) طبری ج ۵ صفحہ ۲۱۹

کے احساس کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ فرض کی پکار پر ہمیں ہمیشہ جواب دینا چاہیے اصول اور فرض کے حدود میں جذبات کا تقاضا اور سن کا اختلاف کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر فرض ہمارا خاموشی کا ہو تو چاہے جوانی کی تمام امنگیں قدم اٹھانے پر آمادہ کر رہی ہوں پھر بھی ہم کو اپنی زندگی خاموشی کے ساتھ گزار دینا چاہیے اور جوانی سکون کے عالم میں بسر کرنا چاہیے اور اگر فرض ہمارا عملی اقدام کا ہو تو چاہے بڑھاپے کا اضمحلال جسمانی قوتوں کو متاثر بھی کیے ہو مگر ہمیں عزم وارادہ کے قدموں پر کھڑا ہو جانا چاہیے اور وہ کرنا چاہیے جو جوانمردانہ ہمت تقاضا ہے۔

اُدھر شام میں اشتعال انگیزی مسلسل جاری رہی۔ جناب عثمان کا خون بھرا کرتا اور اُن کی زوجہ نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں منبر پر آویزاں اور اُس کے سامنے گریہ وزاری۔ یہ سلسلہ ایک سال تک برابر جاری رہا۔ بہت سے اہل شام نے قسم کھائی کہ وہ عورتوں کے قریب نجائینگے۔ سوا غسل واجب کے کسی دن نہائیں گے نہیں اور بچھونے پر سوئیں گے نہیں جب تک اُن آدمیوں کو جو قتل عثمان میں شریک تھے قتل نہ کرلیں گے (۱) اس طرح معاویہ نے پورے شام کو حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کے خلاف برانگیختہ کردیا۔ مگر آپ نے اپنی جانب سے اصلاح کی کوشش جاری رکھی، چنانچہ اسی کے لیے آپ نے جریر بن عبداللہ بجلی کو دمشق بھیجا، مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا آخر کو صفین کی جنگ کے لیے فوجیں میدان میں آگئیں۔ اب بھی آپ نے فہمائش اور نصیحت کا سلسلہ موقوف نہیں کیا۔

بشیر بن عمرو بن محض انصاری، سعید بن قیس ہمدانی اور شیث بن ربعی تمیمی ان تین آدمیوں کو معاویہ کے پاس روانہ فرمایا کہ وہ جاکر اتحاد و اتفاق اور اطاعت

---

(۱) طبری ج ۵ صـ ۲۳۵

واجتماع کی طرف دعوت دیں۔ مگر اس امن پسندانہ پیش قدمی کا جواب یہ ملا کہ پلٹ جاؤ میرے پاس سے کیونکہ میرے تمہارے درمیان بس تلوار سے فیصلہ ہوگا (۱) کہاں تو حاکم شام کے یہ جنگجویانہ انداز اور کہاں حضرت علیؑ کی وہ گفتگو جو آپ نے نمائندگان شام حبیب بن مسلم فہری، شرجیل بن سمط اور معن بن یزید بن اخنس کے سامنے فرمائی تھی جس میں آپ نے کہا تھا "میں تم لوگوں کو کتاب خدا اور سنت رسول، باطل کو پامال کرنے اور حق کو زندہ کرنے کی جانب دعوت دیتا ہوں" (۲) لیکن آپ کی یہ دعوت مسترد کر دی گئی اور بالآخر مسلمانوں کا خون بے دریغ بہایا جانے لگا۔

اس جنگ کے آغاز، اثناء اور انجام میں بہت سے جاذب توجہ امور پیش آتے رہے۔ پہلے یہ کہ اس جنگ میں بھی حضرت علیؑ نے اپنی فوج کو ہدایت کر دی کہ جب تک دشمن ابتداء نہ کرے تم جنگ نہ کرنا (۳) آپ نے ان تمام معرکوں میں جو نام نہاد مسلمانوں کے ساتھ پیش آئے ہیں برابر اپنی فوج کو یہ ہدایت فرمائی کہ اُس وقت تک جنگ نہ چھیڑنا جب تک کہ وہ ابتداء نہ کریں۔ اس لیے کہ تمہاری حجت بحمد اللہ حقانیت کے لحاظ سے تو تمام ہے ہی۔ اب یہ تمہارا جنگ میں ابتداء نہ کرنا اور اُدھر سے ابتدا ہونا اُن کے مقابلہ میں فریضۂ اتمام حجت کا باعث ہو جائیگا اور جب لڑائی چھڑ جائے اور پھر دشمن کو شکست ہو تو کسی بھاگتے ہوئے کا پیچھا نہ کرنا، کسی زخمی پر ہاتھ اٹھانا، کسی عورت کی بے حرمتی نہ کرنا، کسی مقتول کے اعضاء قطع نہ کرنا، خیام میں بلا اجازت داخل نہ ہونا، اُن کے مال و اسباب کو لوٹنا نہ اور دشمنوں کی عورتیں تمہیں اور تمہارے سرداروں کو گالیاں بھی دیں تو انھیں کوئی ایذا نہ پہونچانا (۴)

---

(۱) طبری ج ۵ ص ۲۴۲ (۲) طبری ج ۶ ص ۷ (۳) طبری ج ۵ ص ۲۳۸ (۴) طبری ج ۶ ص ۶

اس کے علاوہ یہ بھی ایک واقعہ سامنے آیا کہ معاویہ کے مقدمۃ الجیش ابوالاعور سلمی نے نہر فرات پر قبضہ کر لیا اور حضرت علیؑ کے لشکر پر پانی بند کر دیا۔ مجبوراً آپ نے پانی کے لیے جنگ کا حکم دیا۔ آپ کے لشکر نے ابوالاعور سلمی کی فوج سے گھاٹ چھین لیا اور یہ ارادہ کیا کہ اب دشمن کی فوج پر اسی طرح پانی بند کر دیا جائے جیسے اُس نے ہم پر بند کیا تھا۔ مگر حضرت علیؑ بن ابی طالب نے اس کو گوارا نہ فرمایا۔ آپ نے کہا کہ وہ اُن کا فعل تھا مگر تم اُنھیں پانی سے نہ روکو۔ اطمینان کے ساتھ سیراب ہونے دو۔

اس سے یہ سبق دیا جا رہا تھا کہ ہماری مخالف جماعت انسانیت اور اخلاق میں کتنی ہی پست ہو جائے مگر ہم کو ہمیشہ بلند ظرفی سے کام لینا چاہیے اور اُس کے کمینہ طرز عمل کا معاوضہ اُس کے مثل سے نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیں انسانیت کی بلندی کا تحفظ کرنا ضروری ہے۔

جنگ صفین میں حضرت علی بن ابیطالبؑ کو مسلمانوں کی خونریزی سے بڑی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ آپ نے پکار کر امیر شام سے کہا کہ اس سے کیا حاصل ہے کہ عام مسلمانوں کا خون فیاضی کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ بس تم نکل آؤ میدان میں اور ہمیں جاؤ اور اس جنگ کا فیصلہ ہو جائے (۱) مگر معاویہ نے اس خطرہ کو اپنی ذات کے لیے مول نہ لیا۔ وہ دوسروں کے گلے کٹواتے رہے اور خود کبھی مقابلے کے لیے میدان میں نہیں آئے۔ برخلاف اس کے حضرت علیؑ جان کو جان نہ سمجھتے ہوئے برابر مجاہدین کی صفوں کے آگے آگے تھے اس لیے کہ اُن کا ضمیر مطمئن تھا۔ وہ شہادت کے مشتاق تھے اُن کا تو قول تھا کہ میں موت کے ساتھ اس سے زیادہ مانوس ہوں جتنا بچہ آغوشِ مادر سے مانوس ہوتا ہے۔ بیشک وہ اُس

(۱) طبری ج ۶ ص ۲

موت کو ناپسند کرتے تھے جو بزدلی کے ساتھ بستر راحت پر ہو چنانچہ اصحاب سے فرماتے تھے کہ یاد رکھو اگر تم قتل نہ ہو تو اپنی موت مرد گے اور قسم اُس خدا کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ ہزار ضربتیں تلوار کی جو سر پر پڑیں آسان ہیں فرش خواب پر ایڑیاں رگڑ کر مرنے سے (۱) چنانچہ اُن کا طرز عمل ہمیشہ اسی کا مظہر رہا تھا۔ ابتدائے شباب میں جب ہر انسان کو زندگی انتہائی عزیز ہوتی ہے۔ رسول کا ارشاد کہ علیؑ میرے بستر پر سو رہو اور علیؑ کا بسر و چشم آمادہ ہو جانا اس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ معلوم تھا کہ خون کے پیاسے دشمن کھنچی ہوئی تلواریں لیے قتل پر آمادہ ہیں مگر ہاں راہ حق میں موت تو خوشگوار سمجھی جاتی تھی۔

اسی جنگ صفین میں ایک موقع پر امام حسنؑ سے فرمایا:۔

تمہارے باپ کو کوئی پروا نہیں ہے کہ موت اُس پہ گر رہی ہے یا وہ خود موت کے اوپر گر رہا ہے۔ (۲) پھر ایسے باپ کے جو بیٹے ہوں اُنکے سامنے یہ سیرت ہو اور جن کے کانوں میں یہ باتیں پڑ رہی ہوں انہیں موت کا اندیشہ کیونکر رہ سکتا ہے۔ چنانچہ حسینؑ اپنے بھائی حسنؑ اور محمد بن حنفیہ کے ساتھ اُس جنگ میں برابر حصہ لے رہے تھے اور سخت سے سخت موقعوں پر ثبات قدم کے جوہر دکھلا رہے تھے۔ تاریخ نے ایک ایسے موقع کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہ جب علی بن ابی طالبؑ کے لشکر کا بڑا حصہ شکست کھا چکا تھا لکھا ہے کہ اُس وقت نہیں رہ گئے تھے علیؑ کے پاس مگر بڑے فرض شناس اور یہ جگرا افراد اُس وقت آپ نے اپنے گھوڑے کا رخ میسرہ کی جانب پھیرا کہ جدہر قبیلۂ ربیعہ کے لوگ اب تک دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ راوی جس کا نام زید بن وہب

---

(۱) ارشاد صفحہ ۱۲۲ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۱۲

جہنی ہے بیان کرتا ہے کہ میں دیکھ رہا تھا علیؑ کو کہ آپ ربیعہ کی فوج کی طرف جا رہے تھے اور آپ کے فرزند حسنؑ و حسینؑ اور محمد حنفیہ آپ کے ساتھ ساتھ تھے اور تیر علیؑ کے کان اور شانوں کے پاس سے گزر رہے تھے مگر آپ کے فرزند بڑھ بڑھ کر سپر بن جاتے تھے اور اپنے باپ کی حفاظت کرتے تھے (۱) کیا یہ جذبۂ فداکاری اور قربانی کا معمولی مظاہرہ ہے جو علیؑ کی آنکھوں کے سامنے ان صاحبزادوں سے ظاہر ہو رہا تھا؟ کیا اس کے بعد کبھی یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ علیؑ کے یہ بہادر بیٹے موت کے ڈر سے کسی فرض میں کوتاہی کریں یا کسی باطل طاقت کے سامنے جان کے خوف سے سر جھکائیں؟

اسی صفین کے میدان میں ایک اور منظر کا بھی مشاہدہ ہوا۔ وہ یہ کہ عین جنگ کی حالت میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی نگاہ آفتاب پر تھی۔ ابن عباس نے سبب دریافت کیا حضرت نے فرمایا کہ دیکھتا ہوں نماز ظہر کا وقت آیا یا نہیں۔ ابن عباس نے عرض کیا یہ نماز کا موقع ہے؟! جنگ تو ہو رہی ہے! آپ نے فرمایا کہ اور یہ ہماری جنگ کس بات کے لیے ہے؟ اسی نماز کے لئے تو جنگ کر رہے ہیں۔

یہ عبادت الٰہی کے فرض کی اہمیت کا ایک بے مثل عملی درس تھا۔ کہ تیروں کی بارش ہو یا آگ برس رہی ہو جب نماز کا وقت آ لے تو لازم ہے کہ اس فرض کے ادا کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں۔

جنگ کو بہت طول ہو چکا تھا۔ آخر ایک دن حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ نے طے کر لیا کہ اب مکمل فتح حاصل کرنے کے بعد ہی جنگ کو موقوف کیا جائے گا۔ ایک

---

(۱) الاخبار الطوال صہ ۱۸۴ - طبری ج ۶ ص ۱۰

دن اور رات مسلسل ہنگامۂ دار و گیر برپا رہا جس کے نتیجہ میں فوج شام کے قدم اکھڑنے لگے۔ اور معاویہ کو شکست کا یقین ہو گیا مگر عمر بن العاص نے اس دن کے لیے ایک چال اٹھا رکھی تھی۔ وہ یہ کہ فوراً قرآن نیزوں پر بلند کر دیے گئے اور ندا دی گئی کہ بھائیو! یہ کتاب خدا ہی ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ شام والے سب ہلاک ہو گئے، تو شام کے حدود کی کون حفاظت کریگا اور عراق والے ہلاک ہو گئے تو عراق کے حدود کا کون نگہبان ہوگا (۱) حالانکہ آغاز جنگ سے پہلے ہی حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ قرآن کے فیصلہ کی دعوت دے چکے تھے مگر اس وقت کامیابی کے تخیلات کی بنا پر علیؑ کی دعوت کو مسترد کر دیا گیا۔ اب شکست کے آخری انجام سے بچنے کیلئے قرآن درمیان میں لایا جا رہا تھا۔ حضرت علیؑ نے اپنی فوج والوں کو اس مکاری اور چالبازی سے آگاہ کیا اور صاف فرمایا کہ یہ لوگ نہ اہل دین ہیں نہ اہل قرآن (۲) مگر آپ کی فوج کے بہت سے لوگ آپ سے منحرف ہو کر اس بات پر مصر ہو گئے کہ اب تلوار روک لیجئے۔ نہیں تو ہمارے آپ کے درمیان تلوار چلے گی۔ یہ بڑی کشمکش کا موقع تھا۔ دشمن سے مقابلہ کے ہنگام میں ایسی صورت پیدا ہو جانا کہ خود اپنی فوج میں تلوار چلنے لگے ایک انتہائی ہولناک صورت حال تھی۔ جسے حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ گوارا نہ کر سکتے تھے۔ مجبوراً آپ نے جنگ کے التواء کا حکم دیا اور طے پایا کہ ایک حکم اہل شام کی طرف سے نامزد ہو اور ایک اہل کوفہ کی طرف سے۔ مگر اہل شام کی طرف سے عمر بن عاص ایسا امیر شام کا نفس ناطقہ مقرر کیا گیا اور جب حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ نے چاہا کہ مالک اشتر یا عبداللہ بن عباس یا کسی دوسرے ایسے ہی اپنے مخلص اور خیر خواہ کو اپنی جانب سے مقرر کریں تو وہی اپنی فوج والے

(۱) طبری ج ۶ صـ ۲۶ (۲) طبری ج ۶ صـ ۲۷ ارشاد صـ ۱۴۲

پھر بگڑ گئے کہ یہ لوگ تو بالکل اس جنگ کے ذمہ دار ہیں ہم اُن کو کیونکر مقرر کریں! آخر سب نے ابو موسیٰ اشعری کو جو پہلے ہی حضرت علیؑ کی موافقت سے گریز کر چکے تھے اپنی جانب سے مقرر کیا۔ مصلحت وقت یہی تھی کیونکہ اپنی جماعت میں خونریزی کا انسداد اسی پر موقوف تھا کہ حضرت با دل ناخواستہ اس کو برداشت کر لیں یہاں تک کہ نتیجہ سب کی آنکھوں کے سامنے آجائے۔ تاہم آپ نے جو صلحنامہ لکھوایا اُس کا مضمون حسب ذیل تھا:۔

"علی بن ابی طالب نے ذمہ لیتے ہیں اہل کوفہ اور تمام اُن مسلمانوں کا جو اُن کے ساتھ ہیں اور معاویہ نے ذمہ داری لی ہے اہل شام اور تمام اپنے طرفداروں کی کہ ہم اللہ اور اُس کی کتاب کے فیصلہ پر دار و مدار رکھتے ہیں اور سوائے کتاب خدا کے کوئی شے ہم میں فیصلہ کن نہیں ہوگی اور کتاب خدا ہمارے سامنے رہے گی شروع سے لے کر آخر تک ہم زندہ کرینگے اُسی بات کو جسے کتاب خدا زندہ کرے، اور مردہ کریں گے اُس کو جسے کتاب خدا مردہ کرے لہٰذا حکمین کو لازم ہوگا کہ وہ کتاب خدا پر نظر کریں اور جو کچھ اس میں ملے اُس پر عمل کریں اور اگر کتاب خدا میں انھیں کوئی ہدایت نظر نہ آئے۔ تو رسولِ خدا کی سنت بے وجہ اختلافی پر عمل کیا جائیگا۔"

اس معاہدہ کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ حکمین کو اپنی ذاتی رائے سے جو کسی سیاست دنیوی کا تقاضا ہو فیصلہ کرنے کا حق نہیں دیا گیا تھا چنانچہ حضرت علیؑ نے خود حکمین سے جو فیصلہ کے لیے مقرر ہوئے تھے فرمایا تھا کہ "تم اس شرط سے حکم ہو کہ کتاب اللہ کے رو سے فیصلہ کرنا اور اگر تمہیں کتاب خدا کی رو سے فیصلہ نہ کرنا ہو تو تم نہیں، اپنے کو حکم نہیں سمجھنا چاہیئے (۲) دوسرے اشخاص سے بھی یہ بتا دیا گیا کہ حکمین پر یہ شرط لگا دی گئی ہے کہ وہ قرآن کی بنا پر فیصلہ کریں اور اپنی ذاتی رائے کو کام میں

(۱) طبری ج ۶ صـ ۲۸ (۲) اسد الغابہ ج ۳ صـ ۲۴۶

ٹلائیں (۱)

یہ اقرار نامہ ۱۳ ار صفر ۳۷ھ کو پایۂ تکمیل تک پہونچا۔

باوجود حضرت علی بن ابی طالبؑ کی اس دور اندیشی اور احتیاط کے پھر بھی ساتھ والے مفسد آدمی فتنہ و فساد برپا کرنے سے باز نہ آئے اور ابھی اقرار نامہ لکھا ہی گیا تھا کہ اسی وقت حضرت علیؑ کی فوج میں یہ آواز بلند ہو گئی کہ انسانوں کو حکم بنانا درست نہیں لا حکم الا للہ یعنی حکم ہونا اللہ سے مخصوص ہے۔ اس آواز کا سب سے پہلا بلند کرنے والا قبیلۂ بنی تمیم کا ایک شخص عروۃ بن ادیہ تھا (۲) یہ جماعت خوارج کا سنگ بنیاد تھا۔ ان لوگوں نے حضرت علیؑ سے اصرار کیا کہ چلیئے معاویہ سے جنگ کیجئے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ نے وہی جواب دیا جو رسولِ خدا صلح حدیبیہ کے بعد دیتے تھے۔

وہ ہم نے نوشتہ دے دیا ہے۔ شرائط طے کیے ہیں۔ عہد و میثاق کر لیا ہے اب اس کی مخالفت ممکن نہیں ہے۔ قرآن میں حکم ہوا ہے کہ وفا کرو عہد و پیمان کے ساتھ اور قسم کھلانے کے بعد اسکی مخالفت نہ کرو جبکہ تم نے اللہ کو اس کا ضامن بنا دیا ہے اور یقیناً اللہ تمہارے افعال و اعمال پر مطلع ہے"

آپ نے اس سختی کے ساتھ معاہدہ پر قیام کیا مگر حکمین نے خود شروط مقررہ کی پابندی نہیں کی اور کتاب خدا و سنتِ رسول سے کوئی سروکار ہی نہیں رکھا۔ چونکہ ابو موسیٰ سادہ لوح آدمی تھے اور جناب امیرؑ سے کوئی خلوص و محبت بھی نہیں رکھتے تھے، انہیں عمرو بن العاص نے اپنی سیاست کا شکار بنا لیا، اس طرح کہ جب وقت مقرر پر دومۃ الجندل میں جو کوفہ و شام کے لحاظ سے بالکل وسط میں واقع تھا اور اس لیئے فیصلہ کے لیے وہیں اجتماع طے پایا تھا یہ لوگ یکجا ہوئے، روز اخر

---

(۱) طبری ج ۶ صـ۳۲ ارشاد صـ۱۴۴ (۲) طبری ج ۶ صـ۳۰-۳۱

ملاقات اور تبادلۂ خیالات کا سلسلہ قائم ہو گیا تو عمرو عاص نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب گفتگو ہو تو ابو موسیٰ اشعری کو اپنے اوپر مقدم قرار دیں اور کہیں کہ آپ بزرگ ہیں، رسول خدا کی صحابیت کا مجھ سے زیادہ شرف رکھتے ہیں، آپ پہلے تقریر کیجئے پھر میں جو کہنا ہے کہوں گا۔ اس طرح عمرو عاص نے ابو موسیٰ اشعری پر اپنے خلوص و عقیدت کا اثر جمایا اور آئندہ کے لئے جو منصوبہ سوچا تھا اُس کی تمہید قائم کر دی۔

پھر زیر بحث مسئلہ کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا اور ابو موسیٰ کو یہ پٹی پڑھائی کہ ہم دونوں فریق یعنی حضرت علیؑ و معاویہ کو ایک ساتھ معزول کر دیں اور پھر مسلمانوں کو اختیار دیں کہ وہ از سر نو جس کو چاہیں منتخب کر لیں۔ ابو موسیٰ اس فریب میں آ گئے اور یہ خیال خود متفقہ حیثیت سے یہی طے کر لیا۔

جب فیصلہ کا وقت آیا اور طرفین کے آدمی فیصلہ سننے کو جمع ہوئے تو عمرو عاص نے حسب عادت ابو موسیٰ اشعری سے کہا "بسم اللہ۔ آپ فرمائیے جو کچھ فرمانا ہے۔" اُن کی تو عادت پڑی ہی تھی کہ ہمیشہ گفتگو میں پہل وہ کریں۔ وہ بلا عذر تقریر کے لیے آمادہ ہو گئے۔ عبد اللہ بن عباسؓ جو سمجھ دار آدمی تھے اُنہوں نے متنبہ بھی کیا کہ دیکھو عمرو بن عاص کہیں کوئی چوٹ نہ دیدے۔ پہلے اُسے تقریر کر لینے دو پھر تم تقریر کرنا مگر ابو موسیٰ نے کہا نہیں ہم نے باہم متفقہ طور پر ایک چیز طے کر لی ہے، چنانچہ کھڑے ہو گئے اور حمد و ثنا کے بعد کہنے لگے کہ "ہم نے انتہائی غور و خوض کے بعد ایسی بہترین صورت طے کی ہے۔ جس سے افتراق و اختلاف کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم دونوں علی اور معاویہ دونوں کو معزول کر دیں اور خلافت کو از سر نو مسلمانوں کے حوالہ کر دیں، کہ وہ جسے چاہیں منتخب کر لیں" وہ یہ کہکر جونہی بیٹھے عمرو عاص نے کھڑے ہو کر کہا کہ "حضرات! آپ لوگوں نے ابو موسیٰؓ کی تقریر سنی وہ علیؑ کے نمائندہ ہیں اور انہوں نے علیؑ کو معزول کر دیا ہے۔ میں معاویہ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے

علیؓ کے معزول کرنے میں اُن سے متفق ہوں مگر معاویہ کو میں برقرار کرتا ہوں۔"

یہ سننا تھا کہ ابو موسیٰ چیخ اُٹھے۔

"ارے یہ تو نے کیا کیا۔ خدا تجھ سے سمجھے تو نے غداری کی۔ بے ایمانی کی۔ تو کتے کی طرح ہے کہ چاہے اُس پہ حملہ کر دیا اُسے اُسکے حال پر چھوڑ دو وہ بھونکنے سے باز نہ آئے گا۔"

عمرو عاص نے جواب دیا۔

"تمہاری مثال گدھے کی سی ہے جس کی پشت پر کتابیں لاد دی گئی ہیں"

مجمع میں سے کوئی ابو موسیٰ کی طرف جھپٹ کر حملہ آور ہوا اور کوئی عمرو عاص پر — غرض اس ہڑبونگ اور لوچ تہذیب و اخلاق کے منظروں کے ساتھ یہ اجتماع منتشر ہو گیا۔(۱) — ظاہر ہے کہ اس طرح کی مکارانہ دھاندلی کو کسی باضابطہ فیصلہ کا درجہ دیا ہی نہیں جا سکتا تھا چنانچہ اُسے کسی نے بھی صحیح تسلیم نہ کیا اور اختلاف جوں کا توں قائم رہ گیا لیکن اس نے حضرت علیؓ کی جماعت کے انتشار میں کچھ اور زیادتی ہو گئی۔

اُدھر خوارج نے اپنی جماعت کو منظم کر کے مقابلہ کی تیاری کی جس سے ۳۸ھ میں جنگ نہروان کی صورت پیش آئی۔

واقعات کے اس طویل سلسلہ سے بڑے نتائج برآمد ہوتے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ ایک قائد کو اپنے ساتھ والوں کے ہاتھوں جبکہ وہ خالص و مخلص یکدل اور ہم آہنگ نہوں کتنی کشمکش اور روحانی تکلیف کا سامنا ہوتا ہے اور اس سے مقصد کو کس درجہ نقصان پہونچ جاتا ہے۔

نہروان کے بعد بھی یہ فتنے اور شورشیں بالکل ختم نہیں ہوئے۔ ایک طرف خوارج نہروان کے ہم خیال افراد جو جنگ میں نہیں گئے تھے اور شہروں

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۴۰

کے اندر مقیم تھے حضرت امیرؑ کے خلاف فضا میں انتشار پیدا کرتے رہتے تھے اور دوسری طرف امیر شام معاویہ جنہوں نے اہل کوفہ کے افتراق سے فائدہ اٹھا کر اپنی قوت کو زیادہ منظم کر لیا تھا برابر اطراف مملکت میں اپنی فوجیں بھیجکر بدامنی کا سلسلہ قائم کیے ہوئے تھے۔ جس میں خفیہ اور علانیہ ہر قسم کے اقدامات شامل تھے مثلاً مصر میں جناب امیرؑ کے بہت بڑے معاون مالک اشتر کا زہر دلوا کر خاتمہ کیا (۱) اس کے بعد محمد بن ابی بکر گورنر بنا کر بھیجے گئے تو عمرو بن عاص نے خطوط لکھ کر خود مصر کے بعض عمائد سے سازباز کی اور پھر اپنی فوج لیکر حملہ کر دیا — اُدھر سے شام کی فوج اور اِدھر سے خود مصر والوں کا ایک مسلح لشکر۔ محمد بن ابی بکر مع اپنی جماعت کے جنگی کو دباٹوں (۲) میں آ گئے آخر اُن کی فوج نے شکست کھائی اور خود انتہائی بیدردی کے ساتھ قتل کیے گئے بلکہ لاش کو بھی آگ میں جلا دیا گیا (۳) محمد ابن ابی بکر کے بعد مصر میں معاویہ کا تسلط قائم ہو گیا۔ اس سے ان کی ہمت اور بڑھ گئی چنانچہ ۳۹ھ میں نعمان بن بشیر کی سرکردگی میں دو ہزار کی فوج نے عین التمر پر حملہ کیا جو ناکامی کے ساتھ پسپا ہوا (۴) سفیان بن عوف غامدی نے چھ ہزار کی فوج کے ساتھ انبار حملہ کیا اور اشرس بن حسان بکری کو جو جناب امیرؑ کی طرف سے وہاں مقرر تھے اُن کے تیس ہمراہیوں کے سمیت قتل کر دیا اور تمام مال و اسباب لوٹ کر واپس چلا گیا (۵) عبداللہ بن مسعدہ فزاری نے سترہ سو آدمیوں کے ساتھ تیماء پر حملہ کیا۔ حضرت علیؑ نے مسیّب بن نجبہ فزاری کو اُس کے مقابلہ کے لیے بھیجا جنہوں نے جنگ کر کے اُس کو شکست دی اور اس نے شام کی جانب فرار کیا (۶) اسی صورت سے ضحاک بن

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۵۴ (۲) طبری ج ۶ ص ۵۸ (۳) طبری ج ۶ ص ۶۰ (۴) طبری ج ۶ ص ۷۷
(۵) طبری ج ۶ ص ۷۸ (۶) طبری ج ۶ ص ۸۰۔

قیس کو تین ہزار فوج کے ساتھ بھیجا گیا جو لوٹ مار کرتی ہوئی قادسیہ کے حدود[1]
تک پہونچ گئی اور حجر بن عدی فوج لیکر گئے تو اُس نے فرار اختیار کیا معلوم ہوتا
ہے کہ صفین کی جنگ کے بعد یہ محسوس ہو گیا تھا کہ حضرت علیؑ سے کھلے میدان میں
مقابلہ کر کے کامیابی حاصل کر لینا ممکن نہیں ہے اسلیے یہ گوریلا جنگ کا طریقہ اختیار
کر لیا گیا تھا جس سے اسلامی مملکت میں ایک مستقل خلفشار قائم رکھنے کا انتظام کیا
گیا تھا۔ اس سلسلہ کا سب سے اندوہناک سانحہ بسر بن ابی ارطاۃ کا تین ہزار کی فوج
کے ساتھ حجاز پر حملہ تھا جس نے مدینہ اور مکہ والوں سے بجبر بیعت لینے کے بعد یمن کا
رخ کیا اور وہاں کئی آدمیوں کو قتل کیا،
عبید اللہ بن عباس کا مکان لوٹا اور اُن کے دو کمسن بچوں کو ذبح کرا دیا۔ پھر جب
حضرت علیؑ نے مقابلہ کے لئے لشکر بھیجا تو وہ مع اپنی فوج کے فرار کر گیا[2]
یہ بزدلی کا طریقہ جنگ حضرت علیؑ کے لیے انتہائی تکلیف کا باعث تھا۔ مجبوراً
پھر آپ نے تہیہ فرمایا تھا کہ دمشق پر فوج کشی کر کے ہمیشہ کے لیے اس قصہ کو ختم کیا جائے
جس کے لیے آپ نے ایک نہایت پر زور خطبہ پڑھ کر مسلمانوں کو آمادہ کر لیا مگر اس
کے بعد ایک ہفتہ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ مسجد میں عین حالت نماز میں ۱۹ ماہ رمضان[3]
کو آپ کے سر مبارک پر ابن ملجم مرادی نے زہر میں بجھی ہوئی تلوار لگائی جس کے اثر
سے ۲۱ ماہ رمضان سنہ ۴۰ھ کو آپ نے دنیا سے رحلت فرمائی۔
اُس وقت حسینؑ بن علیؑ چھتیس ۳۶ برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اس طولانی دور
میں حسینؑ نے اپنے والد بزرگوار علیؑ ابن ابی طالبؑ سے کیا کچھ دیکھا، کیا کچھ سنا
اور کتنا اثر لیا؟
مسلم الثبوت شیعی معتقدات سے قطع نظر کرنے کے بعد عام تاریخی حالات اور

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۷۹ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۸۱ (۳) طبری ج ۶ صفحہ ۸۳-۸۵

ظاہری اسباب کے ماتحت یہ اہم تجربات اور گرانقدر تعلیمات جو ایک ربع صدی سے زیادہ تک حضرت امام حسینؑ کو حاصل ہوتے رہے ایک انسان کے بلندی اخلاق وصفات اور پختہ کاری کے قطعی ضامن اور ذمہ دار ہیں۔

ساتواں باب

بنی امیہ کا اقتدار اور اُن کی سیاسی روش

بنی امیہ اور اس طرح کے اکثر لوگ جو دبدبہ اور شکوہ سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے اُن کی نفسیاتی کیفیت وہی تھی جو ہر دبی ہوئی اور شکست خوردہ قوم کی ہوتی ہے یعنی نفرت، دشمنی، غصہ، جذبۂ انتقام اور اسکے ساتھ ساتھ درجس کے نتیجہ میں وہ کھل کر اپنی عداوت کا اظہار تو نہ کر سکتے تھے مگر برابر موقع کے منتظر تھے کہ کس طرح ہم اسلام کو نقصان پہونچادیں اور اگر اُسکو ختم نہ کر سکیں تو کم از کم اُن خصوصیات امتیازی کو تبدیل کردیں جو اُس نے قائم کیے ہیں اور جن سے ہمارے اقتدار کو صدمہ پہونچا ہے اور اسلام کے پردے میں ہی سہی، اُن حدود و امتیازات کو قائم کردیں جو اسلام کے پہلے عرب میں قائم تھے۔ اُنہوں نے اس کی تیاری تو رسول کے زمانہ ہی سے شروع کر دی تھی مگر پیغمبر اسلام کی زندگی میں اُن کے اس مقصد کی تکمیل مشکل تھی۔ پیغمبر نے اُن کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے واسطے ہر طرح کوشش کی مگر اُن کے جذبات وہی رہے اور ایک ذرا اسلام پر کوئی مصیبت پڑتی تو اُن کے چہرے خوشی سے کھل جاتے اور کبھی جذبات دلی زبان پر بھی آجاتے تھے چنانچہ جنگ حنین میں جب معدودے چند کے سوا باقی تمام مسلمان میدان جنگ سے رو بفرار ہوئے تو ابو سفیان نے کہا بس اب یہ سمندر تک بھاگتے چلے جائیں گے اور ایک نو مسلم نے کہا بس جادو ختم ہو گیا (۱)

---

(۱) طبری ج ۳ ص ۱۲۸

وفات رسول کے بعد ابوسفیان نے اسلام پر حملہ کرنے کی پہلی کوشش وہ کی جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے کہ حضرت علیؑ بن ابی طالب کے پاس آکر آپ کو تلوار اٹھانے پر آمادہ کرنا چاہا۔

یقیناً اس موقع پر اگر کوئی جذباتی انسان ہوتا تو ابوسفیان کا یہ حربہ اتنا کارگر ثابت ہوتا کہ اسلام کی بنیاد ہل جاتی۔ مسلمان اُسی وقت خانہ جنگی میں مبتلا ہو جاتے اور اسلام کا شیرازہ درہم و برہم ہو جاتا مگر وہ نور الہٰی سے دیکھنے والے نباض فطرت علیؑ تھے جنھوں نے مخاطب کے مقصد کو تاڑ لیا اور باوجودیکہ خلافت کا مستحق وہ صرف اپنے کو سمجھتے تھے، پھر بھی ابوسفیان کو ڈانٹ کر جواب دیا کہ تم ہمیشہ اسلام اور اہل اسلام کے دشمن رہے ہو۔

جب ادھر سے مایوسی ہوئی تب ابوسفیان نے چولا بدلا، اُدھر جا کر مل گئے اور اس روش میں کامیابی بھی ہو گئی اس طرح کہ ۱۳ھ ہجری کے آغاز میں خلیفۂ اوّل ابوبکر نے ملک شام پر فوج کشی کا بندوبست کیا اور سات ہزار کے لشکر کے ساتھ یزید بن ابی سفیان کو روانہ کیا (۱) فوج کے دوسرے حصہ پر ابو عبیدہ جراح کو مقرر کیا گیا اور یزید بن ابی سفیان کے ساتھ سہیل بن عمرو اور دیگر حصہ شیوخ قریش کو مشیر کار بنایا گیا اور اس کے بعد جب کچھ اور فوج جمع ہو گئی تو اُس پر معاویہ ابن ابی سفیان کو افسر مقرر کر کے یزید کے پاس روانہ کیا گیا (۲)

مجموعاً یہ ستائیس ہزار کی جمعیت ہو گئی۔ ان لوگوں کی امداد کے لیے خالد بن الولید کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی فوج لے کر عراق سے پہونچ جائیں چنانچہ ۹ ہزار فوج لیکر وہ پہونچے اس طرح سے مسلمانوں کا چھتیس ہزار کا لشکر ہو گیا۔ اُسی وقت اُن امراء سے ہر ایک کو ایک جگہ کی حکومت کے لئے نامزد بھی کر دیا گیا تھا چنانچہ ابو عبیدہ جراح

---

(۱) طبری ج ۴ ص ۲ (۲) طبری ج ۴ ص ۳

کو حمص۔ شرجبیل بن حسنہ کو شرق اردن، عمرو بن عاص اور علقمہ بن مجزز کو فلسطین اور یزید بن ابی سفیان کو دمشق کا حاکم قرار دیا گیا (۱)

اس فوج میں خود ابی سفیان فوج کے سرداروں کا دل بہلانے کے لیے قصہ گوئی کی خدمت انجام دیتے تھے (۲)

ابو سفیان کی اولاد میں سے یزید اور معاویہ کے علاوہ اُن کی ایک بہن جویریہ بنت ابی سفیان بھی اپنے شوہر کے ساتھ موجود تھیں اور اُنہوں نے جنگ میں شرکت بھی کی (۳)

اس دوران میں خلیفۂ اوّل کا انتقال ہوگیا لیکن ملک شام میں لڑائیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ رجب ۱۴ھ میں شہر دمشق فتح ہوا اور حسب قرارداد سابق یزید بن ابی سفیان وہاں کے حاکم ہوئے۔ (۴)

اس کے بعد تدریجاً شام کے دوسرے شہر بھی فتح ہوئے۔

۱۸ھ کے طاعون میں ابو عبیدہ اور یزید بن ابی سفیان دونوں کا انتقال ہوگیا (۵)

ابو سفیان اس وقت مدینہ میں تھے۔ اُن کو بیٹے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی کہ شام کے ملک کی چنانچہ خلیفۂ دوم نے جب اُنھیں بلا کر یزید کے مرنے کی اطلاع دی تو اُنھوں نے فوراً یہ سوال کیا کہ آپ نے اُس کی جگہ پر کسے مقرر کیا۔ جب معلوم ہوا کہ معاویہ کو وہاں کا حاکم بنایا گیا تو وہ خوش ہوگئے (۶)

اب معاویہ بن ابی سفیان کو دمشق اور اُس کے مضافات اور شرجبیل بن حسنہ کو شرق اردن اور اُس کے مضافات کی حکومت ملی (۷) اس کے کچھ

---

(۱) طبری ج ۴ ص ۳۲ (۲) طبری ج ۴ ص ۳۴ (۳) طبری ج ۴ ص ۳۶ (۴) طبری ج ۴ ص ۵۵ و ۵۹ (۵) طبری ج ۴ ص ۲۰۲ (۶) طبری ج ۵ ص ۶۹ (۷) طبری ج ۴ ص ۲۰۲

عرصہ کے بعد شرق اردن کی حکومت بھی معاویہ ہی کو مل گئی (۱)

اس دور میں ابوسفیان وغیرہ نے خوب ہی فوائد حاصل کیے یہاں تک کہ ہندہ مادر معاویہ جنھیں ابوسفیان نے اب طلاق دیدیا تھا اُن کو ہر گز ہی حکومت کے بیت المال سے چار ہزار درہم کی رقم قرض دی گئی جس سے انھوں نے تجارت شروع کی اور نفع خطیر حاصل کیا اور ابوسفیان دمشق گئے تو انھیں ایک دفعہ میں سَو اشرفیاں بطور پرورش حاصل ہوئیں۔ (۲)

حالانکہ اُن کے جذبات اسلام کے متعلق اب بھی خیر خواہی کے نہ تھے۔ چنانچہ جنگ یرموک میں جبکہ مسلمانوں کا مقابلہ سلطنت روم کے لشکر سے تھا اور معرکۂ کارزار گرم تھا۔ اُس وقت ابوسفیان دُور سے کھڑا ہوا تماشا دیکھ رہا تھا جب رومیوں کو غلبہ حاصل ہوتے نظر آتا تو کہتا تھا! یہ بنی الاصفر یعنی شاباش اے ملک روم کے بہادرو! اور جب مسلمانوں کو ذرا تقویت حاصل ہوتی تھی تو ابوسفیان کی زبان سے حسرت و یاس کے ساتھ یہ شعر نکلتا تھا۔

وبنو الاصفر الملوک ملوک الروم لم یبق منھم مذکور

مطلب یہ تھا کہ ہائے افسوس سلطنت روم کے پُرشوکت بادشاہوں کا نام مٹتے ہوئے نظر آتا ہے۔ عبداللہ بن زبیر نے اس واقعہ کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور اپنے باپ زبیر سے بیان کیا اُس وقت کہ جب مسلمانوں کو کامل طور پر فتح حاصل ہو چکی تھی۔ زبیر نے کہا خدا اسے غارت کرے۔ یہ نفاق سے باز نہ آئے گا کیا ہم اس کے لیے رومیوں سے بہتر نہیں ہیں۔ (۳)

اس کے بعد ۲۳ھ میں جب عثمان خلیفہ ہوئے تو چونکہ وہ خاندان بنی امیہ کی ایک فرد تھے، ابوسفیان وغیرہ سمجھے کہ اب ہماری بن آئی۔ دلی جذبات اتنی

(۱) طبری ج ۵ ص ۶۹ (۲) طبری ج ۵ ص ۳۰ (۳) استیعاب

قوت کے ساتھ ابلے۔ کہ تاب نہ رہی۔

ابوسفیان اُن کے پاس آیا۔ وہ اس وقت بہت بوڑھا تھا اور آنکھوں سے بھی معذور ہو چکا تھا اُس نے کہا بڑی مدت کے انتظار کے بعد اب یہ خلافت تم تک پہونچی ہے۔ اب اس کو گیند کی طرح اپنی مرضی کے مطابق گردش دو اور بنی امیہ کے ذریعہ سے اس کی بنیادوں کو مضبوط کرو۔ اس لیے کہ جو کچھ ہے وہ یہی دنیاوی سلطنت۔ رہ گیا جنت و دوزخ اُس کو میں کچھ سمجھتا نہیں (۱)

چنانچہ ابوسفیان کے خاندان والوں نے اس خلافت سے خوب فائدہ اٹھایا اور کوئی کسر نہیں کی۔ ابوسفیان نے اپنے دنیوی خوابوں کی تعبیر اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ ۳۱ھ تک دمشق اور شرق اردن کے ساتھ ساتھ حمص، قنسرین اور فلسطین بھی معاویہ کے زیر نگین ہو گئے اور وہ بلاشرکت غیرے پورے ملک پر قابض قرار دئیے گئے (۲)

اسی ۳۱ھ میں ابوسفیان بن حرب ۸۸ برس کی عمر میں رہسپارِ عالمِ آخرت ہوئے (۳)

مگر وہ مشورہ جو انہوں نے خلیفۂ سوم کو دیدیا تھا وہی اُن کے بعد ان کی جان جانے کا باعث ہوا چنانچہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے اپنی سب سے پہلی ملاقات میں جو اصلاح حالات کے لیے خلیفۂ ثالث سے کی تھی اُن سے صاف کہہ دیا تھا کہ آپ اپنے قرابتداروں کے ساتھ غیر معمولی مراعاتیں برتتے ہیں۔ اُن کی غلطیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ معاویہ بغیر آپ کی مرضی کے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ عثمانؓ کا حکم ہے۔ آپ کو اس کا علم ہوتا ہے اور پھر بھی آپ معاویہ کو اس پر کوئی تنبیہہ نہیں کرتے (۴)

---

(۱) استیعاب (۲) طبری ج ۵ ص ۶۹ (۳) طبری ج ۵ ص ۷۰ (۴) طبری جلد ۵ ص ۹۷

اب حضرت عثمان کے منہ پر یہ کہا جانے لگا تھا کہ ان کے بعد عالم اسلامی کی خلافت معاویہ کو ملے گی اور اسکی کوئی رد نہ کی جاتی تھی (۱)

غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ جب اُن کا محاصرہ ہوا اور اُنھوں نے معاویہ کو مدد کے لیے لکھا تو معاویہ نے اپنی جگہ سے کوئی جنبش نہیں کی بلکہ نتیجہ کے منتظر ہوگئے (۲) کیونکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ اُن کے بعد خلافت مجھے ملے گی۔ اور عمرو بن عاص تو صاف صاف عثمان کے خلاف اشتعال انگیزی کرتے تھے اور جب قصر حکومت کا محاصرہ ہوگیا تو وہ فلسطین جاکر اپنی کوششوں کے انتظار میں بیٹھ گئے اور ہر آنے والے سے مدینہ کا حال بڑی بیتابی سے دریافت کرتے تھے یہاں تک کہ جب قتل عثمان کی خبر ملی تو کہا کیا کہنا میرا۔ یہ تو میری ہی کوشش کا نتیجہ ہے (۳)

اس کے بعد یہی عمرو بن عاص معاویہ کے دست راست بنے اور بڑے مناصب حاصل کیے انھوں نے خود ایک موقع پر معاویہ سے صاف کہدیا کہ اگر حقانیت سامنے ہوتی تو ہم تمہارا ساتھ ہی کیوں دیتے۔ علی کا ساتھ نہ دیتے جن کے اسلامی خدمات فضیلت اور رسولؐ سے قرابت سب ہی کو معلوم ہے۔ مگر ہمارے پیش نظر تو دنیا ہے۔ اسی لیے تمہارا ساتھ دے رہے ہیں (۴)

آل ابو سفیان نے شام میں حکومت قائم کرنے کے بعد ابتدا ہی سے اپنی سیاسی روش شاہانہ رکھی۔ کوئی سیاح اگر ممالک اسلامیہ کا سفر کر کے اسلامی سادگی اور مساوات کی مثالیں دیکھ چکا ہوتا اور پھر شام جاکر وہاں کے تزک و احتشام کا مشاہدہ کرتا تو وہ حیرت و استعجاب کی ایک دنیا میں چکر لگانے لگتا۔ وہ سادگی جو اسلامی زندگی کا طرۂ امتیاز تھی وہاں نام و نشان کو بھی نہ تھی بلکہ اُس کے بجائے ملوکانہ عظمت و جلالت کے مظاہرات پوری طاقت کے ساتھ نظر آتے تھے۔ دیکھئے

---

(۱) طبری ج ۵ ص ۱۰۱ (۲) طبری ج ۵ ص ۱۱۵ (۳) طبری ج ۵ ص ۱۰۹-۱۱۰ و ۱۱۱ (۴) طبری ج ۵ ص ۲۳۵

والوں نے دیکھا اور پیغمبر اسلام کے جاری کیے ہوئے طرز زندگی سے مانوس بعض صحابہ کو اندیشہ ہوا کہ اس طرح اسلام کا اصول قدر و قیمت اور معیار عظمت جو اُس نے بڑی کوشش سے دنیوی جاہ و شوکت کی قدر و قیمت کو مٹا کر قائم کیا تھا فنا ہو جائیگا۔

چنانچہ معاویہ نے پانی پینے کے پیالے سونے کے زیادہ وزن پر فروخت کیے تو ابودرداء صحابی نے منع کیا اور کہا ہم نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ زیادہ وزن پر خرید منع ہے معاویہ نے کہا میرے نزدیک تو اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ یہ سُنکر ابودرداء نے کہا کیا خوب! میں تو رسول اللہؐ کا حکم بیان کر رہا ہوں اور تم اس پر اپنی رائے ظاہر کر رہے ہو۔ میں ایسے مقام پر جہاں تم ہو نہیں رہونگا۔

عبادہ بن صامت (مشہور صحابی) کے ساتھ بھی سونے کی بیع و شرا کے معاملہ میں اسی طرح کا قصہ ہوا تھا۔ اور معاویہ نے اُن کو بھی یہی جواب دیا تھا کہ ہم اس کو کسی طرح بُرا نہیں سمجھتے۔ عبادہ نے کہا میں تو رسول خدا کا حکم بیان کرتا ہوں اور تم اپنی رائے بیان کرتے ہو خدا مجھے اس جگہ سے نکالے۔ میں اس سرزمین پر ہرگز نہ رہونگا جس پر تم حاکم ہو(۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کشمکش دمشق کی سیاست اور پرستاران شریعت میں اس وقت سے شروع ہو گئی تھی۔

اس کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو! عبدالرحمن بن سہل انصاری تیسری خلافت کے دور میں ایک جہاد کے سلسلہ میں شام کی طرف گئے تو اُنھوں نے دیکھا کہ اونٹوں پر شراب کی مشکیں بھری ہوئی جا رہی ہیں۔ وہ آگے بڑھے اور اُنہوں نے اپنے نیزہ سے اُن مشکوں کو چاک کر دیا۔ غلاموں نے مزاحمت کی اور یہ خبر معاویہ کو پہنچائی۔ اُنھوں نے کہا چھوڑ دو اُس بڈھے کو اُس کی عقل جاتی رہی

---

(۱) سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۳

ہے۔ عبد الرحمٰن نے کہا میری عقل نہیں گئی ہے مگر رسول اللہؐ نے ہم کو ممانعت فرمائی ہے کہ شراب ہمارے شکموں میں اور ہمارے ظروف میں داخل نہ ہو" (۱)

انہی باتوں کا نتیجہ تھا کہ اُن سن رسیدہ افراد کو جو صحابۂ رسولؐ میں محسوب ہوتے تھے معاویہ سے تنفر پیدا ہو گیا تھا چنانچہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ معاویہ اہل شام کی ایک جماعت کے ساتھ جبکہ وہ مکۂ معظمہ حج کو گئے ہوئے تھے صبح سویرے سعد بن ابی وقاص کی طرف سے گزرے۔ اُنھیں سلام کیا مگر سعد نے جواب نہیں دیا۔ معاویہ نے اپنی خفت مٹانے کو اپنے ساتھ والوں سے کہا کہ یہ سعد ہیں حضرت رسولؐ خدا کے صحابی۔ ان کا اصول ہے کہ یہ سورج طالع ہونے تک کسی آدمی سے بات نہیں کرتے۔ سعد کو یہ خبر معلوم ہوئی کہا۔ اس کی کوئی اصلیت نہیں مگر بخدا میں نے اُس سے بات کرنا پسند نہیں کی (۲)

اس کے بعد سلطنت دمشق جتنی طاقتور ہوتی گئی اتنا ہی اُس نے اسلامی تمدن کے بجائے دنیا دارانہ تمدن کو فروغ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی قدر و قیمت کے معیار اور وہ امتیازات ختم ہو گئے جو اسلام کے ساوہ اور غربا پرور اصول نے قائم کیے تھے اُس کا ایک نمونہ ہے سنہ ۳۰ھ میں حضرت ابوذر غفاری کا جلاوطن کیا جانا۔ ان کا ایک قصور یہ تھا کہ وہ اُس سرمایہ پرستی کی مذمت کرتے تھے جو انہیں اُس وقت اسلامی ملک میں نظر آرہی تھی۔ وہ غریب مسلمانوں کو بھوکا مرتے دیکھتے تو دمشق کی گلیوں میں وہ آیتیں قرآن کی پڑھتے پھرتے تھے جو سرمایہ پرستی کے خلاف ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ لوگ سونا چاندی خزانوں میں جمع کر رہے ہیں اور انھیں راہ خدا میں صرف نہیں کرتے اُنہیں منتظر رہنا چاہیے اُس وقت کا کہ جب آتش جہنم سے اُن کی پیشانیاں، اُن کے پہلو اور اُن کی پشتیں داغی جائینگی (۱)

(۱) اصابہ ج ۲ ص ۴۰۱ - اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۹۹ (۲) الوزراء والکتاب ص ۲۶ (۱) طبری ج ۵ ص ۶۶

یہ بھی تھا کہ وہ حکومت کی خوشامد نہیں کرتے تھے بلکہ موقع پر سچی بات کہہ گزرتے تھے چنانچہ جب معاویہ نے قصر خضراء کی تعمیر کی تو ابوذرؓ سے پوچھا کیوں اسے آپ کیسا سمجھتے ہیں؟ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا اگر تم نے اسے خدا کے مال سے بنایا ہے تو تم نے خیانت کی اور اگر خود اپنے ذاتی مال سے بنایا ہے تو اسراف کیا (۱)

مزاج قیصریت اس کا متحمل کب ہوسکتا تھا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی شکایت دار السلطنت مدینہ میں بھیجی گئی اور وہاں سے ہدایت ہوئی کہ ابوذرؓ کو مدینہ کی طرف روانہ کردو (۲)۔

ابوذرؓ شام سے مدینہ بھیج دیئے گئے اور یہاں پہنچ کر بجائے اس کے کہ معاویہ کو کچھ تنبیہ کی جاتی اس جلیل القدر صحابی کو مدینہ سے نکلنے کا حکم ہوگیا۔ مسافرت اور بے سروسامانی، آس پاس کوئی ہمدرد کیسا، شناسا تک نہیں، آخر یہ شدائد نہ اُٹھ سکے۔ ۳۲ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

جب ابوذرؓ کی حالت خراب ہوئی، پاس صرف بیوی اور ایک لڑکی تھی۔ ابوذرؓ نے اُن کو وصیت کی کہ مرنے کے بعد تم دونوں مل کر مجھے غسل دینا، کفن پہنانا اور پھر لاش کو لے جاکر قافلہ کی گزرگاہ پر لٹا دینا اور جو قافلہ اُدھر سے گزرے اُس سے کہنا یہ رسول خداؐ کا صحابی ابوذرؓ ہے، اس کو دفن کرادو۔ چنانچہ جب اُن کا انتقال ہوگیا تو غمزدہ ماں بیٹی نے اُسی ہدایت پر عمل کیا۔ لاش کے ساتھ سرِراہ آکر بیٹھ گئیں۔ اتفاقاً عبداللہ بن مسعود اہل عراق کے ایک قافلہ کے ہمراہ جو مکہ معظمہ حج کے لیے جارہا تھا اُدھر سے گزرے۔ روتی ہوئی خاتون اور بچی کو دیکھ کر ٹھہر گئے اور دریافت حال کیا۔ مصیبت زدوں نے

---

(۱) کتاب البلدان ص ۱۵۶ (۲) طبری ج ۵ ص ۹۶

کہا ”لوگو! رسول کے مظلوم صحابی ابوذر نے غربت کے عالم میں وفات پائی، اُنہی کا لاشہ ہے جو بے گور و کفن پڑا ہے۔ ابن مسعود اور اُن کے ساتھی چیخیں مار مار کر رونے لگے اور اُنھوں نے ابوذر کو دفن کیا (۱)

یہ حکومت وقت کی سیاست ملوکانہ کے خلاف پہلی قربانی تھی جو رسول کے مقدس صحابی حضرت ابوذر غفاری نے پیش کی۔

یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ ابوذر غفاری اور عبدالرحمٰن بن سہل انصاری اپنی فرض شناسی کی بنا پر اسلام کے قائم کردہ حدود و امتیازات میں بڑی عظمت کے مستحق تھے مگر موجودہ سیاست کے حدود میں وہ بالکل گم حقیقت اور بے وقعت ہو گئے تھے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اسلامی انقلاب کی جگہ قدامت پرستانہ انقلاب فتح پانے لگا اور اسلام کے مقرر کردہ حدود کے بجائے دوسرے حدود و امتیازات قائم ہو گئے۔

---

(۱) طبری ج ۳ صفحہ ۱۴۵-۱۴۶

آٹھواں باب

پیغمبر خدا کے بعد اسلامی مفاد کے محافظین ان میں اور مخالف قوتوں میں تصادم اور اُسکے نتائج

یہ ایک نمایاں حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد پیغمبر کے حقیقی ورثہ دار جو اُن کے اہلِ بیت تھے، اسلامی انقلاب اور اُس کے خصوصیات و امتیازات کے محافظ تھے۔ دنیا میں عالی شان محل تعمیر ہو چکے تھے لیکن ان کا وہی چھوٹا سا مکان تھا جس میں انہیں پیغمبر نے رکھ دیا تھا۔ دنیا کے محلات میں ریشمی پردے دروازوں پر ہو گئے تھے مگر ان کے دروازے پر وہی پھٹا ہوا پردہ اب بھی نظر آتا تھا دنیا کے جسم پر حریر و دیبا نظر آتا تھا لیکن یہ کھدر کا ملبوس اب بھی زیب تن کرتے تھے۔ دنیا مفتوحہ ممالک کی دولت سے چین کرتی اور عیش و عشرت میں زندگی گزارتی تھی مگر یہ اب بھی اپنے ہاتھ کی محنت سے روزی کھانا اور مال حلال کی تلاش کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اور جو دولت بھی ملتی اُسے غریبوں، مسکینوں، بیواؤں اور یتیموں کی نذر کر دیتے۔ اور اس بنا پر ان میں اور اس کے متوازی دوسرے انقلاب کے علم برداروں میں کشمکش لازمی تھی حضرت علیؑ سے معاویہ کا تصادم جس کے بہت سے واقعات کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اسی کشمکش کا نتیجہ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت اور اس کے علاوہ جب کبھی بھی مقابلہ

پڑا ہے دنیا میں آل رسولؐ کے ساتھی کم نکلے اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ اس کے وجوہ اقتصادی بھی ہیں اور سیاسی بھی۔ نفسیاتی بھی اور نسلی بھی۔ یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام قدیم امتیازات کو مٹا کر مساوات کا پیغام لیکر آیا تھا اور اُس نے امتیاز صرف فرائضِ انسانی کی زیادہ سے زیادہ بجا آوری کی بنا پر قرار دیا تھا۔ مشترکہ دولت جو مالِ غنیمت سے حاصل ہوتی ہے اُس کی اس طرح تقسیم کہ جس میں جانبداری اور عدم مساوات پیدا ہو جائے اسلام کے اصول کے خلاف تھی اور اسلام کے سچے محافظین اس کے قریب نہ جا سکتے تھے۔ اس لیے آل رسولؐ کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ خزانہ میں روپیہ جمع کر کے دولتمند بنیں اور خصوصیت سے اُن لوگوں کو زر و جواہر سے مالا مال کریں جن سے اُن کو اپنے اقتدار کے قوی بنانے میں فائدہ کی اُمید ہو۔ یہاں تو یہ عالم تھا کہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ جو کچھ بیت المال میں آتا ہے روز کا روز تقسیم کر دیتے ہیں اور پھر بیت المال میں جھاڑو دلوا دیتے ہیں اور وہیں پر نماز پڑھتے ہیں کہ وہ زمین خدا کے یہاں گواہی دے کہ علیؑ نے مسلمانوں کے مال کے پہونچانے میں مستحق لوگوں تک دریغ نہیں کیا۔ (۱)

اصفہان سے مال آتا ہے۔ اُس وقت اتفاق سے سات آدمی صاحب استحقاق موجود ہیں۔ آپ نے تمام مال کے برابر سے سات حصّے کر دیئے اور ایک روٹی بھی اُس مال میں نظر آ گئی تو اُس کے بھی سات ٹکڑے کر کے ہر حصّہ میں ایک ٹکڑا رکھ دیا۔ ممکن ہے خیال کیا جائے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا آدمی کو لحاظ نہیں کرنا چاہیے۔ اور اُس روٹی کو کسی ایک حصّہ میں شامل کر دیا جاتا تو بظاہر شریعت کے مطابق کوئی جرم نہ تھا مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ذہنیت عوام کی تشکیل ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتی ہے۔ حضرت علی ابن ابیطالبؑ تو عوام کی ذہنیت اُسی مساوات

---

(۱) استیعاب جلد ۲ صفحہ ۴۷

کے سانچے میں ڈھالنے کا کام انجام دے رہے تھے جیسے رسولؐ نے سکھایا تھا اور مسلمان رسولؐ کی رحلت کے بعد اُسے بھلا بیٹھے تھے۔

اس کے برخلاف امیر شام کے یہاں ان باتوں کی کوئی پروانہ تھی۔ وہاں اپنے اقتدار کے قائم رکھنے کے لیے خزانہ کا منہ کھلا تھا اور جس کو مطلب کا سمجھا جاتا تھا اُسے مالا مال کر دیا جاتا تھا۔ پھر لوگ جو امتیازات کے عادی ہو چکے تھے ان کا ساتھ دیتے یا اُن کا؟!

دنیا کی تو یہ حالت ہے کہ چاہے ملے ملائے کچھ نہیں لیکن اگر معلوم ہو کہ کسی کے پاس روپیہ بہت ہے اور خزانہ میں دولت جمع ہے تو یہی اُس کا اثر قائم ہونے کے لیے کافی ہوتا ہے اور اس طرح اُس کی ساکھ قائم ہو جاتی ہے۔ یہاں حضرت علیؑ کی یہ کیفیت کہ منبر پر اپنی تلوار کے فروخت کا اعلان کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ مجھے ایک لباس کی ضرورت ہے جو بغیر اس تلوار کے فروخت کیے ہوئے ممکن نہیں ہے۔ عبدالرزاق محدث نے اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ اس حالت میں تھا کہ جب سوائے شام کے تمام عالم اسلام کی سلطنت آپ کے قبضہ میں تھی (۱) ہر ایک حریص شخص سمجھتا تھا کہ جس کے پاس خود اپنے لباس کے لیے روپیہ نہ ہو اُس کے پاس ناحق کسی دوسرے کو دینے کے لیے روپیہ کہاں ہو سکتا ہے۔

دنیا ظاہری طمطراق اور آؤ بھگت سے بھی مرعوب ہوتی ہے مگر یہاں یہ حالت تھی کہ جناب امیرؑ اپنی حکومت کے زمانے میں کبھی اس کو عار نہ سمجھتے تھے کہ میثم تمار کی دوکان پر خرید و فروخت کریں۔ بازار میں قنبر کو ساتھ لے کر گئے اور دو پیراہن خریدے۔ ایک سات درہم کا اور ایک پانچ درہم کا سات

(۱) استیعاب ج ۲ ص ۴۷

درہم کا پیراہن قنبر کو دیا اور پانچ درہم کا خود زیب بدن کیا۔ قنبر نے کہا یہ زیادہ قیمت والا آپ لیں۔ کوئی اور ہوتا اور وہ ایسا کرتا تو شاید جواب دیتا کہ میں مساوات کے پھیلانے اور غلاموں کا درجہ بلند کرنے کے لیے ایسا کرتا ہوں۔ علیؑ کا مقصد یقیناً یہی تھا لیکن اگر یہ جواب دیتے تو اس میں خود عدم مساوات کا پہلو مضمر تھا، سننے والے کو احساس غلامی ضرور پیدا ہو جاتا اس لیے آپ نے ایسا جواب دیا جو اپنے بچوں کو دیا جاتا ہے۔ فرمایا قنبر! تم نوعمر ہو تمھیں وہی پیراہن اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میرا کیا میں یہی پہن لوں گا۔ ان باتوں کی قدر اہل دنیا کہاں کر سکتے تھے اور اُن کے دل پر ان باتوں کا اثر کہاں قائم ہو سکتا تھا۔

اس کے علاوہ اسلام نے اُن تمام مقتدر اشخاص اور جماعتوں کے امتیازات کو ختم کیا تھا جو اس سے پہلے برسر اقتدار تھیں۔ وہ مقتدر جماعتیں آپس میں کتنی ہی رقیبانہ چشمک رکھتی ہوں لیکن اسلام سے زخم خوردہ وہ سب ہی تھیں اس لیے اسلام کے حقیقی مقصد اور قائم کردہ امتیاز کے مٹانے میں وہ سب ہم آہنگ بن سکتی تھیں کیونکہ اس کے مٹانے میں اُن میں سے ہر ایک کے اقتدار رفتہ کی واپسی منحصر تھی۔ اور پھر سابق کی شکستوں کا اثر سب ہی پر تھا اور سب ہی میں جذبۂ انتقام پایا جاتا تھا۔ پھر یہ بھی کہ اسلام نے اپنے اصول مساوات کی تلقین سے خود قوم عرب کا بحیثیت قوم بھی امتیاز خاص ختم کیا تھا اور پردیسیوں کے حقوق پر بڑا زور دیدیا تھا اور غیر عربی عناصر جو آتے تھے انھیں عربوں کے برابر حقوق دیے جاتے تھے۔ یہ بات تمام عرب ہی کے کھلنے کی تھی۔ بنی امیہ نے اپنے دور میں عربی تعصب کا مظاہرہ کر کے عربی قومیت کے امتیاز کی حمایت کی اور موالی اور اعجام کی کو دبانے کی کوشش کی چنانچہ اس دور کے امتیازی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ عرب اور غیر عرب کا سوال پیدا ہو گیا۔ بنی امیہ کی اس سیاسی روش

قدرتاً یہ نتیجہ ہونا چاہیے تھا کہ عرب زیادہ تر بنی امیہ کے طرفدار ہو جاتے۔ بنی ہاشم
اسلامی اصول کے حامی ہونے کی وجہ سے عربی قومیت کے اس جذبہ کی طرفداری
نہیں کر سکتے تھے اس لیے عرب کی جانب داری کا پہلو ان کا کمزور تھا۔ اسکی تصدیق
اس سے ہو سکے گی کہ اس کے بعد جب بنی اُمیہ کے خلاف ہاشمیین یعنے بنی عباس وغیرہ
نے علم بلند کیا تو ہاشمیین کا ساتھ دینے والے موالی اور عجم زیادہ تھے۔

بنی ہاشم کے قدیمی روایات اور سیادت و شرافت کے امتیاز کی وجہ سے عرب
خاندانوں کو ان سے پہلے ہی حسد و عناد تھا۔ اس لیے نسلی تعصبات بھی مخالفت
پر آمادہ کرتے تھے اور عرب میں قبائلی نظام بڑی قوت کے ساتھ قائم تھا، ہر قبیلہ
کے سرگروہ اور بڑے افراد اپنے جذبات کی بنا پر جس راستے پر جاتے تھے عوام
اور پست افراد اہل قبیلہ بھی اُن ہی کی پیروی کرتے تھے۔ کیونکہ عوام کا کوئی نظریہ نہیں
ہوا کرتا۔ وہ لیڈروں کے پابند ہوتے ہیں اور لیڈر زیادہ تر جذبات کے شکنجہ میں قید
ہوتے ہیں۔ انہی باتوں کا نتیجہ تھا کہ آل رسولؐ کے مقابلہ میں اُن کے مخالفین کی تعداد
زیادہ رہتی تھی۔

نواں باب

حسن مجتبیٰ کی صلح اور اُس کے نتائج

سنہ ۴۱ھ — سنہ ۶۰ھ

انتقال فرمانے سے پہلے حضرت علی بن ابی طالبؑ نے ایک تحریری وصیت نامہ امام حسنؑ کے نام لکھا اور اُس پر امام حسینؑ اور محمد بن حنفیہ اور اپنی دیگر اولاد، اعزّا، اور مخصوص اصحاب کی گواہیاں لکھوائیں اور وصیت نامہ حسن مجتبیٰؑ کو سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت تم اُسے حسینؑ کے سپرد کر دینا (۱) اس کے علاوہ ایک وصیت آپ نے حسنؑ اور حسینؑ دونوں بھائیوں سے مشترک طور پر فرمائی۔ وہ یہ تھی کہ "میں تم کو فرض شناسی کی وصیت کرتا ہوں اور یہ کہ تم کبھی دنیا کے طلبگار نہ ہونا چاہے وہ دنیا خود تمہاری طلبگار رہو۔ اور کبھی دنیاوی نقصان پر کبھی رنجیدہ نہ ہونا اور ہمیشہ حق کے لیے زبان کھولنا اور ثواب کے لیے کام کرنا اور ظالم کے مدّمقابل اور مظلوم کے مددگار رہنا۔ (۲) میں تم کو، تمام اپنی اولاد اور اعزا اور اُن لوگوں کو جن تک میرا پیغام پہونچے وصیت کرتا ہوں کہ ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہنا اور اپنے شیرازہ کو منتشر ہونے نہ دینا اور اپنے درمیانی جھگڑوں کو صلح و آشتی کے ساتھ طے کرتے رہنا۔ اور دیکھو یتیموں کا خیال رکھنا، اُن کی برابر خبرگیری کرتے رہنا اور پڑوسیوں کا خیال رکھنا اس لیے کہ رسول اللہ نے

---

(۱) کافی ج ۱ ص ۳۴۱ (۲) طبری ج ۶ ص ۵۵۔

ان کے بارے میں وصیت کی تھی۔ اور دیکھو قرآن کا خیال رکھنا، تم سے بڑھ کر کوئی قرآن پر عمل کرنیوالا نہ ہو اور نماز کا خیال رکھنا، یہ تمہارے دین کا ستون ہے اور اللہ کے گھر (خانۂ کعبہ) کا خیال رکھنا، زندگی بھر اس کو کبھی اکیلا نہ چھوڑنا اور دیکھو خدا کی راہ میں اپنے جان و مال اور زبان سے جہاد کرتے رہنا اور آپس میں صلۂ رحم رکھنا اور ایک دوسرے کے ساتھ فیاضی کے ساتھ پیش آنا اور دیکھو کبھی خلق خدا کو نیک اعمال کی ترغیب دینے اور بداعمالیوں سے روکنے سے باز نہ آنا تاکہ تم پر برے لوگوں کا اقتدار قائم نہ ہونے پائے (۱) اور دیکھو میرے بعد ایسا نہ ہونے پائے کہ بنی ہاشم مسلمانوں میں میرے خون کے بہانے سے خونریزی شروع کر دیں

زیادہ سے زیادہ میرے خون کے قصاص کے طور پر بس میرے قاتل کو قتل —— کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اس کو ایک ضربت کی پاداش میں بس ایک ہی ضربت لگائی جائے اور اس کو ہرگز مثلہ کیا جائے۔ یعنی اعضا و جوارح قطع نہ کئے جائیں اس لیے کہ رسول اللہ فرما گئے ہیں کہ خبردار کسی کو مثلہ نہ کرو چاہے وہ کاٹنے والا کتا کیوں نہ ہو۔" (۲)

نفسیات کے واقفکار خوب جانتے ہیں کہ کچھ وہ حالات ہوتے ہیں جن میں بات پتھر کی لکیر کی طرح سننے والے کے دل پر جم جاتی ہے۔ یہ صورت کہ ایک بزرگ مرتبہ واجب الاطاعت باپ بستر بیماری پر ہے، اس کی رحلت کا ہنگام قریب ہے اور اس وقت وہ اپنے تمام اہل بیت میں سے دو ایک سعید فرزندوں کو خصوصیت کے ساتھ بلا کر کوئی خاص بات کہتا ہے۔ یقیناً اس وقت کی کہی ہوئی بات ان فرزندوں کے دل و دماغ پر ایسا اثر کرے گی جیسا کسی دوسرے

---

(۱) نہج البلاغہ ج ۲ ص ۸۵ - ۹۰۔ طبری اور ابوالفرج اصفہانی نے ان میں سے اکثر فقرات کو امام حسن کے نام کے تحریری وصیت نامہ میں درج کیا (مقاتل الطالبیین ص ۵۱ ج ۲) (۲) طبری ج ۶ ص ۸۶ نہج البلاغہ ج ۲ ص ۸۰

صبر و سکون کے لمحوں کی بات اثر نہیں کر سکتی۔

عام دنیا سے جانے والے باپ اس وقت اپنی اولاد سے وصیت اپنے گھر کے نجی معاملات کے متعلق کرتے ہیں مگر آل محمدؐ تو دین و شریعت، کتاب اور سنت کو اپنے ذاتیات میں داخل سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس وقت پر جو وصیتیں کی ہیں وہ سراسر مفاد عامہ، مفاد شریعت اور احکام الٰہی سے متعلق تھیں۔

یوں تو یہ فرزند وہ تھے جو خود صحیح اور مناسب ہی کام کرتے مگر حضرت علی بن ابی طالبؑ کو تو بظاہر اسباب ایک مربی باپ کی طرح اپنا فرض انجام دینا تھا جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ان وصیتوں کی ہر ہر لفظ سعادت شعار بیٹوں کے دل پر نقش ہو جائے۔ یہ الفاظ اُن کے کانوں میں ہمیشہ گونجتے ہیں کہ فرض شناسی کو اپنا اصول رکھنا۔ دنیادی جاہ و اقتدار کے کبھی طالب نہ ہونا۔ دنیاوی نقصان کی کبھی پروا نہ کرنا۔ زبان پر حق کو جاری رکھنا۔ ظالم کے مدمقابل رہنا اور مظلوم کے مددگار رہنا۔ چنانچہ تمام ان تعلیمات کو دونوں فرزندوں نے اپنے عمل سے مجسم شکل میں پیش کیا اور آپس میں ہم آہنگی کو بھی ہر صورت میں برقرار رکھا۔

یہ الفاظ کہ "خدا کی راہ میں اپنے جان و مال اور زبان سے جہاد کرتے رہنا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (اچھی باتوں کی ہدایت اور بری باتوں سے ممانعت) کو کبھی ترک نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ تم پر بُرے لوگوں کا اقتدار قائم ہو جائے۔"

خصوصیت کے ساتھ ان کو عملی جامہ پہنانے کا جس طرح حسینؑ کو موقع ملا وہ دنیا کی تاریخ میں یادگار رہے۔

حضرت علی بن ابیطالبؑ کی وفات کے بعد تمام مسلمانوں نے متفقہ طور پر آپ کے بڑے فرزند امام حسنؑ کی خلافت تسلیم کی۔ آپ پر اپنے والد بزرگوار

کی شہادت کا بڑا اثر تھا۔ آپ نے اس موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں حضرت علی بن ابیطالبؑ کے فضائل و مناقب تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے خاص طور پر آپ کی سیرت اور ترک دنیا کا تذکرہ کیا۔ اور اس ذکر میں گریہ آپ کے گلوگیر ہوا اور تمام حاضرین بھی آپ کے ساتھ بے اختیار رونے لگے۔ پھر آپ نے اپنے ذاتی اور خاندانی فضائل بیان کیے اس کے بعد عبد اللہ بن عباس نے کھڑے ہو کر لوگوں کو آپ کی بیعت کرنے کی طرف دعوت دی، اور سب نے برضا و رغبت آپ کی بیعت کی۔ یہ جمعہ کے دن ۲۱ ماہ رمضان ۴۰ھ کا واقعہ ہے (۱) آپ نے اُسی وقت لوگوں سے صاف صاف یہ قول و قرار لے لیا تھا کہ اگر میں صلح کروں تو تم کو صلح کرنا ہو گی اور اگر میں جنگ کروں تو تمہیں میرے ساتھ مل کر جنگ کرنا ہو گی۔ اس کے بعد سے آپ ملک کے بندوبست کی طرف متوجہ ہوئے اطراف میں عمال مقرر کیے۔ حکام معین کیے اور مقدمات کے فیصلے کرنے لگے۔

ابھی ملک حضرت علیؑ کے غم میں سوگوار ہی تھا اور حضرت امام حسنؑ پورے طور پر انتظامات بھی نہ کر چکے تھے کہ معاویہ کی طرف سے آپ کی مملکت میں در اندازی شروع ہو گئی اور ان کے خفیہ کارکن ریشہ دوانیاں کرنے لگے، چنانچہ ایک شخص قبیلۂ حمیر کا کوفہ میں اور ایک شخص بنی قین میں سے بصرہ میں پکڑا گیا۔ یہ دونوں اس مقصد سے آئے تھے کہ یہاں کے حالات سے دمشق میں اطلاع دیں اور فضا کو امام حسنؑ کے خلاف ناخوشگوار بنائیں۔ غنیمت ہے کہ اس کا انکشاف ہو گیا۔ حمیر والا آدمی کوفہ میں ایک قصائی کے گھر سے اور

---

(۱) ارشاد ص ۱۹۳

قین والا آدمی بصرہ میں بنی سلیم کے یہاں گرفتار کیا گیا اور دونوں کو جرم کی سزا دی گئی۔ اِس واقعہ کے بعد حضرت امام حسنؑ نے معاویہ کو ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "تم اپنی دراندازیوں سے باز نہیں آتے ہو۔ تم نے لوگ بھیجے ہیں کہ میرے ملک میں بغاوت پیدا کرائیں اور اپنے جاسوس یہاں پھیلا دیئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم جنگ کے خواہشمند ہو ایسا ہے تو پھر تیار رہو، یہ منزل کچھ دور نہیں ہے نیز مجھکو خبر معلوم ہوئی ہے کہ تم نے میرے باپ کی وفات پر طعن و تشنیع کے الفاظ کہے۔ یہ ہرگز کسی ذی ہوش آدمی کا کام نہیں ہے۔ موت سب کے لیئے ہے۔ آج اگر ہمیں اس حادثہ سے دوچار ہونا پڑا تو کل تمہیں ہوگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے مرنے والے کو مرنے والا سمجھتے نہیں۔ وہ تو ایسا ہے جیسے کوئی ایک مکان سے منتقل ہو کر اپنے دوسرے مکان میں جائے اور آرام کی نیند سو جائے۔" اس خط کے بعد معاویہ اور امام حسنؑ کے درمیان بہت سے خطوط کی ردّ و بدل ہوئی۔(۱) بہرحال ان واقعات سے یہ امر بالکل ظاہر ہو گیا کہ امیر شام معاویہ کو جناب امیرؑ کی ذات سے کوئی وقتی عداوت نہ تھی ورنہ وہ اُن کی شہادت کے ساتھ ختم ہو جاتی بلکہ یہ آلِ رسول سے ایک مستقل دشمنی ہے جس کے نتائج آئندہ دیکھیئے کیا ہوں۔ یہ بھی اس واقعہ سے ثابت ہو گیا کہ ملک میں دشمن کے جاسوسوں اور مخبروں کے لیئے جائے پناہ موجود ہے اور اگر دو ایک واقعات کا انکشاف ہوا اور دو آدمی گرفتار ہو گئے تو یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے ہی کچھ دوسرے لوگ موجود نہیں ہیں جن کا انکشاف نہیں ہو سکا ہے اور جنھیں خفیہ کام کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ بہرحال امام حسنؑ دشمن کے مقابلہ کے لیئے تیار تھے اور حق کے بارے میں اُس کے ساتھ کوئی مراعات

---

(۱) ارشاد صفحہ ۱۹۲ - ۱۹۳

کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ بیشک آپ کو اور آپ کے ساتھ حسنینؑ کو اپنے ملک کی فضا کی طرف سے بے اطمینانی ضرور تھی اس لیے کہ خوارج کے فتنہ کے بعد سے خود اہل کوفہ میں پھوٹ بڑھ چکی تھی۔ اور بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو بظاہر حضرت علیؑ کی فوج میں شامل تھے مگر قرابت، دوستی یا اور کسی وجہ سے خوارج کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ حضرت امیرؑ کو خود ان لوگوں کی شورش پسندی، اختلاف رائے، اور نظم کی کمی سے اتنی تکلیف اور پریشانی تھی کہ آپ موت کے آرزومند تھے۔ تمام کتب تاریخ اور بالخصوص نہج البلاغہ میں وہ خطبے آپ کے درج ہیں جو آپ کی کبیدہ خاطری بلکہ روحانی تکلیف کے مظہر ہیں، آپ نے اُن کو مخاطب کر کے کبھی فرمایا کہ تم نے میرا دل پیپ سے بھر دیا اور میرے سینہ کو غم و غصہ سے پُر کر دیا (۱) کبھی فرمایا کہ کاش معاویہ میرے ساتھ اپنی جماعت کا تمہاری جماعت سے تبادلہ کر لیتا اُس طرح جیسے سونے کے سکہ کا تبادلہ چاندی کے سکہ سے ہوتا ہے یعنی تم میں دس لے لیتا اور اپنوں میں کا ایک مجھے دیدیتا (۲) کبھی فرمایا کتنے افسوس کی بات ہے کہ اہل شام باطل راستے پر متفق ہیں اور تم حق راستے پر ہو کے باہم تعاون نہیں رکھتے (۳) اہل شام اپنے حاکم کی اطاعت کرتے ہیں درانحالیکہ وہ خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور تم اپنے امام کا کہنا نہیں مانتے درانحالیکہ وہ خدا کی اطاعت کرتا ہے (۴) اور کبھی فرمایا کہ تم لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جہاد کے لیے چلو جاڑے کے زمانہ میں تو تم کہتے ہو کہ یہ تو کڑاکے کا جاڑا ہے۔ ہمیں اتنی مہلت دیجیے کہ یہ سردی کم ہو جائے اور جب تم سے کہا جاتا ہے گرمی کے زمانہ میں تو کہتے

---

(۱) الاخبار الطوال ص۲۱۲ نہج البلاغہ ج ۱ ص۵۸ (۲) ارشاد ص۱۶۲۔ نہج البلاغہ ج ۱ ص۲۰۵ (۳) ارشاد ص۱۶۳۔ نہج البلاغہ ج ۱ ص۶۲ (۴) ارشاد ص۱۶۲۔ نہج البلاغہ ج ۱ ص۲۰۵۔

ہو کہ یہ تراقی کی گرمی ہے اتنی مہلت دیجیے کہ یہ گرمی کم ہو جائے۔ افسوس! تم گرمی اور سردی سے اتنا بھاگتے ہو تو تلوار کی آنچ سے اور زیادہ بھاگو گے (۱)

یہی وہ جماعت تھی کہ جس سے اب امام حسنؑ کو سابقہ پڑا تھا آپ اِن لوگوں کی حالتوں سے اچھی طرح واقف تھے اور یقیناً امیر شام کو بھی اپنے جاسوسوں کے ذریعہ سے یہاں کے حالات کا علم ہو گیا ہوگا اور وہ یہ بھی سمجھے ہوں گے کہ امیر المومنین حضرت علیؑ کی جو ہیبت تمام عرب کے قلوب پر چھائی ہوئی تھی وہ بالکل اُسی درجہ پر حضرت حسنؑ کے لیے ابھی حاصل نہیں ہو سکتی اس لیے انہیں ہمت ہوئی کہ وہ یکایک عراق پر حملہ کر دیں چنانچہ وہ اپنی فوجوں کو لیکر جسر منبج تک پہونچ گئے اب امام حسنؑ نے بھی مدافعت کے انتظامات شروع کیے اور حجر بن عدی کو بھیجا کہ وہ دورہ کر کے تمام مقامات کے عاملوں کو صورت حال کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کریں اور لوگوں کو جہاد کے لیے تیار کریں مگر اندازہ کے بالکل مطابق یہ افسوسناک صورت سامنے آئی کہ لوگوں نے حجر بن عدی کی کوشش کا گرمجوشی کے ساتھ استقبال نہیں کیا عام طور پر جمود اور سردمہری سے کام لیا گیا۔ کچھ تھوڑی سی جمعیت مقابلہ کے لیے تیار ہوئی بھی تو اُس میں کچھ حصہ خوارج کا تھا جو کسی نہ کسی حیلہ سے معاویہ سے جنگ کرنا ہی چاہتے تھے۔ کچھ شورش پسند اور مال غنیمت کے طلبگار اور کچھ لوگ صرف اپنے سرداران قبائل کے دباؤ سے بادل ناخواستہ ساتھ ہو گئے تھے۔ جنھیں فرض کے احساس سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ تھوڑے لوگ وہ ہوں گے جو واقعی حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے شیعہ سمجھے جا سکتے ہیں (۲) بہرحال حضرت امام حسنؑ نے قیس بن سعد بن عبادہ انصاری

---

(۱) الاخبار الطوال صفحہ ۲۱۳ ارشاد صفحہ ۱۵۱ نہج البلاغہ ج ۱ صفحہ ۵۴ (۲) ارشاد صفحہ ۱۵۳

کو بیس ہزار کی فوج کے ساتھ آگے روانہ کیا اور خود مقام دیر کعب کے قریب
ساباط میں جا کے قیام کیا۔ یہاں پہونچ کر نمایاں طور سے آپ کو اپنے ساتھیوں
کی سرد مہری کا مشاہدہ ہوا۔ آپ نے اِن لوگوں کو جمع کر کے خطبہ ارشاد فرمایا
جس کا مضمون یہ تھا کہ "دیکھو میں تمام خلق سے زیادہ خلقِ خدا کا بہی خواہ
ہوں اور مجھے کسی مسلمان سے کینہ نہیں۔ آگاہ ہونا چاہیے کہ اتفاق و اتحاد
جا ہے تمہیں ناپسند ہو اختلاف و افتراق سے بہتر ہے چاہے وہ تمہیں کتنا
ہی پسند ہو۔ یاد رکھو کہ میں تمہارے فائدہ کے لیے تم سے بہتر سوچنے کا حق
رکھتا ہوں۔ تم کو لازم ہے کہ میری رائے سے انحراف اور میرے حکم کی
مخالفت نہ کرو۔ آپ کی تقریر کا ختم ہونا تھا کہ مجمع میں بدنظمی پیدا ہو گئی اور
خوارج نے پکار پکار کر کہنا شروع کیا کہ یہ کافر ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے آپ پر حملہ
کر کے آپ کے قدموں کے نیچے سے مصلا کھینچ لیا اور دوش مبارک پر سے چادر
بھی اُتار لی۔ آپ فوراً گھوڑے پر سوار ہو گئے اور آواز بلند سے پکارا کہ کہاں ہیں
ربیعہ اور ہمدان یہ دونوں جان نثار قبیلے اِدھر اُدھر سے دوڑ پڑے اور
شورش پسندوں کو آپ سے دور کیا (۲)

ابن جریر کی روایت یہ ہے کہ کسی نے خبر اڑا دی کہ قیس بن سعد قتل ہو گئے
بس اس پر یہ غدر مچ گیا اور وہ خیمہ جس میں امام حسنؑ کا قیام تھا لوٹ لیا
گیا یہاں تک کہ جس بچھونے پر آپ بیٹھے تھے آپ کے نیچے سے کھینچ لیا گیا (۳)

اس کے بعد آپ مدائن کی طرف روانہ ہو گئے مگر وہاں پہنچنے پر جراح
بن قبیصہ اسدی نے جو انہی خوارج میں سے تھا کمین گاہ میں چھپ کر خنجر سے
حملہ کر دیا جس سے آپ زخمی ہو گئے۔ عرصہ تک مدائن میں علاج کے بعد

---

(۱) طبری ج ۶ صہ ۹۲ (۲) ارشاد صہ ۱۹۵ (۳) طبری ج ۶ صہ ۹۲

آپ اچھے ہوئے اور پھر معاویہ سے مقابلہ کی تیاری کی۔

معاویہ نے آپ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ جن شرائط پر چاہیں میں صلح کرنے پر تیار ہوں اور اُس کے ساتھ آپ کی فوج کے اُن سرداروں کے خطوط بھی روانہ کر دیے جنھوں نے خفیہ طریقہ پر معاویہ سے ساز باز کرنا چاہی تھی اور دعوت دی تھی کہ آپ آیئے تو ہم حسنؑ کو گرفتار کر کے آپ کے سپرد کر دیں گے یا اُن کو قتل کر ڈالیں گے (۱)

امام حسنؑ پہلے ہی اپنے ساتھیوں کی غداری سے واقف تھے۔ اور اس لیے جنگ کو مناسب وقت خیال نہیں کرتے تھے۔ لیکن یہ ضرور چاہتے تھے کہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو کہ باطل کی حمایت کا دھبا بھی میرے دامن پر نہ آنے پائے۔ اس خاندان کے لوگوں کو حکومت و اقتدار کی تو ہوس کبھی رہی ہی نہیں انہیں تو مطلب اس سے تھا کہ مخلوق خدا کی بہتری ہو اور حدود و حقوق الٰہی کا اجرا ہو۔ اب معاویہ نے جو آپ سے مُنہ مانگے شرائط پر صلح کرنے کی آمادگی ظاہر کی تو آپ نے اپنے نانا اور باپ کی دیکھی ہوئی سیرت کے مطابق مصالحت کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو ناکام واپس نہیں کیا۔ آپ نے صلح کے شرائط مرتب کر کے معاویہ کے پاس روانہ کیے، وہ تمام شرائط جن سے قانونی طور پر آئین و شریعت کا تحفظ ہو جاتا ہے چنانچہ صلح کی دستاویز مکمل ہوئی اور جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ حضرت امام حسینؑ اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنے بڑے بھائی حضرت امام حسنؑ کے ساتھ ان سرد و گرم حالات کا برابر مطالعہ کر رہے تھے۔ اُنھوں نے ان واقعات پر کبھی ایک غیر متعلق انسان کی طرح نظر نہیں ڈالی بلکہ وہ اُس کو اپنی سرگزشت سمجھتے تھے اور جانتے تھے

(۱) صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۱۔ ارشاد ص ۱۹۵

کہ ہمیں اسی حال پر مستقبل کی عمارت کو بلند کرنا ہے۔ اس وقت کے واقعات کا یہ پہلو بہت اہم تھا کہ ساتھیوں کی کثرت اور جمعیت پر اعتماد کا خیال کلیۃً دور از کار ہے۔ حسینؑ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ ایک دفعہ ان ساتھیوں کے عمل کو دیکھ چکے تھے کہ وہ اُن کے سامنے تلواریں کھینچ کر آگئے اور اب اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ساتھیوں کے طرزِ عمل کو دیکھ لیا کہ خود اپنی فوج کے ہاتھوں کس طرح اُن کے بھائی کی جان خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ ممکن ہے کسی وجہ سے اس وقت حسینؑ اپنے بڑے بھائی کے پاس موجود نہ ہوں اور ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اُس سخت اور ناگوار موقع پر کوئی تذکرہ امام حسین علیہ السلام کا نظر نہیں آتا مگر اُنھوں نے یقیناً ان حالات کو دردمندانہ طریقہ پر سنا اور اُس زخم کو دیکھا ہوگا جو اُن کے بھائی کے جسم پر خود اپنے ساتھ والوں میں سے کسی کے ہاتھ سے آگیا تھا اور اس کا اثر اُن کے حساس دل پر جتنا بھی ہوا ہو وہ کم ہے۔

اس کے علاوہ آپ نے اپنے بزرگوں کی سیرت میں ایک دفعہ یہ نمونہ اور دیکھ لیا کہ امن عالم کے لیے نقطۂ اوّل صلح و سلامتی ہے۔ جنگ کا درجہ صلح کے بعد ہے اور صلح کے امکانات پیدا ہونے تک ہے، اس لیے صلح کے خیال کو جنگ کے پہلے اور جنگ کے دوران میں ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ دشمن سے صلح کی گفتگو کو کبھی اپنی خودداری کے خلاف نہ سمجھو۔ چاہے جذباتی لوگ اُس پر معترض بھی ہوں اور چاہے اُس کے لیے تمھیں اپنے جاہ و اقتدار، راحت و آرام یا کسی دوسرے شخصی مفاد کی قربانی بھی کر دینا پڑے مگر یہ خیال ضروری ہے کہ اس صلح کے اندر کوئی ایسا اصول پامال نہ ہونے پائے جس کا محفوظ رکھنا بہر حال اپنا مقدس فریضہ ہے۔ یہی نمونہ حسینؑ نے اپنے نانا سے دیکھا تھا یہی

اُن کو اپنے باپ کے یہاں نظر آیا اور یہی اب اُن کو اپنے واجب الاطاعت بھائی امام حسنؑ کی جانب سے بیش نظر تھا۔

ایک بات ضمنی طور پر اور دوبارہ سامنے آگئی۔ وہ یہ کہ سچائی کے راستے میں اگر اتمام حجت کی ضرورت ہو تو دوست نہیں بلکہ دشمن کے بھی اقرار پر بھروسا کر لینا چاہیے۔

اس صلحنامہ کے مکمل شرائط جو علامہ ابن حجر مکیؒ نے درج کیے ہیں حسب ذیل ہیں (۱)

(۱) یہ کہ معاویہ حکومت اسلام میں کتاب خدا اور سنت رسولؐ اور صحیح راستے پر چلنے والے خلفائے راشدین کے طریقہ پر عمل کرینگے (۲)

(۲) یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی خلیفہ کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

(۳) یہ کہ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لیے امان ہوگی۔

(۴) یہ کہ حضرت علیؑ کے اصحاب اور شیعہ جہاں بھی رہیں اُن کے جان اور مال اور ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے۔ (۳)

(۵) یہ کہ معاویہ حسنؑ بن علیؑ اور اُن کے بھائی حسینؑ اور کسی کو بھی خاندان رسولؐ میں کوئی نقصان پہونچانے یا اُن کی جان لینے کی کوشش نہ کرینگے۔ نہ خفیہ طریقہ پر اور نہ علانیہ اور ان میں سے کسی کو کسی جگہ دھمکایا، ڈرایا اور وحشت میں مبتلا نہیں کیا جائے گا۔" یہ معاہدہ ربیع الاول یا جمادی الاولی سنہ ۴۱ھ کو عمل میں آیا۔

اگر غور کیا جائے تو اس صلح کے ذریعہ سے حضرت امام حسنؑ نے وہ

---

(۱) صواعق محرقہ ص ۸۱ (۲) شیعہ ماخذوں میں اس شرط کے آخری جز کا ذکر نہیں ہے
(۳) اس شرط کے ثبوت کے لیے ملاحظہ ہو طبری ج ۶ ص ۹۷

مقصد حاصل کر لیا تھا جس کے لیے ان کی اپنے فریق مخالف سے منازعت تھی۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ حضرات ذاتی اغراض کے لیے کسی سے مخاصمت نہیں رکھتے تھے۔ ان کی لڑائی جو کچھ تھی وہ اصول شریعت و مذہب کے لیے۔ حضرت امام حسنؑ نے صلحنامہ کی پہلی شرط کے لحاظ سے امیر شام کو پابند بنا دیا کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق عمل کریں۔ اس سے آپ نے ایک طرف تو یہ بات ہمیشہ کے لیے مسلّم بنا دی کہ اصول شریعت اور آئین حکومت اور ہے۔ یہ وہ بڑی چیز تھی جس کے لیے آل محمدؐ برابر کوشاں رہتے تھے یعنی کبھی ایسا نہ ہو کہ حکام اسلام کا طرز عمل عین شریعت سمجھ لیا جائے۔ دوسرا امر یہ بھی آپ نے ثابت کر دیا بلکہ فریق مخالف سے تسلیم کرا لیا کہ اب تک جو کچھ حکومت شام کا رویہ رہا ہے وہ کتاب اور سنت کے مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ صلحنامہ کی بنیادی چیزیں وہی ہوتی ہیں جو دو فریق میں بنائے مخاصمت ہوں۔ اگر حکومت شام کا سابقہ طرز عمل اب تک برابر کتاب و سنت کے مطابق ہوتا تو اس شرط کی ضرورت کیا تھی۔ اس کے بعد دوسری اہم شرط یہ قرار دی کہ اُن کو اپنے بعد کسی کو نامزد کرنے کا حق نہ ہو گا۔ اس طرح آپ نے مستقبل کا تحفظ کیا کیونکہ یہ ممکن تھا کہ معاویہ اپنی زندگی بھر کتاب اور سنت کے مطابق عمل کرتے لیکن بعد میں کوئی ایسا آتا جو اُس کے خلاف کرتا۔ اس لیے آپ نے آئندہ کے لیے جانشین بنانے کے حق کو سلب کر لیا۔

بہرحال صلح ہو گئی۔ فوجیں واپس چلی گئیں اور معاویہ کی گرفت تمام ممالک اسلامیہ پر مضبوط ہو گئی اور اب شام و مصر کے ساتھ عراق و حجاز یمن اور ایران وغیرہ بھی اُن کے تصرف میں آ گئے۔ حضرت امام حسنؑ کو اس

صلح کے بعد اپنے ساتھ کے بہت سے لوگوں کی طرف سے انتہائی دلخراش اور توہین آمیز الفاظ سننا پڑے جن کا برداشت کرنا انہی کا کام تھا۔ بعض لوگ ایسے جو کل تک "امیر المومنین" کہہ کے تسلیم بجالاتے تھے آج "مذل المومنین" یعنی "مومنین کی جماعت کو ذلیل کرنے والے" کے الفاظ سے سلام کرتے تھے مگر امام حسنؑ نے صبر، استقلال اور نفس کی بلندی کے ساتھ ان تمام ناگوار حالات کو برداشت کیا اور معاہدہ پر سختی کے ساتھ قائم رہے لیکن معاویہ نے جنگ کے ختم اور سیاسی اقتدار کے قائم ہوتے ہی عراق میں داخل ہو کر نخیلہ میں جسے کوفہ کی سرحد سمجھنا چاہیے قیام کیا اور جمعہ کے خطبہ کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ میرا مقصد جنگ سے یہ نہ تھا کہ تم لوگ نماز پڑھنے لگو۔ روزے رکھنے لگو۔ حج کرو۔ یا زکوٰۃ ادا کرو۔ یہ سب تو تم کرتے ہی ہو۔ میرا تو مقصد جنگ سے فقط یہ تھا کہ میری حکومت تم پر مسلم ہو جائے۔ وہ حسنؑ کے اس معاہدہ کے بعد مکمل ہو گئی اور باوجود تم لوگوں کی ناگواری کے خدا نے مجھے اس مطلب میں کامیاب کر دیا۔ رہ گئے وہ شرائط جو میں نے حسنؑ کے ساتھ کیے ہیں وہ سب میرے پیروں کے نیچے ہیں اور ان کا پورا کرنا یا نہ کرنا میرے ہاتھ کی بات ہے (۱) مجمع میں ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا مگر اب کس میں دم تھا کہ وہ اس کے خلاف زبان کشائی کرتا۔

اقتدار شاہی کی جراٴت اس نقطہ تک پہونچی کہ کوفہ میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی موجودگی میں معاویہ نے حضرت امیرؑ اور امام حسنؑ کی شان میں ناسزا کلمات استعمال کیے۔ اس پر سکوت کرنا اعتراف و اقرار کا مرادف سمجھا جا سکتا تھا اس لیے فوراً امام حسینؑ جواب دینے کے لیے کھڑے

(۱) ارشاد صفحہ ۱۹۶

ہو گئے مگر حضرت امام حسنؑ نے آپ کو بٹھا دیا اور خود کھڑے ہو کر نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں امیر شام کی تقریر کا جواب دیا (۱) حسینؑ جانتے تو پہلے ہی تھے مگر اس وقت سے محسوس کر لیا کہ حالات کی رفتار کیا ہے اور ہم کو اس کا آخری مقابلہ کس طرح کرنا ہوگا۔ مگر وہ جلد باز انسان نہ تھے۔ نہ وہ ذمہ داریوں کے محل سے ناواقف تھے۔ اُنھیں صبر آزما انتظار کے ساتھ حالات کی تدریجی رفتار کے دوش بدوش اپنے کردار کی منزل کو آگے بڑھانا تھا اور اسکے پہلے ایک فرض شناس انسان کی طرح اپنے بھائیؑ کے ساتھ وقت کی موجودہ ساکن مگر پر اضطراب خاموشی میں غرق رہنا تھا۔

حضرت امام حسنؑ نے امور سلطنت سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے بعد کوفہ کا قیام ترک کر کے پھر سے مدینہ میں جا کر سکونت اختیار فرمائی تو حسینؑ نے بھی بھائیؑ کا ساتھ دیا اور مدینہ میں جا کر قیام فرمایا۔ مگر اس اتحادِ عمل کے باوجود بھی بنی اُمیہ نے یہ غلط شہرت دی کہ اس صلح کے بارے میں حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ دونوں بھائیوں میں اختلافِ رائے ہے۔ اس سے اُن کا مقصد یہ تھا کہ شاید اس طرح بھائیوں کی یک جہتی میں واقعی کوئی فرق آجائے مگر اُن کے یہ تمام توقعات بالکل غلط ثابت ہوئے۔

حسینؑ قول، عمل اور مسلک میں اپنے بھائی امام حسنؑ کے ساتھ بالکل متحد تھے اور ہمیشہ رہے۔ آپ کو معلوم تھا کہ امام حسنؑ نے اگرچہ اتمامِ حجت کے لیے خاموشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے مگر خیال اُن کا بھی یہی ہے کہ آخر میں پھر تلوار درمیان میں آئے گی اور آخری فیصلہ بغیر ایک سخت اور مشکل اقدام کے نہ ہو سکیگا اور وہ اس کے لیے تیار بھی ہیں بشرطیکہ حالات کی تدریجی رفتار انھی کے دورِ حیات میں اُس آخری نقطہ تک پہونچ جائے

(۱) ارشاد ص ۱۹۰

جو اُس آخری اقدام کے لیے ضروری ہے۔ امام حسنؑ اکثر یہ اشعار بطور تمثیل پڑھا کرتے تھے :۔

من عاذ بالسیف لاقیٰ فرصۃ عجبا — موتا علی عجل او عاش منتصفا
لا ترکبوا السہل ان السہل مفسدۃ — لن تدرکوا المجد حتی ترکبوا عنفا

" جو تلوار کو اپنا پشت پناہ بنائے وہ عجیب سکون و اطمینان حاصل کریگا یا دنیا سے جلد ہی گزر جانا اور یا زندگی ایسی جو دادرسی کے ساتھ ہو۔ کبھی سہولت پسندی سے کام نہ لو۔ سہولت پسندی بڑی خرابی کی بات ہے۔ عزت حاصل کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ دشوار گزار منزل کو طے نہ کرو" (۱)

رہ گئے موجودہ حالات، اُن کے لحاظ سے امام حسینؑ بھی اس صلح سے متفق تھے چنانچہ بروایت دینوری جب حجر بن عدی اور عبیدہ بن عمرو جو صلح کے معاملہ میں اختلاف رکھتے تھے امام حسینؑ کے پاس آئے اور کہا آپ لوگوں نے عزت کے بدلے میں ذلت کو خرید لیا، کم حقوق حاصل کر کے بہت سے حقوق سے دست کشی کرلی اچھا اب آپ بذات خود آج ہماری ایک بات مان لیجئے۔ پھر کبھی کوئی بات نہ مانیگا، وہ یہ ہے کہ آپ حضرت امام حسنؑ کو تو اس صلح کے راستے پر جو اُنھوں نے اختیار کیا ہے چھوڑ دیجیے لیکن آپ اپنے ساتھیوں کو جو کوفہ میں ہیں یا کوفہ کے باہر جمع کیجیے اور ہم دونوں کو مقدمۃ الجیش کا افسر بنا دیجئے۔ پھر دیکھیگا کہ معاویہ کو خبر بھی نہ ہو گی بعد ہم اچانک تلواریں مارتے ہوئے نظر آئیں گے۔ حضرت امام حسینؑ نے فرمایا، نہیں ہو سکتا۔ ہم عہد کر چکے اور قول دے چکے ہیں۔ اسی طرح علی بن محمد بن بشیر ہمدانی کا بیان ہے کہ میں سفیان بن ابی لیلیٰ کی معیت میں مدینہ پہنچا اور امام حسنؑ کے پاس ملنے گیا آپ کے پاس اُس وقت مسیب بن نجبہ، عبد اللہ

(۱) کتاب البلدان لابن الفقیہ الہمدانی طبع لیدن ص۱۵۳

بن وداک تیمی اور سراج بن مالک خثعمی موجود تھے۔ میں نے کہا السلام علیک یامذل المؤمنین "سلام ہو آپ کو اے مومنین کے ذلیل کرنے والے" آپ نے فرمایا وعلیک السلام بیٹھو، میں مومنین کی ذلت کا باعث نہیں ہوں۔ میں نے تو اُن کی عزت رکھ لی اور اُن کو خونریزی سے بچالیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اب جنگ کا جوش اور ولولہ باقی نہیں ہے اور کمزوری نمایاں ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اگر جنگ جاری رکھی گئی تب بھی ایک دن یہی ہونا ہے کہ معاویہ کی بادشاہت قائم ہو جائے۔" اب یہ لوگ حضرت کے پاس سے اُٹھ کر امام حسینؑ کے پاس گئے اور پوری گفتگو حضرت امام حسنؑ کی بیان کی۔ آپ نے فرمایا سچ کہا ابو محمد (حضرت حسنؑ) نے تمہیں لازم ہے کہ ہر شخص تم میں سے خاموش ہو کر گھر میں بیٹھ جائے اور بیٹھا رہے اُس وقت تک کہ جب تک یہ شخص (معاویہ) زندہ ہے۔" (۱)

یہ آخری فقرہ درحقیقت بڑا دوررس تھا آپ سمجھتے تھے کہ معاہدہ کی پابندی نہیں ہوگی اور آپ جانتے تھے کہ یہ معاہدہ موت کی آخری ہچکی اُس وقت لے گا جب معاویہ دنیا سے جانے لگیں گے اور اپنے بعد جانشین نامزد کر جائیں گے۔ وہ وقت ہوگا جب ہماری جانب سے کوئی دوسرا اقدام کیا جائے۔ آئندہ چل کر دنیا کو حسینؑ کے تدبر کی داد دینا پڑے گی جنہوں نے بیس برس پہلے یعنی سنہ ۴۱ھ کے آئینہ میں سنہ ۶۰ھ کی تصویر اپنی آنکھ سے دیکھ لی اور حسینؑ کی پیش بینی آئندہ چل کر حرف بحرف پوری ہو کر رہے گی۔

اِس معاہدہ کے بعد اب بنی اُمیہ کی قوت بہت مستحکم ہوگئی تھی۔ اُن کے راستے میں جو ایک خرخشہ تھا وہ بھی بالکل دور ہوگیا تھا اور انہیں اپنی اسکیم کے پورا کرنے کا پورا موقع مل گیا تھا۔ چنانچہ جتنی شرطیں ہوئی تھیں سب کی مخالفت کی گئی اور کسی

(۱) الاخبار الطوال صفحہ ۲۲۲

ایک پر بھی عمل نہیں ہوا (۱)

پہلی شرط یہ تھی کہ کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر عمل ہوگا۔ یہ شرط مسلمانوں کے کسی فرقہ کے نزدیک بھی پوری نہیں ہوئی۔ شیعوں کا عقیدہ تو اس بارے میں ظاہر ہے۔ اور اہلسنت کے نقطۂ نظر سے حضرت رسول اللہؐ کی وفات کے بعد صرف تیس۳۰ برس تک خلافت راشدہ رہی ہے اور یہ تیس۳۰ برس کی مدت ختم ہو جاتی ہے حضرت امام حسنؑ کی صلح پر۔ اس کے بعد ملوکیت وجہانبانی اور دنیاداری ہے خلافت راشدہ نہیں ہے۔ اگر یہ شرط پوری ہوئی ہوتی کہ کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر عمل ہو تو کوئی وجہ نہ تھی کہ معاویہ کی حکومت خلافت راشدہ کے حدود سے خارج ہوتی۔ عمر بن عبد العزیز تک کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ اُن کا زمانہ خلافت راشدہ سے ملتا جلتا ہے مگر فاصلہ ہونے کی وجہ سے اُس میں محسوب نہیں ہوا۔ مگر معاویہ کے دور حکومت کے متعلق کسی نے یہ رائے ظاہر نہیں کی۔ معلوم ہوا کہ تمام مُسلمانوں کے نزدیک اس شرط پر عمل نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ واقعات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے اس کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

ان میں سے ایک بات تھی سیاسی مصالح سے زیاد بن سمیہ کو اپنے باپ کا ناجائز فرزند بنا کر اپنا بھائی قرار دینا حالانکہ اسلام میں ناجائز فرزند کو نسب میں شریک نہیں کیا گیا ہے۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ زیاد پہلے زیاد بن عبید کہلاتا تھا کیونکہ اس کی ماں سمیہ ایک ثقفی قبیلہ والے شخص کے غلام عبید کی زوجیت میں تھی اور یہ خود حارث بن کلدہ کی کنیز تھی حارث نے اس کو آزاد کر دیا تب اس کے یہاں زیاد پیدا ہوا اور اس لیے زیاد

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۹۳

غلامی سے خارج رہا اور بڑھا تو بڑا سمجھدار اور ذہین اور عقلمند اور ادیب دیکھا گیا۔ مغیرہ بن شعبہ جب خلیفۂ دوم کی طرف سے بصرہ کے حاکم ہوئے تو وہ زیاد کو اپنے ساتھ بصرہ لے گئے اور وہاں اسے لکھنا پڑھنا سکھلایا۔
جب حضرت علی بن ابیطالبؑ خلیفہ ہوئے تو آپ نے زیاد کو سرزمین فارس کا گورنر بنایا۔ آپ کی شہادت کے بعد معاویہ نے زیاد کو ایک تہدید آمیز خط لکھا جس پر زیاد نے مجمع عام میں خطبہ پڑھا اور کہا کہ جگر خوارہ کا لڑکا اور نفاق کا مرکز اور دشمنان اسلام کا سردار مجھے ڈرانا چاہتا ہے؟ حالانکہ میرے اور اُس کے درمیان رسول اللہؐ کے چچازاد بھائی (ابن عباس) اور حسنؑ بن علیؑ نوے ہزار اپنے شیعوں کی فوج لیے ہوئے موجود ہیں خدا کی قسم اگر اس نے اِدھر کا رخ کیا تو وہ دیکھے گا کہ میں تلوار لیے ہوئے سامنے موجود ہونگا اور بڑی شدید جنگ کروں گا۔ معاویہ کو معلوم ہو گیا کہ اس شخص کو دھمکیوں سے متاثر نہیں کیا جا سکتا جب امام حسنؑ نے صلح فرمائی اور معاویہ کی سلطنت مضبوط ہو گئی تو زیاد اصطخر میں قلعہ بند ہو گیا (۱)
معاویہ نے اُسے امان نامہ لکھا کہ تم میرے پاس آجاؤ۔ جو کچھ تم کہو گے وہ میں تمہیں دوں گا چنانچہ زیاد، معاویہ کے پاس آیا اور معاویہ کی بارگاہ میں اُس کا رسوخ بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ ۴۴ھ میں معاویہ نے اُسے اپنا بھائی ظاہر کیا۔ (۲) ظاہر ہے کہ ایک ایسا شخص جس کے اصلی باپ کا پتہ نہ ہو اور ہو بھی تو وہ ایک غلام کے سوا کوئی نہ ہو وہ ایک دم شہنشاہ وقت کا بھائی بن جائے اس سے بڑھ کر اس کی عزت کیا ہو سکتی ہے۔ معاویہ نے کہا یہ میرے باپ ابو سفیان کے نطفہ سے ہے اور اس کی گواہی کس نے

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۵ (۲) الوزراء والکتاب ص ۱۲

دی ؟ ابو مریم سلولی نے جو قبل اسلام طائف میں شراب بیچتا تھا اُس نے کہا کہ ابو سفیان میرے شراب خانہ میں آیا اور مجھ سے ایک اس قسم کی عورت کو بلا دینے کو کہا جو اُس رات اُس کی دلچسپی کی باعث ہو۔ میں نے سمیہ کو اس کے پاس بلا دیا اور اس طرح ابو سفیان اور سمیہ میں تعلقات ناجائز پیدا ہوئے اور اُن تعلقات سے زیاد کی ولادت ہوئی۔ ایک شخص نے قبیلۂ بنی مصطلق میں سے جس کا نام یزید تھا گواہی دی کہ میں نے ابو سفیان کو یہ کہتے سُنا تھا کہ زیاد میرے نطفہ سے ہے۔ حالانکہ پہلے زیاد نے کوفہ میں آکر وہاں کے لوگوں سے یہ خواہش کی تھی کہ تم معاویہ کے ساتھ میری قرابت کی گواہی دے دو۔ ان سب نے انکار کیا کہ ہم جھوٹی گواہی نہ دینگے۔ یہاں سے مایوس ہو کر وہ بصرہ گیا اور وہاں ایک شخص گواہی دینے کے لیے تیار ہو گیا (۱) اس ثبوت کو کافی سمجھا گیا اور زیاد معاویہ کے بھائی قرار پا گئے۔

اس بات سے مسلمانوں میں اور بالخصوص صحابہ کے طبقہ میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی کیونکہ پیغمبر اسلامؐ کا یہ ارشاد متواتر طور پر سب کو معلوم تھا کہ الولد للفراش وللعاھر الحجر یعنی بچہ اصلی شوہر کی طرف منسوب ہوگا اور زانی کے لیے بس پتھر ہیں، مگر اقتدار حکومت کے کان عوام کی چیخ پکار کے سننے سے بالاتر ہوتے ہیں۔ انھوں نے کوئی پروا نہیں کی اُن کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا کہ اس ذریعہ سے انھوں نے زیاد اور اُس کی اولاد کو ہمیشہ کے لئے خرید لیا۔

چنانچہ جب زیاد کے سر اُٹھانے کا اندیشہ پیدا ہوتا تو یہ احسان یاد دلا کر اُس کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا جاتا تھا جیسا کہ ایک مرتبہ جب کہ زیاد بہت سے تحائف لیکر معاویہ کے پاس آیا جن میں جواہرات کا ایک نہایت نفیس گلوبند بھی تھا اور معاویہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تو زیاد نے

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۱۲۲

بطور فخر کہنا شروع کیا: حضور دیکھیے میں نے آپ کیلئے کس طرح عراق کو پامال کر دیا ہے اور کس طرح وہاں کے چپے چپے پر آپ کا تسلط قائم کر دیا ہے اور وہاں کی ہر لذت و نعمت آپ کے قدموں پر لا کر ڈال دی ہے۔ یہ سن کر معاویہ ابھی کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ یزید بول اٹھا: تم نے یہ سب کچھ کیا تو کمال کیا کیا۔ ہم نے جو تم کو قبیلۂ ثقیف کی غلامی سے نکال کر قریشی ہونے کی عزت دے دی اور عبید کی فرزندی کے بجائے ابو سفیان کی فرزندی کا شرف عطا کر دیا اور دفتر میں قلم کی گھس گھس سے اونچا کر کے ممبروں کی بلندی نصیب کر دی (۱)

ظاہر ہے کہ یزید ایسے نوعمر کی زبان سے زیاد ایسے سن رسیدہ کا ان الفاظ کو سن کر ناگوار کرنا اُس احساس کمتری ہی کا نتیجہ تھا جو نسبی اعتبار سے اُس میں موجود تھا۔ پھر اس صورت میں زیاد کی نسل اب کبھی معاویہ یا اُن کے بعد یزید کے مقابلہ میں سرتابی کرنے کی کہاں ہمت رکھ سکتی تھی۔ یہ دوررس اثر تھا اس سیاسی اقدام کا جو زیاد کو بھائی بنا کر کیا گیا تھا، چاہے شریعت اس پر کتنی بھی سرزنش کا مستحق قرار دیتی ہو۔

دوسرا واقعہ: ایک شخص تھے حتات بن زید بن علقمہ تمیمی دارمی۔ حضرت رسول اللہ نے ان میں اور معاویہ میں مواخات قرار دی تھی، ویسی ہی مواخات جیسی ایک مرتبہ مہاجرین میں اور ایک مرتبہ مہاجرین و انصار میں کی گئی تھی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ اس مواخات سے نسبی احکام جاری نہیں ہوتے اور میراث ایک کی دوسرے کو نہیں ملتی۔ یہی عملدرآمد متفقہ طور پر ثابت تھا کہ ہر ایک کی میراث اُس کے نسبی ورثہ کو پہنچے۔ اُس مذہبی بھائی کو نہیں جو مواخات کے

---

(۱) طبری ج ۶ صد ۱۳۲

ذریعہ سے بھائی قرار دیا گیا ہے مگر اتفاق کی بات کہ یہ حتات، معاویہ کے پاس آئے ہوئے تھے۔ اور اُن کا وہیں انتقال ہو گیا تو معاویہ نے ان کی میراث پر قبضہ کر لیا یہ کہکر کہ یہ میرا بھائی ہے۔ اس پر بھی مسلمانوں میں شور ہوا یہاں تک کہ فرزدق نے اس بارے میں شعر بھی کہے۔

ابوك وعمی یا معاوی اورثا تراثا فیحتاز التراث اقاربہ
فما بال میراث الحتات اکلتہ ومیراث صخر جامد لك ذائبہ
فلو کان ھذا الامر فی جاھلیۃ علمت من المرء القلیل حلائبہ
ولو کان فی دین سوی ذا شنئتم لنا حقنا او غص بالماء شاربہ

(یعنی) تمہارے باپ اور میرے چچا نے اے معاویہ میراث چھوڑی تو اصول یہی رہا کہ میراث قرابداروں کو دی جائے۔ پھر کیا بات ہے کہ حتات کی میراث تو تم نے نوش جاں فرمائی اور ابو سفیان کی میراث تمہاری ہی ملکیت قرار پائی پس یہ معاملہ اگر زمانہ جاہلیت کی رسم میں داخل ہے تو ہمیں اُس کا علم ہونا چاہئے اور اگر یہ اس کے علاوہ کسی اور دین میں ہے جس کی تم نے ایجاد کی ہے تو ہمیں بھی ہمارا حق ملنا چاہئے نہیں تو یہ تمہیں ہضم نہیں ہو سکتا (۱) مگر تاریخ نہیں بتاتی کہ معاویہ نے اس مال کو کبھی واپس کیا ہو یا حتات کے ورثہ کو اُس کا معاوضہ دیا گیا ہو اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں خلاف شریعت رواج پا رہی تھیں مثلاً معاویہ نے زکوٰۃ فطرہ کے متعلق کہا ہماری رائے میں زکوٰۃ فطرہ دو مد سمرا شام ہے یعنی شام کے گیہوں دو مد۔ ابو سعید خدری نے فرمایا یہ معاویہ کی مقرر کردہ مقدار ہے۔ ہم نہ اسپر

---

(۱) اسد الغابہ ج ۱ صہ ۳۸۹

عمل کرتے ہیں اور نہ اسے قبول کرتے ہیں۔ ہم عہد رسولؐ میں ہر ایک چھوٹے بڑے اور غلام و آزاد کی طرف سے زکوٰۃ فطرہ ایک صاع گندم، ایک صاع پنیر یا جو یا کھجور یا زبیب اسی طرح نکالتے رہے یہاں تک کہ جب معاویہ حج کے لیے آئے تو انھوں نے کہا ہماری رائے میں دو مد گندم شام زکوٰۃ فطرہ ہے۔ ابو سعید خدری کا قول تھا کہ میں جب تک زندہ ہوں کبھی معاویہ کے اس کہنے کے مطابق عمل نہ کرونگا۔ ابن زبیر نے معاویہ کی اس رائے کو سُن کر کہا، بئس الاسم الفسوق بعد الایمان یعنی ایمان لانے کے بعد فاسق ہونا بہت بُرا ہے۔ مقدار زکوٰۃ فطرہ تو بس صاع ہی ہے (۱)

مقدام بن معدی کرب کی گفتگو جو معاویہ سے ہوئی ہے اُس میں انہوں نے کہا تمہیں خدا کی قسم بتاؤ کیا رسول نے نہیں فرمایا ہے کہ سونا پہننا حرام ہے۔ معاویہ نے کہا صحیح ہے۔ پھر مقدام نے کہا کیا آنحضرت نے درندہ جانوروں کی کھال پر بیٹھنا اور اُن کا پہننا ممنوع نہیں قرار دیا تھا۔ معاویہ نے کہا ہاں یہ بھی صحیح ہے۔ مقدام نے کہا پھر کیا بات ہے کہ میں یہ سب چیزیں تمہارے گھر میں دیکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ شریعت اسلام کا حکم ہے کہ پیشاب یا پاخانہ کے وقت رو بقبلہ یا پشت بقبلہ بیٹھنا جائز نہیں ہے حضرت ابو ایوب انصاری جب شام میں پہونچے تو تمام پاخانہ کے مکانات کو رو بقبلہ پایا۔ انھوں استغفار پڑھ کر منہ پھیر لیا (۲)

عرفہ کے روز حج میں تلبیہ کہنا لبیک اللّٰھم لبیک لا شریک لک لبیک الخ ضروری اور لازمی شعائر حج میں سے ہے۔ رسول کریم اور اصحاب برابر کہتے چلے آئے مگر اس نیک کام کو معاویہ ترک کرتے ہیں اور لوگوں کو تلبیہ سے منع کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے سعید سے عرفہ کے روز پوچھا کہ کیا وجہ ہے میں لوگوں سے تلبیہ کی

(۱) دراسات اللبیب ملا محمد معین ص۳۵۱ (۲) دراسات اللبیب ص۱۳۹

آواز نہیں سنتا۔ سعید نے کہا کہ لوگ معاویہ سے ڈرتے ہیں۔ یہ سنکر ابن عباس اپنے خیمہ سے نکلے اور پکارے لبیک اللھم لبیک اور کہا اگرچہ یہ معاویہ کے علی الرغم ہو، ان لوگوں نے علیؑ کی عداوت سے اس سنت کو ترک کر دیا ہے اس طرح کی تین روایتیں کنز العمال میں درج ہیں جن میں ابن عباس نے بد دعا دی ہے اس بات پر کہ عرفہ کے روز تلبیہ کہنے سے اس لیے منع کرتے ہیں کہ علیؑ عرفہ کے روز تلبیہ فرمایا کرتے تھے۔

حضرت علیؑ بن ابی طالب سے یہ کد اور ضد بہت سے سنن و احکام میں ترمیم کا باعث ہو گئی چنانچہ امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ نماز میں بسم اللہ بلند آواز سے کہنے پر زور دیتے تھے اس لئے جب بنی اُمیہ کو اقتدار حاصل ہوا تو اُنہوں نے بلند آواز سے بسم اللہ کہنے کی ممانعت پر زور دیا صرف اس کوشش میں کہ حضرت علیؑ کے آثار باقی نہ رہیں۔ (۱)

مدینہ میں معاویہ نے لوگوں کو نماز عشاء با جماعت پڑھائی تو نہ بسم اللہ پڑھی اور نہ بعض تکبیریں کہیں۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو جماعت مہاجرین و انصار نے شور مچایا کہ تم نے نماز میں عمداً چوری کی ہے یا بھول گئے ہو، بسم اللہ اور سجدہ میں جاتے ہوئے تکبیریں کہاں گئیں مگر معاویہ نے کوئی اعتنا نہیں کی اور اُس نماز کا اعادہ نہیں کیا (۲)

اس کے ساتھ ہی بخاری۔ اور مسلم دونوں کے یہاں یہ روایت موجود ہے کہ عمران بن حصین نے حضرت علیؑ کے ساتھ بصرہ میں نماز پڑھی اور ختم نماز کے بعد کہا کہ انھوں نے ہم کو وہ نماز یاد دلائی جو ہم رسول اللہ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ پھر ذکر کیا کہ علیؑ جب سجدہ سے اُٹھتے تھے اور جب سجدہ میں جاتے تو تکبیر کہتے تھے (۳)

(۱) تفسیر کبیر ج ۱ صـ۱۰۷ (۲) کنز العمال ج ۴ صـ۲۱ (۳) بخاری ج ۱ صـ۹۱

نیز مطرف بن عبد اللہ کا بیان ہے کہ میں نے اور عمران بن حصین نے علی بن ابی طالبؑ کے پیچھے نماز پڑھی پس جب علیؑ سجدہ کرتے تھے تو تکبیر کہتے تھے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تھے تو بھی تکبیر کہتے تھے اور جب دو رکعتوں کے بعد اٹھتے تھے تو تکبیر کہتے تھے۔ پس جب نماز سے فارغ ہوئے تو عمران نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا بے شک انھوں نے ہم کو حضرت رسول کی نماز یاد دلا دی یا یہ الفاظ کہے کہ انھوں نے ہم کو حضرت محمد مصطفٰےؐ والی نماز پڑھائی (۱) ان ہی باتوں کا نتیجہ تھا کہ اصحاب رسولؐ روتے تھے اور افسوس کرتے تھے چنانچہ بخاری کی روایت ہے کہ ایک روز ابو الدرداء غصہ میں بھرے گھر میں آئے۔ سبب دریافت کیا گیا تو کہنے لگے کہ میں ان لوگوں میں اُمتِ محمدؐ ہونے کی کوئی نشانی نہیں پاتا سوائے اس کے کہ نماز جماعت سے پڑھ لیتے ہیں (۲) امام مالک نے روایت کی ہے کہ جو باتیں ہم پہلے پاتے تھے اُن میں سے ایک بات بھی اب ہم نہیں دیکھتے، بجز اس کے کہ اذان دے لیتے ہیں اور زہری بیان کرتے ہیں کہ میں انس بن مالک کے پاس دمشق گیا تو ان کو روتے پایا۔ سبب پوچھا تو انس نے کہا کہ جو باتیں میں نے عہد رسول اللہؐ میں دیکھی تھیں اب اُن میں سے سوا اس نماز کے کوئی نظر نہیں آتی اور یہ نماز بھی ضائع کر دی گئی ہے (۳)

امیر شام کے یہاں گانے والوں کی قدر و منزلت ہوتی تھی چنانچہ سائب خاثر نے جو ایک فاسق و فاجر شخص تھا انھیں گانا سنا کر اپنی تمام حاجتیں جو لے کر آیا تھا پوری کرا لیں (۴)

اس آغاز کا انجام اگر یزید کی شرابخواری اور رقص و سرود کے ساتھ

(۱) بخاری ج ۱ صہ ۹۱ و ۹۶ و مسلم ج ۱ صہ ۱۶۹ (۲) بخاری ج ۱ صہ ۷۰ (۳) بخاری ج ۱ صہ ۶۵ (۴) طبری ج ۶ صہ ۱۸۸

فریفتگی کی شکل میں ظاہر ہو تو تاریخ کی طبیعی رفتار کے لحاظ سے قابل تعجب نہیں ہے،

علامہ ابن الفقیہ نے لکھا ہے کہ معاویہ نے سب سے پہلے پولیس چوکی اور پہرہ دار مقرر کیے اور خواجہ سرا بنائے اور اموال خزانہ میں جمع کر کے رکھے (۱) انھوں نے سلاطین روزگار کی طرح اپنے عمال کے ذریعہ سے نوروز اور مہرگان (ایرانی تہوار) کے تحائف وصول کیے جن کی مقدار ایک کرور درہم سالانہ تک پہنچی (۲)

مذکورۂ بالا واقعات میں سے ممکن ہے کہ بعض حیرت میں ڈالنے والے ہوں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ تاریخ میں اس سے زیادہ حیرت انگیز باتیں بھی درج ہیں جن کو دیکھکر ہر انسان یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ ابو سفیان کی اولاد کو بنی ھاشم سے ایک موروثی عداوت جو تھی اُس کی بنا پر وہ اُن کی ہر سنت، ہر رسم اور ہر طریقہ کو فنا کر دینا چاہتے تھے۔ بلکہ سرے سے اسلام ہی کو نیست و نابود کر دینے کے درپے تھے۔ صرف مجبوری یہ تھی کہ اُن کی حکومت اسلام کی بنا پر تھی اس لیے انھیں پیغمبر اسلام کی نبوت کا انکار ممکن نہ تھا لیکن وہ پھر بھی حضرت کی عظمت کے احساس اور اُس کے اثرات کے قائم رکھنے کا کوئی جوش و ولولہ نہ رکھتے تھے۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ معاویہ کو شوق پیدا ہوا ایک بڑے معمّر آدمی سے ملاقات کا جو گزشتہ زمانہ کے حالات بیان کرے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرموت میں ایک شخص ہے جس کی ۳۶۰ تین سو ساٹھ برس کی عمر ہے۔ معاویہ نے اُس کے پاس آدمی بھیجے اور اُسے بلوایا جب وہ آیا تو پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے۔ اُس نے کہا امد بن ابد۔ معاویہ نے اُس سے عبد المطلب، اور اُمیہ وغیرہ کے حالات پوچھے پھر کہا تم نے محمد کو بھی دیکھا ہے؟ اُسے ایک مسلمان کی زبان سے حضرت کا نام نامی اس طرح سُنکر حیرت ہوئی اور اُس نے کہا من محمد یعنی محمد کون؟

---

(۱) البلدان صہ ۱۰۹ (۲) الوزراء والکتاب صہ ۱۵

انھوں نے کہا "وہی رسول اللہ" اس نے کہا پھر تم نے پہلے ہی ان کا نام اس شان کے ساتھ کیوں نہ لیا جس کا خدا نے انھیں مستحق قرار دیا ہے یہ کیوں نہیں کہا کہ تم نے رسول اللہ کو دیکھا ہے (۱)

اس سے زیادہ اور انتہائی حیرت خیز یہ ہے کہ ان کو رسول اللہ کہکر سلام کیا گیا اور ان کو سزا تو درکنار، معمولی سی تنبیہ بھی نہیں کی گئی۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ عمر بن عاص ایک دفعہ اہل مصر کی ایک جماعت کے ساتھ معاویہ کے پاس دار الخلافہ شام میں باریابی کے لیے آئے یہ وہ زمانہ تھا کہ عمر بن عاص معاویہ سے کچھ برسر پرخاش تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو سمجھا دیا کہ دیکھو جب تم معاویہ کے دربار میں جانا تو اسے خلیفہ کہکر سلام نہ کرنا اور جہاں تک ممکن ہو اس سے حقارت کے ساتھ بات کرنا، اسکی وجہ سے تمھاری ہیبت اس کے دل پر قائم ہو جائے گی۔ معاویہ کو جب ان لوگوں کے پہونچنے کی اطلاع ہوئی تو وہ اپنی ذہانت سے عمر عاص کی سازش کو تاڑ گئے اور دربانوں سے کہا میرا خیال ہے کہ نابغہ کے لڑکے (عمر عاص) نے ان لوگوں کی نظر میں میری منزلت کو گھٹا دیا ہو گا، لہذا تم خیال رکھو جب یہ لوگ آئیں تو ان کے ساتھ انتہائی سختی کرنا یہاں تک کہ ہر شخص کو ان میں سے یقین ہو جائے کہ اس کی جان کی خیر نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے جو شخص معاویہ کے سامنے دربار میں حاضر ہوا وہ یوں آداب بجالایا کہ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ بس پھر کیا تھا سب نے اس کی موافقت کی اور جو آیا اس نے معاویہ کو رسول اللہ کہکر سلام کیا (۲)

مثل مشہور ہے النَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ "لوگ بادشاہوں کے طریقہ پر چلتے ہیں جب حکومت کی یہ روش ہو تو عام افراد کی نظر میں رسولؐ اور شریعت

(۱) کتاب المعمرین ص۸۸ و اسد الغابہ ج ۱ ص ۱۱۵ (۲) طبری ج ۶ ص ۱۲۵ - اسد الغابہ ص ۱۵۲

رسول کی کیا عزت باقی رہ سکتی ہے جب لوگ دیکھ رہے ہوں کہ حکومت کی طرف سے مذہب کا نیلام کرایا جاتا ہے اور تھوڑے سے سکوں کے عوض دین و مذہب کی خریداری ہوتی ہے تو لوگوں کی نگاہ میں مذہب کی کیا وقعت باقی رہ سکتی ہے

واقعہ یہ ہے کہ حتات مجاشعی، جاریہ بن قدامہ، احنف بن قیس اور جون بن قتادہ چاروں آدمی معاویہ کے پاس آئے۔ معاویہ نے ہر ایک کو ایک ایک لاکھ درہم دیئے مگر حتات کو ستر ہزار درہم دیے۔ حتات کو جب اس کا علم ہو تو معاویہ سے آکر اس کی شکایت کی۔ معاویہ نے کہا کہ ان لوگوں سے میں نے اُن کا دین خرید کیا ہے حتات نے کہا پھر مجھ سے بھی میرا دین خرید لیجئے (۱)

اب جو ذرا بھی خدا ترس مسلمان تھے وہ زندگی سے عاجز ہو گئے تھے۔ چنانچہ حکم بن عمرو غفاری نے جو یمن و خراسان کے حاکم بنائے گئے تھے جب ۵۰ھ میں ایک جنگ کے بعد اموال غنیمت حاصل کیے اور یہ حکم نامہ پہونچا کہ لوٹ کے مال کو سپاہیوں میں تقسیم کرنے کے بجائے تمام نقد و جنس خزانۂ سرکاری میں بھیجدیا جائے تو انھوں نے ہمت کر کے یہ جواب لکھ دیا کہ یہ حکم قرآن کے بالکل خلاف ہے اس لیے میں عمل کرنے سے قاصر ہوں مگر اس کے بعد اتنا خوف ہوا کہ خدا سے دعا کی بار الہا اب مجھے زندگی درکار نہیں ہے۔ میری روح قبض فرمالے اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا(۲)

آثار بنی ہاشم کے مٹانے کی سعی پیغمبری یادگاروں تک بھی پہونچی چنانچہ جب معاویہ نے حج کیا تو واپسی میں مدینہ بھی گئے اور منبر رسولؐ کو اُس کی جگہ سے حرکت دی، چاہتے تھے کہ اُسے شام لے جائیں اُسی وقت سورج کو گرہن ہوا جابر بن عبد اللہ انصاری نے کہا معاویہ نے رسول اللہ کے شہر اور اُن کے دار الہجرت میں بڑا

---

(۱) طبری ج ۶ صد ۱۳۵ - استیعاب ج ۱ صد ۱۵۴ - اسد الغابہ ج ۱ صد ۳۷۹ (۲) طبری ج ۶ صد ۱۳۰-۱۳۱

حادثہ رونما گیا۔ ضرور یہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوں گے اسی سال معاویہ لقوہ میں مبتلا ہوئے (۱)

یہ سنہ ۵۰ھ کا واقعہ ہے۔ منبر کو جنبش دیتے ہی سورج میں گرہن لگا ایسا کہ تارے نظر آنے لگے۔ اہل مدینہ میں اس سے اتنا ہیجان پیدا ہوا کہ معاویہ کو اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا اور کہا کہ میں نے تو منبر ہٹا کر صرف یہ دیکھنا چاہا تھا کہ اسے دیمک تو نہیں لگی ہے (۲)

حضرت علی بن ابیطالبؑ کے ساتھ جو دشمنی تھی وہ بھی آپ کی ذات سے خصومت کی بناء پر نہ تھی بلکہ صرف اس لیے کہ آپ بنی ہاشم کے چشم و چراغ اور اصول اسلام کے علمبردار تھے اس لیے سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ ملک میں آپ کے خلاف نفرت کرائی جائے۔ قتل عثمان کا الزام بھی فقط اس سیاست کے پورا کرنے کا ایک بہانہ تھا چنانچہ علامہ ابن حجر مکیؒ نے لکھا ہے مروان بن الحکم کی زبانی منقول ہے اس نے کہا کہ کوئی شخص علیؑ سے زیادہ عثمان کی حمایت کرنے والا نہ تھا۔ کسی نے کہا کہ پھر تم لوگ منبروں پر انھیں گالیاں کیوں دیتے ہو؟ اس نے کہا بغیر اس کے ہمارا اقتدار قائم نہیں ہو سکتا۔ (۳)

پھر جبکہ صلحنامہ کی بنیاد یعنی کتاب اور سنت کی موافقت والی شرط کا یہ انجام ہوا تو دوسری شرطوں کا نتیجہ ظاہر ہے چنانچہ دوسری شرط یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اس کے انجام کا آئندہ ایک مستقل باب میں بیان ہوگا۔

تیسری شرط یہ تھی کہ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لیے امان ہوگی۔ اس کا انجام بہت دردناک ہے۔ عراق میں زیاد بن سمیہ کے ہاتھوں

---

(۱) کتاب البلدان صہ ۲۴ (۲) طبری ج ۷ صہ ۱۳۳ (۳) صواعق محرقہ صہ ۳۳

جو خونریزیاں ہوئیں وہ صفحۂ تاریخ پر نمایاں حروف میں درج ہیں۔ اس شخص کے خصوصیات میں لکھا ہے کہ وہ جرم کے پہلے سزا دیتا، بدگمانی کی بنا پر بلا تحقیق و تفتیش قید کر دیتا اور شبہہ پر ایذارسانی کرتا تھا۔ انسان کی جان کا لینا اُس کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھا۔ اس کا ایک عجیب نمونہ اس واقعہ میں ہے کہ اس نے یہ عام حکم دیدیا تھا کہ جو نصفِ شب کے قریب گلی کوچہ میں نظر آئے اُس کو قتل کر دیا جائے۔ ایک رات ایک دیہاتی عرب کو گرفتار کیا گیا اور اُسے زیاد کے پاس لائے۔ اُس نے اپنی صفائی پیش کی کہ میں یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں، دیہات سے آج ہی آیا ہوں اور مجھے آپ کے اس حکم کی اطلاع نہیں تھی۔ زیاد نے کہا کہ واللہ میرے خیال میں تو سچ کہہ رہا ہے اور بے خطا ہے مگر تیرے قتل کر دینے میں عامۂ خلائق کے لیے بہتری ہے چنانچہ فوراً اُسے قتل کرادیا (۱)

زیاد کی ولایت کوفہ کے بعد بصرہ میں اُس کے جانشین سَمرہ بن جندب کے مظالم اُس سے بھی زیادہ تھے۔ ایک بار چھ مہینہ کی مدّت میں آٹھ ہزار آدمی اُس نے تہ تیغ کیے۔ ابو سَوار عدوی کا بیان ہے کہ سمرہ نے میری قوم میں سے ایک دن میں ۴۷ آدمی قتل کیے جو سب کے سب حافظ قرآن تھے۔

ایک دن سمرہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ شہر سے باہر نکلا، بنی اسد کے مکانوں کے قریب ایک شخص اس قبیلہ کا کسی ضرورت سے ایک گلی میں سے نکلا لشکر کے آگے کے سواروں میں سے ایک نے اُسے دیکھتے ہی اپنے حربہ سے حملہ کر دیا اور وہ گر کر خاک و خون میں تڑپنے لگا۔ سَمرہ بن جندب اُس کی لاش پر

---

(۱) طبری ج ۶ صہ ۱۲۶

سے گزرا اور واقعہ معلوم ہونے پر کہا کہ جب ہماری سواری گزرا کرے تو ہمارے نیزوں سے بچتے رہا کرو۔ (۱)

مسلم عجلی کا بیان ہے کہ ایک شخص سمرہ کے پاس آیا اور اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کی۔ پھر مسجد میں آکر نماز پڑھنا شروع کی اتنی دیر میں ایک شخص آیا اور اُس کی گردن اُڑادی اس طرح کہ مسجد میں ایک طرف اُس کا سر کٹ کر جا گرا اور دوسری طرف بدن۔

ایک دوسرے موقع کا مشاہدہ بیان کیا ہے کہ بہت سے آدمی اس طرح قتل کیے گئے کہ اُن سے شہادتین کا اقرار لیا جاتا تھا۔ وہ توحید اور رسالت کا اقرار کرتے تھے اور خوارج سے برائت کا اعلان کرتے تھے اور پھر اس کے بعد اُن کا سر قلم کر دیا جاتا تھا۔ اور یہ سب کچھ امیر شام معاویہ کی مرضی کے مطابق ہوتا تھا چنانچہ جب عرصہ کے بعد معاویہ نے سمرہ کو معزول کیا تو اُس نے کہا خدا غارت کرے معاویہ کو۔ اگر میں نے اللہ کی اتنی اطاعت کی ہوتی جتنی معاویہ کی اطاعت انجام دی تو وہ کبھی مجھ کو عذاب نہ کرتا (۲)

چوتھی شرط یہ تھی کہ حضرت علیؑ کے اصحاب اور شیعوں کے جان و مال و ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے۔ اس شرط پر قطعی عمل نہیں ہوا۔

عراق میں شیعیان علیؑ پر جتنے مظالم ہوئے اُن میں سب سے ہلکی بات یہ تھی کہ اُن کو کوفہ سے جلاوطنی پر مجبور کیا جاتا تھا اور اُن کی جگہ معاویہ کے طرفداروں کو لا کر بسایا جاتا تھا (۳)

کوفہ اور بصرہ دونوں جگہ کے شیعوں کو ملک بدر کر دیا گیا اُن میں سے اکثر کو شام کے مقام قنسرین میں جو بالکل غیر آباد تھا اے جا کر فوجی زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا (۴)

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۱۳۲ - (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۱۶۴ (۳) طبری ج ۳ صفحہ ۲۳ (۴) طبری ج ۴ صفحہ ۲۶

حجر بن عدی اور اُن کے ساتھی شام میں بلوا کر قتل کر دیے گئے حالانکہ وہ اعلان کر رہے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اپنے معاہدہ پر قائم ہیں اور باغی نہیں ہیں (۱) مگر اُن کا سب سے بڑا جرم یہی تھا کہ وہ محب اہلبیت تھے اس لیے اُن کے واسطے نہ حلم میں گنجائش تھی۔ نہ رحم و کرم اُن پر نگاہ ڈالنے کی اجازت دیتا تھا۔ صیفی بن فسیل شیبانی جو انہی میں سے ایک ممتاز فرد تھے زیاد کے پاس لائے گئے تو زیاد نے پوچھا کہ تم علی بن ابی طالب کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو کہا بہترین رائے جو اللہ کے بندگان مومنین میں سے کسی کے بارے میں رکھی جا سکتی ہے۔ زیاد نے حکم دیا کہ اسے لکڑی سے پیٹو اتنا کہ زمین سے لگ جائے چنانچہ الحفیں اتنی ہی شدت سے زد و کوب کیا گیا۔ زیاد نے کہا بس کرو۔ پھر پوچھا ہاں اب بتاؤ علیؑ کے باب میں کیا کہتے ہو۔ کہا بخدا اگر استروں اور چھریوں سے میری بوٹیاں کاٹ ڈالو تب بھی وہی کہوں گا جو پہلے سن چکے ہو۔ کہا تجھ کو ان پر لعنت کرنا ہوگی ورنہ تیری گردن اڑا دی جائے گی۔ صیفی نے کہا تو پھر پہلے گردن اڑا ہی کیوں نہ دو۔ مجھے اس میں کوئی عذر نہیں بلکہ میں اس سے راضی اور مطمئن ہوں (۲)

زیاد نے بارہ[۱۲] آدمیوں کو پابزنجیر شام کی طرف روانہ کیا (۳)

حجر[۱] بن عدی کندی، ارقم[۲] بن عبد اللہ کندی۔ شریک[۳] بن شداد حضرمی، صیفی[۴] بن فسیل۔ قبیصہ[۵] بن ضبیعہ عبسی، کریم[۶] بن عفیف خثعمی [۷] عاصم بن عوف بجلی [۸] ورقاء بن سمی [۹] بجلی [۱۰] کدام بن حیات عنزی [۱۱] عبد الرحمن بن حسان عنزی [۱۲] محرز بن شہاب تمیمی [۱۳] عبد اللہ بن حویہ سعدی

(۱) طبری ج ۶ ص ۱۴۸ و ۱۵۳ (۲) طبری ج ۶ ص ۱۴۹ (۳) طبری ج ۶ ص ۱۴۳

عتبہ بن اخنس سعدی اور سعد بن نمران ہمدانی، ان دو آدمیوں کو زیاد نے بعد میں بھیجا جس کے بعد اُن کی تعداد چودہ ہو گئی (۱)

ان میں سے سات آدمی مختلف لوگوں کی سفارش پر چھوڑ دیے گئے اور چھ آدمیوں کو مقام مرج عذرا میں تہ تیغ کیا گیا (۲)

ایک شخص عبدالرحمٰن بن حسان عنزی کے بیے معاویہ کو خود اپنی بے رحمی ناکافی محسوس ہوئی اور اُن کو پھر زیاد کے پاس بھیج دیا اس انتباہ کے ساتھ کہ یہ ان تمام لوگوں میں سب سے زیادہ شیعیت میں سخت ہے۔ تم اس کو بد سے بدتر طریقہ جو اختیار کر سکو اُس طرح قتل کرو چنانچہ زیاد کے حکم سے انھیں زندہ زمین میں دفن کر دیا گیا (۳)

حجر بن عدی اُن میں سے تھے جو مرج عذرا میں قتل کیے گئے۔ ان کو عالم اسلام میں کتنی ہر دلعزیزی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب زیاد کی مخبری کی اطلاع ام المومنین عائشہؓ کو پہونچی تو انھوں نے عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کو حسب ذیل پیغام کے ساتھ معاویہ کے پاس روانہ کیا اللہ اللہ فی حجر و اصحابہ یعنی حجر اور اُن کے اصحاب کے بارے میں خدا کا خوف کرنا مگر افسوس ہے کہ عبدالرحمٰن اُس وقت پہونچے جب حجر اپنے ساتھیوں سمیت قتل ہو چکے تھے عبدالرحمٰن نے معاویہ سے کہا آپ کے پاس سے کہاں چلا گیا تھا ابوسفیان سے میراث میں ملا ہوا حلم؟ آپ نے اُس حلم سے کام کیوں نہ لیا؟ آپ نے اُن کو جیل خانہ ہی میں ڈال دیا ہوتا اور وبا و طاعون سے ہلاک ہو جانے دیا ہوتا۔ معاویہ نے طنزیہ طور پر

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۱۵۲ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۱۵۴ (۳) طبری ج ۶ صفحہ ۱۵۵

جواب دیا کہ تمہارے ایسا کوئی مشورہ دینے والا موجود نہ تھا۔ عبدالرحمن نے کہا اب بخدا عرب میں نہ تو آپ کے حلم کا کوئی ذکر ہوگا اور نہ آپ کی اصابت رائے قابل تسلیم رہی۔ آپ نے ایسے آدمیوں کو قتل کیا جن کو قید کرکے آپ کے پاس بھیجا گیا تھا اور وہ مسلمان تھے۔"

عائشہؓ کو اس حادثہ کی اطلاع پہونچی تو اُنھوں نے کہا "اگر معاویہ کو احساس ہوتا کہ اہل کوفہ میں کچھ بھی جرأت و ہمت ہے تو وہ کبھی حجر اور اُن کے اصحاب کو گرفتار کرا کے شام بلوانے اور قتل کرنے کی جرأت نہ کرتا لیکن جگر خوارہ کے لڑکے کو معلوم ہے کہ آدمی فنا ہو چکے ہیں خدا کی قسم یہ لوگ اپنی علمی طاقت اور فقہی قابلیت کے لحاظ سے عرب کے سر اور دماغ سمجھے جا سکتے تھے۔ لبید شاعر نے کیا خوب نظم کیا ہے اپنے دو شعروں میں جن کا مضمون یہ ہے کہ گزر گئے وہ لوگ جن کے پناہ میں زندگی بسر کی جا سکتی تھی اور رہ گیا ہوں میں اب ایسے پس ماندہ افراد میں جو خارشتی اونٹ کی کھال کے مثل ہیں۔ نہ تو اُن سے کوئی فائدہ ہے اور نہ اُن سے کسی اچھائی کی توقع ہے جب وہ بات کرتے ہیں تو عیوب سے مملو ہوتی ہے۔ چاہے وہ شور و غل برپا نہ کریں۔"

جب معاویہ مدینۂ رسولؐ میں آئے اور ام المومنین عائشہؓ کے پاس سلام کے لیے حاضر ہوئے تو سب سے پہلی بات جو عائشہؓ نے پیش کی وہ حجر کا معاملہ تھا اور اس گفتگو میں یہاں تک طول ہوا کہ معاویہ نے کہا اچھا پھر چھوڑ دیجئے مجھے اور حجر کو! خدا کے یہاں دیکھا جائے گا۔

عبداللہ بن عمر کا واقعہ ہے کہ وہ: میں تھے۔ اُن کو حجر کے قتل کی خبر ملی تو وہ بے چین ہو گئے۔ نشست کو قائم نہ رکھ سکے اور کھڑے ہو کر چیخیں

مار مار کر رونے لگے۔

حسن بصری کو جب حجر اور اُن کے ساتھیوں کے قتل کا حال معلوم ہوا تو پوچھا کہ کیا اُن پر نماز جنازہ پڑھی گئی۔ کفن دیا گیا اور دفن کیا گیا اور قبلہ رخ لاش رکھی گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ سب کیا گیا۔ حسن نے کہا تو پھر بخدا حجت اُن کی تمام ہوگئی (۱) مطلب یہ تھا کہ لاشوں کے ساتھ اسلامی احکام پر عمل اُن کے مسلمان سمجھے جانے کا ثبوت ہے تو پھر اُن کا خون مباح کیونکر ہو سکتا تھا۔

ربیع بن زیاد حارثی نے جو خراسان کے حاکم تھے حجر بن عدی کے قتل ہونے اور مسلمانوں کی بے حسی کا تذکرہ کیا اور پھر جمعہ کے دن مسجد میں آکر حاضرین سے کہا ایہا الناس میں زندگی سے عاجز ہو چکا ہوں۔ اب میں ایک دعا مانگتا ہوں تم سب آمین کہنا۔ اس کے بعد ہاتھ اٹھائے اور کہا خداوندا اگر ربیع کے لیے تیرے نزدیک کچھ بہتری ہے تو جلد اُس کی روح کو قبض فرمالے۔ اس کے بعد مسجد سے باہر نکلے، کچھ دور نہ گئے تھے کہ زمین پر گرے اور انتقال کیا (۲)

خود معاویہ کو بعد میں حجر کے بیگناہ قتل کرنے کے جرم کا احساس پیدا ہوگیا تھا چنانچہ جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور تکلیف زیادہ ہوی تو ایک روز عبد اللہ بن یزید اسدی اُن کے پاس آیا اُس نے دیکھا کہ وہ بہت مضطرب ہیں اس نے خوشامدانہ لب و لہجہ میں) کہا آپ کو اضطراب کی کیا ضرورت؟! اگر مر گئے تو جنت میں پہونچے اور اگر زندہ رہے تو مسلمانوں کے جہاں پناہ رہے۔ معاویہ نے کہا "خدا رحمت نازل کرے تمہارے والد پر وہ مجھے حجر بن عدی کے قتل سے منع کرتے تھے۔ محمد بن سیرین کی روایت ہے کہ جب معاویہ کا وقت وفات قریب آیا اور انھیں گھر آلگا تو انھوں نے کہا یومی منک یا حجر یوم طویل (یعنی)

---

(۱) طبری ج ۶ صہ ۱۵۵ (۲) طبری ج ۶ صہ ۱۶۳

"اے حجر تمہارے قتل سے مجھے طویل روزگار کا سامنا ہوگا" (۱)۔ حزن و مشقت کا زمانہ طولانی ہوتا ہے لہٰذا اس سے مقصود یہ ہے کہ مجھے اس قتل کے سبب سے روز قیامت بڑی تکلیف و زحمت کا سامنا کرنا پڑیگا۔

عمرو بن الحمق الخزاعی، ایک بزرگ تھے جن کو حضرت پیغمبر نے سلام کہلوایا تھا اور اس لیے بہت بلند مرتبہ انسان سمجھے جاتے تھے، ان کی گرفتاری کا حکم ہوا اور معاویہ کی خصوصی ہدایت کے مطابق ان پر نو وار نیزے کے کیے گئے حالانکہ پہلے یا دوسرے ہی زخم میں وہ جان بحق تسلیم ہو چکے تھے (۲)

تاریخ کی تصریح کے مطابق سب سے پہلا سر جو اسلام میں نیزہ کی نوک پر بلند کیا گیا وہ ان کا سر تھا۔

ان واقعات سے شیعیان علی میں تلاطم برپا ہو گیا اور حضرت امام حسینؑ پر بھی سخت اثر ہوا چنانچہ دینوری نے لکھا ہے کہ جب حجر بن عدی اور اُن کے اصحاب قتل ہو گئے تو اہل کوفہ نے اس کو بڑی ناگوار مصیبت سمجھا اور کچھ لوگ اشراف اہل کوفہ میں سے حضرت امام حسینؑ کے پاس گئے اور آپ کو اطلاع دی۔ آپ نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون اور یہ واقعہ آپ کو بہت شاق ہوا (۳) تاہم آپ نے اس واقعہ پر ایک دم کوئی انتہائی قدم اُٹھانا مناسب نہیں سمجھا بلکہ آئندہ حالات کا بےچینی کے ساتھ انتظار کرتے رہے۔ بے شک جب معاویہ کو یہ معلوم ہوا کہ لوگ امام حسینؑ کے پاس شکایت لیے گئے ہیں اور آپ نے بھی اُن کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا ہے تو اُنھیں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں آپ مخالفت کے لیے کھڑے نہ ہو جائیں، اس بنا پر اُنھوں نے آپ کے نام ایک تہدیدی خط

---

(۱) طبری ج ۶ صہ ۱۴۳ (۲) طبری ج ۶ صہ ۱۴۴ (۳) الاخبار الطوال۔ ارشاد صہ ۲۰۶

لکھا۔ اسکے جواب میں اب حضرت امام حسینؑ خاموش نہ رہ سکتے تھے آپ نے ایک ایک کرکے امیر شام کی جو خلاف ورزیاں معاہدہ کے متعلق تھیں وہ گنوائیں اور خصوصیت کے ساتھ حجر بن عدی وغیرہ کے قتل کو آپ نے موثر الفاظ میں پیش کیا اور اس پر سخت احتجاج فرمایا جس کا ذکر اس باب کے آخر میں آئیگا۔

پانچویں شرط یہ تھی کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ یا کسی کو بھی خاندان رسول میں سے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کیجائیگی۔ نہ خفیہ نہ علانیہ۔ اس شرط کی بھی صریحی خلاف ورزی کی گئی۔ حالانکہ اس صلح کے بعد یہ حضرات ملکی اور سیاسی امور سے بالکل بے تعلق رہے مگر اس کے بعد بھی امام حسنؑ بنی اُمیہ کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہیں رہے۔ اس کی مختلف صورتیں تھیں۔ پہلے غلط پروپیگنڈے اور بے بنیاد الزامات جن سے ان کی رفعت مرتبہ پر عام نگاہوں میں حرف آئے۔

وہ لوگ سمجھتے تھے کہ خاندان پیغمبر کے ان مقدس افراد کی زندگی اتنی پاک ہے کہ ان کے خلاف ایسا الزام جو کھلا ہوا اصول شریعت کے خلاف ہو عائد کرنا کسی طرح مفید نہ ہوگا اور وہ ہرگز مسلمانوں کی جماعت میں باور نہیں کیا جا سکتا اس لیے اس طرح کے الزامات لگائے جو شرع کے حدود کے اندر تو ہوں مگر عام نگاہوں میں کچھ اچھی حیثیت سے دیکھے نہ جاتے ہوں مثلاً کثرت ازدواج اور کثرت طلاق۔ یہ چیز بجائے خود شرع اسلامی میں جائز ہے لیکن بنی اُمیہ کے پروپیگنڈے نے اس کو حضرت امام حسنؑ کی نسبت ایسے ہولناک طریقہ پر پیش کیا جس سے لوگ حضرت امام حسنؑ کی نسبت کچھ اچھی رائے قائم نہ کریں اسی طرح دونوں بھائیوں کے اختلاف طبیعت اور اختلاف رائے کا پروپیگنڈا اور ایسی بہت سی چیزیں جو صرف اموی سیاست کی پیداوار تھیں۔

دوسرے عمال بنی اُمیہ اور اُن کے ہوا خواہوں کا حضرت امام حسنؑ سے

برابر تاؤ، سخت کلامی اور دشنام طرازی جس سے کسی وقت مشتعل ہو کر حضرت امام حسنؑ یا بنی ہاشم میں سے دوسرے لوگ لڑنے مرنے پر تیار ہو جائیں اور اس سے ایک طرف ان پر معاہدہ کی خلاف ورزی کا بے بنیاد الزام عاید کیا جا سکے دوسرے ان کی خون ریزی کا ایک بہانہ ہاتھ آئے۔ اس کا اندازہ امام حسینؑ کے اُن الفاظ سے ہوتا ہے جو آپ نے مروان بن الحکم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمائے ہیں اُس وقت کہ جب امام حسنؑ کی وفات کے بعد آپ کے جنازہ پر مروان رو رہا تھا۔ امام حسینؑ نے کہا "آج تم رو رہے ہو حالانکہ اس کے پہلے تم ہی اُن کو غم و غصہ کے گھونٹ پلایا کرتے تھے"۔ مروان نے کہا "ٹھیک ہے مگر وہ سب میں ایسے انسان کے ساتھ کرتا تھا جو اس پہاڑ سے زیادہ قوت برداشت رکھنے والا تھا"۔

مگر اس انتہائی ضبط اور تحمل کے بعد بھی امام حسنؑ کی زندگی محفوظ نہ رہ سکی۔ سلطنت وقت کو جب کوئی بہانہ اُن کے خلاف کھلے ہوئے جور و ستم کا نہ ملا تو پھر وہ خاموش حربہ استعمال کیا گیا جو سلطنت بنی امیہ میں اکثر بڑی مہموں کے سر کرنے میں صرف کیا جاتا رہا تھا۔ امیر شام معاویہ نے اشعث بن قیس کی بیٹی جعدہ کے ساتھ جو حضرت امام حسنؑ کی زوجیت میں تھی ساز باز کر کے اس کو ایک لاکھ درہم بھجوائے اور یزید کے ساتھ شادی ہو جانے کا وعدہ کیا اور اُس کے ذریعہ سے حضرت کو زہر دلوا دیا جس سے آپ کے کلیجے کے ٹکڑے ہو گئے (۱) جب آپ کی حالت دگرگوں ہوئی تو آپ نے اپنے مختلف البطن بھائی محمد بن الحنفیہ کو بلا کر فرمایا کہ دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے بعد حسینؑ سے تم اختلاف کرو۔ حسینؑ میرے بعد امام ہیں اور اُن کی اطاعت لازم ہے۔ محمد نے نہایت خلوص کے ساتھ اقرار وفاداری اور امام حسینؑ کی اطاعت کا وعدہ کیا (۲) پھر حضرت نے امام حسینؑ

---

(۱) ارشاد صفحہ ۱۹۰ (۲) کافی ج ۱ صفحہ ۱۸۶

کو پاس بلایا اور وصیت کی کہ مجھے غسل و کفن کے بعد میرے جد بزرگوار رسولِ خداؐ کے روضہ پر لے جانا تاکہ ایک مرتبہ زیارت رسولؐ کا شرف اور حاصل ہو جائے (۱) اور مجھے یقین ہے کہ لوگ یہ خیال کرتے ہوئے کہ مجھے وہاں دفن کیا جائیگا۔ مزاحمت کریں گے تو خبردار اس بارے میں ایک قطرۂ خون بھی گرنے نہ پائے تم مجھکو میری دادی فاطمہ بنت اسد کی قبر کے پاس جنتہ البقیع میں دفن کر دینا (۲)

۲۸ صفر ۵۰ھ کو وہ امن و صلح و سلامتی کا شہنشاہ دنیا سے رخصت ہو گیا! امام حسینؑ وصیت کے مطابق اپنے بھائیؑ کو غسل کے بعد تابوت میں لٹا کر روضۂ رسولؐ کی طرف لے چلے۔ بنی امیہ کو یقین ہوا کہ آپ کو وہاں دفن کریں گے۔ بس کے سب مروان کے ساتھ ہتھیار باندھ کر نکل آئے اور بیچ میں سدِ راہ ہوئے۔ اس وقت بنی ہاشم کو بہت زیادہ اشتعال تھا۔ مگر حسینؑ اپنے بھائی امام حسنؑ کی وصیت اور فرض کے احساس سے مجبور تھے۔ آپ فرما رہے تھے کہ خدا قسم اگر بھائی کی وصیت اور ان کے اصول کا پاس نہ ہوتا تو تم دیکھتے کہ کیسی اس وقت تلوار چلتی ہے (۳) بہرحال حضرت امام حسنؑ کے جنازہ کو روضۂ رسولؐ سے واپس لے گئے اور جنتہ البقیع میں دفن کر دیا (۴) پھر یہ خبریں بھی معلوم ہوئیں کہ امیر شام نے امام حسنؑ کی وفات پر اظہار مسرت کیا اور طعن و تشنیع کے کلمات کہے۔ اتفاق سے اس وقت ابن عباس دمشق میں تھے۔ انھوں نے یہ الفاظ سنے تو کہا کہ خوش نہ ہو۔ تم بھی حسنؑ کے بعد عرصہ تک زندہ نہ رہو گے (۵)

حضرت امام حسنؑ کی وفات بنی ہاشم کے لیے ایک سخت حادثہ تھی چنانچہ اس سانحۂ عظیم پر بنی ہاشم ایک مہینہ کامل سوگوار رہے (۶) مگر اس کے بعد بھی امام حسینؑ اسی راستے پر قائم رہے جو امام حسنؑ نے قائم کر دیا تھا اور اس طرح یہ

---

(۱) کافی ج ۱ ص ۳۰۱ و ۱۸۷ (۲) ارشاد ص ۱۹۵ (۳) ارشاد ص ۱۹۹ (۴) کافی ج ۱ ص ۱۴۸ (۵) الاخبار الطوال ص ۲۲۱
(۶) مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۷۳

خیال بالکل غلط ثابت ہو گیا کہ آپ کو اپنے بھائی سے اصولی اختلاف تھا اور صرف اُن کے دباؤ کی وجہ سے آپ اُس پر قائم تھے ایسا نہیں بلکہ آپ اُسی راستے کو صحیح سمجھتے تھے اور اسی لیے خود صاحب اختیار ہونے کے بعد بھی اُسی کو برقرار رکھا۔ حالانکہ اس وقت شیعوں میں ہیجان بھی پیدا ہوا جس کا تذکرہ تاریخ ان الفاظ میں کرتی ہے کہ جب حضرت امام حسنؑ کی وفات ہوئی تو عراق کے شیعوں میں حرکت پیدا ہوئی اور انھوں نے امام حسینؑ کو لکھا کہ ہم لوگ معاویہ کی بیعت توڑ کر آپ سے بیعت کرنے پر تیار ہیں مگر آپ نے فرمایا کہ نہیں ہم میں اور معاویہ میں معاہدہ ہو چکا ہے، اُس کا توڑنا میرے لیے صحیح نہیں ہے بیشک جب معاویہ کا انتقال ہو گا تو دیکھا جائیگا (۱)

آپ صبر و سکون کے ساتھ تمام شرائط کی خلاف ورزی اور حکومت شام کی چیرہ دستیوں کو دیکھتے اور اُن سے متاثر ہوتے رہے اور اُنھیں آپ نے ایک ایک کر کے اُس وقت ظاہر کر دیا جب امیر شام نے آپ کو ایک تہدید آمیز خط لکھا ہے۔ آپ نے اُس کے جواب میں ایک تاریخی مکتوب تحریر فرمایا جو درج ذیل ہے :-

"تمہارا خط ملا جس میں تم نے لکھا ہے کہ تم نے میرے متعلق اپنی مخالفت کے بارے میں کچھ خبریں سنی ہیں جن کی تم کو اُمید نہ تھی۔ تم کو جو خبریں پہونچی ہیں وہ تمہارے خوشامدی لوگوں اور چغلخوروں کی پہونچائی ہوئی ہیں جو افترا و بہتان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں اس وقت تم سے مخاصمت اور جنگ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور خاموش ہوں۔ مگر تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس خاموشی سے خوش

---

(۱) ارشاد ص ۲۰۶

نہیں ہوں اور یقیناً مجھے اپنے اس سکوت سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں خدا اس کی وجہ سے مجھ پر ناراض نہ ہوا ہو اور یہ میری خاموشی تمہارے لیے اور تمہارے جیسے ہوا خواہوں کے لیے کبھی کوئی سند نہیں بن سکتی۔ کیوں معاویہ! کیا تم ہی نہیں ہو وہ شخص جس نے حجر کندی کو قتل کیا! کیا تم ہی وہ نہیں ہو جس نے ایسے نماز گزاروں اور پرہیزگاروں کو قتل کیا جو ظلم و بدعت کو پسند نہ کرتے تھے اور دین کے معاملہ میں کسی شخص کی ملامت اور سرزنش کی پرواہ نہ کرتے تھے حالانکہ تم اُن کے ساتھ بڑی سخت قسمیں کھا کر پختہ وعدے کر چکے تھے اور انھوں نے نہ کوئی فتنہ ملک میں پیدا کیا تھا اور نہ تمہاری مخالفت کی تھی مگر تم نے اُن کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑا کیا تم ہی وہ شخص نہیں ہو کہ جس نے عمر بن الحمق الخزاعی صحابی رسول کو قتل کیا جو ایسا صالح اور عبادت گزار بندہ تھا کہ کثرت عبادت سے اُس کا جسم گھل گیا تھا۔ بدن ڈھل گیا تھا، قوتیں زائل ہو گئی تھیں اور چہرہ پر زردی چھا گئی تھی۔ تم نے پہلے ان کو امان دیدی تھی اور ایسا مضبوط وعدہ کیا تھا کہ اگر ایسا وعدہ کسی جانور سے بھی کیا جائے تو وہ بھی پہاڑ کی چوٹی سے اتر کر پاس آجائے پھر تم نے بڑی جسارت کے ساتھ اس عہد کو توڑ دیا اور بے جرم و خطا اُن کو مار ڈالا۔ کیا تم ہی وہ شخص نہیں ہو جس نے زیاد بن سمیہ کو جو بنی ثقیف کے غلام عبید نامی کا بیٹا تھا اپنا بھائی، اپنے باپ ابو سفیان کا بیٹا قرار دیا حالانکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ بیٹا اُس کا سمجھا جائیگا جو عورت کا اصلی شوہر ہو اور زنا کار کے لیے بس پتھر ہیں اور کچھ نہیں، مگر تم نے اپنی مصلحت کی بنا پر حکم رسولؐ کو پس پشت ڈال دیا اور اس کو اپنا بھائی بنا کر عراقین کا حاکم بنا دیا تاکہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ پیر قطع کرے اور ان کی آنکھوں کو گرم لوہے کی سلاخوں سے پھوڑے اور درختوں کی شاخوں میں لٹکا کر مارے۔ کیا تم ہی وہ نہیں ہو جسے زیاد بن سمیہ نے لکھا تھا کہ حضرمیین علی کے

دین پر ہیں۔ تم نے حکم دیا کہ جو لوگ علیؑ کے دین پر ہیں اُن میں سے ایک کو زندہ نہ چھوڑو۔ اُس پہ سب کو مار ڈالا اور مثلہ بھی کیا۔ اور جو تم نے مجھے لکھا ہے کہ میں اپنے نفس کا۔ اپنے دین کا، اور اُمت محمدی کا خیال کروں اور اُن کو فتنہ میں نہ ڈالوں اور جماعت کی تفریق سے پرہیز کروں تو میرے خیال میں کوئی فتنہ اس اُمت میں تمہاری خلافت و حکومت سے بڑھ کر نہیں ہے اور میں اپنے نفس، اپنے دین اور اُمتِ محمدی کے لیے کسی فائدہ کو اس سے بڑھ کر نہیں سمجھتا کہ میں اُن امور میں تمہاری مزاحمت کروں، اگر میں ایسا کروں تو بیشک قربت الٰہی کا موجب ہوگا اور اگر ترک کروں اور خاموش رہوں تو اُس کے لیے خدا سے استغفار کروں گا اور اُس سے رشد و صلاحیت کا طالب ہوں گا۔"

اس خط سے امام حسینؑ کے تاثرات کا پورے طور پر اندازہ ہوتا ہے اور یہ کہ آپ کسی اہم اقدام کے لیے اپنی ذمہ داری کو محسوس کر رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد بھی آپ نے اُس وقت تک بالکل خاموشی اختیار کی جب تک کہ معاہدہ کی آخری سانس بھی قائم سمجھی جا سکتی تھی۔ اس کے بعد کے واقعات آنے والے ابواب میں نظر ناظرین ہوں گے۔

دسواں باب

یزید کی ولیعہدی

معاویہ کے لیے اُن کی زندگی کا طویل دور کم نہ تھا جس میں اُنھوں نے مسلمانوں کی قسمت کے مالک بن کر اپنے حوصلے نکال لیے تھے اور دنیا کی جاہ و حشمت اور مال و دولت کے خوب خوب مزے اٹھا چکے تھے جس کا اعتراف اُنھوں نے ایک خاص انداز میں خود بھی کیا اور کہا کہ ہم تو دنیا میں غلطاں ہو گئے اور لوٹ لوٹ کے اُس میں رہے (۱) مگر انھوں نے اس پر اکتفا نہ کی اور یہ چاہا کہ اُن کی اولاد بھی اسی طرح بہرہ اندوز ہو۔ حالانکہ وہ معاہدہ میں یہ شرط کر چکے تھے کہ میں اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد نہ کروں گا۔ پھر بھی اُنہیں فکر اسکی ہوئی کہ اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین بنا دیں مگر وہ یزید کے افعال و عادات کی وجہ سے سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو اس پر تیار کرنا بڑا دشوار گزار مرحلہ ہے اس لیے وہ اس کو زبان پر نہیں لاتے تھے تاہم وہ رفتہ رفتہ اس کے انتظامات مکمل کر رہے تھے۔ اِن میں سے ایک ایسے باثر افراد کا جو مدعی خلافت بن سکیں ختم کرنا تھا جیسے عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید جن کا اثر اس وجہ سے شام میں بڑھ گیا تھا کہ اُن کے والد کے کارنامے رومیوں کے مقابلہ میں اہل شام کے زبان زد تھے اور اس بنا پر معاویہ کو اندیشہ تھا کہ کہیں اہل شام اُن کو خلیفہ تسلیم نہ کر لیں

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۱۸۶

لہٰذا اُن کا علاج یہ کیا گیا کہ ابن اثال کے ذریعہ سے اُن کو زہر دلوادیا جس سے اُن کا خاتمہ ہو گیا (۱) معاویہ نے ابن اثال کو اس کا معاوضہ یہ دیا کہ ہمیشہ کے لیے ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا اور حمص کے خراج کی وصول یابی کا اُسے والی قرار دیدیا (۲) مگر اُسے اِس رشوت سے فائدہ اٹھانے کا زیادہ موقع نہیں ملا اس لیے کہ عبد الرحمٰن کے بھائی مہاجر بن خالد نے مدینہ سے دمشق جاکر اپنی تلوار سے ابن اثال کو قتل کر دیا جس پر معاویہ نے مہاجر کو قید کی سزا دی اور ایک سال کے بعد رہا کیا (۳) دوسرا قول یہ ہے کہ عبد الرحمٰن کے بیٹے خالد بن عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید نے اپنے باپ کے قاتل کو حمص جاکر وہیں تہ تیغ کیا اس پر معاویہ نے اُس کو تھوڑے دن تک قید کیا پھر دیت (خوں بہا) لے کر رہا کر دیا (۴) یہ ۴۶ھ کا واقعہ ہے۔ اُن کے مقربین اور گرد و پیش کے رہنے والے اس کا اندازہ رکھتے تھے کہ معاویہ کی یہ دلی خواہش ہے کہ وہ یزید کو اپنا ولی عہد بنائیں مگر انھیں بھی اس کے بروئے کار آنے کی صورت نظر نہ آتی تھی سب سے پہلے جس نے اس تعطل اور جمود کو حرکت اور عمل میں تبدیل کیا وہ مغیرہ بن شعبہ والی کوفہ تھا۔ یہ شخص بڑا ہی مدبر اور عرب کے نہایت چالاک لوگوں میں محسوب تھا۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ مغیرہ نے شاید فقط امتحان کے طور پر دمشق جاکر معاویہ کے سامنے حکومت کوفہ سے استعفاء دینے کا خیال ظاہر کیا۔ وہ سمجھتا ہوگا کہ امیر معاویہ مجھے کسی قیمت پر ہٹانے کے لیے تیار نہ ہونگے اور اس کے بعد میری خوشامد کریں گے۔ وہاں معاملہ برعکس ہوا اور معاویہ نے ایک دوسرے شخص کو کوفہ کی حکومت کے لیے تجویز کر لیا جب یہ صورت پیش آئی تو

---

(۱) ابوزراء والکتاب صفحہ ۱۶ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۱۲۸ و ۱۲۹ (۳) الوزراء والکتاب صفحہ ۱۷ (۵) طبری ج ۶ صفحہ ۱۲۹

مغیرہ نے حکومت کوفہ پر برقرار رہنے کے لئے تدبیر کی کہ وہ یزید کے پاس گیا اور اُسے یہ پٹی پڑھائی کہ تم اپنے باپ سے ولی عہدی کا اعلان کیوں نہیں کراتے؟ (۱) کون کہہ سکتا ہے کہ یزید خود ہی اس کے واسطے دل ہی دل میں بے چین نہ ہوگا اور اگر اُسے شباب و شراب کے مشغلوں میں اب تک اس پر غور کرنے کا موقع نہ بھی ملا ہو تب بھی مغیرہ کا یہ کہنا اُس کی دیوانہ طبیعت کے لیے "ہوے بس است" سے کم نہ تھا۔ وہ پہونچا۔ وہ معاویہ کے پاس گیا اور ایک لاڈ و پیار سے پلے ہوے بے باک بیٹے کی طرح اپنے باپ سے بضد ہو کر اپنی ولی عہدی کے لیے خواہش کی اور مغیرہ بن شعبہ کے خیالات کو جو اس بارے میں تھے بیان کیا۔ معاویہ کو تو کبھی اسکی توقع ہوتی ہی نہ تھی کہ کوئی سنجیدہ انسان اس منصب کے لئے یزید کا نام پیش کرے گا انھوں نے جو مغیرہ کی یہ گفتگو سنی تو سمجھے کہ سوکھے دھانوں پانی پڑا اُنھوں نے مغیرہ کو بلوایا اور اُس سے اس بارے میں تبادلۂ خیالات کیا۔ مغیرہ نے بڑے اعتماد کے ساتھ تبلایا کہ اس مہم کا پورا ہونا کوئی مشکل نہیں ہے کوفہ میں یزید کی موافقت پر لوگوں کو ہموار کرنے کے لیے میں کافی ہوں۔ بصرہ میں زیاد اس کام کو انجام دے گا۔ ان دو مقامات کے بعد پھر تیسری جگہ کوئی ایسی ہے نہیں جو یزید کی مخالفت کی جرأت کر سکے معاویہ نے مغیرہ کی ان باتوں کو بڑی توجہ کے ساتھ سُنا اور اُس کو کوفہ کی گورنری پر بحال کر دیا۔ مغیرہ فوراً کوفہ پہونچا اور اس مقصد کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔ اُسے اپنی کارگزاری کا نتیجہ جلدی سے معاویہ کی خدمت میں پیش کر کے صلہ حاصل کرنا اور اپنی وفاداری کا سکہ جمانا تھا اِس لیے اُس نے سب سے

(۱) طبری ج ۶ صہ ۱۶۹

پہلے جو خاص بنی اُمیّہ کے ہوا خواہ تھے اُن کو بلا کر اپنے اس مقصد کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ "خلیفۃ المسلمین" اس امر کے متعلق مطمئن نہیں ہیں کہ کوفے کے لوگ اس ولی عہدی کو تسلیم کرینگے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ یہاں سے ایک وفد اُن کی خدمت میں جائے اور یہ التجا پیش کرے کہ وہ یزید کو اپنا ولی عہد قرار دیں۔ پھر بھی ایسے لوگ کم ملتے تھے جو اس وفد میں شریک ہونا پسند کریں۔ اس کے لیے مغیرہ کو اپنی جیبِ خاص یا خزانۂ سرکاری سے ۳۰ ہزار درہم رشوت میں صرف کرنا پڑے۔ اس طرح کوفیوں کا ایک وفد مرتب کر کے اپنے بیٹے موسیٰ کی قیادت میں معاویہ کے پاس روانہ کیا۔ وفد نے جیسا سبق اُسے پڑھایا گیا تھا۔ اُسی کے مطابق معاویہ سے یزید کی نامزدگی کے لیے درخواست پیش کی۔ معاویہ اس التجا کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے چنانچہ اُنھوں نے وفد کو مناسب جواب دینے کے بعد علیحدگی میں موسیٰ بن مغیرہ سے پوچھا کہ سچ بتاؤ کتنے پر تمہارے باپ نے ان لوگوں کے دین و ایمان کو خرید کیا؟ موسیٰ نے کہا تیس ہزار درہم کو۔ (۱)

معاویہ کو اس معاملہ میں مسلمانوں کی رائے عامہ کے متعلق اب بھی اطمینان نہ تھا۔ انھیں جمہور کی نفرت و بیزاری کا خوف دامنگیر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مغیرہ کے اس وفد کو رائے عامہ کا ترجمان نہیں سمجھا جا سکتا۔ اب اُنھوں نے زیاد بن ابیہ کو جسے وہ سیاسی طور پر اپنا بھائی بنا چکے تھے۔ اس معاملہ میں مشورہ لینے کے طور پر خط لکھا۔ زیاد کو معاویہ کی اس خواہش کا اندازہ بہت عرصہ سے ہوگا۔ اب اس خط سے اس خواہش کا اظہار بھی ہوگیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایک وفادار گورنر کی حیثیت سے اس کا کیا فرض ہونا چاہیئے تھا خصوصاً جبکہ

---

(۱) کامل ابن اثیر

معاملہ اس کے "بھتیجے" کا تھا۔ مگر معاملہ کی نزاکت اور اُس کے تمام پہلو زیاد
کو لرزہ براندام بنا رہے تھے چنانچہ اُس نے اپنے خاص محرم راز عبید بن
کعب نمیری کو بلا کر کہا کہ "خلیفۃ المسلمین نے مجھے خط لکھا ہے کہ اُنھوں نے یزید
کی بیعت لینے کا ارادہ کیا ہے مگر اُنھیں لوگوں کی نفرت و بیزاری کا خوف ہے
اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح جمہور مسلمین متفق کیئے جا سکیں اور اس بارے میں مجھ
سے مشورہ کیا ہے۔ اسلامی ذمہ داری کا احساس بہت اہم ہے۔ اور یزید
ایک آوارہ اور مطلق العنان شخص ہے اور شکار کا بڑا دلدادہ ہے۔ تم میری طرف
سے سرکار کے پاس جا کر یزید کے افعال و حالات کا تذکرہ کرو اور کہو کہ ذرا
سوچ سمجھ کر اس کام کو کیجئے۔ تھوڑے دن کی تاخیر کر لینا اس سے بہتر ہے کہ
جلد بازی سے کام لیا جائے۔ جس کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں ظاہر ہو۔" عبید
نے اس میں اتنی ترمیم کہ معاویہ کو اس طرح دو ٹوک جواب نہ دیا جائے بلکہ
یزید سے مل کر اُس سے کہا جائے کہ اگر آپ کو رائے عامہ اپنے موافق بنانا
ہے تو ان افعال کو ترک کیجئے جنھیں مسلمان عموماً ناپسند کرتے ہیں۔ زیاد
نے معاویہ کو صرف اتنا لکھا کہ اس بارے میں ذرا تاخیر سے کام لیجئے تعجیل مناسب
نہیں ہے (۱) کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد یزید نے بہت سی اپنی بد اعمالیوں کو
ترک کر دیا (۲) مگر بعد کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کینہ یزید کے دل میں
زیاد کی طرف سے پیدا ہو گیا۔ بلکہ شاید ہم سنی کی رقابت سے اُس کو یہ خیال
ہوا کہ زیاد نے یہ مخالفت اپنے بیٹے عبید اللہ کے اشارے سے کی ہے اس لیئے وہ
عبید اللہ بن زیاد سے بھی ایک عرصہ تک اس کے بعد بدظن رہا۔
۴۹ھ یا ۵۰ھ میں ستر برس کی عمر میں مغیرہ کا انتقال ہو گیا (۳)

(۱) طبری ج ۶ صہ ۱۶۹ (۲) طبری ج ۶ صہ ۱۷۰ (۳) طبری ج ۶ صہ ۱۳۱

اب کوفہ میں زیاد کی حکومت ہوگئی۔ وہ ۴۵ھ میں معاویہ کی طرف سے بصرہ خراسان اور سجستان کا حاکم بنایا گیا تھا۔ پھر بحرین اور عمان بھی اسکی حکومت میں شامل کردیئے گئے (۱) اب مغیرہ کے مرنے کے بعد کوفہ بھی اسکی حکومت میں شامل کردیا گیا۔ چونکہ اُسکی قلمرو میں بصرہ اور کوفہ دو اہم مقام تھے لہذا اب وہ سال میں چھ مہینے بصرہ میں رہتا تھا اور چھ مہینے کوفہ میں اور اس مدت میں بصرہ کی حکومت پر سمرہ بن جندب کو اپنا قائم مقام بنا جاتا تھا (۲) تین یا چار سال کی مدت گزرنے پر ماہ رمضان ۵۳ھ کو زیاد کی بھی وفات ہوگئی (۳) اب شاید اس اندیشہ میں کہ رہے سہے خاص خاص خیر خواہ بھی کہیں راہی ملک عدم نہو جائیں معاویہ نے ایک تحریری فرمان یزید کی ولی عہدی کا لکھ کر مجمع عام میں اُس کا اعلان کردیا اور رعایا سے اُس کا اقرار لیا گیا (۴)

واقعات بتلاتے ہیں کہ مغیرہ بن شعبہ بڑی حد تک کوفہ کی زمین کو ہموار بنانے کا کام کرچکا تھا، اور کم از کم ہواخواہان بنی اُمیہ کو اس کے لیے تیار کرلیا تھا۔ بصرہ میں بہرحال عبید اللہ بن زیاد کو اس اسکیم کی تکمیل کرنا لازم تھی۔ چاہے اُس کی ذاتی رائے اس بارے میں کچھ بھی ہوتی اور وہاں کی خلقت اس کے باپ سے اور خود اُس سے اس درجہ مرعوب و خائف تھی کہ وہاں کسی مخالفت کا امکان نہ تھا اور شام تو اپنا ملک ہی تھا۔ لے دے کر وہاں ایک عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید تھے۔ جن سے اندیشہ ہوتا اُنہیں پہلے ہی ختم کیا جا چکا تھا۔ دوسرے مقتول خلیفہ عثمان کے بیٹے سعید تھے اُنھوں نے ذرا خلافت یزید پر اظہار ناراضگی کیا اور خود معاویہ کے پاس آکر کہا کہ آپ نے یزید کو مجھ پر مقدم کیا اور اس کے لیے بیعت لی حالانکہ

(۱) طبری جلد ۶ صفحہ ۱۲۴ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۱۳۱ (۳) الوزراء والکتاب صفحہ ۱۶ (۴) طبری ج ۶ صفحہ ۱۷۰

بخدا آپ جانتے ہیں کہ میرے باپ اُس کے باپ سے بہتر اور میری ماں اُسکی ماں سے اچھی اور میں خود اُس سے بہتر ہوں اور آپ کو جو کچھ ملا ہے یہ میرے باپ کا صدقہ ہے۔ یہ سن کر معاویہ نے کہا کہ تم نے خوابِ تباب کے احسان کا مجھ پر ذکر کیا تو مجھے اُس کا انکار نہیں مگر میں نے اُس کا عوض یہ کر دیا کہ اُن کے خون کا مطالبہ کیا اور قاتلوں سے اُن کے بدلہ لیا۔ اور تمہارے باپ کی فضیلت، اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ مجھ سے بہتر تھے اور انھیں رسول خدا سے قرابت مجھ سے زیادہ حاصل تھی۔ اسی طرح تمہاری ماں کی فضیلت ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کیونکہ قریشیہ کی بزرگی کلبیہ پر ظاہر ہے۔ لیکن یہ بات کہ تم یزید سے بہتر ہو تو معلوم ہونا چاہئیے کہ میرے نزدیک اگر تم ایسوں سے میرا گھر بھرا ہو وہ سب مل کر بھی یزید کے برابر نہ ہوں گے۔

وہ تو یہ جواب سن کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ہوں گے مگر پھر کہا جاتا ہے کہ یزید نے اپنے باپ سے سفارش کی، کہ میری وجہ سے کبیدہ خاطر ہو گئے ہیں تو آپ انھیں کسی صورت سے خوش کر دیجئے۔ اس پر معاویہ نے اُنھیں خراسان کا حاکم بنا دیا (۱) اس طرح خدشہ بھی دور ہو گیا شام اور عراق کو ہموار کرنے کے بعد معاویہ نے مکّہ اور مدینہ کے متعلق خیال کیا اس زمانہ میں مروان مدینہ کا حاکم تھا۔ معاویہ نے اُس کو لکھا کہ ہم نے یزید کو اپنا ولیعہد بنایا ہے اور اس کے لیے ولیعہدی کی بیعت لی جا چکی ہے تم خود بھی یزید سے بیعت کرو اور ہماری طرف سے وہاں مدینہ کے لوگوں سے یزید کے لیے بیعت لو۔ مروان نے جب معاویہ

(۱) طبری ج ۶ صہ ۱۷۱

کا حکم پڑھا تو غصہ سے برافروختہ ہو کر گھر میں گیا۔ گھر والوں اور اپنے ماموں زاد قبیلہ بنی کنانہ کے لوگوں پر بھی اپنی اس ناراضگی اور رنج و غضب کا اظہار کیا اور اسی غصہ میں دمشق کی طرف معاویہ سے خود بات چیت کرنے کی غرض سے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہونچ کر معاویہ سے ملا اور اس انداز سے چلتا تھا جس طرح دو برابر کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ معاویہ سے غصہ سے بھری ہوئی تیز و تند تقریریں کیں اور کہا یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ چھوکروں کو امیر اور سردار بناتے ہیں۔ اس ارادہ سے باز آیئے یاد رکھیے کہ آپ کی قوم میں ایسے اور بھی موجود ہیں جو آپ کے مشورں میں شریک اور آپ کے کاموں میں آپکے وزیر و مددگار رہے ہیں۔ معاویہ نے کہا مروان خفا نہ ہو، تم بیشک خلیفۂ وقت کی نظیر ہو اور ہر مشکل میں اُس کے پشت پناہ اور مددگار ہو۔ اس لیے یزید کے بعد تم کو ہی یزید کا ولی عہد ہم نے قرار دیا ہے۔ یہ تھا وہ سیاسی منتر جس نے مروان کے غصہ کو ختم کر دیا اور مروان بخیال خود مطمئن ہو کر مدینہ واپس ہوا۔ مدینہ میں مروان نے ایک جلسہ منعقد کیا اور اس میں یزید کی تخت نشینی کے متعلق ذکر کیا اور کہا معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی بیعت کا اُسی طرح حکم دیا ہے جس طرح ابوبکر نے عمر کے لیے بیعت لی تھی۔ یہ سننا تھا کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر بگڑ گئے اور کہا ابوبکر نے اپنے بیٹے کی بیعت نہیں لی تھی یہ تو کسریٰ و قیصر کا طریقہ ہے۔ ہم ہرگز اس شرابی زانی کی بیعت نہ کریں گے۔ عبدالرحمٰن کے خیالات کی تائید حضرت امام حسینؑ، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمر نے کی۔ جو واقعہ پیش آیا اُس کی اطلاع مروان نے معاویہ کو کر دی۔ معاویہ نے کچھ دن تامل کیا۔ پھر یزید کو لے کر حج کے بہانے سے روانہ ہوئے۔ معاویہ کو خوب احساس تھا کہ ان لوگوں کو جنھوں نے خلافت یزید پر اعتراض کیا ہے۔ دنیائے اسلام

میں کیا اہمیت حاصل ہے یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ مسلمانوں کے ہر فرقہ کے نقطۂ نظر سے جن جن افراد کو اسلامی معاملات سے دلچسپی کا وارثہ ہو سکتا تھا وہ سب ہی یزید سے اختلاف رکھنے میں متفق تھے۔ چنانچہ ایک طرف ان میں حضرت حسین ابن علیؑ تھے تو دوسری طرف

عبدالرحمٰن ـــــــ ابن ابی بکر
عائشہ ـــــــ بنت ابی بکر
عبداللہ ابن عمر
عبداللہ ابن عباس اور
عبداللہ ابن زبیر بھی تھے

ان ناموں کے دیکھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں میں جو فرقہ بندی آج قائم ہے اس کا کوئی اثر یزید کی ولی عہدی کے جواز پر نہیں پڑتا۔ اصولاً یزید کی ولی عہدی سے اختلاف میں تمام وہ افراد متفق تھے جو کسی فرقہ کے نقطۂ نظر سے بھی مذہبی نمایندگی کر سکتے تھے۔ اب یہ اپنا اپنا ثبات قدم اور استقلال ہے کہ کوئی تمام مشکلات کے باوجود آخر وقت تک اپنی اس بات پر قائم رہے اور کوئی پھر حالات سے مجبور ہو جائے لیکن اصول اور آئین کے اعتبار سے ان سب کا متفق ہونا خود ایک بڑی وزنی حقیقت ہے۔

معاویہ نے ان لوگوں کو خوف دلا کر بھی دبانا چاہا اور لالچ دلا کر بھی مائل کرنا چاہا چنانچہ سب سے پہلے جب وہ مدینہ کے قریب پہنچے تو امام حسینؑ سے ملاقات ہوئی آپ کو دیکھ کر معاویہ نے کہا نہ تمہارے لیے خوشی ہو اور نہ برکت۔ تم ایک قربانی کا دنبہ ہو جس کا خون جوش ـــ

کھا رہا ہے۔ خدا کی قسم یہ خون ضرور گرایا جائے گا۔ امام حسینؑ نے فرمایا چپ رہو۔ ہم ایسے کلام کے اہل نہیں ہیں معاویہ نے کہا اس سے بھی بدتر کلام کے مستحق ہو۔ پھر اس کے بعد ابن زبیر سے ملے تو اُن سے کہا کہ تو ایک چھپے ہوئے مکار سوسمار (گوہ) کے مانند ہے جو سر کو اپنے سوراخ میں ڈال کر دم ہلاتا ہے۔ قسم ہے خدا کی عنقریب اُس کی دم پکڑ لی جائیگی۔ دور کرو اس کو اور پھر ان کے خچر پر چابک مارا اور ہٹا دیا۔ پھر اُن کے بعد عبدالرحمٰن بن ابی بکر ملے۔ اُن کو کہا کہ یہ بڈھا بھی سٹھیا گیا ہے اور اس کی عقل جاتی رہی ہے۔ پھر حکم دیا کہ ان کے سواری کے خچر پر بھی تازیانہ مارو اور ہٹا دو۔ پھر عبداللہ بن عمر سے بھی ایسا ہی سلوک کیا گیا (۱)

اس کے بعد مدینہ میں داخل ہو کر بھی خلافت یزید کے لیے ان حضرات کو ڈرانے دہلانے اور قتل کی دھمکیاں دینے لگے۔

عائشہ نے جو یہ سنا تو غصہ میں معاویہ کے پاس گئیں اور کہا کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ تم پہلے میرے ایک بھائی (محمد بن ابی بکر) کو قتل کر چکے اور تم نے لاش اُن کی آگ میں جلائی۔ آج مدینہ میں آکر میرے دوسرے بھائی کو تکلیف پہونچاتے ہو اور اُن کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کرتے ہو۔ اور فرزند رسولؐ اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کو بھی ڈراتے دھمکاتے ہو۔ تم اُن لوگوں میں سے ہو جنھیں رسول نے رحم کھا کر فتح مکہ میں قتل سے آزاد کر دیا تھا۔ تم کو ایسی حرکتیں ہرگز زیب نہیں دیتیں۔

طبری نے معاویہ کا مکالمہ جو عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے ساتھ درج کیا ہے وہ حسب ذیل ہے:-

---

(۱) کامل ابن اثیر جلد ۳ ص۲۵۴

معاویہ نے کہا اے عبدالرحمٰن کیسے ہاتھ پیروں کے ساتھ تم میری نافرمانی کرنے کی جرأت کرتے ہو۔ عبدالرحمٰن نے کہا اس لیے کہ اس امر کے لیے میں اپنے کو زیادہ مستحق سمجھتا ہوں۔ معاویہ نے کہا کہ میں اس صورت میں تمہارے قتل کا ارادہ رکھتا ہوں۔ عبدالرحمٰن کہا اگر تم ایسا کرو گے تو لعنت خدا اور سزائے آخرت کے مستحق ہو گے (۱)

یہ تو خوف دلانے کی ترکیبیں تھیں۔ جب یہ کامیاب نہیں ہوئیں تو دوسری صورت بھی اختیار کی گئی چنانچہ ایک لاکھ درہم عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے پاس بھیجے مگر انھوں نے روپیہ واپس کر دیا اور کہا کہ ہم دین کو دنیا کے عوض فروخت نہیں کریں گے اور مکہ سے ہجرت کر گئے۔ اسی طرح عبداللہ بن عمر کو بھی ایک لاکھ درہم بھیجے گئے انھوں نے کہا کہ میں بڈھا ہو چکا ہوں اور میرا دین ایک لاکھ درہم سے زیادہ قیمتی ہے۔ یہ کہہ کر روپیہ واپس کر دیا۔ اور امام حسینؑ کو بھی بہت کچھ تحفہ تحائف اور زر و مال پیش کیا گیا تھا مگر آپ نے قبول نہ فرمایا۔ اور واپس کر دیا۔

ازواج رسولؐ میں سے عائشہ نے اس مخالفت میں نمایاں حصہ لیا چنانچہ حافظ جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ معاویہ مدینہ میں منبر رسول پر بیٹھے یزید کی بیعت لے رہے تھے کہ عائشہ نے اپنے حجرہ سے پکار کر کہا کہ خاموش ہو جاؤ کیا کر رہے ہو کیا تم سے پہلے شیخین نے بھی اپنے بیٹوں کے لیے کبھی بیعت لی تھی؟ معاویہ نے کہا کہ نہیں، تو عائشہ نے کہا پھر تم کس کی پیروی کرتے ہو؟ معاویہ یہ سن کر شرمندہ ہوئے اور منبر سے اتر آئے۔

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۱۷۰

اس سے ظاہر ہے کہ یزید کی ولی عہدی سب کے نزدیک اصول شریعت اور آئین اسلام کے خلاف تھی۔ اس کے علاوہ ——— حضرت امام حسنؑ کے ساتھ شرائط صلح میں یہ بات طے پا چکی تھی کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی جانشین کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اس کے بعد معاویہ کو اپنے بیٹے کا خود نامزد کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

یہ سب اُس صورت میں بھی تھا کہ جب یزید اپنے کردار کے لحاظ سے اچھا ہی آدمی ہوتا چہ جائیکہ یزید کے اخلاق و عادات وہ تھے جو کسی شائستہ انسان اور ایک معمولی مسلمان کے بھی شایان شان نہیں چہ جائے کہ خلافت کے لیے جو بہر حال ایک مذہبی عہدہ سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب لکھتے ہیں۔ "اسلام کے شروع سے حاکم اسلام دین اور دنیا دونوں کا مقتدا سمجھا جاتا تھا۔ مذہب اور سیاست کا یہ اجتماع عقلمندانہ اصول پر مبنی تھا یا نہیں، یہ ایک مختلف فیہ بات ہے جس کے متعلق میں اپنی رائے کا اظہار ضروری نہیں سمجھتا لیکن یہ اصول عام طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس لیے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ خلیفہ اسلام میں علاوہ سیاسی قابلیت کے مذہبی اور دینی صفات بھی بدرجۂ اتم موجود ہوں۔ اور یہ سب کو معلوم تھا کہ یزید اس لحاظ سے کسی طرح بھی مستحق خلافت نہیں تھا"۔ اسی لیے جتنے سمجھدار انسان تھے سب ہی اس اقدام کو نازیبا سمجھ رہے تھے اور اُسے ایک مہلک اقدام کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔

حسن بصری کا قول تھا۔ کہ معاویہ نے چار باتیں ایسی کیں جن میں سے ایک بھی ہو تو وہی ہلاکت کے لیے کافی ہے۔ اوّل جاہلوں کی مدد سے بغیر امت کے مشورہ کے انھوں نے خلافت پر قبضہ کر لیا حالانکہ اُس وقت اصحاب

رسولؐ اور صاحبان فضیلت موجود تھے۔ دوسرے اپنے بیٹے کو جو شراب خوار نشہ باز تھا اور ریشم پہنتا اور طنبورہ بجایا کرتا تھا اپنا جانشین بنایا۔ تیسرے زیاد کو اپنے باپ ابوسفیان کا بیٹا قرار دیا حالانکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ بیٹا اُسی کا قرار دیا جا سکتا ہے جو اصلی شوہر ہو اور زنا کار کے لیے بس پتھر ہے۔ چوتھے حجر اور اصحاب حجر کا قتل کرنا۔ (۱)

دوسرا قول اُن کا یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کی تباہی کے ذمہ دار دو شخص ہیں۔ ایک عمر بن العاص جس نے معاویہ کو قرآن نیزوں پر بلند کرنے کی رائے دی تھی۔ چنانچہ وہ بلند بھی کیے گئے اور دوسرے مغیرہ جس نے معاویہ کو یزید کی بیعت لینے کا مشورہ دیا۔ اگر مغیرہ کی یہ رائے نہ ہوتی تو قیامت تک انتخاب کا اصول قائم رہتا۔ معاویہ کے بعد جو تخت نشین ہوئے وہ سب کے سب معاویہ کی مثال کے مطابق اپنے بیٹوں کی بیعت کراتے رہے۔

مسلمانوں کی اس رائے عامہ کی نمائندگی وہ چند اشخاص کر رہے تھے جن کے نام تاریخ میں درج ہیں۔

معاویہ پر یہ امر چھپا ہوا نہیں تھا کہ اس جماعت میں سب سے زیادہ نمایاں ہستی حسینؑ کی ہے اور اس بنا پر اُنھوں نے مدینہ میں آکر سب سے پہلا کام

....

(۱) کامل ابن اثیر ج ۲ صہ ۲۵ ۔ ابوالفداء ج ۱ صہ ۱۹۲ طبری جلد ۶ صہ ۱۵۶

جو کیا وہ یہ کہ حسین بن علیؑ کو بلوا کر کہا کہ اس معاملہ میں تمام لوگ ہموار ہو چکے ہیں سوائے پانچ آدمیوں کے قریش میں سے جن کی سرکردگی آپ کر رہے ہیں۔ حضرت نے متعجبانہ انداز سے کہا "میں اُن کی سرکردگی کرتا ہوں؟! معاویہ نے کہا "بے شک آپ ہی ان کے سرغنہ ہیں"۔ یہ سن کر حضرت نے فرمایا تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ آپ دوسرے لوگوں کو بلوا کر اُن سے بیعت کا مطالبہ کیجئے۔ اگر ان سب نے بیعت کر لی تو تنہا مجھ سے آپ کو کسی اندیشہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دفع الوقتی کامیاب ہوئی اور نتیجہ میں معاویہ کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی اور وہ نا اُمیدی کے ساتھ شام واپس گئے۔ امام حسینؑ کا بیعت سے انکار سلطنت کے اقتدار کو بڑی سخت ٹھوکر تھی جسے معاویہ کی قوت سیاست دانی سمجھتی تھی مگر اسے حسینؑ بن علیؑ کا ایک بڑا تدبر سمجھنا چاہیے۔ آپ نے اپنے عمل کو سلبی حدود تک محدود رکھا یعنی صرف بیعت نہ کرنا اور سکوت اختیار کرنا۔ آپ جانتے تھے کہ فریق مخالف ایک وقت میں اس سکوت کو توڑنے کے لیے تشدد سے کام لے گا جس کے لیے آپ تیار تھے مگر آپ یہ نہ چاہتے تھے کہ آپ کی طرف کسی جارحانہ اقدام کا الزام عائد کیا جا سکے دوسری طرف معاویہ نے بھی بتقاضائے سیاست اس وقت کسی عملی اقدام کو مناسب نہیں سمجھا مگر اس کے بعد نہ معاویہ تدبیروں سے غافل تھے اور نہ حسینؑ مستقبل سے بے خبر تھے۔ اصل میں حسینؑ چاہتے تھے کہ میں خاموش رہوں اور حریف تشدد سے کام لے اور معاویہ کا مطلب یہ تھا کہ ہم اپنی طرف سے عملی طور پر تشدد کی پہل نہ کریں اور حسینؑ جوش میں آ کر کوئی ایسا اقدام کر بیٹھیں جو امن عام کو صدمہ پہنچانے کی ذمہ داری اُن پر عائد کر دے۔

درحقیقت کربلا کی جنگ اپنے قریبی اسباب کے لحاظ سے شروع یہیں سے

ہوگئی مگر یہ اُس وقت ایک صبر آزما نفسیاتی کشمکش تھی جو نہ معلوم کب تک جاری رہتی اگر معاویہ کا رشتۂ عمر قطع نہ ہوتا اور نو عمر، نا تجربہ کار، غرورِ سلطنت سے بدمست یزید تختِ سلطنت پر نہ بیٹھتا۔
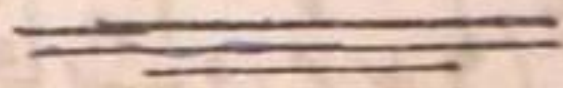
گیارھواں باب

معاویہ کی وفات اور یزید کی تخت نشینی

سنہ ۶۰ھ میں امیر شام معاویہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے

اُنھیں اپنی بیماری کے عالم میں اور خصوصاً اُس وقت جبکہ صحت سے مایوسی ہوگئی تھی شدید احساس تھا کہ اُنھوں نے یزید کی خلافت تسلیم کرانے میں کتنی محنت و مشقت برداشت کی ہے اور کس درجہ اپنے راحت و آرام اور مال و دولت اور سب سے بڑھ کر ضمیر کی قربانی کی ہے جو روحانی تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ جس کا اظہار اُنھوں نے بصیغۂ راز مروان سے کیا۔ ملاحظہ ہو علامہ ابن حجر مکی کی کتاب "تطہیر الجنان واللسان"، جو اُنھوں نے معاویہ کے مناقب و فضائل میں تصنیف کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ایک روز معاویہ رونے لگے۔ مروان نے سبب دریافت کیا۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ دنیا میں کون سی راحت تھی جو میں نے نہ اُٹھائی ہو۔ اب سِن زیادہ ہوگیا اور ہڈیاں گھل گئیں اور جسم کمزور ہوگیا لیکن اگر مجھ پر یزید کی محبت کا غلبہ نہ ہوتا تو میں اپنے لیے راہ راست کو حاصل کر لیتا (۱)

علامہ ابن حجر نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان الفاظ میں

(۱) حاشیہ صواعق محرقہ ص ۱۳۸

معاویہ نے پورے طور پر اقرار کر لیا ہے کہ یزید کی محبت نے اُن کو ہدایت کے راستوں سے اندھا بنا دیا ہے اور اسی فرط محبت نے مسلمانوں کو اُن کے بعد ایسے فاسق و فاجر کے ہاتھوں میں مبتلا کر دیا جس نے اُن کو تباہ و برباد کر دیا (۱)

پھر یہ فطری بات ہے کہ جتنا زیادہ کسی نے ایک مقصد کے لیے ایثار اور کدو کاوش کی ہو اتنی ہی اُسے اپنے اُس مقصد کی کامیابی کی فکر ہوتی ہے اور اُس میں کسی خلل کے واقع ہونے کا قلق ہوتا ہے۔ معاویہ نے یزید کے لئے کیا کچھ کیا اور اس میں اُن کے نزدیک خلل کیا باقی رہ گیا، اس کا تذکرہ انھوں نے خود یزید سے کیا اپنے مرض الموت کی ابتداء میں جبکہ اُنھوں نے اُسے بلا کر کہا:۔ بیٹا میں نے تم کو کوچ اور مقام کی زحمتوں سے بچا دیا اور تمہارے لیے تمام انتظامات مکمل کر دیے اور تمام دشمنوں کے سر تمہارے لیے خم کرا دیے اور تمام قوم عرب کی گردن کو تمہارے واسطے جھکا دیا اور سب کو تمہارے اوپر مجتمع کر دیا ہے مگر مجھے اس خلافت کے مسئلہ میں جو تمہارے لیے مکمل ہو چکا ہے بس قریش کے چار آدمیوں سے کھٹکا ہے۔ حسینؑ بن علیؑ اور عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن زبیر اور عبد الرحمٰن بن ابی بکر (۲)

ظاہر ہے کہ ان آنکھوں کی سوئیوں کے رہ جانے کا معاویہ کو کتنا خیال اور صدمہ ہوگا اور یہ صدمہ اُتنا اتنا بڑھتا جاتا تھا جتنا جتنا اُن کی موت کا وقت قریب آتا جاتا تھا۔

لیکن وہ یزید جس کے لیے انھوں نے یہ سب کچھ کیا تھا اپنے بوڑھے باپ کے آخر وقت پاس موجود بھی نہ تھا (۳) اور دمشق کے باہر مقام "حوارین" پر رنگ رلیوں میں مصروف تھا (۴) معاویہ نے اپنی حالت دگرگوں پا کر

(۱) حاشیہ صواعق محرقہ صفحہ ۵۸ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۱۷۹ (۳) طبری ج ۶ صفحہ ۱۸۲ (۴) طبری ج ۶ صفحہ ۱۶۳

اُس کے پاس بلانے کے لیے آدمی بھیجا مگر اُس کے آنے میں تاخیر ہوئی تو اُنھوں نے اپنے پولیس افیسر ضحاک بن قیس فہری اور اپنے پہرہ داروں کے سردار مسلم بن عقبہ کو بلا کر کہا کہ جب یزید یہاں آئے تو میری وصیت اُس تک پہونچا دینا اور اُسے تبلانا کہ میرا حکم اُس کے لیے یہ ہے کہ وہ اہل حجاز کے ساتھ مراعات سے کام لے، جو لوگ وہاں سے دارالسلطنت میں آئیں اُن کا اکرام واحترام کیا جائے اور جو وہاں کے اشراف اور بزرگ یہاں سے دور ہیں ان کی بھی وقتاً فوقتاً خبرگیری کی جاتی رہے اور اہل شام کو اپنا دست و بازو اور اپنا چشم و گوش بنائے رکھے اور انھیں شام کے صوبہ سے باہر زیادہ عرصہ تک نہ رکھا جائے تاکہ اُن میں دوسرے مقامات کے اخلاق و اوصاف سرایت نہ کریں۔ اس کے بعد یہ تبلا دینا کہ مجھے اُس کے خلاف صرف چار آدمیوں سے خوف ہے۔ اوّل حسینؑ بن علیؑ دوسرے عبد اللہ بن عمر تیسرے عبد الرحمن بن ابی بکر اور چوتھے عبد اللہ بن زبیر (۱)

اس وصیت سے صاف ظاہر ہے کہ معاویہ بستر مرگ پر بھی اپنے دل میں تمام درد یزید کا لیے ہوئے تھے۔ ان کو نہ اپنی بیماری کا کوئی خیال تھا نہ اپنی تکلیف کا کوئی تصور۔ نہ اپنے انجام کے متعلق کوئی فکر۔ انھیں اس وقت بھی خیال تھا، تصور تھا اور فکر تھی تو یزید اور صرف یزید کی۔ اور اس کے ساتھ آخر وقت کی پتھرائی ہوئی نگاہوں میں بھی صورتیں تھیں تو یہ چار جو یزید کے لیے اُن کے نزدیک ایک خطرہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جن میں سب سے پہلی تصویر حسینؑ کی تھی۔

رجب ۶۰ھ میں معاویہ دنیا سے رحلت کر گئے (۲) اڑتیس

(۱) الاخبار الطوال صفحہ ۲۲۳ طبری ج ۶ صفحہ ۱۸۰ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۱۸۱ ارشاد صفحہ ۲۰۶

برس کی عمر میں وہ شام کے گورنر بنے تھے ۵۸ برس کی عمر میں وہ خود مختار خلیفہ ہوئے، اور ۷۸ برس کی عمر میں اب ان کی وفات ہوئی (۱)

بعض مورخین کے بیان کے مطابق اُن کی عمر اس سے کچھ کم ۷۳، یا ۷۵ اور بعض کے نزدیک اس سے زیادہ پچاسی سال کی تھی (۲)

یزید کو اُس کی شکارگاہ میں اس سانحہ کی اطلاع دی گئی جس کو سن کر وہ دمشق پہنچا ایسے وقت جب معاویہ دفن بھی کیے جا چکے تھے۔ باپ کی بچھائی ہوئی مسند اُس کے آنے ہی کی منتظر تھی۔ وہ تخت خلافت پر متمکن ہوا اور تمام اہل شام نے فوراً اُس کی بیعت کر لی۔

---

(۱) کتاب البلدان (۲) طبری ج ۷ ص ۱۸۱

بارھواں باب
یزید تاریخ کی روشنی میں

یزید کی ماں میسون بنت بحدل بن انیف کلبیہ (۱) ایک صحرائی عورت تھی جو شہری زندگی سے نفرت کرتی تھی مگر وہ اپنے حسن و جمال کی بدولت معاویہ کی بہت منظور نظر ہو گئی تھی اور انھوں نے اُس کے لیے غوطہ کے مقابل ایک قصر تعمیر کرایا تھا جہاں سے اس پر نزہت جگہ کی سیر دور تک ہو سکتی تھی اور اُس قصر میں بڑے آرائش کے سامان اور سونے چاندی کے برتن اور دیبائے رومی کے زرکار رنگ اور منقش فرش مہیّا کیے تھے اور بہت سی حسین و جمیل کنیزیں خدمت کے لیے دی تھیں۔ ان شاہانہ انتظامات کے ساتھ میسون کو اس محل میں اُتارا گیا تھا مگر یہ سب کچھ اُس صحرائی عورت کی نگاہ میں خاک تھا اس لیے کہ اُسے تو اپنا جنگل اور اُس میں چرتی ہوئی بھیڑیں، بکریاں یاد آتی تھیں۔ ایک دن معاویہ کے محل میں آنے کا وقت تھا اور میسون ایک بہترین پوشاک پہن کر اور قیمتی زیورات پہن کر اور خوشبو لگا کر کنیزوں کے جھرمٹ میں اُس کھڑکی کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی جو کہ غوطہ کے مرغزاروں کی طرف تھی۔ اُس کو وہاں کے درخت نظر آ رہے تھے اور طائروں کے نغموں کی صدا اور پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ اُس وقت اُسے اپنا نجد کا بادیہ اور ہمجولیاں اور سہیلیاں یاد آئیں

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۱۸۳ و ج ۷ صفحہ ۱۵

جس کی بنا پر وہ بیساختہ رونے لگی اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگی۔ ایک خواص نے رونے کا سبب دریافت کیا، میسون نے ایک لمبی سانس لی اور کچھ اشعار پڑھے جن کا مضمون یہ تھا:۔ یقین سمجھو کہ وہ ڈیرا جس میں جو ہوائی ہوا کے جھونکے آتے رہتے تھے مجھے اس عالی شان محل سے زیادہ محبوب ہے اور وہ بالوں کی عبا جو میرے جسم پر ہوتی تھی ان باریک اور صاف پوشاکوں سے زیادہ محبوب تھی اور ایک سوکھی روٹی کا ٹکڑا اپنے جھونپڑے کے کونے میں بیٹھ کر کھانا مجھے ان صاف اور عمدہ روٹیوں سے زیادہ مرغوب تھا اور وہ درہ ہائے کوہ میں ہواؤں کے تھپیڑے کی صدا میرے لیے طبلوں کی آواز سے زیادہ دلکش تھی اور وہ کتا جو مہمانوں کے آنے کے وقت بھونکتا تھا ان خوبصورت سدھی ہوئی مرغابیوں سے زیادہ محبوب تھا اور وہ سرکش اونٹ جو ہودجوں کو لے کر چلتا تھا مجھے اس زین و لجام سے آراستہ خچر سے زیادہ پسند تھا اور میرے قوم و قبیلہ کا ایک دبلا پتلا حقیر آدمی مجھے ایک بدخو سٹنڈے سے زیادہ محبوب تھا۔

جب معاویہ آئے تو اس خواص نے یہ قصہ معاویہ سے دہرایا یا یہ کہ معاویہ نے میسون کو یہ اشعار پڑھتے خود سن لیا۔ بہر حال ان کو بڑا غصہ آیا اور انھوں نے کہا کہ سب تو سب اس نے مجھکو سخت بدخو سٹنڈا بنایا۔ میں اس کو تین طلاق دیتا ہوں۔ جاؤ اس سے کہو کہ وہ جو کچھ محل میں ساز و سامان ہے سب کچھ لے اور چلی جائے چنانچہ اسے نجد میں اس کے عزیزوں کے یہاں بھجوا دیا گیا۔ اس حالت میں کہ یزید اس کے پیٹ میں تھا (۱) ۲۲ھ میں یزید کا تولد ہوا (۲) دو برس کے بعد جب معاویہ کو اس کی اطلاع ہوئی

(۱) حیوۃ الحیوان ج ۲ ص ۲۰۷ (۲) طبری ج ۴ ص ۲۵۹۔

تو انھوں نے اُس کو وہاں سے بلوالیا (۱) نوجوانی ہی کی عمر سے وہ فسق و فجور اور لہو و لعب میں مبتلا ہو گیا اور سن کے ساتھ ساتھ اُس کے ان اوصاف میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ چنانچہ مختلف جانوروں کے ساتھ اُس کے رکیک حرکات کا تاریخ میں مختلف صورتوں سے چرچا موجود ہے۔

علامۂ دمیری نے لغت "فہد" کے تحت میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے اس کو گھوڑے پر سوار یزید بن معاویہ نے کیا ہے (۲) دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ یزید کے ایک بندر کو گدھے پر بیٹھنے کی مشق کرائی گئی تھی اور گھوڑ دوڑ میں اس کا بڑے شہسواروں سے مقابلہ کرایا جاتا تھا اور ایک مرتبہ وہ تمام شہسواروں سے سبقت لے گیا تو یزید نے اس بارے میں شعر کہے جن کا مضمون یہ تھا کہ کون میری طرف سے کہدے اس بندر سے جو ایک گدھی کی پشت پر بیٹھ کر گھوڑوں سے آگے نکل گیا کہ اے ابو قیس جب تو اس پر سوار ہوا کر تو اس سے لپٹا رہا کر کیونکہ اگر تو گر کر مر گیا تو اس گدھی سے کوئی باز پرس بھی نہ ہو سکے گی (۳)

یزید نے اپنے بندر کی کنیت ابو قیس قرار دی تھی اور اپنے ساغر کی بچی ہوئی شراب اُسے پلایا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ یہ بنی اسرائیل کا ایک بزرگ ہے جس نے گناہ کیا تھا تو وہ مسخ ہو گیا اور وہ اس کو ایک گدھی پر سوار کرتا تھا جو اسی مقصد سے سدھائی گئی تھی اور گھوڑ دوڑ کے میدان میں وہ اُسے گھوڑوں کے ساتھ چھوڑ دیتا تھا۔ ایک روز وہ گدھی آگے بڑھ گئی تو یزید بہت خوش ہوا اور یہ شعر پڑھے :- اے ابو قیس اس کی مہار سے

---

(۱) حیوٰۃ الحیوان ج ۲ صـ ۲۰۷ (۲) حیوٰۃ الحیوان ج ۲ صـ ۱۸۶ (۳) حیوٰۃ الحیوان ج ۲ صـ ۲۰۱

لپٹا رہا کر کیونکہ اگر تو گر پڑا تو اس پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔ اس گدھی نے یہ کار نمایاں کیا ہے کہ وہ تمام گھوڑوں سے آگے نکل گئی (۱)

یہ تو اس کے لغو افعال تھے۔ اس کے علاوہ شراب خواری اس کی ضرب المثل تھی چنانچہ عبداللہ بن زبیر نے نام ہی اس کا "سکران" یعنی بدمست رکھ لیا تھا (۲) وہ کسی موقع پر مصلحۃً بھی اس عادت کو ترک کرنے پر تیار نہ ہوتا تھا چنانچہ جب ولی عہدی کے دور میں معاویہ کے حکم سے وہ مکہ و مدینہ میں اپنا اثر و رسوخ جمانے کے لیے حج کو گیا تو مدینۃ الرسول میں پہونچ کر بھی مصاحبوں کے جھمگھٹے میں شراب کا دور ضرور چلایا (۳)

واقدی نے عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ کی زبانی نقل کیا ہے کہ خدا کی قسم ہم کو یزید کی حکومت میں یہ خوف ہو گیا تھا کہ اب آسمان سے ہم پر پتھر برسیں گے۔ وہ ایسا شخص تھا جو اپنی سوتیلی ماؤں اور اپنی بیٹیوں اور بہنوں تک کو نہ چھوڑتا تھا اور شراب آزادی سے پیتا تھا اور نماز کو ترک کرتا تھا (۴)

اتنا ہی نہیں کہ وہ عملی حیثیت سے ایک لاابالی اور گنہگار شخص تھا بلکہ اُس کے خیالات بھی ایسے ہی تھے۔ وہ اپنے افعال پر منفعل نہیں ہوتا تھا بلکہ ان پر نازاں تھا۔ اس کا مظاہرہ اُس کے دیوان کے اُن اشعار سے ہوتا ہے۔ جن میں اُس نے احکام شریعت کا مذاق اڑایا ہے بلکہ قرآن و حدیث کے ساتھ تمسخر کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اشعار میں اکثر باتیں غیر

---

(۱) تاریخ ابن الفوطی (۲) الاخبار الطوال صـ ۲۶۱ (۳) کامل جلد ۴ صـ ۶۳

واقعی بھی نظم ہو جاتی ہیں اور ان کے بیانات اکثر تخئیلی پیرایہ رکھتے ہیں مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ خیالات ویسے ہی دماغ میں آتے ہیں اور اشعار ویسے ہی تراوش کرتے ہیں جیسا انسان کا مذاق طبیعت ہوتا ہے۔ ایک دیندار، متقی اور پرہیزگار شخص سے ممکن نہیں کہ وہ اشعار میں خدا یا رسول یا آئمہ دین کے ساتھ اس طرح کی عبارتیں کرے جو انتہائی حقارت آمیز ہوں۔ یزید کے اشعار اسی طرح کے ہیں۔

وہ صرف لذائذ سے متمتع نہیں ہوتا تھا بلکہ نظریہ بھی یہی رکھتا تھا دیکھا جائے تو عمر خیام کا یہ فلسفہ کہ آخر میں فنا ہونا ہے اس لیے جتنا ممکن ہو دنیا میں مزے لوٹ لو۔ خیام سے پہلے یزید کے ذہن میں تشکیل پا چکا تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

اقول لصحب ضمت الکأس شملهم وداعی صبابات الهوی یترنّم
خذوا بنصیبٍ من نعیم ولذّة فکلّ وان طال المدیٰ یتصرّم

وہ اُن ساتھیوں سے جنھیں ساغرِ شراب نے ایک مرکز پر جمع کر دیا ہے اور جن کے سامنے عشق و محبّت کے محرکات نغمہ سرائی کرتے ہیں میرا یہ قول ہے کہ جتنا ممکن ہو عیش و لذّت سے بہرہ ور ہو لو کیونکہ کتنی ہی مدّت طولانی ہو آخر میں تو ختم ہی ہوتا ہے"۔(۱)

نماز اور شرابخواری کا موازنہ کرتے ہوئے اُس نے ایک شعر میں کہا:۔

ماقال ربک ویل للاٴلے اشربوا بل قال ربّك ویل للمصلین

(یعنی "خدا نے شرابخواروں کو عذاب سے ڈرانے کے لیے ویل للشاربین کہیں نہیں کہا بلکہ قرآن میں نماز گزاروں کو ویل للمصلین کہا ہے"۔ ایک جگہ

---

(۱) صواعق محرقہ صـ ۱۳۲

اُس نے شراب کے بارے میں اس طرح کہا ہے:۔

فان حرمت یوما علیٰ دین احمد　　فخذ ھا علیٰ دین المسیح ابن مریم

یعنی اگر دین احمد میں شراب پینے کو حرام سمجھا گیا ہے تو خیر دین مسیح پر ہو کر ہی پی لو۔"

اُس نے آخرت کی نعمتوں کا موازنہ نغمہ و شراب سے کرتے ہوئے یوں کہا ہے:۔

معشر الندمان قوموا　　واسمعوا اصوات الاغانی

واشربوا کاس مدام　　واترکوا ذکر المعانی

شغلتنی نغمة العید　　ان من صوت الاذان

وتعوضت عن الحور　　عجوزا فی الدنان

"اے حریفان شراب اُٹھو اور گانوں کی صدا سُنو، ساغر شراب پیو اور دوسری باتوں کا ذکر چھوڑ دو۔ مجھکو ستار اور سارنگی کے نغموں سے اذان کی آواز سننے کی فرصت نہیں اور حوروں کے عوض میں نے شیشہ کی بڑھی کو پسند کر لیا ہے۔"

یوں تو یہ اشعار تفریح طبع کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں مگر ان میں حور و قصور کی خبروں کا مضحکہ ضرور مضمر ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اُس نے حشر و نشر کے انکار کو بالکل صراحت کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے اپنے ان اشعار میں:۔

علیة ھاتی واعلنی وترنمی　　بذلك انی لا احب التناجیا

حدیث ابی سفیان قدما سما بھا　　الیٰ احد حتی اقام البواکیا

الا ھات سقینی علیٰ ذاك قھوة　　تخیرھا العنسی کرما شامیا

اذا ما نظرنا فی امور قدیمة　　وجدنا حلالا شربھا متوالیا

وان مت یا ام الاحیمر فانکحی
ولا تاملی بعد الفراق تلاقیا

فان الذی حدثت عن یوم بعثنا
احادیث طسم تجعل لقلب ساھیا

ولا بد لی من ان ازور محمدا
بمشمولۃ صفراء تروی عظامیا

"اے نازنین محبوبہ مجھے سُنا اور بلند آواز سے سُنا اور گا کر پڑھ مجھے جھکے جھکے گفتگو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ سنا ابو سفیان کا وہ پرانا قصہ، اُحد میں اس کا کارنامہ جہاں اُس نے دشمنوں کے گھر میں ماتم برپا کردیا تھا۔ ہاں اسی افسانہ کے ساتھ مجھے جام شراب پلاتی جا۔ وہ شراب جسے شام کے بہت منتخب انگور سے بنایا گیا ہو۔ ہم جب قدیمی عملدرآمد پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس کا پینا ہمیشہ حلال ہی نظر آتا ہے اور اگر میں مرجاؤں اے نازنین محبوبہ تو تو کسی اور سے نکاح کرلینا اور یہ اُمید نہ کرنا کہ اس جدائی کے بعد کبھی پھر ملاقات بھی ہوگی۔ دوسری زندگی کے متعلق تو نے جو قصے سنے ہوں گے وہ پارینہ قصے ہیں جو انسان کے دل کو نادانی میں مبتلا کرتے ہیں۔ یہ یقینی ہے کہ میں محمدؐ کا سامنا کروں گا ایسی شراب کے نشہ میں مست رہ کر جس کا اثر میری ہڈیوں تک پہونچ گیا ہو"

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اُس کے دل میں جاہلیت کے خیالات اور بدر واحد کا مشرکانہ جذبہ اور حضرت محمد مصطفےٰؐ سے ضد اور کد کا جذبہ موجود تھا۔ ان کے ساتھ آگے چل کر وہ اشعار بھی آئیں گے جو اس نے قتل حسینؑ کے بعد اور اہلبیت کے شام میں وارد ہونے کے وقت کہے ہیں تو وہ بھی انہی خیالات کے حامل نظر آئیں گے۔ اس سب کے باوجود یہ سیاست دنیا کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا تھا کہ ایسا شخص اسلامی خلیفہ اور ایک حیثیت سے جانشین رسولؐ اور امیرالمومنین بن کر بیٹھ گیا تھا اور مسلمانوں کی اکثریت اسکی اس حیثیت کو تسلیم کر رہی تھی۔ اس کا اثر عام مسلمانوں کے اخلاق پر کیا پڑ سکتا

سوائے اس کے کہ اُن میں بھی مذہبی بے حسی بلکہ مذہب کو نگاہ حقارت
سے دیکھنے کا جذبہ اور وہی عیش و نشاط کی گرم بازاری پیدا ہو جاتی
چنانچہ ایسا ہی ہوا۔
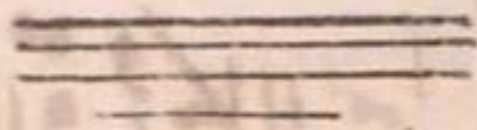
تیرھواں باب

امام حسین کے بلند اخلاق و کمالات اور گرانقدر منقولات

عرب کے ایک فلسفی شاعر نے کہا ہے :- انّ العظائمَ کفوھا العظماءُ "بڑے کارناموں کے لئے بڑے ہی نفوس درکار ہوتے ہیں" ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے :-

علیٰ قدر اھل العزم تأتی العزائمُ وتأتی علیٰ قدر الکرام المکارمُ
ویکبر فی عین الصغیر صغارھا وتصغر فی عین العظیم العظائمُ

(یعنی) صاحبان ارادہ کی شخصیت کے مطابق ہی ہوتے ہیں اُن کے ارادے اور بزرگ مرتبہ نفوس کی مناسبت سے ہی ہوتی ہیں اُن کی بزرگیاں چھوٹے آدمی کی نگاہ میں چھوٹا سا کام بھی بڑا معلوم ہوتا ہے ۔ اس لیے اوّل تو وہ اُس کے کرنے کی ہمت نہیں کرتا اور اگر کبھی لیتا ہے تو اس کو دنیا سب سے بڑا کارنامہ سمجھکر اُس پر نازاں ہوجاتا ہے اور بڑے کی نگاہ میں بڑا کام بھی چھوٹا معلوم ہوتا ہے اس لیے وہ اُسے کر گزرتا ہے اور اُس پر بھی اس کا دل نہیں بھرتا بلکہ اس سے بھی بڑے کارنامہ کے لیے تیار رہتا ہے ۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے تو مجاہدۂ کربلا ایسے عظیم الشان کارنامہ کا حامل ہونا ہی حسینؑ کے نفس کی بزرگی اور اُن کے کردار کی رفعت کے متعلق وہ سب کچھ بتلا دیتا ہے جس کا شاید پورے طور پر اندازہ کرنا اور پھر اُسے واضح طور پر الفاظ کے ذریعہ سے پیش کرنا مورخین کے تصور اور تحریر کی طاقتوں

سے باہر تھا۔
حقیقت یہ ہے کہ واقعۂ کربلا کے نادر خصوصیات عالم وقوع میں آ ہی نہ سکتے تھے اگر اُس کے انجام دینے کے لیے حسینؑ کے ایسے بلند نفس کا انسان موجود نہ ہوتا اور واقعۂ کربلا میں عظمت، اہمیت اور نتیجہ کے لحاظ سے یہ تاثیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی اگر اُس کا تعلق حسینؑ ایسی عظیم المرتبت ذات کے ساتھ نہ ہوتا۔

یوں تو واقعۂ کربلا خود ہی ایسے نادر خصوصیات رکھتا ہے کہ بحیثیت واقعہ اُس کی مثال کوئی مل نہیں سکتی لیکن اُن خصوصیات سمیت بھی اُس کی تاثیر کا بڑا تعلق اس چیز کے ساتھ ہے کہ وہ حسینؑ ایسی بلند ہستی کے ساتھ متعلق ہے۔ کوئی معمولی شخص ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا اور بفرض محال کرتا بھی تو اُس کی یہ تاثیر نہیں ہو سکتی تھی اس لیے واقعۂ کربلا کا وقوع بھی حسینؑ کے نفس کی انتہائی عظمت کا ثبوت ہے اور اُس کی وہ تاثیر بھی جو عالم اسلام میں پیدا ہوئی حسینؑ کے نفس کی رفعت و بلندی اور آپ کی شخصیت کی برتری کی دلیل ہے۔

مگر یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ شخصیت اور کردار کا باہمی تعلق ایک متعاکس نتیجہ رکھتا ہے یعنی کسی خاص عملی کارنامہ میں اہمیت اور تاثیر پیدا ہوتی ہے شخصیت کی رفعت و شہرت اور سربلندی سے اور پھر اُس انسان کی شخصیت و عظمت میں اضافہ ہو جاتا ہے اُس کردار سے۔ اس لیے کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگرچہ واقعۂ کربلا کا وجود میں آنا اور پھر اس میں یہ تاثیر پیدا ہونا ممکن نہ تھا بغیر امام حسینؑ کی شخصیت کی ہمہ گیری اور رہنمایانِ عالم میں آپ کی امتیازی فوقیت کے آفتاب کا بلا تفریق مذہب و ملت ہر واقف و منصف شخص

کی نگاہ میں خط نصف النہار پر پہنچنا بھی واقعۂ کربلا کے سبب سے تھا۔
یہی وجہ ہے کہ واقعۂ کربلا سے پہلے کی آپ کی زندگی تاریخ کے صفحات پر اس
حد تک محفوظ نہیں ہے جتنے کہ واقعۂ کربلا کے دوران میں آپ کی سیرت کے خط
وخال اپنے چھوٹے سے چھوٹے جزئیات کے ساتھ محفوظ ہیں۔ سبب اس کا
صاف ظاہر ہے۔ واقعۂ کربلا سے پہلے امام حسینؑ کو مؤرخین کی نگاہ بس اُس
حد تک دیکھ سکتی تھی جتنا کہ آپ کے بڑے بھائی حضرت امام حسنؑ یا آپ کی
اولاد میں اُن اماموں کو وہ دیکھ سکی جن میں سے ہر ایک تقویٰ، عصمت اور
پاکبازی کا مجسمہ تھا۔ جیسے اُن کے اوصاف وکردار کے متعلق کبھی اجمال
اور کبھی کچھ تفصیل کے ساتھ بعض واقعات سخاوت، عبادت، ریاضت
وحلم وغیرہ کا تذکرہ ہے اُسی طرح امام حسینؑ کے متعلق بھی جستہ جستہ اس
قسم کے مختلف واقعات اور حالات کا تذکرہ صفحات تاریخ پر موجود پایا جاتا
ہے۔ اُس وقت کے تاریخی واقعات محفوظ کرنے والوں کو سنہ ۶۰ھ کے
پہلے تک کیا معلوم تھا کہ آپ ایک ایسا عظیم کارنامہ انجام دینے والے
ہیں جس کی مثال تاریخ کے صفحات پر ناپید ہو گی تاکہ وہ ابتدائے عمر سے آپ
کی زندگی کے ہر جزئیہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے اور اُنھیں سینہ بہ سینہ
محفوظ کر کے لب بہ لب منتقل کرتے ہوئے کتابوں کے دامن تک پہونچاتے

لیکن ایک طرف تو واقعۂ کربلا کے دوران میں تمہیدی یا ضمنی طور پر تاریخ
نے جو مختلف اخلاقی واقعات اور حالات حضرت امام حسینؑ کے بیان کر
دیے ہیں وہ آپ کے سیرت وکردار کا ایک آئینہ پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف
آپ کی سابقہ زندگی کے متعلق جن روایات کو تاریخ نے ہم تک پہونچایا ہے
اُن سے بھی آپ کی عظمت، اور اوصاف وکمالات کے متعلق ایک روشن مرقع

ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ صرف ایک مظلوم اور ستم رسیدہ، شہید ہونے کے لحاظ ہی سے دنیا کے قلوب کا مرکز نہیں ہیں بلکہ آپ کے ذاتی خصوصیات اور اوصاف و کمالات بھی آپ کو دنیا کا قبلہ بنانے کے لیے کافی تھے جن سے آپ انسانیت کی معراج بلندی میں سب سے زیادہ رفیع درجہ پر نظر آتے ہیں۔

ظاہری حیثیت سے ماہرین نفسیات کے نقطۂ نظر سے شخصیتوں کی تشکیل کے اسباب حسب ذیل ہوتے ہیں۔

پہلے خاندانی خصوصیات اور بزرگوں کے قدیم روایات۔ دوسرے ماحول اور تعلیم و تربیت۔ تیسرے زندگی کے اہم تجربات۔ پہلی چیز وہ ہے جو انسان کے خون میں دوڑ کر اُس کی صلاحیت اور استعداد اور فطری قابلیتوں کی تشکیل کرتی ہے۔ دوسری چیز اُن صلاحیتوں کو فعلیت کے درجہ سے قریب تر ہو جانے کا کام انجام دیتی ہے یا بسا اوقات فعلیت میں لے آتی ہے اور تیسری چیز اُن فعلی کمالات میں پختگی پیدا کر کے ملکۂ ذاتی بناتی اور ان میں استحکام پیدا کرتی ہے۔ حضرت امام حسینؑ میں یہ تینوں باتیں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔

آپ کے خاندانی خصوصیات وہ تھے جن کی نظیر دوسرے شخص میں پائی نہ جاتی تھی۔ اور یہ خصوصیت وہ تھی جس کے لحاظ سے آپ کے مخالف گروہ کو اپنی فوقیت ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل ملتی نہ تھی سوائے ظلم و جبر اور قہر و استبداد کے۔ انھیں ایک خاص احساس کمتری کے ساتھ آپ کے بلند خصوصیات کو خود اپنی زبان پر لانا پڑتا تھا اور جواب دینے ہی کے ارادہ سے اُن کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ یزید نے بھی اپنے دربار میں اس کا اقرار کیا کہ بے شک ان کی ماں میری ماں سے بہتر اور ان کے نانا میرے نانا سے بہتر تھے (۱)

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۶۶

ان خاندانی خصوصیات کے ساتھ جو ظاہری اسباب کی بنا پر بھی حسن فطرت کے ضامن ہیں حسینؑ نے تربیت ایسی بلند پائی تھی جس سے انسان کے اخلاق و اوصاف میں بلندی پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو مختلف حالات اور متضاد واقعات کے ایسے دور سے گزرنا پڑا تھا جس میں انسان کو جذبات نفس کے خلاف عقل کی طاقت سے کام لینا پڑتا ہے اس لیے نفس میں پختہ کاری، تدبر اور استقلال پیدا ہونا لازمی ہے۔

ان واقعات سے ایک ایسا شخص بھی جو امام حسینؑ کی بحیثیت ایک معصوم ذات کے معرفت نہ رکھتا ہو، یہ ماننے کے لیے مجبور ہے کہ حسینؑ کوئی جذباتی انسان نہ تھے وہ متحمل اور بردبار تھے اور کبھی غصہ اور جوش میں آکر کوئی کام ایسا نہ کرتے تھے جو نظم و ضبط اور سکون کے خلاف ہو۔ سخت سے سخت مواقع پر خاموشی آپ کا ایک مستقل کردار بن گئی تھی بشرطیکہ اُس خاموشی سے اُن مقاصد کو کوئی ضرر نہ پہونچے جن کے وہ خود اور اُن کے نانا، باپ اور بھائی محافظ رہے تھے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایسی صلح کل، متحمل اور امن پسند ذات کسی ایسے اقدام کے لیے تیار نہیں ہو سکتی جس میں وہ اور اس کے تمام ساتھی ایک دم تہ تیغ ہو جائیں جب تک ایسے اہم اور غیر معمولی اسباب پیدا نہ ہو جائیں جن کے بعد وہ ایسا کر گزرنا خالق کی طرف سے اپنا فرض نہ سمجھے چنانچہ جب ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ ایسا کر گزرتا ہے۔ اور اس سے اُس کے نفس کی ارادی طاقت اور عملی قوت کی پختگی اور اپنے ذاتی جذبات کو فرائض کے مقابلہ میں فنا کر دینے کی وہ بلند منزل ظاہر ہوتی ہے جس پر ہر انسان نہیں پہونچ سکتا۔ نفسانیت کی فنا اور فرض شناسی کا ملکہ یہی وہ ایک جامع اور وسیع

مفہوم ہے جس کے تحت میں انسانی کردار کے تمام مظاہرات جزئی و کلی طور پر داخل ہو جاتے ہیں مگر حضرت حسینؑ کے کمالات و اوصاف کی تشریح کے لیے جب اہل معرفت نے قلم اٹھایا تو اُس پر اجمالی تبصرہ کے لیے بھی بلند ترین الفاظ تلاش کرنا پڑے اور تفصیل کے موقع پر بھی زریں روایات سامنے آئے۔

ابن ابی شیبہ مشہور محدث نے امام حسینؑ کا حال درج کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کان عالما بالقرٰان عاملا علیہ زاھدا تقیا ورعا جوادا فصیحا بلیغا عارفا باللہ و دلیلا علیٰ ذاتہ تعالیٰ"
"آپ قرآن کے عالم اور اُس پر عامل، زہد و تقویٰ کے جوہر کے حامل، پاکیزہ خصال، پرہیزگار، سخی، شیریں بیان اور شیوا زبان خدا کی معرفت رکھنے والے اور ذات الٰہی کا ایک ثبوت تھے"

آخری فقرہ سے ظاہر ہے کہ لکھنے والا پہلے تو اوصاف کے اظہار میں مجبوری اُن الفاظ کو صرف کرتا رہا جو معمولی درجہ کے علماؑ اور زہاد کے متعلق بھی صرف ہوتے رہتے ہیں پھر اُس کا حوصلۂ اظہار ان الفاظ کی کوتاہی سے تنگی کرنے لگا اور اُس نے آخری الفاظ میں صفات انسانی کی معراج کمال کا پتہ دے دیا کہ وہ اپنے خالق کے اوصاف کا مظہر بن جائے۔ علامہ ابن عربی نے اسی لیے پہلے ہی کوتاہ دامن الفاظ کے دفتر کو تہ ہی رکھنا مناسب سمجھا اور انھوں نے کہدیا کان الحسین السبط اٰیۃ من اٰیات اللہ و سبط رسول امام حسینؑ خدا کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی تھے" یہ اختصار بیان اوصاف میں وہ ہوتا ہے جو ہزار تفصیلوں سے بڑھ کر فائدہ دیتا ہے۔ حسینؑ بے شک ذات الٰہی کا ثبوت اور اُس کی بڑی نشانی تھے۔ اسی لیے

خدا کو نہ ماننے والوں کا بھی حسینؑ کو دیکھ کر دل چاہنے لگتا ہے کہ خدا کو مان لیں یا ماننے لگتے ہیں۔ جیسا کہ جوش ملیح آبادی نے کہا ہے :-

ہاں وہ حسینؑ جس کا ابد آشنا ثبات
کہتا ہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
یعنی درونِ پردۂ صد رنگِ کائنات
اک کارساز ذہن ہے اک ذی شعور ذات

سجدوں سے کھینچتا ہے جو مسجود کیطرف
تنہا جو اک اشارہ ہے معبود کیطرف

عبادت، آپ کی یعنی، وہ جسے عام طور پر عبادت سمجھا جاتا ہے ورنہ حقیقت کے لحاظ سے تو آپ کا ہر عمل رضائے پروردگار کی غرض سے اور فرض کے احساس کا نتیجہ ہوتا تھا اس لیے کوئی حرکت و سکون بھی آپ کا عبادت سے باہر نہ تھا مگر اُس محدود مفہوم کے لحاظ سے بھی جس کے اعتبار سے لوگ انسان کو عابد کہتے ہیں آپ کی عبادت دنیا کے لیے ایک بے مثال نمونہ تھی۔ رات دن کی نماز گزاری اور مسلسل روزہ داری کے علاوہ ۲۵ حج آپ نے پاپیادہ کیے (۱)

ان تمام حجوں کے واقعات اور زمانہ کی تعیین سے ہمارے موجودہ معلومات کوتاہ ہیں ایک مرتبہ کے سفر حج کا تذکرہ یہ ملتا ہے کہ خلیفہ ثالث کے زمانہ میں امام حسینؑ اپنے والد بزرگوار جناب امیرؑ کی معیت میں حج کے لیے متوجہ ہوئے مگر آپ سقیا اور عرج کے درمیان تھے کہ بیمار پڑ گئے۔ عبد اللہ بن جعفر آپ کو اُٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ حضرت علیؑ شاید کچھ آگے بڑھ چکے تھے آپ کو بھی خبر دی گئی۔ آپ اسماء بنت عمیس کو لے کر تشریف لائے۔ تقریباً بیسؔ دن تک اور ایک روایت کے مطابق چالیسؔ دن تک تیمارداری ہوتی رہی تب آپ صحیح و سالم

(۱) تہذیب الاسماء نووی ج ۲

ہو کر مدینہ واپس آئے لیکن یہ واقعہ اگر درست ہو تو اُس تعداد سے خارج ہوگا۔[1]
ہاں ایک مرتبہ کا یہ تذکرہ ہے کہ آپ اور آپ کے بھائی امام حسنؑ دونوں شاہزادے پیادہ حج کے لیے جا رہے تھے۔ اتفاق سے راستے میں حاجیوں کا قافلہ بھی اُن تک پہونچ گیا۔ اب جوان شاہزادوں کو لوگوں نے پیادہ دیکھا تو ہر شخص جس کی نظر پڑتی وہ فوراً اُن کے احترام کے لحاظ سے سواری سے اُتر پڑتا۔ کچھ دیر تو لوگ ساتھ ساتھ پیادہ چلتے رہے۔ آخر طاقت رفتار نے جواب دیا۔ سب مل کر سعد بن ابی وقاص کے پاس آئے جو اس قافلہ میں سن رسیدہ صحابی تھے اُن سے آکر کہا کہ اب تو راستا چلنا ہم لوگوں پر بہت بار ہے مگر یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ہم لوگ سوار ہوں اور یہ دونوں سردار پاپیادہ راستا طے کریں۔ سعد امام حسنؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ حضور آپ کے ساتھ والوں میں سے بعض پر پیادہ چلنا نہایت شاق ہو رہا ہے مگر لوگ جب آپ دونوں بزرگواروں کو پیادہ چلتے دیکھتے ہیں تو اُن کا دل نہیں چاہتا کہ وہ سوار ہو کر راستا چلیں اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ دونوں حضرت سوار ہو جائیں۔ امام حسنؑ نے فرمایا کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کیونکہ ہم نے اپنے اوپر فرض یہی قرار دیا ہے کہ ہم خانۂ کعبہ کی طرف اپنے پیروں سے چل کر جائیں مگر لوگوں کو تکلیف دینا بھی ہمیں گوارا نہیں ہے اس لیے ہم اس راستے کو چھوڑے دیتے ہیں چنانچہ وہ دونوں بزرگوار شاہراہ سے ہٹ کر دوسرے راستے سے روانہ ہو گئے[2]
ایک مرتبہ کے حج کا یہ تذکرہ ہے کہ آپ کے بھتیجے عبدالرحمٰن بن حسن آپ کے ساتھ تھے اور حالت احرام میں ابواء کے مقام پر اُن کی وفات ہو گئی (۳)
عبادت الٰہی کے ساتھ جو دلی وابستگی تھی اُس کا اندازہ آپ کو امام

(۱) تفسیر جامع البیان طبری ج ۲ صفحہ ۲۴ (۲) ارشاد صفحہ ۲۶۶ (۳) ارشاد صفحہ ۲۰۳

حسینؑ کے اُن الفاظ سے بھی ہو سکتا ہے جو ۹ محرم کی سہ پہر کو آپ نے ایک شب کی مہلت طلب کرنے کے موقع پر ارشاد فرمائے تھے۔ آپ نے کہا کہ اِس شب کو ہم عبادت و ذکرِ الٰہی میں بسر کر لیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ مجھے اُس کی عبادت و ذکر سے کتنی محبت ہے (۱) چنانچہ یہ شب آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے اِس طرح گزاری کہ لھم دوی کدوی النحل یعنی اُن کے تسبیح و تہلیل اور ذکر و مناجات کی آواز رات کے تاریک سناٹے میں اِس طرح گونج رہی تھی۔ کہ جیسے شہد کی مکھی کے چھتے سے آواز بلند ہوتی ہے۔ اور روز عاشورا ایسے سخت وقت میں نماز باجماعت ادا کی جب کہ موت کا بازار گرم تھا۔ کربلا کی زمین پر خون کی بارش الگ تھی۔ تیروں کی بارش الگ تھی اور گرمی سے آگ الگ برس رہی تھی مگر اس موقع پر ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ یوں ادا ہوئی کہ دو جانثاروں کو محافظت کے لیے سامنے کھڑا کیا کہ جو تیر آئے اُسے اپنے سینہ پر روکیں۔ ادھر نماز تمام ہوئی اور اُدھر اُن میں سے ایک صحابی سعید بن عبد اللہ حنفی زخموں سے چور ہو کر زمین پر گرے۔ اس طرح حسینؑ نے خالق کی عبادت اور فریضۂ نماز کی اہمیت دنیا میں ثابت کی۔

اسی کے ساتھ آپ فیاض تھے اور خلقِ خدا کو فائدہ پہونچانے کی فکر رکھتے تھے۔ اس کے واقعات تاریخ میں بکثرت ملتے ہیں۔

خود رسول اللہؐ نے اپنے اس نواسے کے اندر بچپنے ہی سے اس صفت

---

(۱) ارشاد ص ۳۰۳

کو کچھ ایسا نمایاں پایا کہ ارشاد فرمایا :- امّا الحسن فان لہ ھیبتی و سوددی و امّا الحسین فان لہ جودی و شجاعتی (یعنی) :- حسن کے لیے میرا رعب و داب اور شان سرداری ہے اور حسین میں میری سخاوت اور میری بہادری (۱) یوں تو حسینؑ اوصاف رسول کے وارث تھے ہی لیکن خصوصیت سے اپنی سخاوت و شجاعت بخشنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت کے یہ اوصاف دیگر اوصاف سے ضرور کچھ امتیاز رکھتے ہیں۔

خدمت خلق اور نوع انسانی کی ہمدردی کے بہترین جذبہ کے ساتھ ساتھ آپ نے اس کی بھی تلقین فرمائی ہے کہ اس بارے میں حفظ مراتب کا خیال رکھنا چاہیے یعنی سائل جتنا صفات کے اعتبار سے قابل عزت ہو اور علم و معرفت میں بلند درجہ رکھتا ہو اتنا اُس کے ساتھ سلوک بہتر کیا جائے اس کا بہترین ثبوت یہ واقعہ ہے۔ کہ ایک اعرابی امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور تسلیم بجا لایا اور عرض حال کرتے ہوئے کہنے لگا کہ میں نے آپ کے جد بزرگوار کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب کوئی حاجت پیش کرنا ہو تو چار قسم کے آدمیوں میں سے کسی ایک کے سامنے پیش کرو یا تو شریف النفس عرب یا سخی سردار یا حامل قرآن یا وجیہ و شکیل انسان۔ آپ میں یہ چاروں صفتیں جمع ہیں۔ عرب قوم، اُس کو تو شرف آپ کے جد بزرگوار سے حاصل ہوا۔ اور سخاوت۔ یہ آپ کا شیوہ اور خصلت ہے اور قرآن، وہ آپ ہی کے گھر میں نازل ہوا اور خوبصورتی، اس کے متعلق میں نے آپ کے جد بزرگوار کو فرماتے ہوئے سنا کہ اگر مجھے دیکھنا ہو تو حسنؑ و حسینؑ کو دیکھ لینا۔ یہ پُر معرفت تقریر سنکر حضرت نے فرمایا کہ تمہاری حاجت کیا ہے؟ اُس نے اپنی حاجت زمین پر لکھدی۔ آپ نے فرمایا کہ میں

---

(۱) ارشاد صفحہ ۱۹۱

اپنے والد بزرگوار کا یہ قول سُنا ہے کہ ہر انسان کی قدر و قیمت وہی ہے کہ جو اس میں ہنر موجود ہے اور میں نے اپنے جد بزرگوار کا ارشاد یہ سُنا ہے کہ احسان بقدر معرفت ہونا چاہیے اس لیے میں تم سے تین سوال دریافت کرتا ہوں اگر تم نے ایک سوال کا جواب ٹھیک دیا تو تم کو میں اپنا ایک تہائی مال دے دوں گا۔ اگر دو جواب تم نے ٹھیک دیے تو دو تہائی مال دوں گا اور اگر تم نے تینوں سوالوں کا جواب درست دیا تو جو کچھ میرے پاس موجود ہے وہ سب میں تمھیں دیدوں گا۔ میرے پاس مال دنیا سے اس وقت یہ ایک تھیلی ہے زر نقد کی جو عراق سے بھیجی گئی ہے۔ اُس نے کہا پوچھیے اللہ میری مدد کرے گا۔ آپ نے فرمایا بتاؤ کون سا عمل سب میں بہتر ہے؟ اس نے کہا اللہ پر ایمان لانا۔ پوچھا کہ اچھا بندہ کی نجات کا ذریعہ ہلاکت سے کیا ہے؟ اُس نے کہا اللہ پر بھروسا رکھنا۔ حضرتؑ نے فرمایا انسان کی زینت کیا ہے اس نے کہا علم جس کے ساتھ عقل موجود ہو۔ فرمایا اگر یہ نہ ہو؟ اُس نے کہا پھر مال ہو جس کے ساتھ سخاوت موجود ہو۔ فرمایا اگر یہ بھی نہ ہو؟ اُس نے کہا پھر فقیری ہو جس کے ساتھ صبر موجود ہو۔ حضرت نے فرمایا اور اگر یہ بھی نہ ہو تو؟ اُس نے کہا تو پھر ایک بجلی گرے اور اس شخص کو جلا کر خاکستر کر دے۔ حضرت ہنسنے لگے اور وہ پوری تھیلی اُس کی جانب پھینکدی۔ (۱)

یہ طرزِ عمل غربا اور مساکین کو معلومات مذہبی حاصل کرنے کا بہترین محرک تھا اور اس ذریعہ سے عوام میں علوم و معارف کی اشاعت ہوتی تھی۔ یہ اس لیے تھا کہ آپ خود اپنے تمام صفات جلیلہ کے ساتھ ساتھ عالم تھے ایسے جن سے لوگ مذہبی مسائل اور اہم مشکلات میں رجوع کرتے تھے۔ عرب کی مثل ہے الناس

(۱) تفسیر کبیر ج ۲ صـ ۲۷۲ - غرائب القرآن ج ۱ صـ ۱۲۶

اعداء لما جہلوا" لوگ دشمن ہوتے ہیں اُس چیز کے جس کو وہ نہ جانتے ہوں"
رؤساء اور حکام جو خود علم و ہنر سے بے بہرہ ہوا کرتے ہیں اپنی اس کمزوری پر پردہ
ڈالنے کے لیے عام افراد کی علمی سطح کو پست رکھنے کی فکر کرتے اور لوگوں کی نظر
میں علم و ہنر کی قدر و قیمت گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اسلام کے حقیقی
رہنما ہمیشہ مسلمانوں کی علمی سطح کے بلند کرنے میں منہمک رہے۔ حضرت علیؑ کی زندگی
اسی میں گذری اور آپ کے فرزند اسی راستے پر قائم رہے۔

علاوہ اُن خطب اور اشعار کے جو آپ کی زبانی منقول ہیں اور جو علم الٰہیات
اور معارف حقہ کے خزانہ دار ہیں یا اُن دعاؤں اور مناجاتوں کے جو آپ کی زبان
سے نکلی ہیں اور جن میں سے بعض کا مجموعہ "صحیفہ حسینیہ" کے نام سے اس وقت بھی
موجود ہے اور جو خالق و مخلوق کے باہمی ربط کی بے نظیر آئینہ دار ہیں، اگر جوامع
حدیث کی سیر کی جائے تو اُن میں مسائل فقہیہ کے بارے میں کثیر احادیث آپ
سے منقول ملیں گے۔

اُس وقت بھی جب آپ الحرم کو لے کر مکہ معظمہ سے برآمد ہوئے ہیں اور سفر
غربت اختیار کیا ہے تو راستے میں فرزدق بن غالب شاعر سے ملاقات
ہوئی اور اس نے کچھ مسائل آپ سے نذر اور مناسک حج کے متعلق دریافت
کیے اور اُن کا جواب حاصل کیا (۱)

اسی کا نتیجہ ہے کہ کربلا میں آپ کے اصحاب کی فہرست پر نظر ڈالنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ وہ عوام نہیں تھے بلکہ اس وقت کی اسلامی جماعت کی پوری روح
اور علم و عمل کا مکمل خزانہ تھا جو حسینؑ پر نثار ہو رہا تھا۔ اُن میں حافظانِ قرآن
بھی تھے۔ حاملانِ کتاب بھی اور حاملانِ حدیث بھی۔ ان کے جذب اور کشش

(۱) ارشاد ص۲۳۵

کا مرکز کوئی ہو ہی نہیں سکتا سوا ایسی ذات کے جو خود ان صفات میں بلند تر درجہ رکھتی ہو۔ بلکہ جو آپ کے خاندانی مخالف تھے۔ وہ بھی آپ کی بلندی مرتبہ اور برتری صفات کے قائل تھے چنانچہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں ایک مجمع تھا جس میں ابو سعید خدری اور عبد اللہ بن عمرو بن العاص بھی ___ موجود تھے۔ اُدھر سے حضرت امام حسینؑ کا گزر ہوا اور آپ نے تعلیم اسلام کے مطابق مجمع کو سلام کیا۔ سب نے جواب سلام دیا۔ اُس وقت عمرو بن العاص کے فرزند عبد اللہ چپ رہے۔ جب سب جواب دیکر خاموش ہو گئے تو اُنھوں نے آواز بلند کی اور کہا وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ پھر مجمع کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا کیا میں آپ لوگوں کو بتلاؤں کہ اہل زمین میں سب سے زیادہ محبوب شخص اہل آسمان کا کون ہے؟ سب نے کہا ضرور بتلایئے۔ اُنھوں نے کہا وہ یہی راستے سے گزرنے والا ہے انھوں نے مجھ سے جنگ صفین کے بعد سے اب تک بات نہیں کی ہے اور اگر یہ مجھ سے کسی طرح راضی ہو جائیں تو یہ میرے لیے سُرخ رنگ کے اونٹوں سے زیادہ محبوب چیز ہو گی (۱)

یہ عبد اللہ خاندان بنی امیہ میں زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں مشہور تھے مگر جنگ صفین میں اپنے باپ عمرو بن العاص کے ساتھ حضرت علیؑ سے جنگ کرنے کے لیے آ گئے تھے۔ اُس وقت سے حضرت امام حسینؑ نے ان سے بات کرنا چھوڑ دی تھی مگر اس کے باوجود اُن کے دل پر حضرت کے بلند اوصاف ___ کا اس درجہ اثر قائم تھا۔

راستبازی میں داخل ہے اخلاقی جرأت، حسینؑ میں اخلاقی جرأت ایسی تھی کہ بچپنے میں خلیفۂ دوم کو منبر پر ٹوک دیا۔ اور فرمایا انزل عن مجلس ابی

(۱) اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۳۵

اُترئیے میرے باپ کی جگہ سے"، حضرت عمر نے کہا سچ کہتے ہو صاحبزادے تمہارے ہی باپ کا منبر ہے۔ خدا کی قسم میرے باپ کا منبر نہیں۔"

راست بازی اور راست کرداری کا کھلا ہوا نمونہ یہ تھا کہ آپ نے معرکۂ کربلا کے پہلے مکہ سے روانگی کے بعد اپنی جماعت کی تعداد کو قائم رکھنے کے لیے کبھی آئندہ کے خطرات کو پوشیدہ نہیں کیا بلکہ برابر صورت حال سے مطلع کرتے رہے اور بار بار آئندہ کے خطرات کو یقینی بتا کر ساتھ والوں کو حفاظت جان و مال کے لیے الگ ہو جانے کا مشورہ دیا اور یہ طریقہ اُس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ کسی ایک شخص کے بھی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا امکان سمجھا جا سکتا تھا۔

آپ امن پسند بھی ایسے تھے کہ آخر وقت تک دشمن سے صلح کرنے کی خود اپنی طرف سے کوشش جاری رکھی مگر اس کے ساتھ عزم و استقلال اور ہمت ایسی رکھتے تھے کہ جان دیدی مگر جو راستہ پہلے دن صحیح سمجھ کر اختیار کر لیا تھا اُس سے ذرہ بھر بھی نہ ہٹے۔

اُنھوں نے بحیثیت ایک فرزند کے باپ کی اطاعت کی اور چھوٹے بھائی ہو کر بھائی کی اطاعت کی اس طرح کہ اُن کی وفادارانہ اطاعت میں کبھی کمزوری نظر نہ آئی اور پھر بحیثیت ایک سردار کے کربلا کے واقعہ میں ایک پوری جماعت کی قیادت کی اس طرح کہ ان کے نظم قیادت کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ اس کے ساتھ آپ کی نگاہ نے مردم شناسی کا وہ حیرت انگیز نمونہ پیش کیا کہ اتنے سخت اور دشوار گزار راستے کے لیے جن ساتھیوں کو منتخب کر کے اپنے ساتھ لے لیا تھا اُن میں سے ایک نے بھی وفاداری اور جاں نثاری میں کمی نہ کی اور سب یک جان و یک دل ہو کر مقصد حق کے لیے کوشاں رہے یہاں تک کہ جانیں قربان کر دیں۔

امام حسینؑ کے مقولات

بلند مرتبہ افراد میں بھی بیشتر وہی افراد ہوتے ہیں جن کے اقوال کو اُن کے اعمال پر نمایاں فوقیت حاصل ہوتی ہے مگر حسینؑ کا کردار بذات خود اتنا بلند تھا کہ اُس نے دنیا کی زبان اور اُس کے قلم کی متواتر توجہ کو اپنے لیے مخصوص کر لیا لہٰذا آپ کے مقولات کو یکجا کرنے کی زیادہ کوشش نہیں کی گئی۔ پھر بھی آپ کے مقولات متفرق طور سے مختلف کتابوں میں کچھ نہ کچھ مل ہی جاتے ہیں اور وہ بڑی حد تک آپ کی زندگی کے مختلف رخوں کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں نظم بھی ہیں اور نثر بھی

چنانچہ آپ نے فرمایا ہے کہ

(۱) من جاد ساد ومن بخل ذل

جس نے دیا لیا اُس نے سرداری پائی اور جس نے کنجوسی کی اُس نے ذلت اٹھائی۔

(۲) اجود الناس من اعطیٰ من لا یرجوہ۔

سخی وہی ہے جس نے اُس کو بھی دیا جو اُس سے کوئی توقع وابستہ نہ رکھ سکتا ہو۔

(۳) من انعم اللہ منکم فلینعم علےٰ غیرہ

جس کو خدا نے دیا ہے وہ اوروں کو بھی دے۔

(۴) حوائج الناس الیکم من نعم اللہ علیکم

اہل حاجت کا تمہارے پاس آنا بھی تم پر خدا کی نعمتوں میں سے ہے

(۵) اغن عن المخلوق بالخالق تغن عن الکاذب والصادق

واسترزق الرحمٰن من فضله	فلیس غیر اللہ من رازق
من ظنّ ان الناس یغنونه	فلیس بالرحمٰن بالواثق
اوظن انّ الناس یکفونه	زلّت به النعلان من حالق

خدا سے لو لگا کر مخلوق سے بے نیاز ہو جاؤ تو پھر کسی جھوٹے سچ کی نہیں پرواہ نہ رہے گی۔ مانگنا ہو تو خدا ہی سے مانگو غیر خدا روزی دینے والا نہیں ہے۔ جس کا خیال ہو کہ لوگ اُس کو غنی کر دیں گے اُس کو خدا پر اعتماد نہیں اور جو یہ سمجھتا ہو کہ لوگ اُس کے لیے کافی ہیں وہ یقیناً بڑی پستی میں گرنے والا ہے۔

(۶) کلّما زید صاحب المال مالاً	زید فی همّه وفی الاشتغال

ادھر تو مال والوں کے مال بڑھتے ہیں اور اُدھر اُن کے افکار و اشغال میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۷) من وصل الی اللہ انقطع عن غیرہ

جو خدا سے متصل ہوا اُس کے غیر سے جُدا ہو گیا

ابن کثیر نے بدایۃ النہایہ میں اسحٰق بن ابراہیم کی روایت سے نقل کیا ہے کہ امام حسینؑ نے جنۃ البقیع میں قبور شہداء کی زیارت کی اور حسب ذیل اشعار پڑھے

نادیت سکان القبور فاسکتوا	فاجابنی عن صمتهم ترب الحشا
قالت اتدری ما صنعت بساکنی	مزّقت لحمهم وخرّقت الکسا
وحشوت اعینهم ترابا بعد ما	کانت تأذی بالیسیر من القذا
اما العظام فاننی مزّقتها	حتی تباینت المفاصل والشوی
قطعت ذا من ذا ومن هذا کذا	فترکتها ممّا یطول بها البلا

"میں نے قبروں کے رہنے والوں کو آواز دی تو وہ خاموش رہے مگر مجھے جواب دیا اُن کی خاموشی نے خاک مرقد نے کہ کیا تمھیں معلوم ہے کہ میں نے اپنے رہنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ میں نے اُن کے گوشت کو ٹکڑے ٹکڑے اور کھال کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اور اُن کی آنکھوں کے اندر مٹی بھر دی ہے۔ حالانکہ اس کے پہلے ذرا سا تنکا پڑ جاتا تھا اُن کی آنکھ میں تو چین نہ آتا تھا۔ رہ گئیں ہڈیاں، وہ بھی جدا جدا ہو گئیں یہاں تک کہ جوڑ بند صاف ظاہر ہیں، میں نے اس کو اُس سے اور اُس کو اس سے الگ کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ بوسیدگی و کہنگی کے آثار اُن سے ہویدا ہو گئے ہیں"

ذھب الذین احبھم	وبقیت فیمن لا احبہ
فیمن اراہ یسبّنی	ظھر المغیب ولا اسبّہ
یبغی فسادی ما استطاع	وامرہ مما اربہ
حنقا یدب الی الضرا	ء وذاک مما لا ادبہ
ویری ذباب الشر من	حولی یطن ولا یذبہ
واذا خبا وغر الصدر	فلا یزال بہ یشبہ
افلا یعیج بعقلہ	افلا یثوب الیہ لبّہ
افلا یری ان فعلہ	مما یسور الیہ غبّہ
حسبی بربی کافیا	ما اختشی والبغی حسبہ

ولقل من یبغی علیہ فما کفاہ اللہ ربہ

"وہ گزر گئے وہ افراد جن کو میں محبوب رکھتا تھا اور اب میں رہ گیا ہوں ایسے لوگوں میں جو مجھے کسی طرح پسند نہیں۔ اُن کا کردار یہ ہے کہ

ہیں انھیں ذرا بھی برا بھلا نہیں کہتا مگر وہ بیٹھ پیچھے مجھے گالیاں دیتے رہتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے وہ میرے نقصان کے درپے رہتے ہیں درآنحالیکہ میں ان کو فائدہ پہونچاتا رہتا ہوں۔ وہ گردو پیش شرار تو ںکی مگس اڑتے دیکھتے ہیں مگر اتنا نہیں کرتے کہ انہیں ہٹا دیں بلکہ جب دلوں میں عداوت کی آگ بجھنے لگی ہے تو وہ اسے اور ہوا دے دیتے ہیں کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی بے سمجھ سے کام لیں؟ کیا ایسا نہ ہوگا کہ ان کی طرف عقل واپس آئے؟ کیا وہ نہیں سمجھتے کہ ان کا یہ طرز عمل بنتیجۃً خود انہی کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا، میرے لیے میرا پروردگار کافی ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے مجھ کو کوئی اندیشہ نہیں۔ ناممکن ہے کہ کسی پر ظلم وستم کیا جائے اور خدا اس کی مدد نہ کرے"۔

(۱۰) ابن صباغ مالکی نے فصول مہمہ میں اور علی بن عیسٰی اربلی نے کشف الغمہ میں ابن خشاب کی روایت سے حسب ذیل اشعار نقل کیے ہیں:-

اذا ما عضک الدھر	فلا تجنح الی خلق
ولا تسأل سوی اللہ	تعالی قاسم الرزق
فلو عشت وطوفت	من الغرب الی الشرق
لما صادفت من یقدر	ان یسعد او یشقی

"جب زمانہ کے دانت تمہیں زخمی کریں تو خلق خدا کی طرف کبھی نہ جھکو اور سوائے خدائے برتر کے جو رزق کا تقسیم کرنیوالا ہے کسی سے سوال نہ کرو اس لیے کہ مغرب سے مشرق تک چکر لگانے کے بعد بھی تم کو کوئی شخص ایسا نہ ملے گا جو مقدر کو بنا یا بگاڑ سکتا ہو"۔

(۱۱) وان تکن الدنیا تعد نفیسۃ فدار ثواب اللہ اعلیٰ وانبل

وان تکن الابدان للموت انشأت | فقتل امرئ بالسیف فی اللہ افضل
وان تکن الارزاق قسما مقدرا | فقلۃ حرص المرء فی الرزق اجمل
وان تکن الاموال للترک جمعها | فما بال متروک بہ المرء یبخل

اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ دنیا کوئی اچھی جگہ ہے تب بھی خدا کے اجر و ثواب کا محل زیادہ بلند و برتر ہے اور جب کہ یہ صحیح ہے کہ اجسام پر موت کا طاری ہونا لازم ہے تو انسان کا راہ خدا میں تہ تیغ کر دیا جانا زیادہ بہتر ہے اور جب کہ یہ حقیقت ہے کہ رزق میں ہر ایک کا حصّہ معین ہے تو اس کے بارے میں ہوس سے کام لینا ہی انسان کے لیے مناسب ہے اور جبکہ یہ یقینی ہے کہ اموال جمع ہوتے ہیں بعد میں چھوڑ جانے کے لیے تو کیا یہ حماقت نہوگی کہ ایسی چیز کے بارے میں انسان بخل سے کام لے"۔

(۱۲) ایک شخص نے حضرت کو لکھا کہ مجھے دو جملوں میں موعظہ فرمائیے آپ نے تحریر فرمایا:۔ من حاول امراً بمعصیۃ اللہ کان افوت لما یرجو و اسرع لمجیئ ما یحذر "جو شخص اللہ کی نافرمانی کر کے کسی مقصد کو حاصل کرنا چاہے گا ــــــ، اپنے توقعات میں ناکام اور خطرات سے زیادہ نزدیک ثابت ہوگا" (۱)

مندرجہ بالا مقالات اور اشعار کو نظر غائر سے دیکھنے پر حسب ذیل تعلیمات ان میں نمایاں طور پر موجود پائے جاتے ہیں:۔

(۱) ذات الٰہی پر توکّل۔ یعنی ہم کو کسی نفع کی امیّد، کسی ضرر سے تحفظ کی توقع اور کسی خواہش کی تکمیل کا آسرا اللہ کے غیر سے نہ رکھنا چاہیے۔ یہ وہ دشوار منزل ہے کہ کہنے کو جو بھی چاہے کہہ دے لیکن حقیقۃً عملی حیثیت سے اس راہ

---

(۱) کافی ج ۱ صـ۵۵۲

میں جو بھی قدم رکھے وہ ماسوی اللہ سے بے نیاز ہو جائے۔

انسان سچائی کے راستے سے الگ ہوتا ہے زیادہ تر طمع مال وزر کی بدولت یا پھر خطرہ امروز اور اندیشۂ فردا کے سبب سے مگر جب یہ خیال پورے طور پر کسی کے دل و دماغ پر چھا جائے کہ خدا کی مشیت کے خلاف نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اُسے راہِ حق سے منحرف نہیں کر سکتی۔

ملحوظ رہے کہ اللہ اپنے ماننے والوں کے صحیح عقیدہ کے مطابق وہ پاک و منزہ ذات ہے جو صرف نیکی کو پسند کرتی ہے اور برائی سے نفرت رکھتی ہے لہذا جب کوئی ایک ایسی بزرگ و برتر ذات کو اپنے تفکرات و احساسات کا مرکز بنائے گا تو اُس کے لیے ناممکن ہے کہ بھول کر بھی وہ برائی یا ظلم کے قریب جائے چنانچہ امام حسینؑ کی جگہ اگر کوئی ایسا شخص ہوتا جو دنیاوی نفع اور نقصان کی پرواہ کرتا یا کسی مادی طاقت کو قبلۂ حاجات سمجھتا یا اُس کے اقتدار سے مرعوب کیا جا سکتا تو بالفرض وہ یزید کی بیعت شروع میں نہ بھی کرتا تو اُس وقت تو ضرور کر لیتا کہ جب حکومتِ باطل کا ہزاروں کا لشکر اُس کے خلاف صف بستہ ہوتا اور اُن کے ظلم و تشدد کی بجلیاں آنکھوں کے سامنے کوندنے لگتیں مگر حضرت امام حسینؑ، آپ تو دنیا کی کسی طاقت اور نعمت کو کچھ سمجھتے ہی نہ تھے اس لیے راہ حق سے آپ کو کوئی شے ہٹا ہی نہیں سکتی تھی۔

(۲) خلقِ خدا کی بہر حال بہی خواہی اور فائدہ رسانی کی فکر ہونا جس کا بلند معیار یہ ہو کہ اس بارے میں اپنے اور پرائے، دوست اور دشمن کی تفریق کو بھی کام میں نہ لایا جائے۔

یہ بات اُس صورت میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی کہ جب ہمارے تعلقات دوسروں کے ساتھ مادی بنیادوں پر قائم ہوں اس لیے کہ ایسی صورت میں

طبعی میلانات و رجحانات کی بنا پر نزدیک و دور اور موافق و مخالف کے امتیازات کا بروئے کار آنا لازمی ہے۔ البتہ یہ بات اُس وقت ہو سکتی ہے کہ جب ہمارا تعلق دوسروں کے ساتھ اُس مشترک رشتہ کی بنا پر ہو جو ہم سب کو ایک خالق کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے اور جس کے لحاظ سے تمام افراد انسانی ایک سلسلۂ وحدت میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ صحیح معنی میں غرض خلقت کو سمجھتے ہوئے عمومی طور پر تمام خلق کو اپنی ذات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کریں اور اس کو اپنے اوپر خدا کا ایک احسان سمجھیں کہ اُس نے ہمارے ذریعہ سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسے لوگوں پر بھی احسان کیا جائیگا جو عام عادات و خصائل کی بنا پر اس سے توقع نہ رکھتے ہوں۔ مثلاً ایک دشمن اپنے دشمن سے کب اس کی اُمید قائم کر سکتا ہے کہ وہ اسکے ساتھ کوئی اچھا سلوک کرے گا مگر بلند معیار فیاضی کا یہی ہے کہ اُس کو بھی اپنے انعام سے محروم نہ کیا جائے۔

(۳) مادی زندگی کے تاریک پہلوؤں پر توجہ۔ ان کا لحاظ رکھنے سے تمام لذائذ دنیا ہماری نظر میں ہیچ ہو جائیں گے اور ہم اللہ کے ساتھ وابستگی پیدا کر کے نیکی کے راستے پر قائم رہنے ہی کو اپنی بہترین کامیابی سمجھنے لگیں گے۔

مجموعی حیثیت سے مذکورہ بالا تمام تعلیمات میں وزن پیدا ہوا ہے حسینؑ کے عمل اور بلندی کردار سے جس نے اُن میں سے ہر ہر مقولہ اور تعلیم کو چلتی پھرتی تصویر کی شکل میں آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا

اس طرح کہ یہ مقولات صرف آپ کے خیالات ہی کے حامل نہیں رہے بلکہ ایک سچے عملی انسان کی تاریخ زندگی بن گئے۔

امام حسینؑ کے اس طرح کے اقوال آپ کی زندگی کے کسی ہنگامی یا اتفاقی موقع سے متعلق نہ تھے بلکہ آپ کے روزمرہ کے نظام زندگی کا ایک جزو تھے چنانچہ روزانہ کی نمازوں میں جو مختلف قنوت آپ پڑھا کرتے تھے وہ بھی اسی طرح کے مضامین پر مشتمل ہوتے تھے چنانچہ اُن میں سے ایک قنوت کے الفاظ درج ذیل ہیں۔

اللھم منك البدء ولك المشیٔة ولك الحول ولك القوة ـــــ اللھم وانی مع ذلك کله عائذ بك لائذ بحولك وقوتك راض بحکمك الذی سبق الیّ فی علمك جار بحیث اجریتنی قاصد ما اممتنی غیر ضنین بنفسی فیما یرضیك عنی اذ به قد رضیتنی ولا قاصر بجهدی عما الیه ندبتنی مسارع لما عرفتنی شارع فیما اشرعتنی مستبصر فیما بصرتنی مراع ما ارعیتنی فلا تخلنی من رعایتك ولا تخرجنی من عنایتك لا تقعدنی عن حولك ولا تخرجنی عن مقصد انال به ارادتك واجعل علی البصیرة مدرجتی وعلی الهدایة محجتی وعلی الرشاد مسلکی حتی تنیلنی امنیتی وتحلّ بی علی ما به اردتنی وله خلقتنی والیه أویت بی۔

”خداوندا تیری ہی طرف سے انعام واحسان کی ابتداء ہے اور جو کچھ مشیت اور طاقت وقوت ہے وہ صرف تیری ہے۔ اس سب

کے ہوتے ہوئے میں تیری ہی طرف پناہ لیتا ہوں اور تیری ہی قوت و طاقت کا سہارا ڈھونڈھتا ہوں اور تیرے اُس فیصلہ پر راضی ہوں ۔ جو میرے بارے میں تو پہلے ہی کر چکا ہے ۔ میں چلنے والا ہوں اُسی راستے پر جس پر کہ مجھے تونے چلایا ہے ۔ اور قصد رکھتا ہوں وہی جو تیری مرضی کے مطابق ہے ۔ اور اُن امور کے متعلق جو تیری رضامندی کا باعث ہو سکتے ہیں اپنے نفس کی ذرا بھی رعایت نہیں کرتا ۔ نہ میں اپنی طرف سے تیرے احکام کی تعمیل میں جد و جہد کے سلسلہ میں کوئی کوتاہی ہونے دیتا ہوں بلکہ تیزی سے چلتا ہوں اسی راستے پر جس کی تونے مجھے ہدایت کی ۔ اور عہدہ براہ ہوتا ہوں میں اُن فرائض سے جن کا تونے مجھے محافظ قرار دیا ہے ۔ اب تو بھی مجھے اپنی حمایت میں رکھ اور اپنی نظر رحمت سے مجھے علیٰحدہ نہ کر اور اپنی طاقت کی امداد سے مجھے محروم نہ کر اور اُس مقصد سے الگ نہ کر جس کے ماتحت میں تیری مشیت کو پورا کرنا چاہتا ہوں اور بصیرت پر قرار دے میری رفتار کو اور ہدایت پر میرے مسلک کو اور صحیح منزل کی سمت میرے راستے کو یہاں تک کہ مجھے پہنچا تو میری آرزو تک اور مجھے اتارے تو اُسی منزل پر جس کا تونے میرے لیے ارادہ کیا اور جس کے لیے تونے مجھے پیدا کیا اور جس کی طرف تونے مجھے متوجہ کیا (۱) ؟

کیا اس قنوت کے الفاظ ظاہر آپ کے کسی عزم مستقل کی ترجمانی نہیں کرتے کیا اُن سے مجمل طور پر یہ واضح نہیں ہوتا کہ آپ بس کسی خاص مقصد کی خاطر اپنی زندگی کو وقف کیے ہوئے تھے اور یہ کہ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ خالق کے اشاروں کا تابع ہے ۔

سنہ ۶۰ھ تک یہ الفاظ قول تھے اور سنہ ۶۱ھ ہجری میں وہ عمل بن کر آنکھوں کے سامنے آگئے ۔

---

(۱) مہج الدعوات صفحہ ۷۱ ۔

یہ دعا بھی حضرت امام حسینؑ کی ہے جو آپ قنوت میں پڑھتے تھے۔

اللھم من أوی الی مأوی فانت مأوای ومن لجأ الی ملجأ فانت ملجای۔
واحرسنی فی بلوای من افتتان الامتحان ولمۃ الشیطان بعظمتک التی
لا یشوبھا ولع نفس بتفتین ولا وارد طیف بتظنین ولا یلم بھا فرج حتی
تقلبنی الیک بارادتک غیر ظنین ولا مظنون ولا مراب ولا مرتاب

"خداوندا تیرے سوا کسی کی طرف اگر کوئی پناہ لیتا ہے تو لیا کرے۔ میرا پناہ
دینے والا تو بس تو ہے اور اگر کوئی سہارا لیتا ہے دوسرے کا تو لیا کرے۔ میرا سہارا
دینے والا تو صرف تو ہے تو اپنی اُس عظمت کے ساتھ جس پر نہ کسی کی نفسانی خواہش
اثر انداز ہو سکتی ہے اور نہ بدظنی اور نہ اس میں کسی طرح کی بدگمانی اور کسی وقتی
خوش فراجی کا دخل ہے، آزمائش کے موقع پر مجھے محفوظ رکھ فتنہ میں مبتلا ہونے اور
شیطانی جماعت سے مرعوب ہو جانے سے یہاں تک کہ تیری طرف میری بازگشت
ہو تیرے منشا کے مطابق اس طرح کہ نہ میرے دل میں بُرے خیالات ہوں، اور نہ دوسرے
بُرے خیالات قائم کر سکیں۔ نہ دوسروں کے متعلق میں کسی شک
میں مبتلا ہوں اور نہ میرے متعلق دوسروں کو شک ہو سکے (۱)

آپ صبح و شام دونوں وقت حسب ذیل دعا پڑھا کرتے تھے۔

اللھم انی اسلمت نفسی الیک ووجھت وجھی الیک وفوضت
امری الیک اللھم انک تکفینی من کل احد ولا یکفینی منک احد

"خداوندا میں تیرے سپرد کیے ہوئے ہوں اپنے نفس کو اور تیری طرف موڑے
ہوئے ہوں اپنے رخ کو اور دیئے ہوئے ہوں اپنے کو تیرے ہاتھ میں — خداوندا تو
ہر دوسرے شخص کے شر سے محفوظ رکھ سکتا ہے مجھ کو لیکن تیرا غیر مجھ کو تیرے قہر

---

(۱) مہج الدعوات ص ۴۳

سے نہیں بچا سکتا (۱)

بھلا جس شخص کا مستقل عقیدہ یہ ہو اور جس کی زندگی کا نصب العین یہ ہو جس نے رات دن اسی کو سوچا ہو اور اسی کو اپنی زبان پر دھراتا رہا ہو وہ کہیں ممکن ہے کہ کسی طاغوتی طاقت سے دب جائے اور خدائے قادر و توانا کو بھول کر دنیاوی جبروت کے سامنے سر تسلیم خم کر دے؟ یزید، حسینؑ سے اسی کا تو طالب تھا "کہ آپ خدا کے راستے سے ہٹ کر شیطان کے راستے پر اس کے ساتھ ہو جائیں۔ مگر حسینؑ نے جو اپنے جان و روح کو کلیۃً خدا کے حوالے کر چکے تھے اس کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا۔

اس لیے کہ آپ کو یقین کامل تھا کہ یزید میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا جب تلواریں آپ کے جسم اطہر کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھیں، اس وقت بھی آپ اپنے اسی یقین پر قائم تھے چنانچہ جب معرکۂ کربلا کے نتائج دنیا کی آنکھوں کے سامنے آگئے تو عالم ظاہر میں سب کو اس کا مشاہدہ ہو گیا کہ حسینؑ کا خیال حرف بحرف صحیح تھا۔ اس لیے کہ کہنے کو خون بہا حسینؑ اور انصار حسینؑ کی گردنوں سے مگر دراصل شہرگ قطع ہوئی یزید کے اقتدار کی حسینؑ زندۂ جاوید ہو گئے اور یزید بہلی صحیح معنی میں ہلاک و فنا ہوا جو نتیجہ تھا محض حسینؑ کی اس قوت ارادی کا جس کا مظاہرہ آپ کے اقوال برابر کرتے رہتے تھے۔

لذت حیات دنیا سے سرشار تنگ ظرفوں کے نزدیک اپنے مخالف کو دھمکانے کا سب سے بڑا ذریعہ موت کا تصور پیدا کر دینا ہے مگر وہ افراد جو راہ حق میں موت آنے کو مآل زندگی سمجھتے ہوں اس دھمکانے سے کب متاثر ہو سکتے ہیں ـــ؟

---

(۱) مہج الدعوات ص۱۳۲۔

حسینؑ کا فلسفۂ زندگی وہی تھا جس کی امام حسینؑ کو آپ کے والدِ بزرگوار حضرت علیؑ بن ابی طالب کی طرف سے مخصوص وصیت ہوئی تھی کہ اصبر علی الحق وان کان مرّا "سچائی کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو اُس پر قائم رہو اور ہر مشکل کا مقابلہ کرو"۔ یہی وصیت حسینؑ نے اپنے فرزند زین العابدینؑ کو کی اور اسی پر وہ خود مکمل طور سے کاربند رہے (۱)۔

---

(۱) کافی ج ۱ ص ۳۱۲

چودھواں باب

یزید کا بیعت پر اصرار اور حسینؓ کا انکار

تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد یزید کے لیے عیش و آرام کی کمی نہ تھی۔ دنیا تمام زیب و زینت کے ساتھ اُس کے سامنے موجود تھی اور تاج و تخت، مال و دولت، حشم و خدم اور عیش پرستی و شہوت رانی کے تمام اسباب پوری فراوانی کیساتھ مہیا تھے۔ لیکن ایک خیال تھا جو اُس کے دل و دماغ کو پریشان کیے ہوئے اور اُس کی نظروں میں اس تمام جاہ و حشم کو خاک سیاہ بنائے ہوئے تھا اور وہ اُن چند آدمیوں کا بیعت سے انکار کہ جن میں اوّل درجہ کی شخصیت حسینؓ بن علیؓ کی تھی۔ یزید کے نفسیات اس کے کسی طرح متحمل ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ جوانی کا نشہ اور پھر شراب کی ترنگ۔ بے زحمت و مشقت کے حاصل شدہ سلطنت کا غرور۔ اپنے باپ کی کوششوں کی کامیابی کا گھمنڈ اور تمام ملک عرب کے سر اطاعت خم ہو جانے کا غرہ۔ پھر نو کاری ناعاقبت اندیشی سیاسیات حکومت سے ناشناسی اور نظم سلطنت سے بے خبری۔ اس کے بعد مرنے والے باپ کا مرتے مرتے اسی بات کو یاد کرنا، اور نفس کے آخری آمد و شد تک اسی فکر و اضطراب کی کشمکش میں مبتلا رہنا، یہ وہ باتیں تھیں کہ جن کی وجہ سے یزید کو یہ کد ہو گئی تھی کہ ان انگلیوں پر گنے جانے والے اشخاص سے جلد از جلد بیعت حاصل کر لی جائے۔ کوئی شک نہیں کہ ان سب کی اور بالخصوص

امام حسینؑ کی بیعت سے علیحدگی اور خاموشی معاویہ کو بھی اُتنی ہی شاق تھی جتنی یزید کو مگر معاویہ کو تشدد کے نتیجہ کا اندازہ تھا اور یزید کو نہ تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر معاویہ کی زندگی اور طولانی بھی ہوتی تو اُن کی طرف سے ایسا غیر مدبرانہ طرزِ عمل نہ اختیار کیا جاتا جیسا کہ یزید کی طرف سے اختیار کیا گیا مگر واقعات یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں کہ معاویہ کا رویہ یزید کے آئندہ اقدامات میں ہمت افزائی کا باعث ضرور ہوا۔ مثال کے طور پر معاویہ کا مدینہ پہونچنے کے وقت حضرت امام حسینؑ کو ان الفاظ سے مخاطب کرنا کہ "تم ایک قربانی کا دنبہ ہو جس کا خون جوش کھا رہا ہے۔ قسم ہے خدا کی یہ خون ضرور گرایا جائے گا۔"

یزید اپنی ذہنیت کے مطابق اس سے یہی نتیجہ نکال سکتا تھا کہ میرے باپ کا ارادہ اس دشمن سلطنت کے ساتھ اس طرح کا تھا جسے اُنھوں نے قسم کھا کر ظاہر کیا تھا۔ اور انھیں اس کی تکمیل کا موقع نہیں ملا پھر "اگر پدر نتواند پسر تمام کند"، خصوصاً جبکہ آخر وقت تک معاویہ اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو ان ہی چند منکرین بیعت کے خطرہ کی طرف بار بار متوجہ بھی کرتے رہے۔ یقینی گزشتہ دھمکی سے جو خیال یزید کے دماغ میں پیدا ہو چکا تھا اُس کے ساتھ یہ آخری وقت کی وصیتیں یہی اثر پیدا کر سکتی تھیں کہ یزید اپنا سب سے پہلا نصب العین اور مقصد زندگی اپنے باپ کے بعد اسی کو قرار دے لے کہ خطرہ کو کسی طرح دور کیا جائے اور باپ کا جو مقصد تھا اور جس کی تکمیل کا انھیں موقع نہ مل سکا اس کو اب پایۂ تکمیل تک پہونچایا جائے۔ چنانچہ یزید نے تخت سلطنت پر قدم رکھتے ہی سب سے پہلا جو سیاسی کام کیا وہ یہی کہ اپنے چچازاد بھائی ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو

جو مروان کی معزولی (۱) کے بعد اس زمانہ میں مدینہ کا حاکم تھا خط لکھا کر خلیفۂ وقت یزید کی طرف سے ولید بن عتبہ کو معلوم ہو کہ معاویہ ایک خدا کے بندے تھے جنھیں اُس نے عزت دی اور سلطنت عطا کی اور اپنی نعمتوں سے مالا مال کیا وہ جب تک مقدر میں تھا زندہ رہے اور جب عمر پوری ہو گئی تو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ خدا اُن پر رحمت نازل کرے کہ انھوں نے قابل تعریف زندگی گزاری اور پرہیزگاری و نیکوکاری کے ساتھ عالم آخرت کو سدھارے۔ والسلام

اس خط میں تو صرف معاویہ کے وفات کی اطلاع ہے ایسے رسمی الفاظ میں جو عموماً خبر وفات کے طور پر لکھے جایا کرتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی ایک اور چھوٹا سا پرچہ بھی ولید کو بھیجا گیا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ "حسینؑ اور عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن زبیر کو بیعت پر سختی سے مجبور کرو اور بغیر بیعت لیے ہوئے اُنھیں ذرا سا بھی موقع نہ دو والسلام" (۲)

یہ خط ہے کہ جس میں شروع ہی سے سخت گیری کا عنصر نمایاں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اب صورت حال خاموشی کے حدود پر باقی نہیں رہ سکتی یعنی حضرت امام حسینؑ کا یہ لائحہ عمل کہ ہم شریک ظلم نہ ہوں اور یزید کی خلافت کو تسلیم کر کے اس کے افعال و اعمال کی ذمہ داری اپنے اوپر نہ لیں لیکن اس کے ساتھ ہم اپنی طرف سے کوئی ایسا اقدام بھی نہ کریں کہ ملک کے امن و امان کو صدمہ پہونچے اور شورش و ہنگامہ برپا ہو۔ یہ منفی

---

(۱) مروان ایک مرتبہ معاویہ کی طرف سے مدینہ کا حاکم آٹھ برس دو مہینہ تک رہا اور پھر ربیع الاول سنہ ۴۹ھ میں معزول کیا گیا اور سعید بن عاص کو حاکم مدینہ مقرر کیا گیا (طبری ج ۶ صفحہ ۱۳۲) دوبارہ سنہ ۵۴ھ میں سعید کی معزولی کے بعد مروان کو حاکم مدینہ مقرر کیا گیا (طبری ج ۶ صفحہ ۱۶۴) پھر سنہ ۵۸ھ یا ایک قول کے مطابق سنہ ۵۷ھ میں اُسے معزول کیا گیا اور ولید بن عتبہ کو مدینہ کا حاکم بنایا گیا (طبری ج ۶ صفحہ ۱۶۲) (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۱۸۹

طرز عمل اب نبھنا ناممکن ہے۔ اب تو عمل کی منزل ہے۔ یا تو مختتم اقرار یا مختتم انکار مگر انکار ایسا جس میں نتائج کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔

یزید کا خط ولید کو پہنچا۔ ولید ابو سفیان کا پوتا اور معاویہ کا بھتیجا سہی لیکن وہ ایک حد تک امام حسینؑ کی عظمت و شخصیت سے متاثر تھا، اُس میں بظاہر اتنی سفاکی اور ستم کیشی بھی نہ تھی کہ ایک بے گناہ کا خون بہاتے ہوئے اُس کو لذت محسوس ہو۔ یزید کے فرمان شاہی نے اُس کے باطنی جذبات میں ایک تلاطم پیدا کر دیا اور اس شش و پنج میں پڑ گیا کہ یزید کے اس حکم کو کس طرح انجام دیا جائے۔ لہذا اس نے مروان بن الحکم سے جو اُس وقت مدینہ میں موجود تھا مشورہ کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے ولید کے مدینہ کی حکومت پر آنے کے وقت سے اُس میں اور مروان میں اس حد تک کشیدگی پیدا ہو گئی تھی کہ مروان نے ولید کے یہاں کی آمد و رفت ترک کر دی مگر اس وقت ولید کو ضرورت یہی معلوم ہوئی کہ مروان کو مشورہ میں ضرور شریک کرے شاید اسی لیے کہ کہیں جو طرز عمل وہ اختیار کرنا چاہتا ہے اموی سیاست کے خلاف ہو اور مروان اس کے خلاف جاسوسی یا چغلخوری کا کام انجام نہ دے۔ مروان جو رسول اللہؐ کے زمانہ ہی میں ایسی شرارتیں کر چکا تھا کہ رسولؐ نے اُس کو اور اُس کے باپ کو مدینہ سے باہر نکال دیا تھا اس نے کہا کہ عبد اللہ بن عمر اور عبد الرحمٰن بن ابی بکر کی تم کوئی فکر نہ کرو۔ وہ تو طالب خلافت ہوں گے نہیں۔ ہاں حسین بن علی اور عبد اللہ بن زبیر کو پابند بنانا ضروری ہے لہذا تم ابھی ان لوگوں کو بلوا بھیجو اور وفات معاویہ کی خبر پھیلنے کے قبل ہی اُن سے بیعت یزید کا مطالبہ کرو اور اگر وہ بیعت نہ کریں تو قتل کر دو اس لیے کہ اگر انہیں معاویہ کے انتقال

کی خبر ہو گئی پھر ہر ایک ایک طرف کھڑا ہو جائیگا اور علانیہ مخالفت کرنا اور خود اپنی طرف لوگوں کو دعوت دینا شروع کر دیگا۔(۱)

ولید محسوس کرتا تھا کہ اس پورے مشورہ پر عمل نہیں کر سکتا، تاہم اُس نے اُسی وقت عبد اللہ بن عمرو بن عثمان کو جو ایک کمسن لڑکا تھا حضرت امام حسینؑ اور عبد اللہ بن زبیر کو بلانے کے لیے بھیجا۔ یہ دونوں آدمی اُس وقت مسجد نبوی میں بیٹھے ہوے تھے اور بوقت واحد دونوں کو یہ پیغام پہونچا کہ امیر نے آپ کو بلایا ہے۔ یہ وقت ایسا تھا کہ اُس وقت ولید کبھی باہر نہ بیٹھتا تھا اور لوگوں کی ملاقات نہوتی تھی۔ ان حضرات نے کہا کہ تم چلو ہم آتے ہیں۔ آدمی واپس گیا۔ عبد اللہ بن زبیر نے کہا کہ یہ ولید کے بیٹھنے کا وقت نہیں ہے، اس وقت بلانے کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ کچھ آپ کے خیال میں آتا ہے یہ کیا بات ہے؟ امام حسینؑ نے فرمایا میرا خیال ہے کہ ان کا ظلم کا دیوتا دنیا سے اُٹھ گیا ہے اور ہمیں اس وقت صرف بیعت کیلئے بلایا گیا ہے کہ لوگوں میں ابھی خبر پھوٹنے نپائے اور ہم لوگ پابند کر لیے جائیں عبد اللہ بن زبیر نے کہا خیال تو میرا بھی یہی ہے۔ پھر اب کیا ہونا چاہیے؟ امام نے فرمایا میں تو ابھی اپنے خاندان کے جوانمردوں کو جمع کرتا ہوں اور اُن سب کے ساتھ وہاں جاتا ہوں اُن لوگوں کو دروازہ پر کھڑا کر دوں گا اور میں اندر جاؤں گا۔ عبد اللہ بن زبیر نے کہا مجھے اس میں آپ کی جان کا اندیشہ ہے۔ کہیں آپ قتل نہ کر دیئے جائیں۔ آپنے فرمایا میں جاؤں گا تو کچھ سمجھ کے جاؤں گا۔ اتنا سامان کر لونگا کہ مجھے خطرہ نہ باقی رہے۔

امام حسینؑ اپنے مکان پر تشریف لے گئے اور اعزا اور مخصوصین کو جمع کر کے اُن کے ساتھ ولید کے دروازہ پر پہونچے۔ اصحاب سے فرمایا کہ تم دروازے

(۱) الاخبار الطوال صـ ۲۲۹

پر ٹھہرو اور میں اندر جاتا ہوں۔ اگر میں تمہیں بلاؤں یا تم سنو کہ ولید کی آواز بلند ہوئی تو سب کے سب اندر چلے آنا اور اگر ایسا نہ ہو تو تم سب ٹھہرے رہنا یہاں تک کہ میں واپس آؤں۔ حضرت اندر تشریف لے گئے۔ ولید اور مروان آج خلاف معمول پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے اور ایک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ امام حسینؑ نے فرمایا ”اتفاق و اتحاد بہ نسبت نزاع و اختلاف کے بہتر ہے۔ خدا تم دونوں کے تعلقات کو خوشگوار بنائے“ اس کا کوئی جواب نہیں ملا اور آپ بیٹھ گئے۔ ولید نے یزید کا خط پڑھ کر سنایا۔ غالباً وہی حصہ جس میں معاویہ کی وفات کا تذکرہ تھا اور اس کے بعد بیعت یزید کا مطالبہ کیا۔ امام نے فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون (۱) (یہ فقرہ ہے جو ہر مصیبت کے موقع پر کہا جاتا ہے) خدا تم لوگوں کو اس مصیبت میں صبر عطا کرے، بیعت کے بارے میں یہ ہے کہ میرے ایسے شخص کی بیعت کو مخفی طور سے تو غالباً تم کافی نہ سمجھو گے جب تک کہ علانیہ بیعت نہ ہو اور عام طور سے لوگوں کو اس کا علم نہ ہو۔ ولید نے کہا بے شک۔ آپ نے فرمایا تو پھر جب مجمع عام میں وفات معاویہ کا اعلان کرو اور تمام لوگوں سے یزید کی بیعت لو، اُسی وقت مجھ سے بھی کہنا تاکہ یکسوئی کے ساتھ اس قضیہ کا فیصلہ ہو جائے (۲) ولید شاید اپنے مقام پر یہ سمجھے ہوئے ہو کہ امام حسینؑ یزید کی بیعت کا سوال سنتے ہی فوراً مخالفت پر تیار ہو جائیں گے اور بہت سختی کے ساتھ جواب دیں گے اور اس صورت میں اُسے فکر ہو گی کہ مجھے یزید کے حکم کی تعمیل کے لیے کیا صورت اختیار کرنا پڑے گی۔ اب اُس نے جو آپ سے اس طرح کا ملائم انداز کا جواب سنا تو وہ اُسے غنیمت سمجھا اور خوش ہو کر اُس نے کہا کہ ”بہتر آپ واپس جائیے اور سب کے ساتھ پھر آیئے گا“ مروان ابھی تک خاموش بیٹھا صورت

---

(۱) ہم اللہ کے ہیں اور اللہ کی طرف پلٹ کر جانا ہے (قرآن - سورہ بقر آیت ۱۵۶) (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۱۸۹ الاخبار والطوال صفحہ ۲۲۹۔

حال کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اب جو اُس نے ولید کا یہ نرم طرز عمل دیکھا تو بے اختیار بول اُٹھا، "ولید کیا غضب کرتے ہو۔ اگر حسینؑ اس وقت تمہارے ہاتھ سے نکل گئے اور بیعت نہ کی تو پھر ایسا موقع حاصل نہ ہوگا جب تک کہ بہت سے لوگ طرفین کے قتل نہ ہولیں بہتر ہے کہ ابھی اُن کو گرفتار کر لو اور تمہارے گھر سے جانے نہ پائیں جب تک کہ بیعت نہ کریں یا قتل نہ کر دیے جائیں"

یہ سن کر امام حسینؑ کو غصہ آگیا اور یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ کیا مجال ہے تیری یا ولید کی جو مجھے قتل کرے۔ غلط کہا تو نے بخدا اور گنہگار ہوا" یہ فرما کر آپ باہر نکل آئے اور اپنے اصحاب کی معیّت میں گھر واپس تشریف لے گئے (۱) مروان نے ولید سے کہا "تم نے میرا کہا نہ مانا۔ اب ایسا موقع ہاتھ نہ آئیگا" ولید نے کہا مروان یہ کسی اور سے کہو! تم نے مجھے وہ صورت بتائی تھی جس میں میرے مذہب کی موت تھی۔ خدا کی قسم مجھے یہ پسند نہیں کہ تمام شرق و غرب کا مال و دولت میرے قبضہ میں دیدیا جائے پھر بھی میں حسینؑ کو قتل کروں سبحان اللہ میں حسینؑ کو قتل کروں صرف اتنی بات پر کہ وہ کہتے ہیں میں بیعت نہیں کروں گا۔ خدا کی قسم مجھے یقین ہے کہ جو شخص حسینؑ کے خون کا مجرم ہوگا وہ خدا کے یہاں روز قیامت میزان عمل میں انتہائی سُبک ثابت ہوگا۔ (۲)

مروان نے کہا کہ اچھا یہ عقیدہ تمہارا ہے تو بے شک تم نے بہت اچھا کیا (۳)

بہت ممکن ہے کہ اس کے بعد مروان نے ولید کی شکایت یزید کو لکھ بھیجی ہو اور اس تمام روداد سے اطلاع دی ہو۔

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۱۸۹ (۲) الاخبار الطوال صفحہ ۲۲۹ (۳) طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۰

اور اسی کا نتیجہ ہو کہ اس کے بعد ولید مدینہ کی گورنری سے ہٹا دیا گیا اور عمر بن سعید الاشدق کو مدینہ کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔

یہ اس کی ایک دلیل ہے کہ خط میں بیعت نہ کرنے کی صورت میں حسینؑ کے قتل کے متعلق ضرور لکھا تھا۔ ظاہری اسباب کی بنا پر بھی کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ حضرت امام حسینؑ نے اسی وقت صورت حال کی نزاکت کا پورا احساس کر لیا اور یقیناً اس کے بعد جو کچھ طے کیا وہ تمام نتائج سوچ لینے کے بعد۔ آپ نے یہ طے کر لیا کہ میں یزید کی بیعت ہرگز نہیں کروں گا۔ ابھی تک دنیا اس نفی کے معنی نہیں سمجھ سکتی تھی کیونکہ وہ انکار بیعت کی صورت میں اُن تشدد کے درجوں کا اندازہ نہیں کر سکتی تھی جو بعد میں حسینؑ کے سامنے آئے لیکن حسینؑ جس وقت کہہ رہے تھے کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔ اس وقت وہ بیعت نہ کرنے کے معاوضہ میں ظلم و تشدد کے تمام امکانات پر غور کر کے اور اپنے نفس کی قوت برداشت کا پورا جائزہ لے کر کامل اعتماد کے ساتھ بیعت کی نفی کر رہے تھے اور اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ تشدد اپنی آخری حد پر پہونچ گیا مگر حسینؑ کے صبر و برداشت کی قوت ختم نہ ہو سکی وہ اپنی بات پر آخر تک قائم رہے، اسی عزم و استقلال کے ساتھ جس کو اُنھوں نے پہلے دن طے کر لیا تھا۔

یہاں پر یہ بحث پورے طور پر صاف ہو جانا چاہیے کہ آخر یزید کی رسمی بیعت اختیار کر لینا کون سا ایسا ناقابل برداشت امر تھا جسے حضرت امام حسینؑ کسی صورت سے گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس کے لیے ایک نظر حسینؑ کی اُن ذمہ داریوں پر ڈالنا ہوگی جو خاندان رسول کے اس وقت سب سے بڑے ذمہ دار رکن ہونے کے اعتبار سے اُن پر عائد تھیں ـــ

اور اُن قدیم روایات کو دیکھنا ہوگا جو اسلام اور حقانیت کی حفاظت کے لیے امام حسینؑ کے آبا و اجداد کی ذات سے وابستہ رہی تھیں اور جن کے اس وقت حسینؑ ذمہ دار تھے اور پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ اس وقت حسینؑ اپنے فرض کی تکمیل کس طرح کر سکتے تھے —— یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ یزید کو حضرت امام حسینؑ سے بیعت لینے کے لیے اس قدر کد و کاوش کی ضرورت —— کیا تھی جبکہ جمہوریت کے اصول پر اکثر افراد کا کسی حکومت کو قبول کر لینا آئینی طور پر اُس کے مسلّم ہو جانے کے لیے کافی اور اقلیت کی رائے ناقابل اعتبار ہے اس کے ساتھ یہ کوئی قانون نہیں کہ اقلیت کو جبری طور پر اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا جائے جبکہ اُس کی طرف سے عملی طور پر کوئی شورش انگیزی نہ کی جا رہی ہو خلافت کے ہر دور میں کچھ لوگ ایسے رہے جنھوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ خود حضرت علیؑ بن ابی طالب کے زمانۂ خلافت میں حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور زید بن ثابت وغیرہ کئی آدمی ایسے تھے جنھوں نے آپ کی بیعت سے کنارہ کشی کی تھی مگر صرف بیعت نہ کرنا کوئی قابل سزا جرم نہیں سمجھا گیا۔ یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ معاویہ نے مکّہ اور مدینہ میں چاہے کتنی ہی بڑی کانفرنس یزید کی بیعت لینے کے لیے منعقد کی ہو لیکن یقیناً مکّہ اور مدینہ کی مردم شماری کے اعتبار سے سیکڑوں ہزاروں آدمی ایسے رہ گئے ہوں گے جو گھروں میں بیٹھے ہوں گے اور جنھوں نے یزید کی بیعت نہیں کی ہوگی لیکن کسی سے کے لیے بیعت کی ضد نہیں کی گئی اور سلطنت کو اُن سے کاوش پیدا نہیں ہوئی، پھر ایک حسینؑ میں کیا بات ایسی تھی کہ آپ سے بیعت حاصل کر لینے کے لیے سلطنت شام کی پوری مشینری حرکت میں آجائے

طبری ج ۵ ص ۱۵۳

اور شاہی جبروت کی تمام طاقت صرف کر دی جائے۔ ماننا پڑے گا کہ حسینؑ سے بیعت بحیثیت ملک عرب کی ایک فرد کے نہیں طلب کی جا رہی تھی۔ بلکہ اس بنا پر کہ ایک فرد ایک جماعت یا قوم بن جاتی ہے نمائندگی کے اعتبار سے۔ حقیقت میں حسینؑ فقط حسین ہی نہ تھے وہ تو اُس وقت خاندان رسالت کی بزرگ ترین ہستی ہونے کے لحاظ سے اُس ورثہ کے حامل تھے جو دین خدا کی صحیح معنی میں حفاظت سے متعلق تھا اور جو پیغمبر اسلام کے بعد اُن کے اہلبیت میں یکے بعد دیگرے منتقل ہو رہا تھا۔ اور اسی لیے خاندان رسول یا خاندان علی بن ابی طالبؑ میں محمد بن حنفیہ بھی تو تھے، عبد اللہ بن جعفر بھی تو تھے، حضرت عباسؑ بن علیؑ اور اُن کے بھائی بھی تو تھے کوئی شک نہیں کہ ان میں سے کسی نے یزید کی بیعت نہیں کی مگر تاریخ نہیں بتا سکتی کہ ان میں سے کسی سے بھی بیعت طلب کی گئی ہو۔ صرف اس لیے کہ اُن میں سے کسی کو حسینؑ کی موجودگی میں وہ ذمہ دارانہ حیثیت حاصل نہ تھی جو حسینؑ کو حاصل تھی۔

یزید کو حسینؑ سے بیعت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اگر وہ صرف دنیوی قسم کی ایک سلطنت کا دعویدار ہوتا مگر وہ جس قسم کی سلطنت کے مالک ہونے کا مدعی تھا وہ تو خلافت اسلامیہ والی حکومت تھی جو رسول اکرمؐ کی جانشینی کی مرادف سمجھی جاتی تھی۔ اُس کا نصب العین یہ تھا کہ بادشاہ مذہب کے جزو و کل کا مالک ہو اور مذہبی قوانین بادشاہ کی خواہشوں کے پابند ہوں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ وہ پیغمبر اسلام کے مذہبی وارث سے اپنی حکومت کو تسلیم کرائے اور وہ خوب سمجھتا تھا کہ اس امانت کی حامل اس وقت صرف حسینؑ کی ذات ہے اس لیے وہ لازم سمجھتا تھا کہ آپ سے اپنی بیعت

حاصل کرے۔

حسینؑ سمجھتے تھے کہ اگر اس وقت میرے بھائی حضرت امام حسنؑ زندہ ہوتے تو بیعت کی خواہش اُن سے کی جاتی، مجھ سے نہ کی جاتی۔ اگر میرے پدر بزرگوار حضرت علیؑ ہوتے تو جھگڑا اُن سے کیا جاتا، مجھ سے نہ کیا جاتا اور اگر میرے جد بزرگوار رسول اللہؐ ہوتے تو اپنی حکومت کے جواز کی تصدیق اُن سے حاصل کرنے کی کوشش ہوتی مجھ سے نہ ہوتی۔ مگر اب تو وہ دیکھ رہے تھے کہ میرے نانا رسول اللہؐ نہیں ہیں۔ میرے بابا علی مرتضیٰؑ نہیں ہیں اور میرے بھائی حسن مجتبیٰؑ بھی نہیں ہیں۔ اب تو میں ہوں اس لیے مجھ سے بیعت طلب کی جا رہی ہے۔ اس صورت میں اگر میں نے بیعت کر لی تو وہ ایسا ہے جیسے میرے بھائی حسنؑ ہوتے اور وہ بیعت کر لیتے۔ میرے بابا علیؑ ہوتے اور وہ سر تسلیم خم کر دیتے اور میرے نانا رسول اللہؐ ہوتے اور وہ اس حکومت کو جائز تسلیم کر لیتے۔ اُنھوں نے اس سخت احساس ذمہ داری کی بنا پر تمام مشکلات کو برداشت کرنا گوارا کر لیا اور یہ طے کیا کہ میں بیعت نہیں کرونگا۔

یہ عزت نفس، شرف حق اور وقار دینی کا سوال تھا اور پہلے ہی دن آپ نے اس مرحلہ میں آخر تک ثابت قدم رہنے کا عزم کر لیا تھا جس کا آخری نتیجہ بھی معلوم تھا۔ اس کا آپ نے کوئی بلند بانگ اعلان نہیں بھی کیا تب بھی آپ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ سننے والوں کو اس کا پتہ دے رہے تھے چنانچہ ابو سعید مقبری کا بیان ہے کہ میں نے امام حسینؑ کو مدینہ کی داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ آپ کے ساتھ اس وقت دو آدمی تھے جن کے کاندھے پر باری باری ہاتھ رکھ کر چل رہے تھے اور آپ کی زبان پر ابن مفرغ کے یہ اشعار تھے:۔

لا ذعرت السوام فی فلق الصبح مغیرا و لا دعیت یزیدا

یوم اعطی من المھابۃ ضیما　　　والمنایا یرصدننی ان احیدا

ان کا مطلب یہ ہوا کہ خدا وہ دن نہ لائے کہ موت کی طاقتیں کمینگاہوں سے حملہ کر کے مجھے میرے راستے سے ہٹانے کی کوشش کریں اور میں اُن کے خوف سے ذلت کو برداشت کر لوں"

ابو سعید کا بیان ہے کہ ان اشعار کو سن کر اُسی وقت میری سمجھ میں آیا کہ آپ کسی خاص اقدام کا ارادہ رکھتے ہیں ــــ
دو ہی دن گزرے تھے کہ معلوم ہوا آپ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ (۱)

---

(۱) طبری ج ۶ صـ ۱۹۱

پندرھواں باب

حسنؑ کی خاموشی اور حسینؑ کا اقدام

اس مقام پر اکثر یہ سوال پیش کیا جاتا ہے کہ آخر حضرت امام حسنؑ نے بھی تو یزید کے باپ معاویہ سے مصالحت کر لی تھی، اسی طرح اگر امام حسینؑ صلح کر لیتے تو کیا حرج تھا؟ بظاہر دونوں بھائیوں کے طرز عمل میں اختلاف ہے اور اسی سے سلطنت بنی امیہ کے ہواخواہوں نے دونوں بھائیوں کے اختلاف رائے کی حکایتیں بھی تصنیف کی ہیں لیکن تاریخی واقعات کی رفتار کا بغور مطالعہ اس اختلاف طبیعت کے سوال اور اس خیال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حالات مختلف ہوتے ہیں اور اُن حالات کے لحاظ سے فرائض کا تقاضا بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ ابنائے زمانہ زیادہ تر جذبات کے پابند ہوتے ہیں اور جذبات اکثر افراط و تفریط کی بنا پر حد اعتدال سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن اخلاق انسانی میں کامل اشخاص ہر موقع پر فرض کا اندازہ کرتے ہیں۔ انھیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ وہ ابنائے زمانہ کے جذبات کے مطابق ہے یا مخالف اس لیے اُن کا طرز عمل اکثر عام افراد انسانی کو متضاد نظر آتا ہے اور اکثر اُن پر دونوں طرح کے معترض پائے جاتے ہیں۔ کبھی اُن پر اقدام پسند طبائع اعتراض کرتے ہیں اور کبھی رجعت پسند طبیعتیں معترض ہوتی ہیں لیکن وہ ان اعتراضات کی کوئی پرواہ نہیں کرتے اور اپنے مسلک کے پابند رہتے ہیں اس لیے کہ وہی

اُن کے نزدیک فرض کا تقاضا ہوتا ہے۔[۲]

یہی صورت ہم کو پیغمبر اسلام کے طرزِ عمل کے متعلق ملتی ہے۔ یہی علی مرتضیٰ کی سیرت اور یہی اُن کے بعد حسنؑ اور حسینؑ کے طرزِ عمل کے متعلق نظر آتی ہے

واقعہ یہ ہے کہ حسن مجتبیٰ[۴] کی صلح جس کے واقعات کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے وہی مجاہدہ کربلا کی تمہید تھی اس لیے کہ ہر اقدام جو اپنے وقت پر ہو وہ مفید، نتیجہ خیز اور موثر ہوتا ہے لیکن اگر وقت سے پہلے عمل میں لایا جائے تو وہ نتیجۃً مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتا ہو بلکہ اپنے مرتکب کو اکثر ہمیشہ کے لیے مورد الزام بنا دیتا ہے۔

واقعات کی رفتار یکساں حالت پر نہیں رہتی بلکہ تدریجی حیثیت سے ترقی کرتی ہے اور اُن کا طریقۂ علاج بھی اسی اعتبار سے مختلف ہوتا ہے مثال کے طور پر زخم رسیدہ پکے ہوئے جزو بدن ہاتھ یا پیر کا علاج کرو، پھاہے لگاؤ، مرہم بدلو، ضرورت ہو تو بار بار نشتر دلواؤ، پھر اگر نہ اچھا ہو اور اس کی سمیّت کے جسم میں سرایت کرنے کا خوف ہو تو اُسے کاٹ کر بھی پھینک دو کسی کو اعتراض کا حق نہ ہوگا لیکن اگر زخم پیدا ہونے کے ساتھ ہی اور کوئی علاج معالجہ کرنے کے پہلے ہی کاٹ ڈالئے تو ضرور مورد الزام ہوتے اور عام طور پر بے عقل سمجھے جاتے حالانکہ یہ طرزِ عمل وہی ہے جو بعد میں اختیار کئے جانے پر ممدوح و مستحسن قرار پائیگا۔

دشوار گذار حالات کی اصلاح کے لیے قربانی اور وہ بھی جان کی قربانی کامیاب اور موثر ترین حربہ ہے لیکن سب سے آخری، جب تمام وسائل اور ذرائع ختم ہو جائیں اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہو اُسی وقت اس کا درجہ ہے۔ وہ جہاں تک آخری رہے وہیں تک موثر ہے اور اگر اس سے پہلے عمل میں آجائے تو جلد بازی، غیر موقع شناسی اور ناعاقبت اندیشی وغیرہ کا الزام آجانا ضروری ہے جس کے بعد اس کو حق بجانب نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور اسی کے ساتھ اُس کی کامیابی اور تاثیر رخصت۔

حالات کی اصلاح کے لیے احتجاج و استغاثہ، مصالحت اور معاہدۂ مودت یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا اختیار کیا جانا ابتدائی حدود میں ضروری ہے۔ بے شک جب یہ سب ذرائع اختیار کیے جانے پر ناکام ثابت ہوں تو پھر عربی مثل من جرّب المجرّب حلت به الندامة اور فارسی مثل "آزمودہ را آزمودن جہل است" کے مطابق انسان سے ان ذرائع کا مطالبہ نہ ہوسکیگا اور اس کی رفتار عمل کو آگے بڑھ کر دوسرے اقدام تک پہونچنے کا حق ہوگا۔ یہی تدریجی رفتار اقدام عمل میں جب تک قائم ہے کامیابی کی توقع ہے ورنہ نہیں۔ ایک بات ہو جانے پر پہلے ہی دن مرنے مارنے پر آمادہ ہوجانے والا مغلوب الغضب کہا جائے گا۔ وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں برخلاف اس کے اگر تمام دیگر ذرائع و اسباب سے اتمام حجت کے بعد انسان کسی اہم مقصد کے لیے جان دینے پر تیار ہو جائے تو فداکاری و جاں نثاری اور مؤثر قربانی قرار پائے گی۔

ایک انسان اگر اپنے افعال و اعمال میں توازن کو ملحوظ رکھتا ہے اور اپنی کارگزاریوں میں صرف جذبات کا فرماں بردار نہیں بلکہ عقلی غور و تدبر کا پابند ہے تو اُسے اس نظام کا پابند ہونا ضروری ہے۔ شام کی اموی سلطنت کے ہاتھوں بے شک مذہب خطرہ میں تھا۔ اور حق و راستی پامال ہو رہی تھی جس کی اصلاح کے لیے قربانی درکار تھی لیکن اس قربانی کے حق بجانب قرار پانے کے لیے دوسرے پر امن اور صلح پرور وسائل و ذرائع کے پہلے صرف کیے جانے کی ضرورت تھی۔ اگر امام حسینؑ بغیر کسی قسم کے سابقہ حالات کے اچانک یزید کی بیعت سے کنارہ کشی کر کے باوجود فقدان اعوان و انصار مخالفت پر جس کا لازمی نتیجہ آپ کا قتل ہونا تھا تیار ہو جاتے اور ایسا کرتے تو ان سوالوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا کہ آخر امام نے اتحاد عمل کے ساتھ حالات کی درستی کی کوشش کیوں نہ کی؟

مخصوص شرائط کے ساتھ صلح کر کے اپنے مقاصد کو کیوں نہ حاصل کیا؟ کم سے کم امورِ سلطنت سے بے تعلقی اختیار کر کے مدینۂ رسول میں قیام پذیر کیوں نہ رہے اور کربلا آکر اپنے کو معرضِ خطر میں کس لیے ڈالا ۔؟

ان سوالات کے پیدا ہونے کے بعد جن کا کوئی صحیح حل بھی بظاہر موجود نہ ہوتا یقینی آپ کا قتل ہونا صرف جذبات کی کارفرمائی کا نتیجہ قرار پاتا اور اس لیے نہ قابلِ ستائش ہوتا اور نہ مؤثر و کامیاب مگر یہاں صورت حال یہ تھی کہ امام حسینؑ کا اقدام ایک مکمل نظام کے تحت میں واقع ہو رہا تھا جس کے لیے برسوں کی طویل مدت کے حالات موقع کو قریب لا رہے تھے یہاں تک کہ ۶۰ھ سے لے کر ۶۱ھ تک میں اُس کا وقت آگیا۔

شروع شروع میں جناب امیرؑ کا اپنے حقوق کی پامالی کے باوجود ۲۵ سال خاموش رہنا، اس کے بعد لوگوں کے انتہائی اصرار پر خلافت قبول کرنا اور بنی امیہ کا آپ کے مقابلہ میں برسرپیکار ہو جانا آپ کا شہید ہونا اور امام حسنؑ کا مسندِ خلافت پر متمکن ہونا لیکن حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے صلح کر لینا اور مخصوص شرائط معاہدہ کے ساتھ سلطنت کی ذمہ داریوں سے دستکش ہو کر دس برس خاموشی کی زندگی بسر کرنا اور پھر دس ہی برس تک خود امام حسینؑ کا بھی عملی حیثیت سے خاموش رہ کر حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اکثر زبانی یا مکتوبی احتجاج کرتے رہنا لیکن باوجود اس کے حالات کا رو باصلاح ہونے کے بدلے بد سے بدتر ہوتے جانا، شرائط معاہدہ کو ٹھکرا دیا جانا، صلح نامہ کے دفعات کا پامال ہو جانا زبانی احتجاج و استغاثہ پر کوئی شنوائی نہ ہوتا بلکہ اپنے انسانیت سوز اور اسلام کش افعال پر بیش از بیش اصرار کیا جانا اور اس سلسلہ میں پانی کا سر سے اونچا ہو جانا اور معاملات کا حد سے گزر جانا وہ تھا جس نے امام حسینؑ کے لیے

اس عظیم اقدام کا موقع پیدا کر دیا تھا کہ جو اُنھوں نے کربلا کی سرزمین پر انجام دیا۔
حسینؑ کے سامنے اب صلح کا سوال آ ہی نہیں سکتا تھا اس لیئے کہ صلح کی منزل کو امام حسنؑ طے کر چکے تھے اور اب شرائط صلح کی مخالفت ہی وہ صورت حال تھی جو امام حسینؑ کے سامنے تھی حالانکہ معاویہ اپنے اعمال میں بہر حال کچھ نہ کچھ پردہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر جب معاویہ کے ساتھ مصالحت نتیجہ میں ناکام رہی تو یزید کے ساتھ مصالحت کے کیا معنی؟

پھر امام حسنؑ نے جو صلح کی اُس کی نوعیت تو یہ تھی کہ پہلے حضرت امام حسنؑ مسند خلافت پر متمکن تھے۔ صلح کے ذریعہ سے آپ نے حکومت ظاہری کو چھوڑ دیا اور مخصوص شرائط کے ماتحت معاویہ کے سپرد کر دیا مگر اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ آپ نے خلافت الٰہیہ، امامت یا تمدن اسلامی کے بارے میں اپنے دینی مسلک و معاشرتی و اجتماعی اصول سے دست برداری اختیار کر لی۔ یہ صلح اس کے بعد سے صرف ایک معاہدۂ عدم تعرض کی حیثیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے روحانیت کا مرکز دنیوی اقتدار کے مرکز سے ایک عرصہ تک کے لیے علیحدہ ہو گیا۔ بس اسی لیے حضرت امام حسنؑ کی زندگی اس معاہدہ کے بعد بھی محفوظ نہیں رہی سلطنت شام امام حسینؑ سے اس عدم تعرض پر اکتفا کرنے والی ہوتی تو طلب بیعت کی ضرورت نہ تھی کیونکہ عدم تعرض تو ان حضرات کی جانب سے قائم ہی تھا۔ دمشق کی سیاست اب اس پر رضامند نہیں تھی کہ روحانیت کا مرکز مادی اقتدار کے مرکز سے الگ دنیا میں موجود رہے۔

معاویہ کا معاہدہ وقتی طور پر ایک مجبوری کا نتیجہ تھا، بغیر اس کے حضرت امام حسنؑ کی تسلیم شدہ حیثیت جو مسلمانوں میں باعتبار حکومت حاصل تھی ختم نہیں ہو سکتی تھی اس کے بعد اُن کو خود اور اُن کے بعد یزید کو شدت کے ساتھ

اس کا احساس تھا کہ یہ کانٹا ہمیشہ کے لیے راستے سے نکل جائے۔ تسخیر ممالک اور تسخیر قلوب مختلف چیزیں ہیں ایک کو دوسرے سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ فاتح ممالک کو فاتح قلوب سے ہر وقت اندیشہ رہتا ہے۔ یہی خطرہ تھا جس کی وجہ سے اہلبیت رسول سلطنت دمشق کی نظر میں بہرحال قابل مزاحمت تھے خواہ وہ مزاحمت کریں یا نہ کریں۔

ان حالات کے ہوتے ہوئے امام حسینؑ کے لیے اُس طرح کی صلح کا کوئی محل نہ تھا جیسی صلح امام حسنؑ کر چکے تھے۔ وہ صلح ایسی تھی کہ اگر اُس وقت ذمہ دارانہ حیثیت امام حسینؑ کی ہوتی تب آپ بھی اُس صلح کے مسلک کو اختیار کر کے مسلمانوں میں امن قائم کر دیتے اور حسینؑ کے سامنے تھا بیعت کا سوال۔ اس کے معنی تھے اُس روحانی مرکز کی شکست جس کے حسینؑ ذمہ دار تھے۔ اس کے معنی تھے اُس تمدن اور نظام سیاست کو قبول کر لینا جو سلاطین دمشق نے قائم کیا تھا۔ یہ ایسی چیز تھی جو آل محمدؐ کے لیے کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی خواہ حسینؑ ہوتے یا ان کے بجائے اس وقت امام حسنؑ ہوتے۔

پھر سابق زمانہ میں تو خلفاء اپنے کو کتاب اور سُنت کا محافظ ظاہر کیا کرتے تھے اور بیعت بھی اسی پر لی جاتی تھی کہ کتاب و سُنت پر عمل ہوگا مگر یزید کے دور میں سلطنت کی مطلق العنانی اور خودسری اس درجہ پر پہونچ گئی تھی کہ بیعت لی جاتی تھی اس بات پر کہ ہم خلیفہ کی ملکیت ہیں وہ ہمارے جان و مال اور اولاد کے ساتھ جو چاہے سلوک کر سکتا ہے۔ مدینہ میں یزید بن عبد اللہ بن ربیعہ بن اسود اسی جرم پر قتل کئے گئے کہ وہ کتاب اور سنت پر بیعت کرنے کے لیے تیار تھے۔ مگر مذکورہ الفاظ میں یزید کی غلامی کا اقرار کرنے کے لیے تیار نہ تھے[1]

---

(۱) الاخبار الطوال صفحہ ۲۶۱

ان ہی باتوں کا نتیجہ تھا جیسا کہ بعد میں معلوم ہوگا کہ امام حسینؑ کو آپ کے اس اقدام کے سلسلہ میں مختلف اوقات میں بہت سے مشورے دیئے گئے۔ یہ کہا گیا کہ مدینہ ہی میں قیام کیجیے۔ یہ کہا گیا کہ مکہ کو مستقر بنائے رکھیے۔ یہ کہا گیا کہ طائف یا یمن کی طرف چلے جائیے یہ کہا گیا کہ کوہ اجا میں چل کر پناہ لیجیے مگر یہ کسی عزیز یا دوست نے مشورہ نہیں دیا کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجیے کیونکہ یہ ایک تسلیم شدہ بات تھی کہ یزید کی بیعت امام حسینؑ کے لیے کسی طرح ممکن نہیں۔

یزید کی بیعت کرنے کے معنی یہ تھے کہ حسینؑ ہر قسم کے شریفانہ شعور اور مسلمانوں کے ہر قسم کے حقوق کو بیچ ڈالتے۔ حسینؑ کے لیے محال تھا کہ حسینؑ فضیلت اور ذلیلت کو ایک درجہ میں رکھتے۔

عبد اللہ بن عباس، عبد الرحمٰن بن ابی بکر اور عبد اللہ بن زبیر وغیرہ نے بھی یزید کی خلافت کو پسند نہیں کیا۔ ان سب نے معاویہ کے سامنے ہی یہ کہدیا تھا کہ ان کا یہ طریق عمل کسی طرح جائز نہیں ہے۔ پھر حسینؑ تو ہر دوسرے شخص سے زیادہ اسلام کا درد رکھتے تھے۔

حسینؑ زیادہ حق رکھتے تھے کہ وہ یزید کے مطالبات کو حقارت کی نظر سے دیکھیں اور ہر قسم کی قربانی اسلام کی حمایت میں پیش کریں۔

سولھواں باب

حسینی موقف کی تشریح

جب کوئی صورت سمجھوتے اور مصالحت کی بھی نہیں تو پھر اب کیا رہ جاتا ہے؟ جنگ! مگر مادی طور پر جنگ کرنے کا سوال اس وقت پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ تاریخی صورت حال یہ ہے کہ اس وقت حضرت علی بن ابی طالبؑ کی وفات کو بیس۲۰ برس گزر چکے تھے۔ بنی امیہ کی طاقت جو شام میں تھی حضرت علیؑ ہی کے زمانہ میں اتنی مضبوط ہو گئی تھی۔ کہ حضرت علیؑ کی قوت سے صفین میں گویا برابر کی ٹکر لے سکی اور حضرت امام حسنؑ کو اُس سے مقابلہ میں ایک شدید خونریزی کے آثار نظر آئے جس کی وجہ سے آپ نے صلح کرنا بہتر سمجھا۔ حالانکہ اُس وقت "شیعیان علی" کی جمعیت منظم تھی مگر اب بیس۲۰ برس کی طولانی مدّت گزرنے پر وہ جتھا پراگندہ ہو چکا تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے ضمیر خریدے جا چکے تھے، بہت سے ثابت قدم لوگوں کے سر قلم کیے جا چکے تھے اور بہت سوں کو جیلوں میں بھرا جا چکا تھا۔ بقیہ لوگ خوف و دہشت اور بددلی سے ادھر اُدھر پریشان و پاشان ہو گئے تھے۔ ایسی صورت میں دمشق کے شہنشاہی اقتدار کے مقابلہ میں جنگ کا سوال ہی کیا پیدا ہو سکتا تھا؟! اس کے علاوہ آپ کا مقصد جو یزید کے مقابلہ میں تھا وہ مادی جنگ سے حاصل بھی نہیں ہو سکتا تھا اس کی تشریح آئندہ کی جائے گی۔

اس کے بعد جو حضرت امام حسینؑ بیعت سے انکار کر رہے تھے تو کیا کرینگے؟ اسے اگر حسینؑ کر کے نہ دکھلاتے تو ہماری ہرگز سمجھ میں نہ آتا۔ حسینؑ نے یہی طے کیا کہ وہ جنگ کریں گے مگر جنگ کا طریقہ بدل دیا۔ جتنی لڑائیاں ہوتی ہیں ان میں طاقت کا مقابلہ طاقت سے ہوتا ہے۔ حسینؑ نے سب سے پہلے یہ نمونہ پیش کرنا چاہا کہ آپ طاقت کا مقابلہ کردار سے کریں گے، آپ نے یہ طے کیا کہ آپ اقتدار کا مقابلہ بےبسی سے، کثرت کا مقابلہ قلت سے اور ظلم کا مقابلہ مظلومیت کے ساتھ کریں گے اور یہ وہ طریقہ جنگ تھا جس کا مشاہدہ اس کے پہلے دنیا نے نہیں کیا تھا۔

آپ محسوس کر رہے تھے کہ تعلیمات اسلام پر ایسا غلاف چڑھ گیا ہے جس سے آئندہ صدیوں کو اور قیامت تک آنے والی نسلوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ حقیقۃً وہ تمدن، وہ آئین معاشرت اور وہ نظام زندگی کیا تھا جسے پیغمبر اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ بعد کی آنے والی نسلوں کے لیے سابقہ حالات معلوم کرنے کا ذریعہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ کتب تواریخ۔ یہی تاریخ کی دوربین وہ ہے جس کے ذریعہ سے صدیوں اور ہزاروں برس پہلے کے حالات کا انسان مطالعہ کرتا ہے۔ اسلامی دنیا میں سلاطین اسلام کا شاہنشاہی اقتدار اتنا نمایاں تھا کہ اگر اسلامی تمدن و تہذیب کی جانچ کے لیے کوئی طالب تحقیق تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالتا تو اُس کو اسلام کی سرزمین پر دمشق اور بغداد کے اونچے قصر نظر آتے، وہ بڑے بڑے پھاٹک دکھائی دیتے جن پر زرتار پردے پڑے ہوئے ہیں، وہ ایوان جلوہ دکھاتے جہاں دیواروں پر زر و جواہر کا کام بنا ہوا ہے اور سونے چاندی کے دروازے ہیں اور اگر محل کے اندر

باریابی ہو جاتی تو زر و جواہر سے مرصع تخت نظر آتا اور زریں کمر غلام صف باندھے ایستادہ، مہ جبینوں کا جھرمٹ، شراب کے دور، مغنی کی صدا اور سازِ طرب کے نغموں کی گونج۔ "پیشوائے اسلام" کی بارگاہ میں نماز کا وقت آتا ہے تو وہ بھی سلام کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ موذن کی صدا آتی ہے مگر نشاط و طرب کے نقار خانہ میں طوطی کی آواز بن کر سنائی نہیں دیتی۔ جب وہ یہ نظارہ دیکھتا تو کیا یہی رائے قائم نہ کرتا کہ اسلام کا تمدن یہی ہے اور یہی وہ تہذیب ہے جس پر مسلمان نازاں ہیں؟ یقیناً ایسا ہی ہوتا کہ وہاں کا آئین و نظام بطور مثال پیش کیا جاتا۔ اُن کے افعال مسلمانوں کے افعال بتائے جاتے اور اُن کا کردار ہی ایک ایسا آئینہ ہوتا جس میں مسلمانوں کی تصویر نظر آتی۔ کہاں نظر آتے محلہ بنی ہاشم کے وہ ٹوٹے پھوٹے کھنڈر جن میں کچھ بوڑھے، کچھ جوان اور کچھ بچے اپنے خالق کی یاد میں مصروف ہیں۔ وہ دروازے جہاں غریب، محتاج اور مسکین آتے ہیں تو اپنے سامنے کا کھانا اٹھا کر دے دیا جاتا ہے اور خود فاقہ سے دن گزار لیے جاتے ہیں۔ جہاں غلام اور کنیز سے مساویانہ برتاؤ کیا جاتا ہے۔ کہاں نظر آتے وہ چہرے کہ جن پر محنت و مشقت برداشت کرنے سے زردی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ ہونٹ جو ذکر الٰہی سے خشک ہو گئے ہیں۔ وہ افراد جن کا نصب العین یہ ہے کہ کسی غریب کو اٹھاؤ، کمزور کی مدد کرو۔ کسی محتاج و بیکس کی دستگیری کرو۔ کسی مظلوم کو ظلم سے نجات دلاؤ اور دنیا کو اپنے اخلاق سے نمونۂ جنت بناؤ۔

بس حسینؑ بن علیؑ کا مقصد یہ تھا اور وہ یزید کی بیعت کا انکار کرتے

ہوئے اسی پر کمر بستہ ہوگئے تھے کہ تو سہی انسانیت کی نگاہ کو ان اونچے مناظر سے ہٹا دیں، ان قصروں اور میناروں سے موڑ دیں اور اسلامی اصولوں کی برق تجلی کو عمل کی اُس معراج پر آنکھوں کے سامنے لائیں کہ نظر اُٹھتے ہی سب سے پہلے اُسی پر جا پڑے اور اُسی کی چمک دمک میں محو ہو جائے۔ اُنھوں نے چاہا کہ اپنے کردار کو ایسی بلندی پر لے جائیں جہاں وہ ستارے کی طرح چمک اُٹھے۔ سلاطین دنیا کے بڑے بڑے محل اور مینار نظر نہ آئیں بلکہ آپ کا کردار نظر آئے۔ وہ چاہتے تھے کہ انسانیت کے کانوں کو اُس نقارہ خانۂ ساز نغمہ سے بہرا بنا دیں اور حقانیت اسلام کی اُس سریلی اور دلکش آواز سے شناسا کر دیں جو موجودہ فضا میں سنائی نہیں دیتی۔

دوسری لفظوں میں آپ کا مطلب یہ تھا کہ ایک مرتبہ دنیا کے سامنے اس حقیقت کو پوری شدّت و قوت سے پیش کر دیں کہ حکومت و شہنشاہیت اور ہے اور اسلامی تمدن و تہذیب اور اُس کے اصول اور ہیں۔

حضرت امام حسینؑ جس مقصد کو لے کر اُٹھ رہے تھے وہ اپنی نوعیت و خصوصیت میں کوئی نیا نہ تھا وہ تو وہی تھا جسے تمام انبیاء لے کر آئے تھے اور جس کے لیے تمام مصلحین ہمیشہ کوشش کرتے رہے مگر اس کو جس صورت سے آپ نے حاصل کیا وہ ایک ایسی مثال ہے جو نہ اس سے پہلے نظر آئی اور نہ بعد کو۔

سیاسیاتِ امم کے واقفکار خوب جانتے ہیں کہ ظلم و جور کی طاقت اور شہنشاہیت جس وقت افراد انسانی کو اپنے شکنجہ میں قید رکھنا چاہتی ہے

تو کچھ ذرائع اختیار کرتی ہے اور اُن تمام ذرائع کا اصلی مقصد دو چیزیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ عوام سے قوت احساس کو سلب کیا جائے دوسرے جرأت اظہار کو ختم کیا جائے۔ شام کی اموی حکومت نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ان ہی دو باتوں پر پوری طاقت صرف کردی تھی۔ ورنہ مسلمان جن کو پیغمبر نے محنت و مشقت کیساتھ اصول انسانیت کی تلقین کی ہو اور جنہوں نے دیکھا ہو کہ پیغمبر کس طرح مادی ساز و سامان کو ہیچ سمجھتے تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو کہ پیغمبر کے دروازے پر بیٹھا ہوا پردہ پڑا رہتا تھا جنہوں نے دیکھا ہو کہ تین تین دن تک پیغمبر کے گھر سے دھواں نہیں اٹھتا، جتنا روپیہ آتا ہے غریبوں اور مسکینوں کو دے دیا جاتا تھا وہی کیونکر اس کو برداشت کر سکتے کہ بادشاہ کے خزانہ میں غریبوں کا خون چوس چوس کر روپیہ جمع ہو اور اُس کو رنگ رلیوں میں صرف کیا جائے۔ خلیفہ کی بارگاہ میں رقص و سرود کی محفلیں ہوں اور شراب و کباب کے مشغلے رہیں مسلمان اس کو صرف خاموشی سے دیکھتے ہی نہ رہیں بلکہ ایسے شخص کو پیشوا تسلیم کریں۔ یہ فطرت کا انقلاب مسلمانوں میں کس طرح پیدا ہو سکتا تھا؟ صرف قوت احساس ختم ہونے اور جرأت اظہار کے سلب ہونے سے۔

قوت احساس ختم کرنے کی صورتیں بہت سی ہیں۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ عوام صاحب رائے نہیں ہوتے اُن کے پاس دل ہوتا ہے مگر دماغ نہیں ہوتا۔ دماغ رکھنے والے ممتاز افراد اور لیڈر ہوتے ہیں۔ خاص خاص لیڈروں کو اپنے ہاتھ لے لیا جائے تو جدھر یہ لیڈر لے جانا چاہیں

عوام بے خبری کے ساتھ اُسی طرف چلے جائیں گے۔ خواہ یہ راستہ کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو۔ اسی بنا پر عموماً جمہوریتوں میں ظاہری کثرت رائے حقیقی رائے عامہ کی ترجمان نہیں ہوتی۔ اموی سیاست نے خواص کو اپنے قبضہ میں کیا اس طرح کہ جس کو ذرا مخالفانہ رجحان رکھتے ہوئے پایا، اُس کی جیب میں اشرفیوں کی ایک تھیلی پہونچا دی گئی۔ اگر اُس نے قبول کرلی تو سمجھ لیجیے کہ جتنا ان اشرفیوں کا وزن تھا اتنا ہی اُسکی مخالفت کا سر جھک گیا۔ بلکہ "چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی" جہاں خیال پیدا ہوا کہ اب کی دفعہ دو توڑے ملے ہیں اس کے بعد بجائے دو کے چار لیں گے وہیں قوت احساس ختم ہوگئی یعنی یہ خیال ہونے لگا کہ دنیا کے لیے چاہے جیسے ہوں یہ حکام ہمارے لیے تو بہت اچھے ہیں۔ اس طرح بہت سے لوگوں کا ضمیر خرید لیا گیا اور بہت سے اصول کے پختہ جن کے سر اُٹھے ہی رہے اُن کے سر اور جسم میں جدائی پیدا کر دی گئی اور اگر یہ حربہ خطرناک معلوم ہوا تو شہد کا ایسا جام جو لب تک پہونچتے ہی موت کی میٹھی نیند سلا دے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے یہ سوچنا موقوف کر دیا کہ ہو کیا رہا ہے اور بہت سے لوگوں نے جب کچھ سوچا تو اُن لوگوں کے انجام کو دیکھا جو اس کے پہلے کچھ سوچ کر اختلاف کا اظہار کر چکے تھے کہ آج صفحہ ہستی اُن کے نقش وجود سے خالی ہے۔ اس طرح جرأت اظہار ختم ہوئی۔

یہی دو چیزیں ایسی تھیں جن کو از سر نو پیدا کرنے کا بیڑا اٹھا کر حضرت امام حسینؑ میدان میں آئے۔ آپ نے سوچا کہ قوت احساس کیونکر پیدا کی جائے؟ اس کے لیے ایک حاذق طبیب کی طرح مرض کے

سبب پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔ آخر مسلمانوں کی اس بے حسی کا سبب کیا ہے؟ کیا یہ واقعی مسلمان نہیں رہے؟ دیکھا تو اب بھی لوگ اسلام کو مانتے ہیں اور اپنے کو مسلمان کہنا فخر سمجھتے ہیں۔ مگر ان کے احساسات اسلامی پر غشی چھا گئی ہے جیسے کوئی آدمی بیہوش ہو جائے تو اس میں نفس کی آمدو شد قائم رہتی ہے جو زندگی کا پتہ دیتی ہے مگر آثار زندگی مفقود ہوتے ہیں۔ احساس اور حرکت ارادی دونوں چیزیں گم ہوتی ہیں اسی طرح اس وقت جامعۂ اسلامیہ میں کلمۂ توحید کے نفس کی آمد و شد ہے جو ان کے ظاہری طور پر اسلام کی دلیل ہے مگر اسلامی روح کام کچھ نہیں کر رہی ہے اور احساسات اسلامی فنا ہو گئے ہیں۔ ہر ایک کو معلوم ہوگا کہ جب کسی کو غش آجاتا ہے تو اس کے چہرے پر چھینٹا دیا دیا جاتا ہے۔ جتنی گہری بے ہوشی ہو اتنا ہی تیز چھینٹا دیا جائے گا۔ امام حسینؑ نے بس یہ چاہا کہ مسلمانوں کے بیہوش احساسات پر ایک ایسا تیز چھینٹا دے دیں جس کے بعد وہ پھر ہری لے کر آنکھ کھول دیں اور گھبرا کر یہ دیکھنے لگیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ یہ بھی قابل غور امر تھا کہ اس بیہوشی کا سبب کیا ہے؟ یقیناً اس کا سبب یہ تھا کہ وہ جماعت جو تعلیمات اسلامی کو مٹا رہی ہے اگر صاف صاف کوئی غیر مسلم جماعت ہوتی تو مسلمان جلدی سے چونک پڑتے لیکن وہ جماعت جو اس وقت تعلیمات اسلام کو برباد کر رہی ہے۔ اپنے چہرہ پر اسمی و رسمی اسلام کی نقاب ڈالے ہوئے تھی۔ اور مسلمانوں کی جماعت میں داخل تھی اس لیے مسلمان بیدار نہیں ہوتے تھے حضرت امام حسینؑ نے یہ ارادہ کر لیا کہ اپنی مقابل جماعت کے چہروں سے اسلام کی اس نقاب کو اتار کر

پھینکدیں اور دنیا کو دکھلادیں کہ اس نقاب کے پیچھے کیسے لوگ چھپے ہوئے ہیں اور یہ کہ ان کو اسلام سے حقیقۃً کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس طرح ایک تو موجودہ مسلمان ان سے بیزار ہو جائیں گے اور ان کے خلاف انقلاب پیدا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ دوسرے بعد میں مسلمانوں کے لیے ان کے افعال سند نہ رہیں گے۔ جب مسلمانوں کو ان کے اسلام کی صحیح تصویر معلوم ہو جائیگی تو مسلمان دھوکا کھا کر ان کے دام میں نہ پھنس سکیں گے۔ تیسرے غیر مسلم دنیا کے سامنے اسلام کی جانب سے صفائی پیش ہو جائے گی۔ اگر بنی اُمیّہ کے اوصاف و اخلاق کو اسلام کے خلاف پیش کیا جائے گا تو مسلمانوں کی گردنیں جھکیں گی نہیں بلکہ حسینؑ بن علیؑ کا کردار مسلمانوں کے سر کو بلند کریگا کہ اگر یزید کے افعال کا اسلام سے کوئی تعلق ہوتا تو پیغمبر اسلام کا نواسا اپنے کو خطرہ میں کیوں ڈالدیتا۔ یہی مقاصد وہ تھے جو تمام و کمال مادی جنگ سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ مادی جنگ سے جو فتح حاصل ہوتی ہے اُس سے افراد و اشخاص قتل ہوتے ہیں مگر ذہنیت قتل نہیں ہوتی۔ سلطنتوں میں انقلاب ہو سکتا ہے مگر افراد جامعہ کے احساسات میں انقلاب نہیں ہوتا۔ حسینؑ بن علیؑ اشخاص کو قتل کرنے نہیں اُٹھے تھے۔ یزید کو ہلاک کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو یزیدیت کو قتل کرنا چاہتے تھے ہو سکتا تھا کہ یزید ختم ہو جاتا اور اُس کے تمام عمال اور فوجی افسر بھی ہلاک ہو جاتے پھر بھی یہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا کہ یزیدیت ختم ہو گئی اور یزیدی مسلک فنا ہو گیا۔ ذہنیت دنیا کی جب تاوقتیکہ تھی تو اگر عسکری طاقت سے کر

جنگ کرتے تو جو اُس کی واقعی حیثیت تھی اُس کے سمجھنے والے بہت کم ہوتے اور یہ سمجھنے والے زیادہ ہوتے کہ حکومت و سلطنت کی غرض سے دو بادشاہوں کی جنگ ہے اور سیاسی حیثیت سے یزید کا پلہ گراں رہتا، اس لیے کہ وہ بادشاہ تسلیم کیا جا چکا تھا۔ اس صورت میں اگر آپ کو فتح حاصل بھی ہوتی جو گزشتہ اسباب کی بنا پر بظاہر غیر ممکن تھی تو اس کا اثر ایک وقتی انقلاب سلطنت کی صورت سے ہوتا جس کا نتیجہ دیرپا نہوتا اور بنی اُمیہ پر جو ظاہری اسلام کا پردہ تھا وہ اُسی طرح پڑا رہتا اور اگر کچھ لوگ حسینؑ کو حق پر سمجھتے بھی ہوتے تو فریق محارب کو خطاء اجتہادی کی سند دیدیتے جیسا کہ اس سے پہلے صفین کی جنگ کے متعلق ہو چکا تھا اس صورت میں بنی اُمیہ کے باطنی حالات کا اس درجہ انکشاف کہ جو اُن سے ہمدردی کا کوئی گوشہ انسانیت کے دل میں باقی نہ رکھے ہرگز نہیں ہو سکتا تھا اور جب تک اُن سے نفرت انتہائی درجہ پر پیدا نہ ہوتی اُس وقت تک ان امتیازات و اقدار کی مکمل شکست نہیں ہو سکتی تھی جنہیں بنی امیہ نے عملی طور پر قائم کرنا چاہا تھا۔

اگر امام حسینؑ طاقت کے ذریعہ سے یزید کی طاقت کو شکست دیتے تو پھر بھی دنیا اس چیز کو نہ سمجھتی کہ حقانیت اور حکومت دو الگ چیزیں ہیں حسین بن علیؑ کی فتح ویسی فتح سمجھی جاتی جو بادشاہوں کی فتح ہوتی ہے یعنی اگر آپ یزید کو شکست دے کر سلطنت پر قابو حاصل کر لیتے تو آپ کی سلطنت کو دنیا سلطنت ہی سمجھتی۔ اسلام کی حقیقت نہ سمجھتی حالانکہ تاریخی حالات بتلاتے ہیں کہ اس طرح کی مکمل فتح آپ کو کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ بڑی سے بڑی مادی کامیابی بھی آپ کی محدود حیثیت رکھتی یعنی اُس صورت

ہیں کہ جب کوفہ میں حالات سازگار ہوتے اور سب لوگ آپ کی حکومت تسلیم
کر لیتے تو زیادہ سے زیادہ وہی ہوتا جو حضرت علی بن ابی طالبؑ کو وقت سے
مجبور ہو کر گوارا کرنا پڑا تھا یعنی عراق و حجاز وغیرہ کی حکومت امام حسینؑ کے
پاس اور شام کی حکومت یزید کے پاس ہوتی دونوں طرف کی حکومتوں میں
مقابلہ ہوا کرتا اور مسلمانوں کی طاقتیں آپس میں لڑ کر پاش پاش ہوتی رہتیں
مگر امام حسینؑ ایسی کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے جو نہ باعتبار حدود مملکت محدود ہو
اور نہ باعتبار حدود زمانہ محدود۔

ممکن ہے یہ سوال اُٹھایا جائے کہ حسینؑ کے واقعۂ شہادت کے بعد بھی
تو بہت سے سلاطین انہی افعال کے مرتکب ہوتے رہے جن کا یزید ارتکاب
کرتا تھا مگر یاد رکھنا چاہیے کہ حسینی مقاومت نے اسلام کے تمدن و اصول کو اتنا
نمایاں کر دیا کہ اب اس کے خلاف جو افعال ہوتے ہیں وہ انفرادی اور شخصی
جرائم کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھیں آئینی اور مذہبی درجہ نہیں حاصل ہوتا یعنی
یہ خطرہ اب ہمیشہ کے لیے دور ہو گیا ہے کہ انہی کو اسلام کا مستقل اصول اور طریق
معاشرت سمجھ لیا جائے کیونکہ امام حسینؑ نے اسلام کی آئینی عظمت کا نہ مٹنے والا
نقش قائم کر دیا ہے

گزشتہ بیانات سے صاف ظاہر ہو گیا کہ حسینؑ بن علیؑ کے لیے اپنے
مقصد کے حصول کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ وہی جسے اُنھوں نے اختیار
کیا اور اسکے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔

آپ اس راستے میں موت کے استقبال پر ہمیشہ سے تیار تھے جو آپ کے
الفاظ اور مخاطبات سے ظاہر تھا۔

چنانچہ مکہ سے روانگی کے وقت اپنے خطبہ میں آپنے ارشاد کیا کہ "موت انسان

کی گردن سے اُسی طرح وابستہ ہے جیسے گلوبند جوان عورت کی گردن سے"۔ بادی النظر میں تو آپ کو اس سے صرف اتنا ظاہر کرنا مقصود تھا کہ انسان کے گلے میں موت کا پھندا پڑا ہوا ہے اور بہرحال اُس کو ایک نہ ایک دن اس دارفانی سے رخصت ہونا ہے۔ مگر آپ نے اس تلخ حقیقت کا کچھ ایسے دلکش انداز سے تذکرہ فرمایا ہے جس سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک موت کوئی ناگوار شے نہیں بلکہ حسین و دیدہ زیب چیز ہے۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ انسان کی جیسی ذہنیت ہوتی ہے ویسے ہی الفاظ اُس کی زبان پر آتے ہیں۔ چونکہ حسینؑ اُس گھرانے کی ایک فرد تھے جس کے افراد عمومی حیثیت سے موت کو کبھی خطرے میں لاتے ہی نہیں تھے۔ اور آپ کے پیش نظر بقائے حقانیت کا اہم ترین مقصد بھی تھا لہٰذا آپ کے تاثرات اس بارے میں بہت زیادہ قوی تھے۔

چنانچہ مکہ سے روانگی کے بعد پہلی ہی منزل پر جب آپ کی فرزدق شاعر سے ملاقات ہوئی اور اُنھوں نے کوفہ کی حالت آپ سے بیان کی کہ "لوگوں کے دل تو آپ کی طرف ضرور ہیں مگر تلواریں اُن کی بنی اُمیہ کے ساتھ ہوں گی"۔ تو آپ نے فرمایا "تم سچ کہتے ہو لیکن ہر بات خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور ہر دن وہ ایک نیا کرشمۂ قدرت کا دکھاتا ہے۔ خدا کی تقدیر اگر ہماری خواہش کے مطابق ہوئی تو ہم خدا کی حمد کریں گے اور ادائے شکر کے لیے اُسی سے مدد کے طالب ہوں گے اور قضائے الٰہی ہمارے سدراہ ہوئی تو انسان کے لیے یہی کیا کم ہے کہ اُس کی نیت میں سچائی اور اُس کے ضمیر میں پارسائی کا خیال باقی رہے"۔ (۱)

---

(۱) ارشاد ص ۲۲۰

عراق کے راستے میں حُر کے ساتھ جو آپ کی گفتگو ہوئی تھی وہ بھی آپ کے اسی مستقل نظریہ کے ماتحت تھی یعنی یہ کہ حر نے کہا کہ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں آپ اپنے اوپر رحم کریں اس لیے کہ اگر آپ نے جنگ کی تو آپ یقیناً قتل کر دیئے جائیں گے اور تباہ ہوں گے۔ تو آپ نے جواب دیا کہ تم مجھے موت سے ڈراتے ہو؛ کیا تم اس سے زیادہ کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو؟

اس کے بعد آپ نے قبیلۂ اوس کے ایک شاعر کا یہ شعر پڑھا کہ:۔

سامضی وما بالموت عار علی الفتیٰ اذا ما نوی حقا وجاھد مسلما

"میں اپنے ارادہ پر قائم رہوں گا اور موت سے دوچار ہونے میں جوانمرد کے لیے کوئی عار و ننگ نہیں ہے جب کہ اُسکی نیت میں سچائی ہو اور وہ راہِ حق میں جہاد کر رہا ہو۔" (۱)

یہ بظاہر عجیب چیز ہے۔ انسانی نگاہ میں آخری اور انتہائی انجام قتل ہونا ہے۔ لیکن حضرت امام حسینؑ فرماتے ہیں کہ "کیا اس سے زیادہ تم کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو"، یعنی آپ قتل ہونے کو ایک درمیانی منزل قرار دے کر آخری معیار فتح و شکست کا کچھ اور قرار دے رہے ہیں۔

ذو حسم ہی کے مقام پر جب حر کا لشکر امام کی مزاحمت کے لیے آچکا ہے تو حضرتؑ نے اپنے اصحاب کے سامنے خطبہ ارشاد کیا جس میں حمد و ثنائے باری کے بعد فرمایا:۔

"صورت حال جو پیش آئی ہے وہ تم دیکھ رہے ہو اور یقیناً دنیا کا رنگ بدل گیا ہے۔ اور اُس کی نیکی رخصت ہو چکی ہے اور اُس میں کچھ رہ نہیں گیا ہے

---

(۱) ارشاد ص ۲۳۶ - ۲۳۷

سوائے تھوڑے حصہ کے جو پانی بہنے کے بعد برتن میں بچ رہتا ہے۔ اور ایک پست زندگی مثل زہریلی گھانس کے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہوتا اور باطل سے علیحدگی نہیں اختیار کی جاتی۔ اس صورت میں مومن یقیناً خدا کی ملاقات کا آرزومند ہوتا ہے۔ میرے نزدیک تو موت کی صورت میں شہادت کی سی نعمت ہے اور زندہ رہنا ان ظالموں کے ساتھ وبال جان ہے"(۱)

اسی کے ساتھ ——— آپ نے حکام اور عوام کے حقوق و فرائض کے حدود قائم کر دیے اور بتایا کہ حکومت عوام کی ذہنی و عملی ترقی اور دین کے احکام نافذ کرنے کے لیے ہے اور وہ اُس وقت تک قابلِ احترام ہے جب تک عوام کی زندگی کو اُس سے فائدہ پہونچ رہا ہو ——— ایک موقع پر آپ نے حاکم کے اوصاف ان الفاظ میں بیان فرمائے "حاکم کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی دستور پر چلتا ہو۔ عدل و انصاف سے پیش آتا ہو۔ حق کا پابند ہو اور رضائے الٰہی میں اپنے نفس کو مقید کیے ہوئے ہو"(۱) اور جس حکومت کے خلاف آپ احتجاج کرتے رہے اُس کے طرزِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے کئی بار اظہار خیال کیا۔ حر کے لشکر کے سامنے آپ نے فرمایا "رسول خدا نے فرمایا ہے کہ جو ظالم بادشاہ کو دیکھے کہ وہ عہد خدا اور سنت رسول کی مخالفت کر رہا ہے اور بندگان خدا کے ساتھ ظلم و تعدی سے پیش آتا ہے اور وہ قول یا فعل سے اُس ظالم کو نہ روکے تو خدا اسے بھی اُسی جابر و دست بادشاہ کے زمرہ میں شمار کرے گا۔ دیکھو موجودہ حکومت شیطان کی حلیف

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۹ (۲) ارشاد صفحہ ۲۱

بن گئی ہے اور خدا کی فرمانبرداری سے روگردانی کر رہی ہے۔ فتنہ و فساد برپا کر رکھا ہے اور حدود و آئین کو بے کار بنا دیا ہے۔ ملک کے سارے سرمایہ کو اپنی ملکیت بنالیا ہے۔"

عمر سعد کے لشکر سے خطاب کر کے فرمایا "تم دیکھتے نہیں کہ حکومت حق پر عمل نہیں کر رہی ہے اور باطل سے باز نہیں آتی۔ یہ وہ وقت ہے کہ مومن کو موت کی تمنا کرنا چاہیے میں تو اس ماحول میں موت کو اپنے لیے آسودگی اور نیک بختی اور ظالموں کے ساتھ زندگی کو سراسر تکلیف سمجھتا ہوں۔"

شب عاشور کے خطبہ میں اعوان و انصار کو مخاطب کر کے فرمایا "میں باعزت مر جانے کو زندگی سمجھتا ہوں اور ذلت کی زندگی بسر کرنے کو موت خیال کرتا ہوں"

کربلا میں روز عاشور کے خطبہ میں آپ نے فرمایا "خدا کی قسم میں ذلت کے ساتھ اپنے کو تمہارے قبضہ میں نہ دوں گا اور نہ غلاموں کی طرح تمہارے سامنے سے بھاگوں گا"، یہ تھا بہادری اور جانبازی کی موت کا اعلان۔

پھر ارشاد کیا:۔

"میں پناہ مانگتا ہوں ایسے ہر شخص سے جو نخوت و غرور رکھتا ہو اور روز قیامت پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ (۱) موت عزت کے ساتھ بہتر ہے اس زندگی سے جو ذلت کے ساتھ ہو"، پہلے فقرہ میں جبار و سرکش یزید کے جبروت سلطنت کی تحقیر ہے اور دوسرے فقرہ میں اس کی تشریح ہے کہ مادی طاقت کے آگے بلند مقاصد کے خلاف سر جھکا دینا عزت انسانی کے خلاف ہے اور اس زندگی سے جو اس طرح ہو موت بہتر ہے۔

---

(۱) ارشاد ص ۲۴۵

ستر ھواں باب

حرم رسول سے سفر اور حرم خدا میں پناہ

ولید سے گفتگو کے بعد وہ وقت آگیا کہ جب امام نے مدینہ کو ترک کرنا ہی اپنے لیے ضروری سمجھا۔

یہ خیال کرنا کہ آپ مدینہ ہی میں قیام فرماتے تو مدینہ والے آپ کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے، تاریخ کے مسلسل واقعات سے بے خبری یا اُن کے نتائج سے غفلت کا مظاہرہ ہوگا۔

وفات رسول خدا کے بعد ہی سے مدینہ پر کچھ ایسے اثرات چھائے ہوئے نظر آتے ہیں جن کی بنا پر یہ توقعات غلط ثابت ہوتے ہیں۔

آخر یہ مدینہ ہی تو تھا جہاں وفات رسول کے بعد ہی حضرت فاطمہ زہرا پر مصائب کی یورش تھی مگر اہل مدینہ کی طرف سے اُن کے ساتھ ہمدردی کا کوئی مظاہرہ کہیں تاریخ میں نظر نہیں آتا۔

پھر وہ مدینہ ہی تھا جہاں حضرت علیؑ نے گوناگوں دل شکن حالات کا پچیس برس تک مقابلہ کیا مگر اہل مدینہ نے اُن کے ساتھ کسی بھی محبت و غمخواری کا ثبوت نہیں دیا۔

اس کے بعد اسی مدینہ میں وہ موقع آنکھوں کے سامنے آیا کہ حضرت امام حسنؑ کے جنازہ کو روضۂ رسول پر لے جانے میں مزاحمت کی

گئی مگر مدینہ کے لوگوں نے ذرہ بھر بھی اس پر احتجاج نہیں کیا۔ کیا یہ واقعہ
ایسا اہم نہ تھا کہ مدینہ کے جسم میں اگر روح ہوتی تو اس میں حرکت پیدا ہوتی
اور کسی قسم کے احساس کا مظاہرہ کیا جاتا ؟ !

یہ تو کربلا کے پہلے کے کچھ نمونے ہیں اور خود سنہ ۶۱ھ میں حیرت انگیز مگر
ناقابل انکار صورت سے اہل مدینہ کی خاندان رسول کے بارے میں بے حسی
کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ جب شہید ہو گئے اور آپ کے دردناک
مصائب و مظالم کا تفصیل اہل مدینہ کو حال معلوم ہو گیا تب بھی اہل مدینہ
نے خون حسینؑ کے انتقام کے لیے کسی بے چینی کا مظاہرہ نہیں کیا اور
باوجودیکہ عراق میں تلاطم ہو رہا تھا حجاز اس بارے میں بالکل خاموش تھا۔

وہ تو امام حسینؑ کی قربانی کا طبعی اثر تھا کہ یزید کی بداعمالیوں پر نگاہیں
متوجہ ہو گئیں اور پھر دوسرے سال یزید کے افعال و اعمال کے تفصیلی
حالات معلوم ہونے کے بعد انھوں نے اعلان مخالفت کر دیا۔ جس کے
نتیجہ میں واقعۂ حرّہ ظہور پذیر ہوا جسکی اجمالی تفصیل اپنے محل پر بعد کو
آئیگی مگر خود قتل حسینؑ کا جرم اُن کو اتنا اہم معلوم نہ ہوا کہ وہ اُسکی بنا پر یزید
کے مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

پھر اس کے بعد واقعات کا ایک طویل سلسلہ ہے جسمیں سادات بنی فاطمہ پر
بنی اُمیّہ کے آخری دم تک اور پھر بنی عبّاس کے دور حکومت میں کیسے کیسے
ہولناک مظالم ہوتے رہے مگر اہل مدینہ نے کبھی اُن کی کوئی امداد نہیں کی
حضرت امام زین العابدینؑ سے لے کر امام علی نقیؑ تک تمام وہ مقدس
ہستیاں جو اپنے وقت میں خاندان رسول کی چشم و چراغ اور تعلیمات اسلام
کی محافظ تھیں اپنے اپنے ابتدائی دور حیات میں اسی مدینہ میں مقیم تھیں۔ پھر

یہیں کسی کو بہ جبر زہر دیا گیا۔ کسی کو مقید کر کے جلاوطن کیا گیا۔ کسی مدینہ سے بلایا گیا مگر کیا کبھی مدینہ نے اُن کی حفاظت کی کوشش تو درکنار اُس پر اُف بھی کی ؟ کبھی نہیں۔

کیا ان ماقبل اور مابعد کے واقعات کو پیش نظر رکھنے کے بعد پھر یہ تصور صحیح ہو گا کہ امام حسینؑ مدینہ میں قیام فرماتے تو مدینہ والے آپ کی حفاظت میں جان لڑا دیتے ؟ ہرگز نہیں۔

عام طور سے اہل حجاز کے متعلق دانش مندان عرب کی رائے یہی تھی کہ وہ مشکلات میں ثابت قدم بہت کم رہ سکتے ہیں چنانچہ جب معاویہ نے ابن الکواء سے مختلف عرب ممالک کے متعلق رائے دریافت کی اور اُس میں اہل حجاز کے متعلق پوچھا تو اُس نے کہا "فتنہ انگیزی میں سب سے آگے مگر اُس کے نتائج کے برداشت کرنے میں بہت کمزور اور مہمات کے سر کرنے میں ناکارہ (۱)

اس صورت میں حالات اور بعد کے واقعات تبلاتے ہیں کہ اگر امام حسینؑ عاقبت اندیشی کر کے مدینہ رسول کو خالی نہ کر دیتے تو مروان جس نے ولید کو قتل حسینؑ کا مشورہ دیا تھا اور ولید کے اس مشورہ پر عمل نہ کرنے سے سخت برہم ہوا تھا وہی ولید کے ملائم طرز عمل کی اطلاع یزید کو دیتا اور اس وقت یزید کا عتاب نامہ ولید کے پاس آتا تو یا تو خود ولید ہی کو پھر عمر سعد کی طرح باوجود اپنے ضمیر کی مخالفت کے مال وجاہ دنیا کی طمع اور سطوت حکومت کے خوف سے حسینؑ کے خلاف اقدام کرنا پڑتا یا کوفہ کے نعمان بن بشیر کی طرح اُس کو معزول کر کے مروان بن الحکم یا اسی کے مثل کسی دوسرے سفاک اور سخت ترین دشمن اہلبیت

---

(۱) کتاب البلدان صہ ۱۲۵

کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا جاتا اور فرزند رسول کے خون سے مدینہ رسول کی زمین کو گلرنگ بنا دیا جاتا۔

یہ خطرہ بالکل یقینی تھا اور اس نے فعلی حیثیت اختیار کر لی تھی اس خط سے جو ولید نے یزید کے نام لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ وہ خلیفۃ المسلمین یزید کی خدمت میں ولید بن عتبہ کی جانب سے گزارش ہے کہ حسینؑ بن علیؑ آپ کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ وہ آپ کی بیعت پر تیار ہیں اب آپ کی جو رائے ہو"۔ اس کے جواب میں یزید نے لکھا کہ "اس میرے خط کی تعمیل جلد کرنا کہ تمام اُن ممتاز افراد کی جنہوں نے میری بیعت کر لی ہے اور جنہوں نے بیعت نہیں کی ہے مکمل فہرست جلد بھیجو لیکن اس جواب کے ساتھ حسینؑ بن علیؑ کا سر موجود ہو"۔ اس حکم کی گرمی کے مقابلہ میں ولید کہاں ٹھہر سکتا تھا؟ وہ تو اتفاق سے اس خط کے آنے سے پہلے ہی حضرت مدینہ سے روانہ ہو چکے تھے اس لیے ولید تعمیل حکم سے مجبور رہا مگر اس کے بعد بھی ولید معتوب ہونے سے نہیں بچا اور ماہ رمضان میں اُسے معزول کر کے عمرو بن سعید ہی کو جو ابھی تک حاکم مکہ تھا مدینہ کا بھی حاکم مقرر کر دیا گیا (۱)

پھر اگر حضرت امام حسینؑ مدینہ میں شہید ہوتے تو کیا آپ کی شہادت ایسی نمایاں حیثیت کے ساتھ ہوتی جس طرح کربلا جا کر ہوئی؟ سیاست حکومت کا یہ تقاضا ہرگز نہ ہوتا بلکہ اُسے طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے یا تو امام حسنؑ کی شہادت کی طرح کوئی "جعدہ بنت اشعث" فراہم کی جاتی یا حضرت علیؑ کی کی طرح کوئی "ابن ملجم" کی طرح کا خارجی جس کے بعد بھی حکومت دمشق کا

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۱۹۱ و ۱۲۶

دامن اس الزام سے بری ہی ثابت کیا جاتا۔ اس صورت میں حسینؑ واقعی قتل ہوتے یعنی وہ دنیا سے جاتے بھی اور سلطنت دمشق کے چہرہ پر اسلام و انسانیت کی نقاب پھر بھی پڑی رہتی۔

حضرت امام حسینؑ اس کے لیے ہرگز تیار نہ تھے ــــ تدبّر کا اقتضاء تھا کہ مدینہ میں قیام اُسی وقت کیا جاتا جب مدینہ میں قیام ممکن ہو، اور جب بیعت نہیں کرنا تھی تو اپنے اصول، اپنے مقصد اور اپنی قربانی کو اُسی اُفق پر لے جا کے پیش کرنا چاہیے تھا جس پر آپ کربلا کے میدان میں اُنھیں لے جا سکے "بے شک یہ سفر کوئی معمولی سفر نہ تھا۔ وہ کربلا کی منزل کا پہلا مرحلہ یا آخرت کے سفر کا پہلا قدم تھا اس لیے یہ رات حضرت امام حسینؑ نے پوری جاگ کر بسر کی اور اسے اپنے نانا (حضرت رسولِ خداؐ) ماں (حضرت فاطمہ زہراؑ) اور بھائی (حسن مجتبیٰؑ) کے مقدس مزارات سے رخصت ہونے میں صرف کیا"

رات ختم ہو رہی تھی کہ آپ مدینہ سے روانہ ہو گئے۔ مدینہ کی صبح آج بے رونق تھی اس لیے کہ حقیقی آفتاب اُس کا آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا اور رسولؐ کی قبر بے چراغ تھی اس لیے کہ رسولؐ کا نورِ دیدہ آج صحرائے غربت میں گامزن تھا۔

۶۰ھ ماہ رجب کی اٹھائیس تاریخ اتوار کی رات تھی جب امام حسینؑ مدینہ سے روانہ ہوئے (۱) اس وقت آپ کی زبان پر قرآن کی یہ آیت تھی (۲) فخرج منھا خائفا یترقب قال رب نجنی من القوم الظالمین (۳) اس آیت میں موسیٰ کا ذکر ہے اُس وقت کا جب وہ

---

(۱) طبری ج ۶ صـ ۱۹۰ و ۲۱۵ ارشاد صـ ۲۰۰ (۲) طبری ج ۶ صـ ۱۹۱ (۳) قرآن مجید سورہ قصص آیت ۲۱

---- فرعون کے ظلم و تشدد سے بیزار ہو کر مصر سے باہر نکلے ہیں۔ روانگی کے بعد امام حسینؑ شاہراہ عام سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے حالانکہ ابن زبیر اس کے پہلے شاہراہ عام کو چھوڑ کر غیر معروف راستوں سے مکہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ یہی مشورہ آپ کو بھی دیا گیا مگر آپ اپنی مدینہ سے روانگی کو فرار کی حیثیت دینے پر تیار نہیں تھے۔ آپ نے اس مشورہ پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ نہیں، میں تو اسی راستے سے جاؤں گا۔ پھر جو خدا کو منظور رہو (۱)

آپ نے اپنے دادا ابو طالب کی تمام اولاد کو اپنے ساتھ لیا جن میں آپ کی دو بہنیں حضرت زینب اور ام کلثوم بھی تھیں، اس کے علاوہ سب بھائی بھتیجے اور متعلقین آپ کے ساتھ تھے سوائے محمد بن الحنفیہ کے (۲) جو کسی مجبوری یا مصلحت سے مدینہ میں چھوڑ دیئے گئے اور ام ھانی بنت ابو طالب پیرا سالی کی وجہ سے نہ جا سکی تھیں بس ان کے علاوہ اولاد ابو طالب میں سے کوئی بھی حسینؑ کے ساتھ سے جدا نہیں ہوا اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حسینؑ کے ساتھ بنی ہاشم میں سے سوائے اولاد ابو طالب کے کسی اور سلسلے کا ایک شخص بھی میدان کربلا میں نظر نہیں آتا

اس طرز عمل سے بھی کہ آپ نے صرف اپنے گھر والوں کو ساتھ لیا صاف نمایاں تھا کہ آپ جنگ کے ارادہ سے روانہ نہیں ہو رہے ہیں۔ مدینہ سے باہر نکلنے کے بعد امام حسینؑ نے مکہ معظمہ کی طرف رخ کیا اس لیے کہ مکہ میں عرب کے قدیم روایات اور نیز اسلام کے مخصوص تعلیمات کی بنا پر کسی جانور تک کا قتل بلکہ گھاس تک کا بھی اکھاڑنا جائز نہیں (۳) امام حسینؑ نے یہاں

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۰ (۲) الاخبار الطوال صفحہ ۲۳۰۔ طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۰ (۳) صحیح بخاری ج ۱ صفحہ ۲۱۶ صحیح مسلم ج ۱ صفحہ ۴۳۸ و ۴۳۹۔

پہونچ کر اپنے کو ظاہری طور سے ایک محفوظ آغوش پناہ میں ڈال دیا اور یہاں رہ کر آپ خاموشی کی زندگی گزارنے لگے۔ نہ امور سلطنت سے غرض اور نہ مہمات مملکت سے کوئی تعلق۔ آپ نے مکہ پہونچ کر بھی نہ کہیں خطوط و رسائل روانہ کیے اور نہ مختلف اطراف و جوانب کے لوگوں کو اپنی نصرت کی طرف دعوت دی یہ بھی آپ کے مقصد کے تعین کے لیے آپ کے کردار کا ایک اہم جزو ہے۔ آپ کا مکہ میں ورود شب جمعہ ۳ شعبان ۶۰ھ کو ہوا (۱) اس وقت آپ کی زبان پر قرآن کی یہ آیت بھی (۲) ولما توجہ تلقاء مدین قال عسٰی ربی ان یھدینی سوآء السبیل (۳) یہ بھی حضرت موسیٰ کے واقعہ سے متعلق ہے جبکہ انھوں نے مدین میں پناہ لی تھی۔

آپ نے مکہ میں پہونچ کر "شعب ابی" میں قیام کیا۔ عبداللہ بن زبیر آپ سے دو ایک دن پہلے پہونچ چکے تھے۔ اُن کے مکہ میں اچانک پہونچنے کے ساتھ لوگ اُن کے گرد جمع ہو گئے تھے اور انھیں ایک مرکزیت سی حاصل تھی۔ لیکن حضرت امام حسینؑ کے مکہ میں پہونچنے کے ساتھ لوگوں نے عبداللہ بن زبیر کو چھوڑ دیا اور اب وہ حضرت امام حسینؑ کے گرد و پیش رہنے لگے۔ اس بات سے عبداللہ بن زبیر کو گو نہ ناگواری پیدا ہوئی اور انھیں اندازہ ہو گیا کہ حسینؑ موجودگی میں اُن کا کوئی اثر قائم نہیں ہو سکتا۔ مصلحت وقت کی بنا پر وہ بھی صبح و شام دونوں وقت امام حسینؑ کے پاس آنے جانے لگے (۴)

جب معاویہ کی وفات ہوئی ہے تو مدینہ میں ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کی حکومت تھی اور مکہ میں یحییٰ بن حکیم بن صفوان بن اُمیہ اور کوفہ میں نعمان بن بشیر انصاری اور بصرہ میں عبیداللہ بن زیاد گورنر تھا (۵)

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۱۵ - ارشاد صفحہ ۲۰۸ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۲۲ (۳) قرآن مجید سورہ قصص آیت ۲۲ (۴) الاخبار الطوال صفحہ ۲۳۳ (۵)

معلوم ہوتا ہے کہ حکومت دمشق کو یحییٰ بن حکیم پر اطمینان نہ تھا۔ چنانچہ حضرت امام حسینؑ کے مکہ میں پہونچنے کے بعد یحییٰ بن حکیم کو معزول کیا گیا اور عمرو بن سعید بن عاص بن امیہ کو گورنر مقرر کیا گیا(۱) پھر جب ولید کے طرزِ عمل کی اطلاع اور شاید مروان کی طرف سے رپورٹ یزید کو پہونچی تو ولید کے بجائے بھی اسی عمرو بن سعید کو مقرر کیا گیا مگر یہ بعد کی بات ہے۔ بعد میں یہ بھی ظاہر ہوگا کہ کوفہ کے گورنر کی پالیسی بھی حکومت دمشق کو ناگوار ثابت ہوئی اور وہاں بھی تبدیلی کی ضرورت پیش آئی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ امام حسینؑ کے معاملہ میں یزید کا طرزِ عمل اتنا غیر منصفانہ اور جارحانہ تھا کہ اُسے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے آدمی نہ ملتے تھے اور خود اُس کے گورنر اُس کے احکام کی تعمیل اُس کی خواہش کے مطابق نہ کر سکتے تھے۔ صورت حال سے ظاہر ہے کہ عمّال حکومت میں سے جو بھی حسینؑ کے ساتھ ذرا مراعات برتنے کا رجحان ظاہر کرتا تھا وہ فوراً ہٹا دیا جاتا تھا۔ تلاش تھی ایسے لوگوں کی جو اہلبیت رسول کے ساتھ کسی مراعات کی جگہ اپنے دل میں نہ رکھتے ہوں اس کے بعد بھی کیا کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ جو کچھ کبھی تشدد ہوا۔ اُس کی ذمہ داری یزید پر نہیں بلکہ عمّال حکومت پر تھی؟!

اس وقت امام حسینؑ کا مکہ معظمہ میں قیام ایک پناہ گزین کی حیثیت سے تھا اور یہی مشورہ تھا جو آپ کو مدینے سے روانگی کے وقت آپ کے بھائی محمد بن حنفیہ نے دیا تھا جسے آپ نے پسند کیا تھا۔ مکہ میں حالات کے ناسازگار ہونے کی صورت میں کیا ہوگا؟ اس کے متعلق محمد بن حنفیہ کی رائے یہ تھی کہ اگر وہاں حالات آپ کے موافق نہ ہوں تو آپ نکل جائیے گا ریگستانی صحراؤں

(۱) الاخبار الطوال صـ ۲۳۰

یں اور پہاڑوں کے دامنوں میں اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہوتے رہیئے گا یہاں تک کہ لوگوں کے حالات کا آخری نتیجہ سامنے آئے اور اُس وقت کوئی قطعی رائے قائم کیجئے۔ (۱)

آپ کا قیام مکہ میں ظاہری طور پر مستقل حیثیت رکھتا تھا اور کوئی خاص مقصد آپ کے پیش نظر نہیں تھا سوائے ایک پُرامن زندگی کے جسے "جیو اور جینے دو" ہی کے لفظوں میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں آپ نے نہ تو اپنی موافقت میں کوئی عسکری طاقت فراہم کی اور نہ جمہور کو یزید کے خلاف مشتعل کیا۔ تقریر اور تحریر کسی حیثیت سے بھی ایسی کوئی کوشش ثابت نہیں کی جا سکتی۔

---

(۱) ارشاد ص ۲۰۷ - ۲۰۸ طبری ج ۶ ص ۱۶۱

اٹھارواں باب

دعوت اہل کوفہ اور سفارت مسلم بن عقیل

کوفہ کی داغ بیل فرات اور حیرہ کے بیچ میں اُس وقت ہوئی جب سنہ ۱۴ھ سے سنہ ۱۶ھ تک قادسیہ اور دوسرے محاذوں پر ایرانیوں کے مقابلہ میں فتوحات کے بعد (۱) مسلمانوں کی فوج نے عراق میں سکونت اختیار کی اور مدائن کی آب و ہوا اُن کو راس نہ آئی اور سعد بن ابی وقاص کی ہدایت کے ماتحت یہ جگہ تلاش کی گئی اور یہاں مسجد اور مسلمانوں کے قیام کے لیے مکانات کی بنیاد ڈالی گئی۔ (۲)

سنہ ۱۷ھ میں سعد بن ابی وقاص اپنی فوج کے ساتھ مدائن سے منتقل ہوئے اور اس جگہ آکر مقیم ہوئے۔

کوفہ۔ عربی زبان میں اُس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سنگریزے اور ریگ مخلوط ہوں۔ چونکہ یہ جگہ اسی قسم کی تھی اس لیے اس کا نام کوفہ ہوا (۳)

دوسری طرف سمندر کے کنارے اُس زمین پر جو "ارض الہند" کہلاتی تھی ایک دوسرے شہر کی بنا قائم کی گئی جس کا نام بصرہ ہوا اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ عراق کے ان دونوں شہروں کوفہ اور بصرہ کی آبادی بالکل ایک ساتھ شروع ہوئی۔ (۴)

ابتداءً سینٹھوں کے مکان بنائے گئے اور چھپر ڈالے گئے پھر اسی سال دونوں

---

(۱) طبری ج ۴ صفحہ ۱۴۳ (۲) طبری ج ۴ صفحہ ۱۴۲ (۳) طبری ج ۴ صفحہ ۱۸۹

(۴) طبری ج ۴ صفحہ ۱۴۹

جگہ آتش زدگی واقع ہوئی جس میں یہ مکانات جل گئے تو اینٹوں کے مکانات کی تعمیر ہوئی (۱)

کوفہ کی آبادی اُسی وقت سے کہ جب وہ آباد کیا گیا ایک لاکھ فوجیوں کی تھی (۲)

جب جناب امیرؑ تخت خلافت پر متمکن ہوے اور طلحہؓ و زبیر نے عائشہ کو ساتھ لے کر آپ کے خلاف فوج کشی کی تو اُنھوں نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز عراق کو قرار دیا اس لیے حضرت امیرؑ کو ان کے تدارک کے لیے عراق آنا پڑا اور جنگ جمل واقع ہوی۔ اس مقابلہ میں بصرہ والوں نے طلحہ اور زبیر کا ساتھ دیا تھا اور کوفہ کے لوگ حضرت علی بن ابی طالبؑ کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد حضرت علیؑ نے اسی کو اپنا پایۂ تخت رکھا۔

بارہ رجب ۳۶ھ کو پہلا وہ دن تھا جب آپ کوفہ میں تشریف لائے۔ لوگوں نے کہا کہ قصر میں قیام فرمائیے جہاں اب تک حاکم قیام کیا کرتے تھے۔ آپ نے اسے ناپسند کیا اور مقام رحبہ کے ایک مکان میں سکونت اختیار فرمائی (۳)

اس کے بعد زیادہ تر اہل کوفہ ہی تھے جنھوں نے آپ کے ساتھ صفین اور نہروان میں بھی مخالفین کا مقابلہ کیا اسی لیے وہ "شیعۂ علیؑ" کہلائے۔ حالانکہ مذہبی طور پر ان میں سے اکثر اس معنی میں شیعہ نہ تھے کہ وہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو خلیفۂ بلا فصل جانتے ہوں اور آپ کے قبل دوسرے خلفا کو تسلیم نہ کرتے ہوں۔ مگر "شیعۂ بنی امیہ" کے مقابلہ میں وہ اپنے کو "شیعۂ علیؑ" کہنا فخر سمجھتے تھے۔

---

(۱) طبری ج ۴ صد ۱۹۱ (۲) طبری ج ۴ صد ۲۶۲ (۳) الاخبار الطوال صد ۱۵۲

وہ وقت وہ تھا کہ کوفہ ایسے شیعیان اہلبیت سے چھلک رہا تھا لیکن ادھر معاویہ کا ممالک اسلامیہ پر تسلط ہوا اور کوفہ پر زیاد بن ابیہ کی حکومت ہوئی اُدھر اہل کوفہ پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور عراق کی زمین اُن کے لیے تنگ ہو گئی۔ جو لوگ محبّ علی سمجھے جا سکتے تھے، اُن کا ہر نفس آئندہ آنے والے خطرات کی پیشین گوئی کرتا اور ہر دقیقہ و ثانیہ اپنے آخری ہونے کا پیغام دیتا تھا۔

یہ صورت حال دو ایک ماہ، دو ایک سال نہیں بلکہ بیس[2] سال تک قائم رہی۔ اس صورت میں ناممکن تھا کہ کوفہ کے اندر شیعۂ علیؑ کے لیے کوئی نمایاں حیثیت حاصل رہتی بلکہ مارے جانے، سولی پانے اور جلاوطن ہونے کے بعد جو بچے کھچے تھوڑے سے اشخاص موجود تھے وہ گوشوں کے اندر اور پردوں کے پیچھے زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے اور دوستی اہلبیتؑ کا نام بھی زبان پر لانا ان کے استحقاق قتل کی دستاویز خیال کیا جاتا تھا اور اس شکنجہ کے اندر شیعیت ایک مخصوص قلیل التعداد جماعت میں مخفی حیثیت سے مقیّد تھی اور وہ جماعت عراق و حجاز وغیرہ کے مختلف شہروں میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ روسائے عشائر اور شیوخ قبائل، ذمہ دار و با اعتبار اشخاص سب حکومت وقت کے ساختہ و پرداختہ تھے۔ رہ گئی عام خلقت جس پر انقلابات کا دار و مدار ہوتا ہے وہ بلا استثناء ہر ملک میں "ہر کسے سکہ زند خطبہ بنامش خوانند" کے مطابق ہوا کے رُخ پر اُڑنے والی اور زمانہ کے غیر معمولی حوادث سے تیزی کے ساتھ رنگ بدلنے والی ہوا کرتی ہے۔ اُن میں ایک ایسا اچانک واقعہ جس میں جوش پیدا کرنے کی صلاحیت ہو وہ انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ جو برسوں کی دعوت و تبلیغ پیدا نہیں کرتی۔ اس کا نمونہ حکومتوں کے تغیر و تبدل اور سلاطین کے عزل و نصب کی صورت

میں ہمیشہ نظر سے گزرتے رہتے ہیں اور وہ اکثر اسی قسم کی ناگہانی صورتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

بے شک بیس سال تک صورت حال ایک طرح رہنے کا سبب یہ تھا کہ اس مدت میں کوئی تازہ حادثہ رونما نہیں ہوا جو رجحانات طبعی سے ٹکرا کر اُن کو سیلاب کی طرح کسی خاص طرف متوجہ کر سکے۔

سنہ ۶۰ھ کے رجب کا مہینہ تھا جب **معاویہ** نے انتقال کیا اور اُن کا نام زد کردہ جانشین اُن کا بیٹا یزید ہوا۔ ایسے ہی مواقع وہ ہوتے ہیں جو پرسکون فضا میں تموج اور مطمئن سطح میں تلاطم پیدا کر دیتے ہیں۔ فطرۃً ہر شخص سابق فرمانروا کے بعد اپنے جدید والی سلطنت اور قسمت کے مالک کی سابقہ زندگی اور اُس کے اخلاق وعادات اور ذاتی خصوصیات کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے اور بیک وقت مختلف حلقوں میں یہی چرچے شروع ہو جاتے ہیں۔

یزید کے اخلاق وعادات، اُس کی مے نوشی اور شہوت رانی، اُس کی طفلانہ جوانی اور لہو ولعب میں سرگرمی، احکام شرعیہ سے آزادی اور نفسانی خواہشوں کی پرستاری ایسی نہ تھی جو مخفی حیثیت رکھتی ہو۔

جاننے والوں کو یاد آ گیا اور انجام کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگا اور نہ جاننے والوں کو پوچھ گچھ میں معلوم ہو گیا کہ ہمارا ہونے والا خلیفہ و مالک سلطنت ان صفات وعادات کا شخص ہے۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بلاتخصیص فرقہ و مذہب ایک عام بے چینی، اضطراب اور نفرت وبیزاری خلق خدا میں پھیل گئی اور اسی کے ساتھ آنکھیں گردش کرنے لگیں کہ کون ہے جو اس سخت وقت پر کام آئے اور وقت کی ذمہ داریوں کو اپنے کاندھے پر اٹھا کر ملت اسلامیہ کو اس بدکردار خلیفہ سے چھٹکارا دلائے۔

اسی کے ساتھ یہ خبریں بھی مشتہر ہوئیں کہ حسین بن علیؑ نے یزید کی خلافت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور اسی لئے مدینہ سے ہجرت کر کے مکۂ معظمہ آگئے ہیں اور یہ طے کر لیا ہے کہ جو کچھ بھی ہو یزید کی بیعت نہ کریں گے۔ اس وقت دوستانِ علیؑ کی اس قلیل جماعت کو جو بیس برس کی طویل مدت تک طرح طرح کے صبر آزما مصائب برداشت کرتے کرتے عاجز آچکی تھی اور ہر آن حضرت احدیت کی جانب سے کشائش کی منتظر تھی اپنی مایوسیوں کی مدت سے چھائی ہوئی تاریک گھٹا میں اُمید کی شعاعیں نظر آنے لگیں اور ان کے ضمیر نے آواز دی کہ اس موقع سے بہتر کوئی موقع نہ ملے گا اور اس وقت کا سکوت خودکشی کا مرادف ہوگا۔

یہ سوچ کر وہ سب سلیمان بن صرد صحابی رسول کے گھر میں مجتمع ہوئے۔ سن رسیدہ اور تجربہ کار سلیمان نے جو پیغمبر خداؐ کی آنکھیں دیکھے ہوئے اور حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے ساتھ معرکے جھیلے ہوئے تھے۔ مجمع کو ان الفاظ سے مخاطب کیا:۔

"آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ معاویہ کا انتقال ہوا اور امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے انکار کیا ہے اور وہ مکۂ معظمہ چلے گئے ہیں۔ آپ لوگ اُن کے اور اُن کے پدر بزرگوار کے شیعہ ہیں۔ اگر آپ اس بات کا یقین رکھتے ہوں کہ اُن کی نصرت و مدد اور اُن کے دشمنوں سے جنگ میں کوتاہی نہ ہوگی تو بسم اللہ اُن کو خط لکھیے اور اگر سستی و کمزوری کا اندیشہ ہو تو برائے خدا ایک شخص کو فریب دے کر اس کی جان کو خطرہ میں نہ ڈالیے۔" (۱)

الفاظ سے ظاہر ہے کہ سلیمان ایک مقرر کی طرح گرجتے برستے الفاظ سے وقتی جوش کو ابھار کر اپنے مقصد کو حاصل کرنا نہیں چاہ رہے ہیں بلکہ وہ خود

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۱۹۷ - ارشاد ص ۲۰۰

مجمع سے اُس کے موجودہ جوش و ولولہ کی آخری تھاہ اور موقع اقدام پر اُس کی انتہائی کارفرمائی کا جائزہ لوانا اور اسی کے ساتھ اُن کو موقع کی نزاکت اور آیندہ کے خطرات کا اندازہ کرادینا چاہتے ہیں مگر یہ امر فطری ہے کہ جذبات کی طغیانی میں انسان کو اپنی طاقت کا اندازہ مشکل سے ہوتا ہے اور وہ اکثر عواقب کی فکر اور سخت مواقع پر اپنے ثبات و استقلال کی تشخیص میں غلطی کرجاتا ہے مجمع کے اندر ان کے بڑھتے ہوئے جوش میں سلیمان کے الفاظ نے وہ کام کیا جو پانی کا چھینٹا بھڑکتے ہوئے آگ کے شعلوں میں۔ ایک مرتبہ سب بول اُٹھے، نہیں نہیں، ہم یقیناً اُن کے دشمنوں سے جنگ کرینگے، اور اپنے کو حضرت کے قدموں پر نثار کردینگے۔ (۱)

یہ جمعیت کتنی تھی؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ کسی میدان یا عالیشان قصر کے وسیع صحن میں نہیں۔ بلکہ عربی ساخت کے مختصر مکانات میں سے جن کے نمونے آجتک عربستان میں نظر آتے ہیں ایک مکان یعنی سلیمان بن صرد کے گھر میں مجتمع ہوگئی تھی۔ پھر ان میں بھی یہ یقین نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سب سچے اور راسخ العقیدہ حضرت علیؑ کو وصی رسول اور امام برحق سمجھنے والے شیعہ ہی تھے۔

مذکورۂ بالا سوال و جواب کے الفاظ میں بے شک سچائی کا جوہر نظر آرہا ہے اور یقیناً بولنے والوں کے باطنی ضمائر کی مخلصانہ ترجمانی کررہے ہیں لیکن ان میں سے ہر شخص آنے والے ناگہانی انقلابات کا کہاں تک مقابلہ کرسکیگا؟ اس کا فیصلہ مستقبل ہی کے ہاتھ ہے۔

سلیمان بن صرد کی حجت تمام ہوچکی تھی۔ چنانچہ خط امام حسینؑ کے نام

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۱۹۷

بایں عنوان لکھا گیا :-

"یہ خط ہے حسینؑ بن علیؑ کی طرف سلیمان بن صرد، مسیب بن نجبہ، رفاعہ بن شداد، حبیب بن مظاہر اور دیگر دوستوں کی طرف سے مومنین و مسلمین اہل کوفہ میں سے" اس کے بعد معاویہ کے انتقال اور یزید کی ولیعہدی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا، پھر لکھا تھا کہ ہمارے سر پر کوئی امام نہیں ہے لہٰذا آپ تشریف لائیے۔ شاید آپ کی وجہ سے ہم حق کی نصرت پر یکدل ہو سکیں اور دمشق کا گورنر نعمان بن بشیر دار الامارہ میں موجود ہے۔ مگر ہم اُس کے ساتھ نماز جمعہ میں شریک نہیں ہوتے، نہ عید گاہ جاتے ہیں۔ اگر ہم کو خبر معلوم ہو جائیگی کہ آپ تشریف لا رہے ہیں تو ہم اُس کو یہاں سے نکال کر شام جانے پر مجبور کر دینگے والسلام"

اس خط کو عبد اللہ بن سبیع ہمدانی اور عبداللہ بن دال کے ہاتھ روانہ کیا گیا اور یہ سب سے پہلا خط تھا جو امام حسینؑ کو مکہ معظمہ میں دسویں ماہ رمضان کو ملا (۱) جمعیت منتشر ہوئی اور اب ان میں سے ہر ایک نے اپنے حلقۂ اثر میں اس تحریک کو پھیلانا شروع کیا اور دو ہی دن کے عرصہ میں ۵۳ عرضداشتیں تیار ہوگئیں جو ایک دو تین چار آدمیوں کے دستخط سے تھیں اور یہ سب خطوط قیس بن مسہر صیداوی اور عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن کدن ارحبی اور عمارہ بن عبید سلولی کے ہاتھ روانہ کیے گئے (۲) اسی اضطراب اور روحانی تلاطم کے سبب سے جو یزید کی خلافت کے باعث عام طور پر پیدا تھا اور جس میں کسی مذہب و مسلک کا افتراق نہ تھا، ان حضرات کی مذکورہ بالا تجویز کا ہر طرف سے خیر مقدم کیا گیا اور وہ لوگ جو شیعیت کا جذبہ نہ رکھتے تھے وہ بھی خاص حضرت امام حسینؑ کے ساتھ کسی عقیدت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس خیال سے کہ یزید ایسے شرانگیز

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۷ ارشاد صفحہ ۲۰۹ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۷

وفاسق سے آپ یقیناً بہتر ہیں، اس تجویز کے گرمجوشی سے مؤید نظر آنے لگے جسکو دیکھکر اُن افراد کو جو حقیقۃً اس تجویز کے محرک تھے یہ یقین پیدا ہو گیا کہ رائے عامہ ہمارے ساتھ ہے۔ لیکن یہ فریب نظر تھا۔ عام خلقت اس تحریک سے ہمدردی میں ویسی ہی تھی جیسے آندھی کے رُخ پر اُڑتے ہوئے پرند، اس غلط فہمی کا یہ نتیجہ ہوا کہ یا تو پہلے خط کے وہ الفاظ کہ وہ شاید خدا آپ کے ۔ سے ہماری شیرازہ بندی کرے "بیم و رجا" کا اظہار کر رہے تھے یا اب وہ ہی روز کے بعد جو خط لکھا گیا اس میں پرزور الفاظ صرف کیے جانے لگے کہ "تشریف لایئے جلد اس لیے کہ لوگ آپ کے منتظر ہیں اور آپ کے سوا کسی کی امامت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں لہٰذا جلدی کیجیے جلدی والسلام" اس خط کو ہانی بن ہانی سبیعی اور سعید بن عبداللہ حنفی کے ذریعہ روانہ کیا گیا (۱)

رائے عامہ کی قوت اور ہوا کے موجودہ رُخ کا اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ سرداران قبائل جو یزید کے خاص آدمی تھے اور جنھیں اس تحریک کے محرکین نے اپنے ساتھ نہیں لیا تھا انھوں نے بھی سیاست کا تقاضا یہی سمجھا کہ اس آواز میں آواز ملا دیں چنانچہ ان اجتماعی کارروائیوں سے علیحدہ اور اس خط کے بعد جو اپنے مضمون کے اعتبار سے بالکل آخری کہا جا سکتا ہے، ایک خط کوفہ سے اور لکھا گیا جس کے الفاظ یہ تھے:۔

"کھیتیاں لہلہا رہی ہیں، میوے درختوں میں رسیدہ ہیں اور تالاب لبریز۔ پس جب آپ چاہیں تشریف لائیں ایک ایسے لشکر کی جانب جو آپ کی امداد کے لیے بالکل آراستہ موجود ہے۔ والسلام"

اس پر مندرجۂ ذیل سات آدمیوں کے دستخط تھے۔ شبث بن ربعی۔ حجار

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۷

بن الجبر - یزید بن حارث یزید بن رویم - عزرہ بن قیس - عمرو بن الحجاج زبیدی - محمد بن عمیر تمیمی - (۱)

یہ خطاب ولہجہ کے اعتبار سے گزشتہ خطوط سے بالکل مختلف تھا۔ اُن میں نہ دوستی واخلاص کے اظہارات تھے اور ہدایت کی خواہش تھی - یہاں مادی طاقت کی پیشکش اور منافع دنیا کی نمائش تھی جو ایک طرف لکھنے والوں کی مادّی ذہنیت کی ترجمان اور دوسری طرف مکتوب الیہ کے مذاق طبیعت سے اجنبیت اور ناشناسی کی دلیل ہے - چنانچہ ——— اس آخری خط کے لکھنے والے تقریباً سب کے سب واقعۂ کربلا میں حضرت امام حسینؑ سے لڑنے کے لیے موجود تھے - ممکن ہے کہ اس خط کے لکھنے میں کوئی خاص سازش مضمر ہو اور اگر ایسا نہیں تو اس سے اُس موقع کی رائے عامّہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو بھی یہ ضرورت پڑ گئی تھی کہ ہم بھی اس تحریک میں شامل ہو کر آیندہ کے لیے اپنے مستقبل کو محفوظ بنالیں - دینوری کا بیان ہے کہ یہ سب قاصد اور اُن کے ساتھ کے خطوط تابڑ توڑ دو دن کے اندر امام حسینؑ کو پہنچے اور اس کے بعد چند دن میں تو خطوط کی تعداد اتنی ہو گئی کہ اُن سے دو خرجیاں بھر گئیں (۲)

گزشتہ تقریر سلیمان بن صرد کی اور اس کے بعد کے واقعات، ان سب کے مطالعہ سے حسب ذیل نتائج صاف طور سے برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) امام حسینؑ کی بیعت یزید سے کنارہ کشی اور مدینہ سے روانگی۔ کسی خارجی تحریک اور اہل کوفہ کے ساتھ کسی متقدمہ گفت و شنید کا نتیجہ نہ تھی۔

(۲) حضرت کو مدینہ سے روانگی کے موقع پر ظاہری اسباب کی بنا پر

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۷ - ارشاد صفحہ ۲۱۰ (۲) الاخبار الطول صفحہ ۲۳۱

یہ خیال بھی نہ تھا کہ آپ کوفہ تشریف لے جائیں گے۔

(۳) آپ نے مکہ پہونچنے کے بعد بھی خود اپنی جانب سے کسی قسم کی تحریک اہل کوفہ سے نہیں کی اور نہ وہاں اپنے مقاصد کی تبلیغ کے لیے کوئی خط بھیجا۔ مگر اب جبکہ کوفہ سے خود یہ آوازیں بلند ہیں کہ آپ ہمارے یہاں آئیے۔ ہم آپ کی نصرت و امداد کے لیے تیار ہیں۔ ہم آپ کو امام جانتے ہیں اور آپ سے ہدایت کے طالب ہیں۔ یہ دو ایک آوازیں نہیں بلکہ کوفہ بھر یہی چلا رہا ہے۔ چاہے وہ دوست ہوں یا دشمن۔

یہاں تک کہ دو خرجیاں خطوط سے بھر گئیں۔ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اب موقع کی حالت کا تقاضا کیا ہے؟ حضرت امام حسینؑ کو ان خطوط کے بعد کیا کرنا چاہیے؟

صورت حال یہ ہے کہ آپ یزید سے بیعت جیسا کہ ابتک نہیں، آئندہ بھی کرنا نہیں چاہتے۔ مدینہ میں قیام یزید کے اس تہدیدی حکم کی بنا پر کہ آپ سے بیعت لی جائے یا قتل کر دیے جائیں ناممکن ہو چکا ہے۔ مکہ معظمہ میں قیام وقتی حیثیت سے امن کا ذریعہ سہی لیکن تابکے؟ جبکہ یزید کے اخلاق و عادات اور احکام مذہبی کے مقابلہ میں خود سری سے یہ توقع بعید تھی کہ وہ مکہ معظمہ کے مذہبی احترام کا لحاظ کریگا بلکہ یہ خطرہ بہت قریب تھا کہ مکہ میں آپ کا قیام اس کا باعث ہوگا کہ وہیں مکہ میں آپ کے خلاف فوج کشی ہو اور مکہ میں نہ تو کوئی فوجی طاقت ایسی ہے جو آپ کی حفاظت کر سکے اور نہ آپ مکہ میں قیام کر کے حرم خدا کے اندر خونریزی ہونے کے خود باعث بننا چاہتے ہیں۔

اسکے علاوہ باوجودیکہ رسولؐ کے نواسے کی ہجرت مدینہ سے مشہور ہو چکی ہے مگر طائف ہو یا یمن۔ بصرہ ہو یا یمامہ کہیں سے کوئی آواز ایسی بلند نہیں

ہوتی کہ ہم آپ کی مدد کے لیے حاضر ہیں اور آپ کی حفاظت کے لیے آمادہ۔
ایسے سخت اور نازک موقع پر عرب کے آباد ترین خطۂ ملک (عراق) اور اُسکے بھی اہم مرکز (کوفہ) سے یہ تحریک ہوتی ہے کہ آپ یہاں تشریف لائیں، ہم آپ کی حفاظت و حمایت کے لیے ہر طرح تیار ہیں اور صرف معمولی سی تحریک نہیں بلکہ پیہم عرضداشتیں اور دو خورجین بھر کے خطوط اور ساتھ قاصد یکے بعد دیگرے روانہ کیے جاتے ہیں اور لکھنے والوں میں بہت سے ایسے اشخاص بھی ہیں جن کی محبت پر آپ کو پورا بھروسا ہے جیسے حبیب بن مظاہر۔ سلیمان بن صرد رفاعہ بن شداد وغیرہ ان حالات میں ظاہر ہے کہ امام حسینؑ کو کیا کرنا چاہیے تھا۔ کیا آپ کے لیے مناسب تھا کہ اس دعوت کو مسترد کر دیتے؟

حقیقت یہ ہے کہ مکۂ معظمہ کے قیام کی صورت میں بھی حضرت کا شہید ہونا یقینی تھا۔ یعنی جیسے عبداللہ بن زبیرؓ اسی مکہ میں فوج کشی ہوئی اور وہیں قتل کیے گئے اسی طرح آپ پر بھی فوج کشی ہوتی اور یہیں محصور ہو کر آپ کو شہید ہونا پڑتا۔ اس صورت میں جبکہ اہل کوفہ کی جانب سے اتنے اصرار و تاکید کے ساتھ آپ کو دعوت دی جارہی تھی اور آپ کی نصرت کا وعدہ کیا جارہا تھا، آپ اس دعوت کو ٹھکرا کر مکہ میں قیام کرتے اور شہید کیے جاتے تو یہی لوگ جو آپ پر اب اعتراض کرتے ہیں کہ آپ کوفہ کیوں گئے؟ یہی یہ کہنے اُٹھ کھڑے ہوتے کہ یہ کون سی عقلمندی تھی کہ ایک اتنے بڑے خطہ کی دعوت و وعدۂ نصرت کو رد کر دیا جہاں کے لوگ آپ کے والد بزرگوار کی بھی نصرت کر چکے تھے اور خود آپ کی بھی محبت کا دم بھرتے تھے اس وقت بجان و دل آپ کی حمایت کا وعدہ کر رہے تھے اور سیکڑوں عرضداشتیں بھیج کر آپ سے قیادت و ہدایت کے طالب تھے۔ ایسے نادر موقع کو ہاتھ سے دے کر مکہ میں قیام رکھا جہاں کی زمین بے آب و گیاہ، جہاں کے

رہنے والے پست حوصلہ دبے اُمنگ اور جہاں کی فضا بے مہر و وفا۔ یہاں تک کہ خود قتل بھی ہوئے اور مکہ معظمہ کی حرمت کو بھی برباد کرایا۔ ان صورتوں میں ظاہر ہے کہ عقل و تدبر کا اقتضا یہی تھا کہ ان بلانے والوں کی آواز پر لبیک کہی جائے۔ ان کی نصرت کے وعدوں کو آزمایا جائے اور اگر وہ سچے نہ بھی ثابت ہوں تب بھی اُن پر اتمام حجت کیا جائے۔

بے شک بہتے ایسے لوگ جو آپ کو عراق جانے سے منع کرتے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ عراق والوں کے وعدہ کا کوئی اعتبار نہیں۔ مگر وہ اس پہلو کو نظر انداز کیے ہوئے تھے کہ مکہ معظمہ میں آپ کا قیام آپ کو قتل سے بچا نہ سکتا تھا بلکہ حقیقتہً اگر موازنہ کیا جاتا تو موجودہ حالات کے لحاظ سے مکہ میں قیام کی صورت میں آپ کا قتل کیا جانا یقینی اور کوفہ کی طرف روانگی کی صورت میں مشکوک تھا اس لیے کہ ظاہری اسباب و علل کے ماتحت اہل کوفہ کے مواعید کے غلط ہونے کا کوئی ثبوت نہیں تھا بلکہ یہ خیال صرف اُن کے ذاتی اُفتادِ طبع کے متعلق ایک غیر متیقن حکم بلکہ بدگمانی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس صورت میں اگر آپ مکہ میں شہید ہو جاتے تو دنیا کے اندر آپ کی شہادت سے کوئی ہمدردی کا جذبہ پیدا نہ ہوتا لیکن اب جبکہ اہل کوفہ کی ان تمام خواہشوں پر لبیک کہتے ہوئے، نوع انسانی کے اتنے افراد کی درخواستوں کو منظور کرتے ہوئے روانہ ہو رہے ہیں تو اب اگر آپ شہید بھی ہو گئے تو ایک بڑے انسانی فرض کو ادا کرتے ہوئے اور اخلاق و مروت کی ایک اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے اور کوفہ کے لوگوں پر حجت بھی تمام فرماتے ہوئے اور حفاظت خود اختیاری کے اصول پر بحدِ امکان عمل کرتے ہوئے اور پھر اپنے کو مکہ سے علیحدہ کر کے مکہ کے

احترام کو بھی پورے طور سے محفوظ کرتے ہوے۔

اسی لیے امام نے اُن لوگوں کے جواب میں جو آپ کو عراق جانے سے منع کرتے تھے جیسے عبد اللہ بن عباس وغیرہ، کبھی یہ نہیں فرمایا کہ مجھے عراق کے لوگوں پر اطمینان ہے۔ اور اگر میں وہاں جاؤں گا تو ضرور وہ میری نصرت کرینگے۔ ہرگز نہیں بلکہ آپنے زیادہ تر اہل عراق کے متعلق اُن کی بے اطمینانی اور عدم اعتماد کے بارے میں اپنی رائے کو محفوظ رکھتے ہوے اپنے ارادہ پر مبہم و مجمل طور سے قائم رہنے کا اظہار فرمایا جیسا کہ ابن عباس سے گفتگو کے موقع پر (۱) اور کبھی صاف کہدیا کہ میں یہاں رہوں گا تو بھی قتل ہوں گا اور خانۂ کعبہ کا احترام میرے سبب سے زائل ہو گا جیسا کہ ایک مرتبہ عبد اللہ بن زبیر سے فرمایا مجھے معلوم ہے کہ یہاں ایک شخص مینڈھے کی طرح ذبح ہو گا جس سے یہاں کی حرمت زائل ہو گی۔ میں وہ مینڈھا بننا نہیں چاہتا (۲)

دوسرے موقع پر جب ابن زبیر نے آپ سے چپکے چپکے کان میں کچھ کہا تو ابن زبیر کے جانے کے بعد آپ نے اپنے کچھ مخصوصین سے فرمایا جانتے ہو ابن زبیر نے کیا کہا؟ ابن زبیر نے کہا کہ آپ مکہ میں قیام فرمائیے اور باہر نہ جائیے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا "خدا کی قسم میں ایک بالشت بھر "مکہ" کے حدود سے باہر قتل کیا جاؤں، مجھے زیادہ پسند ہے اس سے کہ ایک بالشت بھر مکہ کے حدود کے اندر مارا جاؤں اور قسم خدا کی اگر میں کسی جانور کے سوراخ میں جا کر رہوں تب بھی یہ لوگ مجھکو وہاں سے باہر لے آئیں گے یہاں تک کہ جیسا چاہتے

(۱) الاخبار الطوال ص۲۴۳ (۲) طبری ج ۶ ص۲۱۷

ہیں میرے ساتھ سلوک کریں خدا کی قسم مجھ پر یہ لوگ تعدی کریں گے جیسے یہود نے روز شنبہ کے بارے میں ظلم و تعدی سے کام لیا (۱)

ان حالات میں ظاہری اسباب کی بنا پر آپ کے لیے کوفہ کی طرف تشریف لے جانا ناگزیر تھا اور آپ کے لیے اہل کوفہ کی درخواست کو مسترد کرنا مناسب نہ تھا پھر بھی آپ نے بحسب ظاہر اسباب احتیاطی تدبیر یہ اختیار فرمائی کہ اپنے چچا زاد بھائی جناب مسلم بن عقیل کو جو مدینہ سے آپ کے ساتھ آئے تھے (۲) اپنا نمائندہ بنا کر حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے کوفہ جانے پر مامور فرمایا (۳) اور اس کے لیے آپ نے ایک خط اہل کوفہ کے نام لکھ کر ہانی بن ہانی اور سعید بن عبداللہ کے سپرد کیا جو اہل کوفہ کے آخری قاصد تھے اور انھیں حکم دیا کہ وہ جناب مسلم کے آگے روانہ ہوں۔

اس خط کا مطلب یہ تھا کہ ہانی اور سعید تمہارے خطوط لے کر پہنچے اور یہ دونوں شخص تمہارے سب سے آخری قاصد ہیں جو میرے پاس آئے ہیں۔ جو کچھ تم نے لکھا ہے میں نے غور سے پڑھا اور سمجھا۔ تم میں سے اکثر کا قول یہ ہے کہ ہمارے سر پر کوئی امام نہیں۔ آپ آ جائیے۔ شاید خدا ہم کو آپ کی بدولت حق پر مجتمع کر دے۔ اچھا تو میں تمہاری جانب اپنے بھائی، چچا کے بیٹے اور مخصوص معتمد کو روانہ کرتا ہوں اور انھیں حکم دیتا ہوں کہ وہ مجھکو تمہارے حالات کے متعلق اطلاع دیں۔ اگر انھوں نے اطلاع دی کہ تمہاری جماعت اور اہل حل و عقد اس امر پر جسے تم نے اپنے خطوط میں ظاہر کیا ہے متفق ہیں تو میں عنقریب تمہاری طرف آتا ہوں اور واضح رہے کہ امام کے معنی نہیں سوائے

---

(۱) طبری ج ۶ صہ ۲۱۶ (۲) الاخبار الطوال صہ ۱۳۲ (۳) طبری ج ۶ صہ ۱۹۳ الاخبار الطوال صہ ۲۳۲

اُس کے جو کتاب الٰہی پر عامل عدالت کا پابند، حق کا متبع اور اپنی ذات کو خدا کی مرضی پر وقف کیے ہوئے ہو والسلام (۱)

اس خط کی عبارت سے ظاہر ہے کہ مسلم بن عقیل کو جنگ پر مامور نہیں کیا گیا تھا اور نہ وہ کوفہ کی تسخیر کی غرض سے بھیجے گئے تھے بلکہ وہ صرف ایک نمایندہ کی حیثیت رکھتے تھے کہ کوفہ کی رائے عام اور وہاں کے لوگوں کے حالات و خیالات کا حضرت امام حسینؑ کے متعلق اندازہ کر کے آپ کو اس کی اطلاع دیں۔ جناب مسلمؑ قیس بن مسہر صیداوی اور عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کدن ارحبی اہل کوفہ کے نامہ بردوں کے ساتھ (۲) حکم امام کی تعمیل میں مکہ سے روانہ ہوئے اور پہلے مدینہ رسولؐ گئے۔ وہاں مسجد پیغمبرؐ میں نماز پڑھی پھر عزیز و اقارب سے رخصت ہوئے اور قبیلہ قیس میں سے دو عربوں کو جو راستے سے واقف تھے اپنے ساتھ لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں راستے کے ماہر ہوتے ہوئے جب آپ کو لے کر چلے تو ایک دم راستا بھول گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریگستان میں پڑ گئے، پیاس کا غلبہ ہوا اور اسی عالم میں ایک ایسے مقام پر پہنچ کر جہاں سے دور پر مسافروں کے چلنے کی سڑک نظر آ رہی تھی وہ دونوں بالکل بے حال ہو گئے۔ انھوں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے سڑک کا پتہ دیا اور ان میں سے ایک (۳) یا دونوں (۴) گر کر ہلاک ہو گئے۔ جناب مسلم اور ان کے ساتھیوں کی حالت بھی بہت تباہ ہو چکی تھی مگر یہ اُن کی غیر معمولی قوت برداشت تھی کہ اُنھوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے کو شاہراہ تک پہنچا دیا اور بطن خبت (وادی) کے ایک چشمہ پر جس کا نام مضیق

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۷ - ۱۹۸ و صفحہ ۲۱۰ - ۲۱۱ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۸ (۳) طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۴

(۴) طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۸ الاخبار الطوال صفحہ ۲۳۲۔

تھا قیام کر کے وہاں سے امام حسینؑ کی خدمت میں خط بھیجا جس میں آغاز سفر کے اس حادثہ پر اپنے غیر معمولی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ میرا دل کوفہ کے سفر کے لیے کسی طرح اٹھتا نہیں ہے مگر دوبارہ امام کے تاکیدی حکم نے مجبور کر دیا اور وہ کوفہ کی طرف روانہ ہوئے (۱) کوفہ پہنچ کر حکم امام کے مطابق جناب مسلم نے امن پسندی سے کام لیا۔ حاکم دارالامارہ میں موجود تھا مگر مسلم نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا جسے شورش انگیزی منظور ہوتو اُس کا پہلا کام یہ ہوتا کہ دارالامارہ پر قبضہ کرے مگر مسلم نے اپنے عمل سے ظاہر کر دیا کہ ہمیں تمہاری سلطنت سے مطلب نہیں، تمہاری حکومت سے کوئی غرض نہیں۔ ہمیں تو صرف طالبان ہدایت کی تلاش اور ان کی مذہبی و اخلاقی اصلاح مدنظر ہے۔

مسلم کے ورود: کوفہ کے متعلق حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلیمان بن صرد خزاعی اس وقت کوفہ میں موجود نہ تھے ورنہ مسلم اُن ہی کے مکان پر قیام کرتے اس لئے کہ وہ اس تحریک کے روح رواں اور اس جماعت میں سب سے زیادہ صاحب وجاہت اور ذی اثر تھے مجبوراً مسلم نے مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے گھر میں قیام کیا (۲)

کوفہ میں یہ خبر تیزی کے ساتھ پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق آپ کے پاس ملاقات کے لیے پہونچنے لگے۔ جب کافی مجمع ہو گیا تو مسلم نے امام حسینؑ

---

(۱) الاخبار الطوال ص ۲۳۲۔ طبری ج ۶ ص ۱۹۸ (۲) الاخبار الطوال ص ۲۳۲ طبری ج ۶ ص ۱۹۹ و ج ۷، ص ۵۸۔ ارشاد ص ۲۱۱ اس گھر کے نشانات غالباً چوتھی صدی ہجری تک باقی تھے چنانچہ ابو حنیفہ دینوری نے لکھا ہے کہ اب یہ گھر "دار مسیب" کے نام سے مشہور ہے (الاخبار الطوال ص ۲۳۲) طبری نے لکھا ہے "دار مسلم بن مسیب" کے نام سے مشہور ہے (طبری ج ۶ ص ۱۹۹ دوسری جگہ "دار مسلم بن مسیب" درج ہے (طبری ج ۷، ص ۵۸)

کا خط جو اس جماعت کے نام تھا پڑھ کر سنایا جس کو سن کر حاضرین میں کافی جوش کے آثار نمودار ہوئے۔ عابس بن ابی شبیب شاکری نے کھڑے ہو کر حمد و ثنائے الٰہی کے بعد اپنے ذاتی خیال کو ظاہر کرتے ہوئے کہا "مجھکو عام لوگوں کے متعلق کسی اظہار رائے کا حق نہیں ہے اور نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے اور میں ان کی طرف سے وکالت کر کے آپ کو دھوکے میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا مگر میں وہ ظاہر کرتا ہوں جسے میں نے اپنے دل میں ٹھان لیا ہے۔ خدا کی قسم میں جس وقت بھی آپ دعوت دینگے لبیک کہتا ہوا حاضر ہوں گا اور آپکے ہمراہ دشمنوں سے جنگ کروں گا اور اُس وقت تک شمشیر زنی کرونگا کہ اس زندگی کو ختم کر کے اپنے خدا سے ملاقات کروں اور میرا مقصد اس سے سوائے رضائے پروردگار کے کچھ نہ ہوگا۔"

یہ تقریر ختم ہونا تھی کہ حبیب بن مظاہر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے "مرحبا جزاک اللہ کتنی مختصر لفظوں میں تم نے حقیقت حال کو واضح کیا ہے۔" پھر مسلم کی طرف خطاب کر کے کہا۔ خدا کی قسم میرا بھی ذاتی حیثیت سے یہی خیال ہے جس کو عابس بن ابی شبیب نے انہی لفظوں میں ظاہر کیا۔" اسی سے ملتی جلتی لفظوں میں سعید بن عبد اللہ حنفی نے تائید کی جس کے بعد مجمع متفرق ہوا (۱)۔ خط کے مضمون کی بناء پر اس کارروائی کا مقصد ظاہر ہے یعنی یہ عہد و پیمان اس غرض سے نہ تھا............ کہ مسلم کوئی جارحانہ اقدام کرنا چاہتے تھے اور اس کے متعلق یہ لوگ نصرت اور مدد کا وعدہ کر رہے تھے اور نہ موجودہ صورت حال کی بناء پر یہ خیال کسی دماغ میں جگہ پا سکتا تھا کہ چند ہی روز میں تن تنہا مسلم کے مقابلہ میں فوج کشی ہوگی اور اس کے لیے اس جماعت کو تیار رہنا چاہیے بلکہ یہ عہد و پیمان

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۱۹۹

صرف امام حسینؑ کی تشریف آوری کی پیش نہاد اور اُس موقع کے لیے ان لوگوں کے عزائم و نیات کے اندازہ کے طور پر تھا۔

مسلم بن عقیل کے ورود کی خبر کوفہ میں عام طور پر مشہور ہو ہی چکی تھی اور اُس فضا کے لحاظ سے جو امام حسینؑ کو دعوت دینے کی تحریک کے سلسلہ میں ابتدا ہی سے کوفہ میں پیدا ہو گئی تھی اور جس کے اسباب وضاحت کے ساتھ درج کیے جا چکے ہیں۔ ہر شخص نے اس خبر کا مسرت کے ساتھ استقبال کیا۔

یزید کی خلافت سے بسبب اس کی سیاہ کاریوں کے بیزاری ایک طرف حضرت حسینؑ بن علیؑ کی ہر دلعزیزی نہ صرف خاندانی وجاہت کے باعث بلکہ اپنے اخلاق و کمالات کے لحاظ سے دوسری جانب، وہ لوگ کہ جو مسلم بن عقیل کی تحریک کے مبلغ و داعی تھے اُن کی ذاتی وجاہت اور تعلقات تیسری طرف اور کل جدید لذیذ، کے طبعی قانون کے مطابق ہر تازہ تحریک میں جو لذت ہوتی ہے وہ چوتھی جانب ان تمام اسباب کی بنا پر حضرت مسلم کے ہاتھ پر ایک ہفتہ کے اندر بارہ (۱) یا اٹھارہ ہزار (۲) کوفیوں نے بیعت کی لیکن کیا یہ سب دوستان علیؑ تھے؟ کیا کوفہ میں زیاد و آل زیاد کی بیس سال حکومت کے بعد جس میں کھنچی ہوئی تلواریں اور جلادوں کے ہاتھ برابر اپنی سفاکی دکھاتے رہے ہوں اور دست و پا سر و زبان کے قطع و برید کا سلسلہ برابر جاری رہا ہو کوفہ میں اتنی تعداد میں علیؑ کے دوست موجود ہو سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ سچے شیعہ تو کوفہ میں پہلے ہی کم تھے اور

(۱) طبری ج ۶ صہ ۱۹۷ (۲) طبری جلد ۶ صہ ۲۱۱

جو پہلے بھی وہ معاویہ کے قتل و غارت کے بعد تقریبا نیست و نابود ہو چکے تھے ۔ اس کے بعد تھوڑے سے چھپے چھپائے افراد باقی ہو سکتے ہیں ورنہ جتنے تھے وہ وہی افراد تھے جو حضرت علی بن ابی طالبؑ کو چوتھا خلیفہ تسلیم کر کے محض ساتھ ہونے کی وجہ سے لغوی معنی کے اعتبار سے شیعہ کہے جاتے تھے اور وہ بھی اب زیادہ تعداد میں باقی نہیں تھے ۔ اس صورت میں یہ ماننا ناگزیر ہے کہ مذکورہ بالا سطحی اور عارضی اسباب سے جو رائے عامہ ہموار ہوی ہو اس میں کوی وزن نہیں ہو سکتا ۔ بے شک جب اُس تحریک کے ابتدائی محرکین کو رائے عام کی نوعیت سمجھنے میں غلطی ہوئی حالانکہ وہ یہیں کے رہے سہے ، بروردہ اور تجربہ یافتہ تھے تو جناب مسلم کو جو کہ یہاں پر دیسی کی حیثیت رکھتے تھے ، دھوکا ہونا قابل تعجب نہیں ہے ۔

مسلم کی تحریک کو چلانے والے ، اُن کی صدا پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے اور سب سے پہلے جلسہ میں جانبازی کا اقرار کرنے والے اور رائے عامہ کو ہموار کر کے مسلم کی نصرت و بیعت پر آمادہ کرنے والے ان میں سے اکثر بے شک سچے خالص اور مخلص ہمدرد اور دوست تھے اور اُن کا کام یہی تھا کہ وہ شہر کی فضا کو مسلم کے موافق بنا دیں جس میں اُن کو بظاہر خاطر خواہ کامیابی ہوی لیکن آیندہ کے انقلابات کوئی دوسری صورت پیدا نہ کرینگے ، اس کی ذمہ داری کسی پر عائد نہیں ہو سکتی ۔ بے شک ان قلیل التعداد خالص دوستوں نے اپنے اقرار اور عہد جانبازی پر بہترین طریقہ سے عمل کیا اور جو کہا تھا اُسے کر دکھایا جس کے مشاہدہ کے لیے مستقبل کا انتظار کرنا چاہیے ۔

جناب مسلم بن عقیل کو حالات خوشگوار اور مطابق قول و قرار نظر آئے، اس لیے امام حسینؑ کو خط لکھ دیا کہ جلد تشریف لائیے۔ حالات سازگار ہیں اور اہل کوفہ اپنے قول و قرار پر قائم ہیں (۱) مقامی حکومت کا طرز عمل اُن کی نسبت روادارانہ تھا۔ کوفہ کے حاکم نعمان بن بشیر نے منبر پر جا کر ایک تقریر کی جس کا مضمون یہ تھا کہ اے بندگان خدا فتنہ و فساد اور افتراق سے پرہیز کرو۔ اس سے خواہ مخواہ جانیں جائینگی، خون بہینگے اور مالی تباہیاں ہونگی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں جب تک کوئی جارحانہ اقدام میرے خلاف نہو اُس وقت تک کوئی اقدام نہیں کرونگا (۲) کوفہ میں یہ خبر گرم تھی کہ اب بہت جلد ہی حسینؑ بن علی، تشریف لانے والے ہیں اور اس وجہ سے ہر طرف ایک خاص چہل پہل نظر آتی تھی اور خلقہ خلقہ جماعت جماعت لوگ مل کر اس پر اظہار خیالات کرتے تھے۔ اور بے چینی کے ساتھ دیدہ براہ تھے مگر کوفہ کے اندر ایک جماعت ایسی موجود تھی جو ان تمام منصوبوں کو خاک سیاہ بنا دینے پر تلی ہوئی تھی اور یہ اموی حکومت کے خیر خواہ وہ لوگ تھے جنھیں اندیشہ ہوا ہوگا کہ حسین بن علیؑ کے اقتدار کے بعد انھیں اموال خلق پر بے جا تصرفات کا موقع باقی نہ رہیگا چنانچہ ان میں سے ایک شخص بنی امیہ کے حلیف عبداللہ بن مسلم حضرمی نے تو نعمان بن بشیر کی مذکورۂ بالا روادارانہ تقریر کے بعد ہی کھڑے ہو کر کہہ دیا کہ یہ آپ کا طریق کار صحیح نہیں ہے اور آپ کمزوری دکھا رہے ہیں جس پر نعمان نے کہا کہ "میں اللہ کی اطاعت کے لیے کمزور ثابت ہوں یہ بہتر ہے اس سے کہ معصیت الٰہی کر کے زورآور ثابت ہوں" (۳) یہ جواب نعمان کے

---

(۱) طبری ج ۶ صہ ۲۱۱ الاخبار الطوال صہ ۲۴۳ (۲) طبری ج ۶ صہ ۱۹۹ (۳) طبری جلد ۶ صہ ۱۹۹

ضمیر کی صاف ترجمانی کر رہا تھا جس کے بعد فسادی اشخاص کو کچھ کہنے کا موقع نہ تھا۔ اس لیے یہاں سے جا کر فوراً عبد اللہ بن مسلم (۱) نے یزید کے نام خط لکھ کہ مسلم بن عقیل کوفہ آئے ہیں اور ان کے طرفداروں نے ان کے ہاتھ پر حسین کی بیعت کر لی ہے۔ اگر آپ کو کوفہ اپنے ہاتھ میں رکھنا ہے تو یہاں کوئی مضبوط آدمی بھیجیے جو آپ کے فرمان کے مطابق عمل کر سکے۔ اس لیے کہ نعمان بن بشیر کمزور شخص ہیں یا وہ جان بوجھ کر کمزوری دکھا رہے ہیں۔"

عمارہ بن عقبہ اور عمر بن سعد نے بھی ایسے ہی مضمون کے خطوط روانہ کیے (۲) ان خطوط کے پہنچنے پر یزید نے سرجون بن منصور رومی سے مشورہ لیا۔ یہ شخص عیسائی تھا جو معاویہ کے زمانہ سے محکمہ خراج میں کاتب تھا (۳) سرجون نے عبید اللہ بن زیاد (۴) کا نام لیا۔ یزید اس وقت تک ابن زیاد سے خفا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اسی کی وجہ سے زیاد نے میری ولیعہدی سے اختلاف کیا تھا اور یہ کہ شاید معاویہ کے بعد بجائے میرے یہ خود خلافت کا امیدوار تھا اس لیے اس کا اب تک یہ ارادہ تھا کہ وہ بصرہ کی حکومت سے

---

(۱) دینوری نے اس خط لکھنے کی نسبت مسلم بن سعید حضرمی اور عمارہ بن عقبہ کی طرف دی ہے اور کہا ہے کہ یہ دونوں یزید بن معاویہ کے جاسوس تھے (الاخبار الطوال ص ۲۳۳) (۲) طبری ج ۶ ص ۱۹۹۔ ارشاد ص ۲۱۱ - ۲۱۲ (۳) الوزراء والکتاب ص ۱۵ - چونکہ اس زمانہ کوفہ و بصرہ اور دمشق دونوں مرکزوں میں مالیات سے متعلق دو دفتر تھے - ایک رعایا کی مردم شماری کا اور ان کے وظائف و انعامات کا۔ یہاں کام عربی میں ہوتا تھا اور دوسرا آمدنی خرچ کے حسابات کا یہ کام کوفہ و بصرہ میں اب تک فارسی زبان میں ہوتا تھا اور شام میں یہ رومی زبان میں لکھا جاتا تھا اس لیے عراق میں یہ دفتر مجوسیوں اور شام میں عیسائیوں کے ہاتھ میں تھا چنانچہ اس دفتر کا مہتمم اعلیٰ دمشق میں سرجون تھا جو معاویہ کے وقت سے عبد الملک بن مروان کے عہد تک برابر اسی شعبہ کا ذمہ دار رہا اور اس غرض سے ہیں کہ یہ کام بغیر ہمارے ہو ہی نہیں سکتا ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ خلیفہ تک کو خطرے میں نہیں لاتا اسی وجہ سے عبد الملک کے زمانہ میں عراق اور دمشق کے ان دونوں دفتروں کو بھی عربی میں منتقل کیا گیا چنانچہ ۸۰ھ میں حجاج بن یوسف نے عراق کے دفتروں کو بھی عربی میں منتقل کیا ۸۱ھ میں حجاج بن یوسف نے عراق کے دفتروں سے مجوسیوں کو نکال کر ان کو عربی کی طرف منتقل کیا اور تقریباً اسی زمانہ میں عبد الملک کے حکم سے دمشق کے دفتر کی زبان عربی بنائی گئی اور سرجون کو عہدہ سے برطرف کر دیا گیا (الوزراء والکتاب ص ۲۳ و ۲۴) (۴) سب سے پہلے زیاد کے مرنے کے بعد ۵۳ھ میں عبید اللہ بن زیاد کو معاویہ نے خراسان کا حاکم قرار دیا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۵ برس کی تھی (طبری ج ۶ ص ۱۶۶) پھر ۵۵ھ میں اسے بصرہ کا حاکم قرار دیا (ص ۱۶۸)

بھی ابن زیاد کو معزول کر دے گا (۱) چنانچہ ابن زیاد کا نام سنتے ہی یزید نے انکار کیا اور کہا نہیں وہ تو ٹھیک نہیں ہے، کسی اور کا نام لو۔ سرجون نے کہا یہ بتلایئے کہ اگر معاویہ اس وقت زندہ ہوتے اور وہ اس وقت آپ کو یہی رائے دیتے تو آپ قبول کرتے؟ یزید نے کہا بے شک اُن کے کہنے کو ضرور قبول کرتا۔ یہ سن کر سرجون نے ایک تحریر نکالی اور کہا کہ یہ معاویہ کا فرمان ہے جس میں ابن زیاد کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا ہے۔ وہ اسے بھیجنے نہ پائے کہ انتقال ہو گیا۔ اب آپ بصرہ اور کوفہ دونوں جگہ کی حکومت عبیداللہ بن زیاد کے لیے قرار دے دیجئے۔

یزید نے معاویہ کی اس تحریر کے مطابق ابن زیاد کے نام خط لکھا کہ مجھے میرے شیعوں نے کوفہ سے خطوط لکھے ہیں کہ وہاں پسر عقیل نے آکر لشکر جمع کرنا شروع کر دیا ہے تاکہ مسلمانوں میں تفرقہ اور فساد پیدا ہو۔ تم اس خط کے پہنچنے کے ساتھ ہی اُدھر روانہ ہو اور مسلم کو قبضہ میں لا کر قید کرو، قتل کرو یا نکال دو والسلام (۲)

قدیم مورخ جہشیاری نے اس خط کا مضمون حسب ذیل لکھا ہے جس کے پس منظر میں یزید کی ابن زیاد سے ناراضگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُس میں تہدید کا انداز زیادہ نمایاں ہے۔

"معلوم ہونا چاہیے کہ جس کی ایک وقت تعریفیں ہوتی ہیں وہی دوسرے وقت سب و شتم سے یاد کیا جاتا ہے اور جسے سب و شتم کیا جاتا ہوتا ہے وہی ایک دم محل تعریف بن جاتا ہے ——— اس وقت ایک بڑا منصب تمہارے سپرد کیا جا رہا ہے جس سے بڑھ کر تمہارے لیے کوئی اعزاز نہیں ہو سکتا

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۱۹۹ (۲) ارشاد ص ۲۱۲۔ طبری ج ۶ ص ۲۰۰

اور اتفاق سے حسینؑ کی مہم تمہارے ہی دور اور تمہارے ہی قلمرو مملکت کے نصیب میں آئی ہے اور تمام عمال حکومت میں تم ہی وہ ہو جو اس محل آزمائش میں پڑے ہو۔ اب یا تو تمہاری شرافت پایۂ ثبوت تک پہنچ جائیگی اور یا جیسے کبھی تھے ویسے ہی غلام کے غلام قرار پا جاؤ گے۔ والسلام" (۱)

اس کے آخرہ فقرہ میں تلمیح وہی زیاد کے مجہول النسب ہونے اور پھر معاویہ کی نظر عنایت سے فرزند ابو سفیان قرار دیے جانے کی طرف ہے۔ اس خط کے مضمون سے یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ صرف مسلم ہی کے بارے میں ابن زیاد کو سرگرمی کی تحریک نہیں کر رہا ہے بلکہ سخت و درشت اور غیرت انگیز الفاظ میں خود حضرت امام حسینؑ کے معاملہ میں ابن زیاد کو مضبوط اقدامات کی تحریک کر رہا ہے جس میں ذرا بھی کوتاہی اس کے سامنے اسکے تمام مستقبل کے تاریک بنانے کی دھمکیوں کا مرکز بنا دی گئی ہے۔

بہرحال اس خط کو کوفہ کی حکومت کے پروانہ کے ساتھ مسلم بن عمرو باہلی (۲) کے ہاتھ ابن زیاد کے پاس روانہ کیا جس کو دیکھتے ہی اُس نے بصرہ میں اپنے بھائی عثمان بن زیاد کو قائم مقام بنا کر خود کوفہ جانے کی تیاری کر دی اور مسجد جامع میں ایک تہدید آمیز تقریر کرنے کے بعد جس میں اعلان کیا تھا کہ اگر تم میں سے کسی نے ذرا بھی مخالفت کی تو میں اُسی کو نہیں بلکہ اُس کے ورثا کو بھی قتل کرا دوں گا اور آس پاس کے آدمیوں اور خطاکار کے ساتھ بے خطا کو بھی سزا دینے میں کمی نہ کروں گا (۳)۔ دوسرے دن روانہ ہو گیا (۴) وہ کوئی اور نہیں۔ زیاد بن ابیہ کا بیٹا اور معاویہ کا اُن کے ادعا کے مطابق بھتیجا تھا اور یہ پورا خاندان ہی وہ تھا جس پر حیلہ و فریب کا خاتمہ تھا۔ چنانچہ

---

(۱) انوار رار و الکذاب صفہ ۱۹ (۲) قتیبہ بن مسلم کی شخصیت تاریخ میں مشہور ہے۔ یہ مسلم بن عمرو اسی کا باپ تھا۔ (الاخبار الطوال صفہ ۲۳۳ (۳) الاخبار الطوال صفہ ۲۳۲ (۴) طبری جلد ۶ صفہ ۲۰۱۔ ارشاد صفہ ۲۱۲ و ۲۱۳

سب سے پہلی بات ابن زیاد نے یہ کی کہ اُس نے اپنی نقل و حرکت کو بالکل صیغۂ راز میں رکھا تاکہ اُس کا درود کوفہ میں اچانک حیثیت سے ہو اور پھر جب کوفہ نزدیک رہ گیا تو اُس نے اپنی وضع میں تغیر پیدا کرکے ایک سیاہ عمامہ سر پر باندھا اور چہرہ پر اُسی طریقہ سے جو عرب قوم کے بہادروں کا جنگ وغیرہ کے موقعوں پر دستور تھا ایک ڈھاٹا باندھ لیا جس کی بنا پر شناخت ناممکن ہوگئی۔ ایک مرتبہ شہر پناہ کوفہ کے اندر یہ نقشہ نظر آیا کہ آگے آگے عربی گھوڑے پر سوار ایک رئیس قوم پورے وقار و تمکنت کے ساتھ، سیاہ عمامہ سر پر باندھے جو اشراف عرب کا امتیازی نشان تھا اور اُس کے پیچھے ایک شاندار قافلہ زین و لجام، ساز و سامان سے آراستہ آرہا ہے۔ اس حشم و خدم کو دیکھ کر اُن توقعات کی بنا پر جو پہلے سے قائم تھے وہی ہونا چاہیے تھا جو ہوا یعنی ہر شخص یہی سمجھا کہ حضرت حسینؑ بن علیؑ تشریف لائے ہیں اور اس قائم شدہ اثر کی بنا پر یا متوقع جدید انقلاب سے نفع دنیوی حاصل کرنے کی تمنا میں جس جماعت کی طرف سے عبیداللہ کا گزر ہوتا۔ وہ بہ نظر تعظیم کھڑے ہو کر آداب بجالاتی اور خوش آمدید کے معنی میں یہ الفاظ زبان پر جاری کرتی تھی کہ مرحبا بك یا ابن رسول اللہ قدمت خیر مقدم ابن زیاد کسی کو کچھ جواب نہ دیتا بلکہ آوازوں کو سنتا، چہروں کو بغور دیکھتا، شکل و شمائل کو پہچانتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ مجمع زیادہ ہوگیا اور لوگ اشتیاق میں گھروں سے نکل آئے اور ہر شخص فرزند رسول سمجھ کر آگے بڑھنے لگا اور نوبت یہ پہونچی کہ راہ چلنے میں رکاوٹ پیدا ہونے لگی۔ اُس وقت مسلم بن عمرو باہلی نے جو ابن زیاد کے ساتھ تھا پکار کر کہا "راستہ چھوڑ دو۔ یہ امیر عبیداللہ بن زیاد ہیں"(۱)

---

(۱) الاخبار الطوال صفحہ ۲۳۱ - طبری ج ۶ صفحہ ۲۰۱

نہ معلوم ان الفاظ میں کون سا اثر تھا کہ بڑھتے ہوئے قدم اور اُٹھتے ہوئے ہاتھ اور مسرت آمیز ترانے سب موقوف ہو گئے ایک سناٹا تھا جو چھا گیا اور سارا مجمع تتر بتر ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب ابن زیاد دارالامارہ میں پہونچا تو دس آدمیوں سے زیادہ اُس کے ساتھ نہ تھے (۱)

اِس موقع پر اہل کوفہ کے فطری رجحانات پر غور کرنے کے بعد اُن کے باطنی اضطراب کا اندازہ کرنا چنداں دشوار نہیں اس لیے کہ حالات کا غیر متوقع صورت سے ظہور پذیر ہونا بجائے خود سنسنی پیدا کر دیتا ہے چہ جائیکہ صورت حال یہ ہو کہ اُن میں سے ہر ایک نے اپنے خلاف خود جاسوسی کے کام کو انجام دیا یعنی اپنے باطنی خیالات اور حسینؑ بن علیؑ کے ساتھ خلوص و عقیدت کی خود ابن زیاد کے سامنے بوقت ورود ترجمانی کر دی۔ اور ابن زیاد نے ایک ایک کے چہرہ اور آواز کو پہچان لیا اور پھر ابن زیاد وہی تھا جس کی اور جس کے باپ کی تلوار کے نیچے بیس۲ برس تک اس تمام خلقت کی گردنیں اس طرح خم رہی ہیں کہ جس کو چاہا گرفتار کیا، سولی پر لٹکایا، جلاد کے ہاتھ سے سر کو قلم کرا دیا اور ایسے ہیبت ناک مناظر ان ہی ہاتھوں سے آنکھوں کے سامنے آچکے ہیں جن کو سوچ کر اب تک رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور دل ہل جاتے ہوں گے اور اب وہی صورتیں اپنے اور اپنی اولاد اور اعزاؔ و اقاربؔ کے لیے پیش نظر ہیں، کیا یہ وجوہ ایسے نہ تھے جن کی بنا پر دل و دماغ معطل طاقتیں مضمحل اور ہمتیں پست ہو جاتیں اور اُن پر عظیم خوف و ہراس کا غلبہ ہو جاتا خصوصاً جبکہ زیادہ تر تعداد عوام کی تھی جو واقعات و حالات کو سمجھے بغیر ہر نئی آواز پر لبیک کہنے کے شوق میں شریک ہو گئے تھے۔

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۰۱

ابن زیاد نے مسجد جامع میں ایک تہدیدی تقریر کے ساتھ اپنی حکومت کا اعلان کرنے کے بعد قصر میں جاکر قیام کیا اور نعمان بن بشیر نے فوراً قصر کا تخلیہ کر کے کوفہ سے اپنے وطن شام کی طرف روانگی اختیار کی (۱) ابن زیاد نے اس کے بعد تمام محلّات کوفہ کے ذمہ دار اشخاص کو جن سے عرافت (۲) کا منصب تعلق رکھتا تھا بلا کر یہ فرمان جاری کیا کہ جلد سے جلد ہر محلّہ کی مردم شماری اور جو لوگ نو وارد ہیں اُن کی فہرست اور جن لوگوں سے حکومت شام کو خطرہ ہے، اُن کے نام ادارۂ حکومت محلّیہ میں پیش کر دیئے جائیں اور اگر وہ کسی وجہ سے ان فہرستوں کے تفصیل وار ترتیب دینے سے معذور ہوں تو ضمانت داخل کریں کہ ان کے محلّہ میں کوئی متنفس بھی حاکم شام کی مخالفت پر آمادہ نہ ہوگا اور اسکے خلاف ظاہر ہوا تو اُس مختار محلّہ کو فوراً اُس کے گھر کے دروازہ پر سولی دی جائے گی اور اُس کے خاندان سے ہمیشہ کے لیے اس منصب کو علیحدہ کر لیا جائیگا (۳)

یہ مضبوط تدبیر ایسی نہ تھی جس کی کامیابی مشتبہ ہو۔ کوفہ کا چپّہ چپّہ جواسیس و مخبرین کی کثرت سے غیر محفوظ نظر آنے لگا۔ اب ہر شخص خاص اپنے محلّہ میں ایک گھر سے دوسرے گھر پر جاتے ڈرتا تھا اور اس طرح دس پانچ آدمیوں کا بھی ایک جگہ جمع ہو کر کسی امر پر گفتگو کرنا اور کوئی قرارداد استوار کرنا ناممکن ہو گیا۔

---

(۱) الاخبار الطوال ص۲۳۲ (۲) ملک عرب میں اب تک یہ طریقہ رائج ہے کہ بڑے شہروں میں ہر محلّہ میں ایک مختارِ محلّہ ہوتا ہے جو اُس محلّہ کی مردم شماری، وارد و صادر، زائیدہ و مردہ، شادی شدہ و غیر شادی شدہ وغیرہ امور کی تشریح کا مقامی حکومت کی طرف سے ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی منصب کو اُس زمانہ میں عرافت کہتے تھے۔
(۳) طبری ج ۶ ص۲۰۱ ارشاد ص۲۱۲

یہ پہلا موقع وہ ہو سکتا تھا کہ جب مسلم بن عقیل کو جان کا اندیشہ اور مقصد کی پامالی کا احساس ہو جاتا۔ اب آپ کا صرف ایک فرض رہ گیا تھا کہ آپ حفاظت خود اختیاری کے فریضہ کے ماتحت جہاں تک ممکن ہو اپنے تحفظ کے لیے احتیاطی تدابیر عمل میں لائیں۔ اس کے لیے آپ کو مختار بن ابی عبیدہ کا مکان جس آپ اب تک مقیم تھے غیر محفوظ معلوم ہوا اس لیے کہ آپ کا قیام وہاں مشتہر ہو چکا تھا اور پھر اگر کوئی وقت آتا تو وہاں آپ کی حمایت کرنے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ مختار بن ابی عبیدہ شریف قوم سہی لیکن صرف ایک زمیندار کی حیثیت رکھتے تھے وہ کسی بڑے قبیلہ کے سردار نہ تھے۔ اس کے علاوہ اس خاص موقع پر وہ کوفہ میں موجود بھی نہ تھے (۱)

لہذا مسلم نے اپنے لیے اس سے بہتر کوئی صورت نہ دیکھی کہ آپ رات کو شب میں ہانی بن عروہ کے گھر میں منتقل ہو جائیں (۲) یہ قبیلۂ مراد مذحج کے سردار تھے اور جب نکلتے تھے تو بارہ ہزار آہن پوش سوار ان کے ہمراہ رکاب ہوتے تھے۔

مسلم نے ہانی کے گھر میں پناہ لے کر ظاہری اسباب کی بنا پر اپنے کو بارہ ہزار شمشیر زن بہادروں کے حلقہ میں پہنچا دیا جو بظاہر آپ کی حفاظت کا فرض بہترین طریقہ پر ادا کر سکتے تھے

ہانی نے مسلم کو مخفی طور پر اپنے یہاں رکھا اور سوائے مخصوص افراد کے جو محل اعتماد تھے کسی کو اس راز کی اطلاع نہ دی۔

اب اُن قلیل التعداد دوستان اہلبیت کو جو اس تحریک کے داعی تھے

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۰۵ (۲) الاخبار الطوال صفحہ ۲۳۵ طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۵ و ۲۰۳ ارشاد صفحہ ۲۱۳

فضا کی ناسازگاری کا پورا پورا احساس ہو گیا تھا مگر وہ مستقل مزاجی کیساتھ صورتِ حال کے مقابلہ پر آمادہ ہو گئے اور اب لازمی طور پر نقطۂ نظر میں تبدیلی ہو گئی۔ اس کے پہلے امام حسینؑ کے خط کے مطابق مسلم کی حیثیت صرف ایک پرامن نمایندہ کی تھی جس کا مقصد فقط کوفہ کے لوگوں سے امام حسینؑ کے لیے عہد وفاداری کا استوار کرنا تھا۔ چنانچہ اس کے پہلے ہرگز یہ پتہ نہیں چلتا کہ کوئی اسلحہ کی فراہمی کی کوشش ہو رہی ہو یا جنگ کی تیاری ہو مگر اب نوعیت یہ ہے کہ یہ یقینی ہے کہ عنقریب مسلم کے خلاف حکومت کی طرف سے جارحانہ اقدام ہو گا اور اب اس جماعت کو جو مسلم کے بلانے کی ذمہ دار ہے اُس کے مقابلہ کے لیے تیار ہونا چاہیے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے اب یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اُس ہدایت نامہ کے حدود سے آگے جو مسلم اور امام حسینؑ کی جانب سے دیا گیا تھا۔ یہ اب ایک ہنگامی صورت حال ہے جس کے لیے مُسلم اور جماعت کوفہ کو بہر حال مناسب طرز عمل اختیار کرنا لازم ہے۔ چنانچہ مُسلم بن عوسجہ اسدی نے حضرت مُسلم کی طرف سے اب لوگوں سے حفاظت و نصرت کا وعدہ لینا شروع کیا اور "ابو ثمامہ صائدی فراہمی سرمایہ اور جمع آوری اسلحہ کے ذمہ دار ہوئے۔ (۱)

ابن زیاد کو جناب مسلم کی جائے قیام کا پتہ لگانے کی بڑی فکر تھی۔ اُس نے مُسلم کی سراغ رسانی کے لیے اپنے شامی غلام معقل کو تین ہزار درہم دے کر مقرر کیا کہ وہ خفیہ طریقہ پر کسی نہ کسی طرح مسلم کا پتہ چلائے معقل

(۱) طبری ج ۵ ص ۲۰۳۔ ارشاد ص ۲۱۵

اس فکر میں مسجد جامع میں آیا، اتفاق سے اس وقت مسلم بن عوسجہ ایک رکن مسجد کے پاس نماز میں مصروف تھے۔ وہ دیر تک ان کو دیکھتا رہا اور اُس نے اپنے دل میں کہا (جیسے خود اُس نے بعد میں بیان کیا) کہ یہ شیعہ لوگ نمازیں بکثرت پڑھتے ہیں اس لیے ہوں نہ ہوں۔ یہ اُنھیں میں سے ہوں لہٰذا وہ انتظار میں بیٹھا رہا (۱) جب مسلم نماز سے فارغ ہوئے تو وہ اُن کے پاس آکر بیٹھا اور کہا کہ میں شام کا رہنے والا۔ ذوالکلاع کا غلام، خدا کے فضل سے اہلبیت رسول کا دوست ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس خاندان میں سے کوئی بزرگ آج کل کوفہ میں آئے ہوئے ہیں اور لوگوں سے رسولِ خدا کے نواسے کی بیعت لے رہے ہیں۔ اور یہ تین ہزار درہم میرے پاس ہیں تو کیا آپ مجھے اُن کا پتہ بتا سکتے ہیں کہ یہ رقم میں اُن کی خدمت میں حاضر کردوں جسے وہ اپنی مُہم میں صرف کریں،،

مسلم نے کہا کہ آخر مسجد میں دوسرے لوگ بھی تو ہیں۔ تم میرے ہی پاس اس کے دریافت کرنے کو کیوں آئے ہو؟ اُس نے کہا کہ سبب یہ ہے کہ میں نے آپ میں نیکوکاری اور پرہیزگاری کے آثار دیکھے تو یقین ہوا کہ آپ ضرور دوستان اہل بیت رسول میں سے ہیں۔ جناب مسلم اُس کے فریب میں آگئے اور کہا تم نے خوب پہچانا، میں تمہارے ہی بھائیوں میں سے ایک ہوں۔ میرا نام مسلم بن عوسجہ ہے۔ مجھے تمہاری ملاقات سے بہت خوشی ہوئی اور اس بات سے اور زیادہ مسرت حاصل ہوئی کہ تم اپنی خواہش میں کامیاب ہوئے اور تمہارے ذریعہ سے اہلبیت رسول کو کچھ تقویت پہونچے گی۔ بے شک یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ظالم ابن زیاد کو بھی

(۱) الاخبار الطوال صہ ۲۳۶

اس کی اطلاع نہ ہو جائے لہٰذا تم مجھ سے عہد کرو کہ کسی سے اس کا اظہار نہ کرو گے۔ چنانچہ کافی اطمینان اور عہد و پیمان اور راز داری کے وعدوں کے ساتھ مسلم بن عوسجہ نے اقرار کیا کہ میں کل تمہیں جناب مسلم بن عقیل کی خدمت میں لے چلوں گا۔ معقل دوسرے دن جناب مسلم بن عوسجہ کے مکان پر آیا اور وہ اُسے حضرت مسلم بن عقیل کے پاس لے گئے اُس نے آپ کی بیعت کی اور تین ہزار درہم جو لایا تھا آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ اُس کے بعد معقل کی یہ صورت تھی کہ وہ دن بھر جناب مسلم کے پاس رہتا اور تمام حالات معلوم کرتا تھا اور رات کو ہر بات کی اطلاع ابن زیاد کو پہنچا دیتا تھا (۱)

ہانی سے اور ابن زیاد سے بہت قدیم تعلقات تھے مگر صرف اس اندیشہ پر کہ کہیں ابن زیاد کو مسلم کے میرے یہاں قیام کی کچھ بھنک نہ مل گئی ہو، وہ آج کل ابن زیاد کی ملاقات کو جانے سے پرہیز کرتے تھے اور بیماری کے عذر کے ساتھ خانہ نشین ہو گئے تھے۔ ابن زیاد کو یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح ہانی کو بلانا چاہیے چنانچہ اُس نے ہانی بن عروہ کے پاس ملاقات کا پیغام بھیجا (۲) ہانی کو اس وقت کسی وقتی خطرہ کا احساس نہیں ہوا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ابن زیاد کے دعوتی پیغام پر اُنھوں نے اپنے بارہ ہزار جوانوں میں سے کسی ایک کو بھی واقعہ سے اطلاع دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ خود تن تنہا ابن زیاد کے پاس چلے گئے۔ وہاں پہونچے تو پہلے ہی سے ابن زیاد کا رنگ بدلا ہوا پایا۔ پہلے تو صورت دیکھتے ہی اُس نے عرب کی ایک مثل زبان پر جاری کی کہ "اتتك بحائن رجلاہ" جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہانی اپنے پیروں سے موت کی طرف آ رہے ہیں۔ پھر اُس نے شریح قاضی کی طرف

---

(۱) الاخبار الطوال صـ ۲۳۶ (۲) الاخبار الطوال صـ ۲۳۳ طبری ج ۶ صـ ۲۰۲

رخ کر کے یہ شعر پڑھا۔

ارید حیوٰتہ و یرید قتلی عذیرک من خلیلک من مراد

یعنی میں تو اُسکی زندگی چاہتا ہوں اور وہ میری جان لینے کا درپے ہے۔ خدا ہی سمجھے اس قبیلۂ مراد والے تمہارے دوست سے"

اس سے ہانی سمجھ تو گئے کہ بظاہر راز افشا ہو چکا ہے مگر اُنھوں نے کہا "کیوں امیر کیا معاملہ ہے؟" اُس نے بڑے غصہ سے کہا کہ "ارے کتنے غضب کی بات ہے کہ تم نے اپنے گھر کو خلیفۂ وقت اور تمام مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا اڈا بنایا ہے۔ تم نے مسلم بن عقیل کو بلا کر اپنے گھر میں رکھا ہے۔ اُن کے لیے اسلحہ جمع کر رہے ہو۔ اپنے گرد و پیش کے گھروں میں اُن کی مدد کے لیے آدمی جمع کر رہے ہو اور سمجھتے ہو کہ یہ باتیں سب مجھ سے چھپی رہیں گی۔" ہانی نے پہلے ان باتوں کی صحت سے انکار کیا مگر جب اُس نے معقل کو بلا کر سامنے کھڑا کر دیا اور ہانی کو معلوم ہوا کہ یہ شخص جاسوس تھا تو اب اُن کے پاس کوئی جواب نہ تھا اور تھوڑی دیر کے لیے وہ مدہوش سے ہو گئے ــــ پھر اُنھوں نے اپنے ہوش و حواس جمع کر کے کہا:۔ اب مجھ سے اصل حقیقت سنئے اور باور کیجئے۔ بخدا ایک لفظ بھی غلط نہ کہوں گا واقعہ یہ ہے کہ میں نے مسلم کو نہ خود بلایا اور نہ مجھے اُن کی تحریک کے متعلق کوئی علم تھا مگر وہ خود میرے پاس آ گئے اور میرے مکان پر قیام کے خواہشمند ہوئے ــ اب مجھے شرم دامنگیر ہوئی اور انکار بن نہ پڑا۔ اس طرح میں نے اُنھیں مہمان کر لیا اور پناہ دے دی۔ تاہم میں آپ سے یہ عہد کرتا ہوں کہ میں آپ کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام نہیں کرونگا اور ابھی آکر اپنے کو آپ کے حوالہ کر دوں گا مگر اتنی اجازت دے دیجئے کہ میں جا کر مسلم سے کہدوں کہ

میرے گھر سے نکل کر جہاں جاہیں چلے جائیں تاکہ اُن کے پناہ دینے کی ذمہ داری سے میں سبکدوش ہو جاؤں۔ پھر مجھے اُن سے کوئی مطلب نہ رہے گا۔

ابن زیاد نے کہا "نہیں جب تک اُنہیں خود میرے پاس حاضر نہ کرو تم نہیں جا سکتے"۔ ہانی نے کہا یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے مہمان کو بلا کر آپ کے سپرد کروں کہ آپ قتل کر دیں (۱)

بات اتنی بڑھی کہ ابن زیاد نے کہا "تم کو انھیں لانا ہوگا۔ نہیں تو میں تمہارا سر قلم کرا دوں گا"۔

ہانی نے کہا "ایسا ہوا تو آپ کے مکان کے گرد بجلیاں کوندتی ہوں گی" اُن کا خیال تھا کہ اُن کا قبیلہ اُن کی مدد کرے گا۔ یہ سننا تھا کہ ابن زیاد کو زیادہ غصہ آیا اور کہا "اچھا! تم بجلیوں سے مجھے ڈراتے ہو۔ لاؤ — اسے میرے قریب لاؤ" — سپاہی دوڑ پڑے۔ ہانی کو ظالم ابن زیاد کے قریب لائے — نتیجہ یہ تھا کہ بوڑھے لیکن بات کے پکے ہانی کا سر و چہرہ چھڑی کی ضرب سے خون میں رنگین ہو گیا۔ ہانی بالکل نہتے تھے۔ انھوں نے ایک سپاہی کی تلوار پر جو اُن کے پاس کھڑا تھا ہاتھ ڈالا کہ اُس سے چھین لیں۔ ابن زیاد نے کہا "اچھا اب تو تم خارجی قرار پا گئے۔ تمہارا خون ہمارے لیے حلال ہے"۔ جلاد بے دردی سے انھیں کھینچ کر لے گئے اور قید خانے میں ڈال دیا (۲)

---

(۱) الاخبار الطوال صفحہ ۲۳۳ طبری جلد ۶ صفحہ ۲۰۵ ارشاد صفحہ ۲۱۶

(۲) طبری ج ۶ صفحہ ۲۰۶ ارشاد صفحہ ۲۱۶

بنی زبیدہ کا سردار عمرو بن الحجاج ہانی بن عروہ کا برادر نسبتی تھا (۱)

اُسے اطلاع ہوئی کہ ہانی قتل کر ڈالے گئے تو وہ مذحج کے بہت سے زرہ پوش سوار لے کر دار الامارہ پر چڑھ دوڑا اور تلواروں کی جھنکار، گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز نے ہانیؔ کے دل میں رہائی کی توقعات پیدا کر دیے۔ لیکن افسوس کہ شریح قاضی کی فہمائش اور اُس کے کہنے سے کہ ھانی قتل نہیں ہوئے ہیں بلکہ بعض مصالح سے ایک محدود زمانہ تک نظر بند کر دیے گئے ہیں، وہ سب مطمئن ہو کر واپس گئے (۲)

حضرت مسلم کے لیے یہ موقع بہت سخت تھا۔ اُن کا پناہ دینے والا، وفادار اور مستقل مزاج بہادر ھانی بن عروہ اُن کی وجہ سے زدوکوب کی توہین آمیز تکلیف برداشت کر کے دشمن کے قید خانہ میں تھا۔ اور مسلم کے گرد گھر میں خاندان مراد کی عورتیں نالہ و شیون کر رہی تھیں (۲) کیا اب بھی مسلم بن عقیل چھپے بیٹھے رہتے یا اس وجہ سے کہ یہاں اُن کا قیام معلوم ہو گیا ہے کسی دوسرے قابل اعتماد شخص کے یہاں جا کر مخفی ہو جاتے؟ ہرگز نہیں! غیرت بنی ہاشم کا یہ تقاضا نہ تھا۔ اُنھوں نے یہ طے کر لیا کہ ہانیؔ نہیں! غیرت بنی ہاشم کا یہ تقاضا

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۰۵ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۵ و ۲۰۶ ۔ ۲۰۷ ارشاد صفحہ ۲۱۷ ۔ ۲۱۸ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۲۰۶ ارشاد صفحہ ۲۱۸

نہ تھا۔ اُنھوں نے یہ طے کر لیا کہ ہانی نہیں تو پھر میں بھی نہیں۔ طبری نے صاف طور پر تصریح کی ہے کہ مُسلم کا جنگ کے لئے نکلنا اپنے ساتھیوں کی اطلاع کے بغیر تھا۔ اور کوئی قرارداد اُس دن کے متعلق نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک مرتبہ اُسی وقت کھڑے ہوگئے جب کہ اُن کو معلوم ہوا کہ ہانی بن عروہ مرادی زدو کوب کے بعد قید کیے گئے ہیں (۱)

دینوری کا بیان ہے کہ جناب ھانی قتل کر دیئے گئے اور اُن کی شہادت کا حال سن کر جناب مسلم باہر نکلے (۲) ابن زیاد نے مسجد میں آکر پھر ایک تہدیدی تقریر کی۔ ابھی وہ منبر سے اُترا نہ تھا کہ لوگ دوڑتے ہوئے "باب التمارین" سے مسجد میں داخل ہوئے یہ کہتے ہوئے کہ ابن عقیل آگئے، ابن زیاد گھبرا کر منبر سے اُترا اور تیزی کے ساتھ قصر کے اندر جا کر دروازے قصر کے بند کر لیے (۳)

واقعہ کی ناگہانی حیثیت کو دیکھتے ہوئے اب یہ توقع تو کی ہی نہیں جا سکتی تھی کہ وہ ۱۸ ہزار بیعت کرنے والے سب مسلم کے گرد جمع ہو جائیں گے اور جنگ میں اُن کے ساتھ شرکت کریں گے اور پھر جب کہ کوفہ کے محلے بھی ایک دوسرے سے متصل نہیں تھے بلکہ کافی فاصلہ رکھتے تھے۔ ہاں یہ

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۵ (۲) الاخبار الطوال صفحہ ۲۳۹ (۳) طبری ج ۶ صفحہ ۲۰۶۔ ارشاد صفحہ ۲۳۰

محلہ کہ جس میں مسلم کا قیام تھا کافی وسعت رکھتا تھا اور اُسی کے اطراف میں مسلم کے گرداگرد چار ہزار آدمی موجود تھے اور مسلم کی طرف سے جو نہی یا منصور امت کا نعرہ بلند کیا گیا جو اُن کا شعار یعنی امتیازی نعرہ جنگ تھا تو شرماشرمی وہ چار ہزار آدمی جمع ہو گئے لیکن ظاہر ہے کہ اس محدود وقت میں جبکہ جنگ کے پہلے سے کچھ آثار نہ تھے وہ شاہی منظم فوج سے کہاں تک مقابلہ کے لیے تیاری کر سکے ہوں گے خصوصاً جب کہ اُن چار ہزار میں بھی اکثر ایسے ہی عوام تھے جو نتائج پر غور کیے بغیر وقتی اقدامات پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور جن کا حقیقی شیعۂ آل رسول ہونا ہرگز ثابت نہیں۔

بہرحال جناب مسلم نے اُس مختصر لشکر کو ترتیب دیا اور پیش قدمی شروع کی مگر جناب مسلم دارالامارہ تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ لوگ واپس جانا شروع ہو گئے اور پہنچتے پہنچتے صرف تین سو رہ گئے (۱) لیکن ابن زیاد اس خیال سے کہ مسلم کے ساتھ کوئی بڑی جمعیت ہے قصر کے اندر قلعہ بند ہو گیا اور مسلم نے بنی مراد کی ایک جماعت کو لیے ہوئے قصر کا محاصرہ کر لیا۔ رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی آ گئے یہاں تک کہ مسلم

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۰۷

کے پاس کافی جمعیت ہو گئی اور ظہر سے شام تک برابر لڑائی ہوتی رہی[1]

موجودہ جمعیت کو جو مسلم کے ساتھ محاصرہ میں شریک تھی مختلف
قبائل کے مخلوط مجمع پر مشتمل سمجھنا چاہیے اور قبائل کے روح رواں شیوخ
واشراف قبائل ہوتے ہیں جو حکومت کے ہوا خواہ اور پابند فرمان تھے
اور ابن زیادہ نے بروقت پیش بندی یہ کی تھی کہ آج صبح سے شیوخ
اشراف کو بلا کر اپنے پاس زیر حراست رکھ لیا تاکہ اُن
سے حسب موقع کام نکالا جا سکے۔ باوجودیکہ ابن زیاد
کے پاس محل میں اس وقت کوئی فوج نہیں تھی
بلکہ قصر حکومت میں صرف تیس[3] پولیس کے سپاہی تھے اور
بیس[2] آدمی اُس کے مخصوصین اور روسائے قبائل میں سے (۲) یا زیادہ سے
زیادہ دو سو آدمی (۳) موجود تھے، اس لیے وہ کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا
تھا لیکن ایک طرف اُس نے یہ کوشش کی کہ قصر کا دروازہ کھلنے نہ پائے[4]
دوسرے کچھ آدمی ادھر اُدھر بھیج کر باہر سے سپاہی اکٹھا کر کے یہ انتظام
کیا کہ شہر کی ناکہ بندی ہو جائے یعنی چوراہوں اور عام راستوں پر پہرے
بیٹھ جائیں کہ کوئی شخص مسلم کی مدد کو نہ آ سکے اور صورت واقعہ کی بنا پر
یہ امر لازمی تھا کہ مسلم کی مدد کو آنے والے مجتمع حیثیت سے کسی لشکر کے ساتھ
نہ آتے بلکہ اکا دکا جس کو خبر ہوتی جاتی وہ تنہا یا اپنے بھائی بندوں کے
ساتھ مسلم کی شرکت کے لیے آتا اور وہ فوراً گرفتار ہو جاتا تھا چنانچہ
عبد الاعلیٰ بن یزید کلبی اپنے گھرانے کے کچھ نوجوانوں کو ساتھ لیے

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۰۸ ارشاد صفحہ ۲۱۸ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۲۰۸ ارشاد صفحہ ۲۱۹ (۳) الاخبار الطوال صفحہ ۲۳۹
(۴) طبری ج ۶ صفحہ ۲۰۸۔

آرہے تھے جن کو کثیر بن شہاب نے گرفتار کر لیا اور محلہ بنی عمارہ کی طرف سے عمارہ بن صلخب ازدی نے ہتھیار جسم پر آراستہ کر کے چاہا تھا کہ مسلم کے پاس آئیں لیکن محمد بن اشعث نے گرفتار کر لیا (۱) یہ دونوں جانباز مسلم و ہانی کی شہادت کے بعد پسر زیاد کے حکم سے قتل کر ڈالے گئے (۲)
اس طرح مسلم سے مختلف اطراف و جوانب کی مدد قطع ہو گئی چنانچہ حبیب بن مظاہر، مسلم بن عوسجہ اور ابو ثمامہ صائدی ایسے خاص لوگ تک آج جناب مسلم کے پاس پہنچنے سے قاصر رہ گئے۔ اس کے علاوہ اشراف قبائل کو مجمع کے منتشر کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہ لوگ دار الامارہ کے بالاخانہ پر چڑھ گئے اور انھوں نے اپنے قبیلہ والوں کو پکار پکار کر ہمدردانہ انداز میں قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ عنقریب مرکزی حکومت شام کی جانب سے بہت بڑی فوجیں آنے والی ہیں اور اس صورت میں تمہارے جان و مال و اولاد سب تلف ہو جائیں گے۔ دمشق سے فوجیں آنے کی خبر ہر طرف پھیلا دی گئی جس کے بعد عالم یہ ہوا کہ عورتیں اپنے گھروں سے نکل نکل کر اپنے باپ بھائی کے پاس آتی اور کہتی تھیں کہ چلو واپس چلو۔ دوسرے لوگ کافی ہیں۔ باپ یا بھائی اپنے بیٹے بھائی کے پاس آتا اور کہتا تھا کہ ارے کل دمشق سے لشکر آجائیگا تو پھر تم کیا کرو گے، چلو لڑائی سے ہاتھ اٹھاؤ اور مجبور کر کے اسے اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام ہوتے ہوتے صرف تیس ۳۰ آدمی حضرت مسلم کے پاس رہ گئے۔ آپ نے مسجد میں جا کر نماز مغرب پڑھی نماز کے ختم ہونے کے بعد جب آپ باہر نکلے تو رفتہ رفتہ وہ بقیہ تیس ۳۰ بھی چلے گئے (۳)

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۰۶ (۲) طبری ج ۶ ص ۲۱۲ (۳) الاخبار الطوال ص ۲۴۲۔

اب مسلم تنہا بازاروں میں پھرنے لگے اور کوئی آشنا تک نہ تھا کہ آپ کو رستا بتا دیتے۔ آپ تاریکی شب میں یونہی چلے جا رہے تھے یہاں تک کہ قبیلۂ کندہ میں پہنچ گئے (۱) اس قبیلہ کی ـــــ عورت طوعہ جو پہلے محمد بن اشعث کی کنیز تھی اور اُس کے آزاد کرنے کے بعد اسید حضرمی کے نکاح میں آئی جس سے ایک لڑکا بلال پیدا ہوا۔ یہ کہیں گیا ہوا تھا اور طوعہ گھر کے دروازہ پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جناب مسلم نے اُسے دیکھ کر بعد سلام پینے کو پانی مانگا عورت خدا ترس تھی۔ وہ گئی اور پانی لائی۔ جناب مسلم بیٹھ گئے اور پانی پیا۔ وہ برتن رکھنے گھر میں گئی۔ آئی تو دیکھا کہ یہ پھر بھی بیٹھے ہیں۔ اُس نے کہا "آپ پانی تو پی چکے۔ اب اپنے گھر جائیے" مسلم خاموش رہے۔ اُس نے جب دو بارہ اور سہ بارہ کہا تو مسلم نے جواب دیا کہ "اے کنیز خدا میرا اس شہر میں کوئی گھر نہیں ہے۔ کیا تم مجھے پناہ دے کر ثواب حاصل کر سکتی ہو۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد میں کبھی اس کا معاوضہ تمہارے ساتھ کر سکوں"۔ اُس نے حیران ہو کر پوچھا "آپ ہیں کون اور واقعہ کیا ہے"۔ فرمایا "میں مسلم بن عقیل ہوں۔ یہاں لوگوں نے میرے ساتھ غداری کی۔ مجھ سے نصرت کے وعدے کیے اور اب میرا ساتھ چھوڑ دیا"۔ اُس نے کہا "اچھا آپ مسلم ہیں"؟ کہا "ہاں میں وہی ہوں"۔ یہ سننا تھا کہ وہ آپ کو اپنے گھر میں لے گئی اور مکان کے ایک مخصوص کمرے میں آپ کے لیے فرش بچھا دیا اور کھانا حاضر کیا مگر آپ نے کھانا نوش نہیں کیا۔ تھوڑی دیر میں اُس کا لڑکا آیا اور اُس نے ماں کو ایک کمرے میں بار بار آتے جاتے دیکھ کر سبب دریافت کیا اور اخفاء کی کوشش محسوس کر کے زیادہ کد کرنے لگا یہاں تک کہ طوعہ کو واقعہ کا اظہار کرنا پڑا اس تاکید

(۱) الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۰

کے ساتھ کہ اس کا کسی سے اظہار نہ کرنا۔ وہ سن کر خاموش ہو گیا اور رات گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ (۱)

اُدھر ابن زیاد نے جب دیکھا کہ خطرہ بظاہر بالکل نہیں رہا تو اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ سائبانوں میں دیکھیں۔ کہیں ابن عقیل کے ساتھ والے سائبانوں میں چھپے نہ ہوں۔ پورے طور اطمینان کر لینے کے بعد ابن زیاد نے عمرو بن نافع کو حکم دیا کہ شہر میں اعلان کر دے کہ آج عشا کی نماز کے لیے ہر شخص کو مسجد میں آنا ضروری ہے۔ کوئی شخص نماز کے وقت اپنے گھر میں نہ رہے ورنہ اُس کے جان و مال کی ذمہ داری امیر کے سر نہ ہو گی۔ تھوڑی دیر میں مسجد کے اندر لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ اقامت کہی گئی اور پسر زیاد نے اپنے داہنے بائیں محافظ کھڑے کر دیئے اس کے بعد نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد منبر پر جا کر تقریر کی کہ ابن عقیل نے جو مخالفت کا ہنگامہ اُٹھا رکھا ہے۔ تم نے دیکھا۔ جس کے گھر میں ہم ابن عقیل کو پائیں گے اُس کے جان و مال کی ذمہ داری ہم پر نہیں۔ اور جو انھیں ہمارے پاس لائیگا اُس کو اُن کی دیت (خون بہا) دی جائیگی۔ اس کے بعد حصین بن نمیم کو حکم دیا کہ تمام شہر کی خانہ تلاشی کرے اور ابن عقیل کا پتہ لگائے اور لوگوں کو عمرو بن حریث کی ذمہ داری پر چھوڑ کر خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ (۲)

طوعہ کا لڑکا بلال صبح ہوتے ہی محمد بن اشعث کے نوعمر لڑکے عبدالرحمن کے پاس گیا اور اُسے مسلم کے اپنے گھر میں ہونے کی اطلاع دی اور وہ فوراً اپنے باپ کے پاس جو ابن زیاد کے دربار میں جا چکا تھا، پہونچا اور اس کے ذریعہ

---

(۱) طبری ۶ صفحہ ۲۰۹-۲۱۰ (۲) الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۰

سے ابن زیاد کو مطلع کیا (۱) ابن زیاد نے محمد بن اشعث کی سرکردگی میں مسلم کی گرفتاری کے لیے فوج روانہ کردی حضرت مسلم نے جو گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنی سمجھ گئے کہ فوج میری گرفتاری کے لیے آئی ہے تلوار لے کر حجرے سے باہر نکلے۔ اتنی دیر میں فوجی گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ آپ نے حملہ کیا اور ایسا سخت کہ دشمنوں کو گھر سے باہر نکال دیا۔ وہ دوبارہ ہجوم کر کے اندر گھسے اور آپ نے دوبارہ انہیں باہر کر دیا۔ بے شک اس حملے میں بکر بن حمران احمری کی تلوار سے اُن کے اوپر کا لب قطع ہو گیا۔ اور نیچے کے لب پر بھی زخم آگیا اور دو دانت شکستہ ہو گئے۔ پھر بھی دشمنوں کو یہ یقین ہو گیا کہ مسلم پر یوں فتح پانا مشکل ہے لہٰذا وہ مکان کی چھت پر چڑھ گئے اور پتھر مارنے لگے۔ اس کے علاوہ وہ سینٹھوں کے مٹھے آگ سے جلا کر اوپر سے پھینکنے لگے۔ جناب مسلم نے یہ بزدلانہ طریقۂ جنگ دیکھا تو آپ تلوار کھینچے ہوئے مکان سے باہر کوچہ میں آگئے۔ محمد بن اشعث نے پکار کر کہا کہ آپ کے لیے امان ہے۔ خواہ مخواہ تلوار نہ چلائیے۔ آپ نے جنگ جاری رکھی اور رجز پڑھنے لگے جس کا مضمون یہ تھا کہ "میں نے قسم کھائی ہے، نہ قتل ہونگا مگر آزادی کی حالت میں اگرچہ موت ناگوار چیز ہے مگر بہر حال وہ ایک نہ ایک دن تو ہر شخص کے لیے ضروری ہے مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں مجھ سے جھوٹ نہ بولا جائے۔ اور دھوکا نہ دیا جائے"، محمد بن اشعث نے کہا کہ "نہیں، آپ سے جھوٹ نہیں کہا جائے گا اور نہ دھوکا دیا جائے گا۔ اطمینان رکھیے" مسلم جنگ کر کے تھک چکے تھے اور زخموں

(۱) الاخبار الطوال صـ۲۱۳ (۲) طبری ج ۶ صـ۲۱۱ - ارشاد صـ۲۲۲

سے مجبور تھے۔ اُنھوں نے پوچھا "کیا واقعی مجھے امان ہے؟" اُس نے کہا "ہاں
آپ امان میں ہیں" جتنے محمد بن اشعث کے ساتھی تھے اُن سب نے بھی
امان کا وعدہ کیا سوا ایک عمرو بن عبید اللہ بن عباس سلمی کے جس نے
کہا میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا اور یہ کہکر وہ الگ ہٹ گیا۔
مسلم نے کہا دیکھو تم نے مجھے امان دی ہے اس لیئے میں تلوار اپنی
نیام میں رکھتا ہوں اور اگر تم امان نہ دیتے تو میں کبھی اپنے کو تمہارے
حوالے نہ کرتا۔ اتنی دیر میں ایک مرکب لایا گیا جس پر مسلم کو سوار کیا
اور سپاہیوں نے گرد حلقہ کر کے آپ کی تلوار کمر سے نکال لی۔ یہ ہو
کہ مسلم کا دل ٹوٹ گیا اور کہا یہ پہلی غداری ہے۔ محمد بن اشعث نے
کہا "مجھے اُمید ہے کہ تمہیں کوئی خطرہ پیش نہ آئیگا"، مسلم نے کہا۔ "اچھا
تو بس ایک اُمید ہی ہے اور امان کا وعدہ تمہارا کیا ہوا؟ انا للہ وا
الیہ راجعون" یہ کہہ کر رونے لگے۔ عمرو بن عبید اللہ بن عباس
سلمی جس نے پہلے ہی وعدۂ امان سے انکار کیا تھا کہنے لگا۔

"جو ایسی مہم کے لیے کھڑا ہوا ہو جس کے لیئے تم کھڑے ہوئے تھے
اُسے خطرہ دیکھ کر رونا تو نہیں چاہیئے"۔ مسلم نے کہا "واللہ میں
اپنے لیے نہیں روتا۔ میں تو حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں کے لیے
روتا ہوں جو میرے خط کو دیکھ کر کوفہ کی طرف روانہ ہو چکے
ہونگے"۔ پھر آپ محمد بن اشعث کی طرف متوجہ ہوئے۔ کہا "اے اللہ
کے بندے! مجھے یقین ہے کہ تم مجھے امان دلوانے سے قاصر رہو گے۔
اب تم اتنا کرنا کہ ایک قاصد حسینؑ کے پاس بھیجدینا جو میری
طرف سے اُن سے جا کر کہدے کہ میں تو دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار

ہوں اور یقین ہے کہ شام ہونے کے پہلے تک قتل ہو چکو نگا۔ مگر آپ ادھر
آنے کا قصد نہ کیجئے اور اہل کوفہ کے فریب میں نہ آیئے۔ اُن کے تمام
وعدے بالکل غلط اور قول قرار جھوٹے ہیں"۔ ابن اشعث نے وعدہ
کیا کہ "میں ضرور قاصد روانہ کردوں گا"۔ اس کے بعد محمد بن اشعث جناب
مسلم کو لے کر دار الامارہ کے دروازہ پر پہونچا اور پہلے خود اجازت
لے کر ابن زیاد کے پاس گیا۔ اُس سے تمام جنگ کی کیفیت اور پھر
وعدۂ امان پر مسلم کو ساتھ لانے کا تذکرہ کیا۔ ابن زیاد نے کہا "امان
دینے والے تم کون تھے؟ ہم نے تمہیں کیا اس لیے بھیجا تھا کہ تم انھیں
امان دو۔ ہم نے تو اس لیے بھیجا تھا کہ انھیں ہمارے پاس لے آؤ"۔
ابن اشعث میں اب کہاں جرأت تھی کہ وہ اس کے بعد کچھ کہتا۔ خاموش
ہو رہا (۱) اس وقت دار الامارہ کے دروازہ پر بہت سے لوگ اجازت
حضوری کے انتظار میں موجود تھے جن میں عمارہ بن عقبہ۔ عمرو بن
حریث۔ مسلم بن عمرو باہلی اور کثیر بن شہاب مخصوص لوگ تھے۔ اور
ایک صراحی ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی دروازے کے قریب رکھی
ہوئی تھی جناب مسلم بہت پیاسے تھے۔ انھوں نے کہا "تھوڑا سا پانی
مجھے پلا دو"۔ مسلم بن عمرو نے بڑے سخت الفاظ میں پانی پلانے سے
انکار کیا مگر عمرو بن حریث نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ وہ مسلم کو پانی پلا
دے۔ اُس نے گلاس پانی سے بھر کر مسلم کے سامنے پیش کیا مگر جناب
مسلم نے جب پانی پینا چاہا تو منہ سے خون بہنے لگا اور پانی کو رنگین
کردیا۔ دو مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ تیسری دفعہ دو دانت ٹوٹ کر گلاس

---

(۱) طبری ج ۶ صہ ۲۱۱

میں گر پڑے۔ جناب مسلم نے مایوس ہو کر گلاس ہاتھ سے دے دیا اور کہا معلوم ہوتا ہے پانی میری قسمت سے اُٹھ چکا ہے۔" اتنی دیر میں ابن زیاد کا آدمی آیا اور مسلم کو اندر جانے کے لیے کہا۔ جب آپ ابن زیاد کے پاس پہونچے تو امیر کہکر اُنکے سلام نہیں کیا۔ ابن زیاد نے کہا مسلم اب تم بچ نہیں سکتے۔ ابھی قتل کیے جاؤ گے۔" جناب مسلم نے کہا "میں اس کے لیے تو تیار ہی ہوں مگر مجھے اتنا موقع دیا جائے کہ میں کسی اپنے شناسا سے جو یہاں ہو کچھ وصیت کر لوں" اُس نے کہا "اچھا جس سے چاہے وصیت کر دو" مسلم نے گرد و پیش نظر ڈالی تو عمر بن سعد کو پہچانا۔ آپ نے اُس سے کہا کہ تم قریش کے خاندان سے ہو، مجھے اس وقت تم سے کچھ راز کی باتیں کہنا ہیں، ذرا انھیں سن لو" حکومت وقت کا خوشنودی سننے کے لیے تیار نہ ہوا جس پر خود ابن زیاد نے کہا کہ "آخر سن لینے میں تمہارا کیا حرج ہے" اس پر عمر سعد اُٹھا اور مسلم کے ساتھ تھوڑی دور آگے بڑھ کر ایک ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں ابن زیاد کی نظر دونوں پر پڑ رہی ہو۔ جناب مسلم نے کہا "مجھے ایک بات یہ کہنا ہے کہ میں جب سے کوفہ میں آیا ہوں سات سو درہم کا مقروض ہو گیا ہوں۔ تم میرے بعد میری تلوار اور زرہ فروخت کر کے یہ قرضہ ادا کر دینا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرے قتل ہونے کے بعد میری لاش ابن زیاد سے مانگ لینا اور اُسے دفن کر دینا۔ تیسرے یہ کہ امام حسینؑ کے پاس کسی کو بھیج کر اُس کے ذریعہ سے میرے واقعہ کی اطلاع کرا دینا تاکہ وہ واپس چلے جائیں اور اہل کوفہ کے فریب میں مبتلا نہ ہوں۔"

مسلم نے بطور راز یہ باتیں کہیں تھیں مگر بدعہد عمر سعد نے ابن زیاد کے پاس آکر کہا آپ جانتے ہیں مسلم نے مجھ سے کیا کہا؟ یہ یہ باتیں اُنھوں نے مجھ سے کی ہیں۔ یہ ایسا شرمناک رویہ تھا جسے ابن زیاد نے بھی بُرا جانا۔

عرب کی یہ مثل زبان پر جاری کی کہ لا یخونك الامین ولکن قد یؤتمن الخائن " امانتدار آدمی کبھی خیانت نہیں کرتا مگر کبھی کبھی غلطی سے خائن کو امانتدار بنا دیا جاتا ہے "(۱) اس کے بعد اُس نے ہر وصیت کے بارے میں اپنا فیصلہ سنایا۔ کہا " تمہارے مال سے ہمیں مطلب نہیں وہ فروخت ہو کر تمہارا قرضہ ادا کر دیا جائے اور حسین کے بارے میں یہ ہے کہ وہ اگر ہماری طرف نہ آئے تو ہمیں اُن سے کوئی مطلب نہیں ہے مگر لاش اُس کے بارے میں ہم کوئی وعدہ کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ تم نے ہماری مخالفت کی اور رعایا میں انتشار پیدا کیا لہٰذا ہم تمہاری لاش کے متعلق کسی احترام کے ذمہ دار نہیں ہیں "(۲)

اس وصیت اور اُس کے جواب کے بعد جو گفتگو جناب مسلم اور ابن زیاد میں ہوئی ہے وہ خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہے۔ دیکھنا چاہئے کہ مسلم پر جو بغاوت کا الزام عائد کیا جاتا ہے اُس کے بارے میں مسلم کیا جواب دیتے ہیں اور اپنے کوفہ آنے کی نوعیت کیا بتلاتے ہیں۔ ابن زیاد۔ ابن زیاد نے کہا " ابن عقیل! تم یہاں آئے تھے لوگوں میں تفرقہ ڈالنے اور آپس میں فساد کرانے کہ ایک جماعت دوسری جماعت پر حملہ کرے اور خانہ جنگی ہو " مسلم نے جواب دیا اور وہ جواب جس نے آخر تک حسینی مقاومت کی نوعیت کو ظاہر کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ " نہیں۔ میں اس لیے نہیں آیا تھا بلکہ اس ملک والوں نے یہ ظاہر کیا کہ تمہارے باپ نے اُن کے نیک آدمیوں کو قتل کیا اور اُن کے خون بہائے اور اُن میں (اسلام کی سادگی کو مٹا کر) وہ افعال و اعمال رائج کیے جو کسریٰ و قیصر کی سنت میں داخل تھے تو ہم آئے

---

(۱) الاخبار الطوال صد ۲۴۱ - ۲۴۲ (۲) طبری ج ۶ صد ۲۱۲

اس لیے کہ اُن کے اخلاق و عادات کی اصلاح کریں اور اُن کو عدالت و انصاف اور تعلیمات قرآن پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیں"(۱)

واقعۃً چونکہ مسلم کا کوئی طرزِ عمل اُن کے اس بیان کے خلاف ظاہر بھی نہیں ہوا تھا لہٰذا یہ صفائی بغاوت کے الزام سے اُن کے بری ہونے کے لیے کافی تھی مگر استبداد کے سامنے دلیل و برہان کام نہیں دیا کرتا۔ ابن زیاد نے حکم دیا کہ اُنھیں قصر کے بالاخانہ پر لے جایا جائے، وہاں اُن کی گردن قلم کیجائے اور پھر سر کے ساتھ ہی جسم کو نیچے گرا دیا جائے اور اس کے لیے وہی بکر بن حمران احمری (۲) جس کی تلوار سے جناب مسلم کے لب و دہن پر زخم آیا تھا نامزد کیا گیا۔

جناب مسلم انتہائی صبر و سکون سے تکبیر، استغفار اور صلوات کے اوراد کے ساتھ دار الامارہ کے کوٹھے پر تشریف لے گئے اور اُن کے سر کو جدا کر کے جسم کو قصر سے نیچے پھینک دیا گیا (۳) روز سہ شنبہ ۸ ر ذی الحجہ سنہ ۶۰ھ جناب مسلم نے جنگ شروع کی (۴) اور روز چہارشنبہ ۹ ر ذی الحجہ کو شہادت پائی (۵)

اس کے بعد سے شہر میں خوف و دہشت کی عملداری اور رعب و ہیبت کا پورا دور دورہ تھا۔ لوگ گھروں سے نکلنا خطرناک سمجھتے تھے، اس لیے ہر طرف سناٹا تھا اور ایک کو ایک کی خبر نہ تھی۔

انتہا یہ تھی کہ وہی ہانی بن عروہ جن کے ہمراہ رکاب ۱۲ ہزار مسلح سوار ہوتے تھے اور جن کے قتل کر دیے جانے کی غلط خبر پر دار الامارہ کھنچی ہوئی تلواروں کے حلقہ میں آ گیا تھا رسیوں میں جکڑ کر بازار میں لائے جا رہے تھے اور وہاں آواز دے رہے تھے کہ کہاں ہیں میرے قبیلۂ بنی مذحج کے بہادر! ہائے افسوس کہ اس وقت

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۱۲ ارشاد ص ۲۲۵۔ (۲) دینوری نے اس کا نام احمر بن بکیر لکھا ہے (الاخبار الطوال ص ۲۴۲) (۳) طبری ج ۶ ص ۲۱۳۔ ارشاد ص ۲۲۶ (۴) طبری ج ۶ ص ۲۱۵ (۵) ارشاد ص ۲۲۲ دینوری نے شہادت جناب مسلم کی تاریخ سہ شنبہ ۳ ر ذی الحجہ سنہ ۶۰ھ درج کی ہے (الاخبار الطوال ص ۲۴۲) یہ درست نہیں معلوم ہوتی۔

بنی مذحج مجھے نظر نہیں آتے لیکن کوئی متنفس بھی ان کی طرف رخ کرتے نظر نہ آتا تھا۔

یہاں تک کہ ابن زیاد کے ترکی غلام نے اپنی تلوار سے اُن کے سر و تن میں جدائی کر دی (۱)

ابن زیاد نے مسلم و ہانی کے سرہائے بریدہ ہانی بن ابی حیہ ہمدانی اور زبیر بن اروح تیمی کے ہاتھ واقعہ کی مختصر روئداد کے ساتھ روانہ کیے اور ان دونوں نے تفصیلات جا کر زبانی بھی بیان کیے۔ یزید نے جواباً اس کارنامہ پر بڑی شاباشی دی اور لکھا کہ تم نے وہی کیا جس کی ہمیں تم سے اُمید تھی اب خود حسینؑ بن علیؑ کے بارے میں تمہاری کارگزاری دیکھنا ہے (۲)

---

(۱) طبری ج ۶ صہ ۲۱۳ - ۲۱۴ - ارشاد صہ ۲۲۶ (۲) الاخبار الطوال صہ ۲۴۲

انیسواں باب

مکہ سے کربلا تک

سفر امام حسینؑ۔ منازل سفر اور کربلا میں ورود

کوفہ میں انقلاب، مسلم وہانی کی شہادت یہ سب کچھ ہو گیا مگر ظاہر ہے کہ اس سب کی اطلاع بر وقت مکہ میں کیونکر پہونچ سکتی تھی حضرت امام حسینؑ کو مسلم کا خط پہونچ چکا تھا کہ یہاں تشریف لائیے۔ سب آپ کی اطاعت کے لیے تیار ہیں۔ یہ خط جناب مسلم نے عابس بن ابی شبیب شاکری کے ہاتھ (۱) اپنی شہادت سے ستائیس دن پہلے ۱۲ ذی القعدہ کو لکھا تھا (۲) اس خط کے پہونچنے کے بعد آپ کے لیے کوفہ کا سفر اختیار کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ پھر بھی عام حالات میں اتنی جلدی کی ضرورت نہیں تھی کہ آپ حج کے دو ایک دن باقی رہنے کے باوجود حج کو ترک فرما دیں اور مکہ سے نکل کھڑے ہوں۔ یہ غیر متوقع صورت یقینی طور پر نہایت اہم ہنگامی اسباب کا پتہ دیتی ہے۔

آپ کی افتاد طبیعت اور ذوق عبادت کا لازمی تقاضا بھی یہ تھا کہ آپ اس سال کے حج کو جو آپ کی زندگی میں آخری تھا مکمل فرما کر روانگی کا ارادہ کرتے لیکن نہ معلوم کیا ہوا کہ حج کی تکمیل میں ڈیڑھ دن باقی تھے کہ آپ نے حج کو عمرہ سے بدل کر مکۂ معظمہ سے روانگی اختیار فرمائی۔

اس کے اسباب عام طور پر لوگوں کے سامنے کچھ نہ تھے کیونکہ حرم الٰہی کے

---

(۱) طبری ج ۶ صـ ۲۱۱ (۲) ارشاد صـ ۲۳

اندر کوئی فوج ولشکر نہ تھا جسے سب دیکھتے مگر حاجیوں کے لباس میں فوج کے سپاہی آئے ہوئے تھے اور انھیں یہ ہدایت تھی کہ حسین جس حال میں بھی ہوں اُن کو گرفتار کر لو۔ یہ راز اُس وقت کھلا جب آپ مکہ سے باہر آ چکے تھے اور فرزدق شاعر نے آپ سے راستے میں ملاقات کی اور پوچھا کہ "فرزند رسول! اتنی جلدی کس لیے کہ حج بھی نہ ہو سکا؟" امام نے جواب دیا کہ "اگر میں اتنی جلدی نہ کرتا تو میں گرفتار کر لیا گیا ہوتا" (۱) بس یہ خبر وہ تھی جس نے امام حسین کو عراق کی طرف اس قدر تعجیل کے ساتھ روانگی پر مجبور کر دیا۔

نتیجۂ آخر امام کے پیش نظر تھا یعنی شہادت جس پر آپ کی وہ تقریر گواہ ہے جو آپ نے مکۂ معظمہ سے روانگی کے وقت فرمائی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ "موت فرزند آدم کے گلے کا ہار ہے اور مجھے اپنے اسلاف کی ملاقات کا اشتیاق ہے اتنا ہی جتنا یعقوب کو یوسف سے ملنے کا اشتیاق تھا اور میرے لیے بہت اچھی ہے وہ جگہ جہاں میں کشتہ ہو کر گروں گا۔ گویا میری آنکھوں میں پھر رہا ہے وہ سماں کہ میرے جوڑ بند کو صحرائی درندے (۲) جدا کر رہے ہیں کوئی چارہ کار نہیں اُس دن سے جو خط تقدیر میں گزر چکا۔ خدا کی مرضی میں ہم اہلبیت کی مرضی ہے۔ ہم اُس کے امتحان پر صبر کرتے ہیں اور صابروں کے اجر کو حاصل کرتے ہیں۔ رسول سے ان کے جسم کے ٹکڑے الگ نہیں ہو سکتے۔ جو شخص ہمارے ساتھ اپنی جان کی قربانی پر آمادہ اور خدا سے ملاقات پر تیار ہو، وہ ہمارے ساتھ سفر کرے۔ میں کل صبح کو انشاء اللہ روانہ ہو جاؤں گا" یہ تھی وہ تقریر جو آپ نے گرد و پیش کے لوگوں کے سامنے کی تھی اس رات کو جس کی صبح ہوتے ہوتے آپ مکہ سے روانہ ہو گئے۔ اس کے علاوہ ایک واقعہ یہ ہے کہ اثنائے سفر میں آپ ہر منزل پر جناب یحییٰ اور ان کی شہادت کو یاد کرتے تھے کہ دنیا کی بےقدری کے لیے اتنا اللہ کے نزدیک یہ کافی ہو کہ (۳) اس دنیا میں یحییٰ بن زکریا کا سر قلم ہو کر بنی اسرائیل کے زناکار کے سامنے

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۱۸ (۲) یعنی دشمنان انسانیت

بطور تحفہ بھیجا گیا (۱)

یہ بھی حقیقت میں اپنے مستقبل کی طرف ایک اشارہ ہی تھا جو آپ بار بار فرما رہے تھے۔ پھر بھی آپ کے لیے اپنے عمل کو امکانی تحفظات کے حدود سے آگے بڑھنے دینا روا نہیں تھا۔ آپ کے لیے "مکہ" سے فوراً علیحدگی اختیار کرنا اُن خطرات کی بنا پر جو اس وقت یہاں پیدا ہو گئے تھے لازمی قرار پا چکا تھا۔ اس کے بعد آپ کہاں جاتے؟ عقلاً اُسی جگہ کہ جہاں کے لوگ انتہائی اصرار کے ساتھ آپ کو بلا رہے تھے۔

اس صورت میں کسی شخص کا یہ پہلو آپ کے سامنے لانا کہ اس میں جان کا خطرہ ہے تحصیل حاصل اور فضول تھا۔

جان کا خطرہ تو تھا ہی مگر اس خطرہ کے ہوتے ہوئے کسی ایسی طرف جانا قرین مصلحت ہو سکتا تھا جہاں کا جانا "ناخواندہ مہمان" کی حیثیت رکھتا ہوتا یا ایسی جگہ جہاں کے لوگ الحاح وزاری کے ساتھ دعوت دے رہے تھے۔

خطرہ کے معنی کیا ہو سکتے تھے؟ یہی تو کہ جان جائے گی مگر جان تو جانا ناگزیر بھی پھر یہ جان ایک انسانی اور مذہبی فرض کی ادائی کے سلسلہ میں میں کیوں نہ جاتی جس کا نام تھا وعدہ وفائی، طالبان ہدایت پر اتمام حجت اور خلق خدا کی فریاد رسی۔ اسی لیے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔۔

۔۔۔ حضرت امام حسینؑ نے اُن لوگوں کے خیال، کی کبھی رد نہیں کی جو اہل کوفہ پر بے اعتمادی کا اظہار کرتے تھے اور یہ کہا کہ نہیں مجھے اُن سے اُمید ہے کہ وہ اب کی اپنی بات پر قائم رہیں گے مگر اسی کے ساتھ آپ نے ہمیشہ

---

(۱) ارشاد صفحہ ۲۶۸

اپنی روانگی کو اُن کی طرف ضروری بتلایا جیسا کہ فرزدق سے گفتگو میں جس کا تذکرہ ابھی آئیگا آپ نے فرمایا۔ خانۂ کعبہ میں گرفتاری کا جو خطرہ تھا، اُس کا ایک حد تک یقینی قرینہ سامنے آگیا اُس وقت جب آپ کی مکہ سے روانگی کے موقع پر حاکم مکہ عمرو بن سعید بن العاص کی طرف سے ایک فوجی دستہ نے یحییٰ ابن سعید کی قیادت میں بیرون شہر آکر آپ سے مزاحمت کی اور آپ کو واپس لے جانا چاہا، حضرت نے واپس جانے سے انکار کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ طرفین میں تھوڑی دیر آویزش بھی ہوئی مگر امام حسینؑ کے ساتھ والے پوری بہادری کے ساتھ مقابل جماعت کی مزاحمت کو رد کرنے پر تیار تھے اس لیے اُن لوگوں کو ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا اور قافلہ روانہ ہوگیا (۱) دینوری نے لکھا ہے کہ خود عمرو بن سعید نے اس اندیشہ سے کہ صورت حال کچھ نازک نہ ہو جائے اپنے پولیس آفیسر کو واپس آنے کی ہدایت بھیجدی (۲) یہ سہ شنبہ ۸ ذی الحجہ ۶۰ھ کا واقعہ ہے اور اسی روز کوفہ میں ابن زیاد کی فوج سے جناب مسلم بن عقیل کا مقابلہ ہو رہا تھا اور دوسرے دن جبکہ وہ شہید ہوئے، حضرت امام حسینؑ مکہ سے نکل کر وادی عرب میں راستا طے فرما رہے تھے (۳)

آپ کے قیام مکہ کے دوران میں علاوہ آپ کے خاص عزیزوں کے جو مدینہ سے ساتھ آئے تھے کچھ مخصوص افراد اہل حجاز میں سے اور کچھ اہل بصرہ میں سے آپ کی خدمت میں پہنچ گئے تھے۔ اب

---

(۱) طبری ۶ صفحہ ۲۱۷ ۔ ۲۱۸ ارشاد صفحہ ۲۲۹ (۲) الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۴ (۳) ارشاد صفحہ ۲۲۸ دینوری کا بیان ہے کہ جس دن جناب مسلم کی شہادت ہوئی اُسی دن امام حسینؑ مکہ سے روانہ ہوئے (الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۳)

بطور تحفہ بھیجا گیا (۱)

یہ بھی حقیقت میں اپنے مستقبل کی طرف ایک اشارہ ہی تھا جو آپ بار بار فرما رہے تھے۔ پھر بھی آپ کے لیے اپنے عمل کو امکانی تحفظات کے حدود سے آگے بڑھنے دینا روا نہیں تھا۔ آپ کے لیے "مکہ" سے فوراً علیحدگی اختیار کرنا اُن خطرات کی بنا پر جو اس وقت یہاں پیدا ہو گئے تھے لازمی قرار پا چکا تھا۔ اس کے بعد آپ کہاں جاتے؟ عقلاً اُسی جگہ کہ جہاں کے لوگ انتہائی اصرار کے ساتھ آپ کو بلا رہے تھے۔

اس صورت میں کسی شخص کا یہ پہلو آپ کے سامنے لانا کہ اس میں جان کا خطرہ ہے تحصیل حاصل اور فضول تھا۔

جان کا خطرہ تو تھا ہی مگر اس خطرہ کے ہوتے ہوئے کسی ایسی طرف جانا قرین مصلحت ہو سکتا تھا جہاں کا جانا "ناخواندہ مہمان" کی حیثیت رکھتا ہوتا یا ایسی جگہ جہاں کے لوگ الحاح و زاری کے ساتھ دعوت دے رہے تھے۔

خطرہ کے معنی کیا ہو سکتے تھے؟ یہی تو کہ جان جائے گی مگر جان تو جانا ناگزیر تھی پھر یہ جان ایک انسانی اور مذہبی فرض کی ادائی کے سلسلہ میں کیوں نہ جاتی جس کا نام تھا وعدہ وفائی، طالبان ہدایت پر اتمام حجت اور خلق خدا کی فریاد رسی۔ اسی لیے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔

... حضرت امام حسینؑ نے اُن لوگوں کے خیال کی کبھی رد نہیں کی جو اہل کوفہ پر بے اعتمادی کا اظہار کرتے تھے اور یہ کہا کہ نہیں مجھے اُن سے اُمید ہے کہ وہ اب کی اپنی بات پر قائم رہیں گے مگر اسی کے ساتھ آپ نے ہمیشہ

(۱) ارشاد صفحہ ۲۶۰

اپنی روانگی کو اُن کی طرف ضروری بتلایا جیسا کہ فرزدق سے گفتگو میں جس کا تذکرہ ابھی آئیگا آپ نے فرمایا۔ خانہ کعبہ میں گرفتاری کا جو خطرہ تھا، اُس کا ایک حد تک یقینی قرینہ سامنے آگیا اُس وقت جب آپ کی مکہ سے روانگی کے موقع پر حاکم مکہ عمرو بن سعید بن العاص کی طرف سے ایک فوجی دستہ نے یحییٰ ابن سعید کی قیادت میں بیرون شہر آکر آپ سے مزاحمت کی اور آپ کو واپس لے جانا چاہا، حضرت نے واپس جانے سے انکار کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ طرفین میں تھوڑی دیر آویزش بھی ہوئی مگر امام حسینؑ کے ساتھ والے پوری بہادری کے ساتھ مقابل جماعت کی مزاحمت کو رد کرنے پر تیار تھے اس لیے اُن لوگوں کو ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا اور قافلہ روانہ ہوگیا (۱) دینوری نے لکھا ہے کہ خود عمرو بن سعید نے اس اندیشہ سے کہ صورت حال کچھ نازک نہو جائے اپنے پولیس آفیسر کو واپس آنے کی ہدایت بھیجدی (۲) یہ سہ شنبہ ۸ ذی الحجہ ۶۰ھ کا واقعہ ہے اور اسی روز کوفہ میں ابن زیاد کی فوج سے جناب مسلم بن عقیل کا مقابلہ ہو رہا تھا اور دوسرے دن جبکہ وہ شہید ہوئے، حضرت امام حسینؑ مکہ سے نکل کر وادی عرب میں راستا طے فرما رہے تھے (۳)

آپ کے قیام مکہ کے دوران میں علاوہ آپ کے خاص عزیزوں کے جو مدینہ سے ساتھ آئے تھے کچھ مخصوص افراد اہل حجاز میں سے اور کچھ اہل بصرہ میں سے آپ کی خدمت میں پہنچ گئے تھے۔ اب

---

(۱) طبری ۶ صـ۲۱۷ - ۲۱۸ ارشاد صـ۲۲۹ (۲) الاخبار الطوال صـ۲۴۴ (۳) ارشاد صـ۲۲۸ دینوری کا بیان ہے کہ جس دن جناب مسلم کی شہادت ہوئی اُسی دن امام حسینؑ مکہ سے روانہ ہوئے (الاخبار الطوال صـ۲۴۳)

یہ سب آپ کے ساتھ ساتھ روانہ ہوئے (۱)

مکہ سے کربلا تک کے سفر میں حضرت امام حسینؑ نے جن منزلوں میں قیام کیا تھا اُن کی تفصیل کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ جہاں تک تاریخی واقعات کی مدد سے ثابت ہوتا ہے اُن کی ترتیب واقعات کے ساتھ ساتھ حسب ذیل ہے:۔

(۱) **صفاح** | یہ مکہ معظمہ سے روانگی کے بعد پہلی وہ جگہ ہے جس کا نام ملتا ہے۔ یہاں قیام نہیں ہوا بلکہ رہ گزر ہی میں فرزدق بن غالب ــــ شاعر سے ملاقات ہوئی (۲) اور فرزدق نے کوفہ کی حالت بیان کی کہ لوگوں کے دل آپ کی طرف مگر تلواریں اُن کی بنی اُمیہ کے ساتھ ہونگی۔ آپ نے فرمایا "تم سچ کہتے ہو لیکن ہر بات اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور ہر دن وہ ایک نیا کرشمہ قدرت کا دکھاتا ہے۔ اللہ کی تقدیر اگر ہماری دلی خواہشوں کے مطابق ہو تو ہم اُس کا شکر کرینگے اور ادائے شکر کے لیے اُسی سے مدد کے طالب ہونگے اور اگر قضائے الٰہی ہمارے مطلب میں سدّ راہ ہوئی تو انسان کے لیے یہی کیا کم ہے کہ اُس کی نیت میں سچائی اور اُسکے ضمیر میں پارسائی ہو (۳)

اس کے معنی یہ ہوئے کہ مقصد نیک ہو اور نیت خیر، اس کے بعد "ہرچہ باداباد"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام حسینؑ کسی کے وعدوں پر اعتماد کرکے منزل عمل میں گام زن نہیں ہوئے تھے بلکہ محض اللہ کے بھروسے پر اُس کے عائد کردہ فرض کی تکمیل کے لیے امتحان گاہِ عمل میں آ گئے تھے۔

(۲) **تنعیم** | اس جگہ یمن کا ایک قافلہ آتا نظر آیا جس سے حضرت نے

(۱) ارشاد ص ۲۲۸ (۲) الاخبار الطوال ص ۲۴۵ (۳) طبری ج ۶ ص ۲۱۸ ارشاد ص ۲۲۸

کچھ اونٹ اپنے اسباب اور ساتھیوں کی سواری کے لیے کرایہ پر لیے اور ان کے مالکوں سے فرمایا کہ تم میں سے جو عراق تک جانا چاہے اُسے ہم پورا کرایہ دینگے اور پھر کچھ انعام بھی عطا کرینگے اور جو راستے سے واپس جانا چاہے گا اُسے ہم اُتنی دُور کا کرایہ دے کر واپس کر دینگے چنانچہ کچھ لوگ اُن میں سے حضرت کے ساتھ عراق تک جانے کے لیے تیار ہوئے (۱)

اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ سے آپ کی روانگی اچانک بغیر کسی تیاری کے ہوئی تھی اس لیے آپ اپنے ساتھیوں کے لیے مکہ معظمہ سے باربرداری اور سواری کا سامان بھی پورا مہیا نہیں فرما سکے تھے۔

اِسی منزل پر عبد اللہ بن جعفر اور یحیٰی بن سعید بن العاص نے امام سے آکر ملاقات کی واقعہ یہ تھا کہ جب امام حسینؑ مکہ معظمہ سے روانہ ہو رہے تھے اس وقت عبد اللہ بن جعفر مدینہ میں بھی ظاہری حالات کی بنا پر امام کا مدینہ سے آنا اس خطرہ کے ماتحت ہوا تھا کہ وہاں کے حاکم کو یزید کا یہ فرمان پہنچ چکا تھا کہ اگر حسینؑ بیعت نہ کریں تو ان کا سر روانہ کیا جائے اور اب مکہ سے روانگی اس اندیشہ کی وجہ سے ہو رہی تھی کہ وہاں کچھ لوگ حاجیوں کے لباس میں بھیج دیے گئے تھے تاکہ جس طرح ممکن ہو حسینؑ کو قتل کر ڈالیں یا گرفتار کر کے شام کی سمت بھیجدیں۔ اس موقع پر عبد اللہ بن جعفر نے عون و محمد اپنے دونوں فرزندوں کے ہاتھ امام کے نام یہ خط بھیجا کہ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ میرا خط دیکھتے ہی یہاں واپس آ جائیے کیونکہ اُس طرف جدھر آپ کا قصد ہے مجھے آپ کی ہلاکت اور آپ کے اہلبیت کے تباہ ہونے کا اندیشہ ہے اور اگر آپ دنیا سے اُٹھ گئے تو زمین کی روشنی رخصت ہو گئی کیونکہ آپ طالبان ہدایت کے

---

(۱) ارشاد صفحہ ۲۲۹

لیے نشانِ راہ اور مومنین کی اُمیدوں کا مرکز ہیں۔ سفر میں جلدی نہ کیجئے میں خود اس خط کے پیچھے آرہا ہوں۔ عون و محمد یہ خط لے کر امام کے قافلہ سے راستے میں جاکر ملحق ہوئے۔ اس کے بعد عبداللہ بن جعفر، حاکم مدینہ عمرو بن سعید بن العاص کے پاس گئے اور اُس سے گفتگو کر کے ایک امان کا پروانہ امام حسینؑ کے لیے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے (۱) عبداللہ کی خواہش کے مطابق عمرو بن سعید نے اُس پر مہر کی اور اپنے بھائی یحییٰ بن سعید کو عبداللہ کے ساتھ کیا۔ عبداللہ یحییٰ کے ساتھ اس تحریر کو لیے ہوئے مدینہ سے روانہ ہوئے اور راستے میں امام سے ملحق ہو کر تحریر آپ کے سامنے پیش کی۔ آپ خوب جانتے تھے کہ مرکزی حکومت کی پالیسی کے خلاف ایک مقامی حاکم کے امان نامہ کی کیا وقعت ہے۔ آپ نے عبداللہ بن جعفر کی رائے سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ مجھے اب یہاں قیام کرنا مناسب نہیں ہے اور عمرو بن سعید کے نام اس تحریر کا جواب لکھ کر اُن کے سپرد کیا۔ (۲) عبداللہ کچھ مجبوریوں کی وجہ سے اس سفر میں ساتھ نہ جا سکتے تھے۔ انھوں نے عون و محمد کو حضرت کے ساتھ رہنے کی ہدایت کی اور خود مدینہ واپس ہوئے (۳)

(۳) **ذاتِ عرق** شیخ مفیدؒ نے عبداللہ بن جعفر اور یحییٰ بن سعید کی واپسی کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حضرت امام حسینؑ تیزی کے ساتھ عراق کی سمت راہ قطع کرتے رہے یہاں تک کہ ذاتِ عرق میں پہنچ کر قیام فرمایا (۴)

(۴) **بطن الرمہ اور حاجر** "بطن الرمہ" ایک وادی کا نام تھا جس کے ایک مقام کا نام "حاجر" ہے۔ اس منزل سے آپ نے قیس بن مسہر کو جو اہل کوفہ کے فرستادہ آپ کے ساتھ ساتھ تھے اہل کوفہ

---

(۱) عمرو بن سعید مکہ اور مدینہ کا مشترک حاکم تھا۔ بظاہر جس وقت امام روانہ ہوئے اُس وقت عمرو بن سعید اور اُس کا بھائی یحییٰ بن سعید دونوں مکہ میں موجود تھے اور یحییٰ کی قیادت میں ایک دستے نے آکر امام کا راستہ روکا۔ اس کے بعد امام عراق کے راستے پر روانہ ہوئے اور یہ دونوں مدینہ چلے گئے وہاں عبداللہ بن جعفر نے عمرو بن سعید سے ملاقات کر کے یہ خط حاصل کیا اور یحییٰ بن سعید کے ساتھ امام سے منزلِ تنعیم پر آکے ملاقات کی (۲) طبری ج ۶ ص ۲۱۹ ارشاد ص ۲۳۰ (۳) ارشاد ص ۲۲۹

کے نام خط دے کر روانہ فرمایا (۱)، اس خط کا مضمون یہ تھا! " یہ خط ہے حسینؑ بن علیؑ کا برادران ایمانی و اسلامی کے نام۔ بعد سلام اور حمد الٰہی کے معلوم ہو کہ مسلم بن عقیل کے خط سے مجھے تمہارے حالات کی درستی اور میری نصرت پر تم لوگوں کی ہم آہنگی کا علم ہوا جس پر میں نے خدا سے دعا کی کہ وہ ہمارے معاملہ کو بہترین صورت پر انجام تک پہنچائے اور تم کو اس کے متعلق بہترین اجر عطا فرمائے۔ میں مکہ معظمہ سے روز شنبہ ۸ ذی الحجہ کو روانہ ہو گیا ہوں جب میرا خط تمہیں پہنچے تو انتظامات مکمل اور تیزی سے اپنا نظام درست کر لینا کیونکہ چند ہی روز میں میں تمہارے یہاں پہنچنے والا ہوں۔ انشاء اللہ والسلام (۲)

بعض کا قول ہے کہ اس خط کو عبد اللہ بن یقطر کے ہاتھ بھیجا تھا (۳)۔ اس خط کے مضمون اور نوعیت سے صاف ظاہر ہے کہ مکّہ سے نکلنے کے بعد یہ سب سے پہلی ایسی منزل تھی جہاں اطمینان کی سانس لی جا سکتی تھی۔ ورنہ اس خط کو پہلے ہی روانہ کر دیا جاتا۔

قیس اس خط کو لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے مگر جب قادسیہ پہنچے تو حصین کی فوج نے گرفتار کر لیا اور اُنھیں ابن زیاد کے پاس بھجوا دیا۔ ابن زیاد نے کہا کہ اگر جان بچانا چاہتے ہو تو منبر پر جا کر حسین بن علی کے خلاف تقریر کرو اور اُن کی مذمت بیان کرو۔ قیس یہ سن کر منبر پر چلے گئے۔ مجمع ہمہ تن گوش تھا کہ دیکھیں۔ حسینؑ کا قاصد حسینؑ کے خلاف کیا کہتا ہے مگر انھوں نے مقصدِ امام کی اشاعت کا یہ ایک ممکن موقع پیدا کیا تھا۔ حمد و ثنائے الٰہی کے بعد مجمع کو مخاطب کیا اور کہا:۔

" ایہا الناس! اس وقت خلق خدا میں بہترین شخص حسینؑ بن علیؑ ہیں

(۱) الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۵ (۲) الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۵ طبری ج ۵ صفحہ ۲۲۳ ارشاد صفحہ ۲۲۳ (۳) ارشاد صفحہ ۲۲۳

جو رسولؐ کی بیٹی حضرت فاطمہؑ کے فرزند ہیں۔ میں انھیں کا بھیجا ہوا تمھارے
پاس آیا ہوں۔ تمھارا فرض ہے کہ اُن کی نصرت کے لیے قدم آگے بڑھاؤ
اور اُن کی آواز پر لبیک کہو" ابن زیاد غضبناک ہوا اور اُس نے حکم دیا
کہ انھیں قصر کے اوپر سے زمین پر گرا دو۔ بیرحموں نے انھیں نیچے گرا دیا
جس سے اُن کے اعضاء چکنا چور ہو گئے (۱)

جب آپ اس منزل سے آگے بڑھے تو ایک چشمہ پر عبداللہ بن مطیع
سے ملاقات ہوئی جو عراق سے واپس ہو رہے تھے۔ اُنھوں نے بھی آپ
سے مکہ چھوڑنے کا سبب دریافت کیا اور اہل کوفہ کی دعوت کا حال سن
کر دوسرے تمام مشورہ دینے والوں کی طرح آپ کے کوفہ جانے سے اختلاف
کیا (۲)

(۵ فرود) اس منزل سے قریب جو چشمہ تھا اُس پر زہیر بن القین
کا خیمہ نصب تھا۔ یہ حج کر کے مکہ سے واپس ہوئے تھے اور کوفہ جا رہے
تھے (۳) شروع میں ان کو خاندان رسول سے کوئی عقیدت نہ تھی بلکہ
عام طور پر وہ اہل شام کے ہم عقیدہ سمجھے جاتے تھے جس کو اُس زمانہ
میں "عثمانی" مسلک کہا جاتا تھا۔ مگر امام حسینؑ کی نباض فطرت
بصیرت اُن کی باطنی استعداد کو دیکھ رہی تھی۔ آپ نے اُن کے پاس پیغام
بھیجا کہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں، خاندان رسولؐ سے جو وحشت عام
طور سے اس گروہ میں پیدا کر دی گئی تھی اُس کی بناء پر انھوں نے ملنے
سے انکار کر دینا چاہا مگر اُن کی بیوی نے جو ان کے ساتھ تھیں کہا کہ واہ کیا

---

(۱) الاخبار الطوال ص۲۴۵ ارشاد ص۲۳ (۲) الاخبار الطوال ص۲۴۶ طبری ج۶ ص۲۲۴

(۳) الاخبار الطوال ص۲۴۶ طبری ج۶ ص۲۲۴

غضب کی بات ہے کہ رسول کا فرزند تمہارے پاس پیغام ملاقات بھیجے اور تم مسترد کر دو۔ اس بات سے متاثر ہو کر یہ امام حسینؑ کے پاس گئے اور کچھ اس طرح صفائی سے ان کے سامنے امام حسینؑ نے اپنے معاملہ کو پیش کیا کہ وہ ہمہ تن آپ کے موافق ہو گئے اور بڑے خوش خوش اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر انھوں نے حکم دیا کہ ہمارا خیمہ یہاں سے اکھاڑ کر اصحاب حسینؑ کے خیموں کے پاس لگا دیا جائے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دیا اور اُن سے کہا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ میکے چلی جائیں پھر ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے امام حسینؑ کے ساتھ مرنے کا مضبوط ارادہ کر لیا ہے۔ جو شخص تم میں سے ہمارے ساتھ شہید ہونا چاہے وہ میرے ساتھ رہے اور جو نہ چاہے وہ یہیں سے علیحدہ ہو جائے۔ چنانچہ ساتھ والے سب علیحدہ ہو گئے(۱)

صورت حال سے صاف ظاہر ہے کہ امام کی گفتگو زہیر سے کچھ خوش آئند توقعات یا اُمید افزا تصورات پر مبنی نہ تھی بلکہ صفائی کے ساتھ اُس انجام کار کا انکشاف کر دیا گیا تھا جس پر ابھی تک عام نگاہوں میں توقعات کے پردے پڑے ہوئے تھے کیا اس کے بعد بھی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر منزل عمل میں گامزن ہو رہے تھے۔

پھر بھی چونکہ عوام بالکل ظاہر بین ہوتے ہیں لہذا اُن کے توقعات امام کی نسبت بہت خوش آئند تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ فرزند رسولؐ اپنے باپ بھائی کے پایۂ تخت اور عراق ایسے مردم خیز صوبہ کے صدر مرکز کوفہ کی طرف خود وہیں کے باشندوں کے اصرار و طلب پر جا رہے ہیں وہاں پہونچ کر تاج و تخت، فوج و لشکر اور حشم و خدم سب کچھ مہیا ہو گا۔ حضرت شاہ عراق تسلیم کئے جائیں گے اور آپ کی ذات میں امامت و سلطنت دوش بدوش جمع ہو گی ان خیالات کو پیش نظر رکھ کر

(۱) طبری ج ۶ صـ ۲۲۴، ارشاد صـ ۲۳۱ - ۲۳۲ - الاخبار الطوال صـ ۲۴۶

دنیا کے لالچی لوگ بھی جوق در جوق آپ کے ساتھ شامل ہو رہے تھے اور راستے
میں آپ کا وہ مختصر قافلہ جو مکہ سے نکلتے وقت خاص خاص لوگوں پر مشتمل تھا اب
ایک مختصر لشکر کی صورت اختیار کر چکا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بے شک
کوئی بادشاہ ہے جو اپنے مرکز سلطنت کی طرف جا رہا ہے لیکن زرود سب سے
پہلا وہ مقام تھا جہاں سے روانہ ہونے پر پریشانی کا آغاز ہوا جبکہ عبد اللہ
بن سلیم اور منذری بن مشمعل دونوں اسدی شخصوں نے جو مکہ معظمہ سے فراغت
حج کے بعد بہت تیزی سے روانہ ہو کر زرود میں حضرت سے ملحق ہو گئے تھے ایک
شخص کو کوفہ کی طرف سے آتے دیکھا۔ امام اُس کو دیکھتے ہی ٹھہر گئے تھے کہ کچھ
حالات کوفہ کے معلوم کریں لیکن اُس نے حسینی قافلہ کو دیکھ کر رُخ دوسری
جانب کر دیا لہٰذا امام آگے بڑھ گئے۔ ان دونوں اسدی شخصوں نے آپس میں
مشورہ کیا کہ اس سے کچھ کوفہ کے حالات دریافت کرنا چاہئیں۔ چنانچہ یہ دونوں
قافلہ سے جدا ہو کر انتہائی تیز رفتاری سے اُس جانے والے تک پہونچ گئے اور
سلامت کے بعد اُس کا قوم و قبیلہ اور نام و نسب دریافت کیا معلوم ہوا بکیر بن
مثعبہ اسدی ہے تو انھوں نے بھی اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ ہم بھی قبیلہ بنی اسد
میں سے ہیں ذرا تم سے اپنے شہر کی حالت دریافت کرنا چاہتے ہیں اُس نے
کہا کہ "ہاں سنو میں کوفہ سے باہر نہیں آیا تھا کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ قتل
کئے گئے اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اُن کی لاش کے پاؤں میں رسی
باندھ کر بازار میں رسی باندھ کر بازار میں گھسیٹا جا رہا ہے۔" (۱) بڑی وحشت
ناک خبر تھی دونوں آدمیوں نے سن لیا اور موقع شناسی سے کام لے کر اُس
وقت اُسے دل میں رکھ لیا یہاں تک کہ وقت اُس کے اظہار کی اجازت دے

(۱) طبری ج ۶ صـ ۲۲۵ - ارشاد صـ ۲۳۲

(۶) ثعلبیہ اس منزل پر دوسرے دن شام کے وقت جب امام حسینؑ نے قیام کیا تو دونوں اسدی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تسلیم بجالائے۔ حضرتؑ نے جواب سلام دیا، انھوں نے عرض کیا کہ ہمیں ایک اطلاع دینا ہے۔ حضور فرمائیں تو سب کے سامنے عرض کریں اور اگر ارشاد ہو تو علیحدہ تخلیے میں کہیں، حضرتؑ نے ایک نظر حاضر الوقت اشخاص پر ڈالی اور فرمایا "ان لوگوں سے کسی رازداری کی ضرورت نہیں ہے"۔ انھوں نے کہا آپ نے اُس سوار کو دیکھا تھا جو کل شام کے وقت آرہا تھا؟" فرمایا "ہاں اور میں نے اُس سے کچھ حالات بھی دریافت کرنا چاہے تھے"۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے حضور کے منشا کے مطابق اُس سے حالات دریافت کیے اور وہ ہمارے ہی قبیلہ کا آدمی ہے اور بہت سمجھدار سچا اور دانشمند شخص ہے۔ اُس نے ہم سے بیان کیا کہ وہ کوفے سے باہر نہیں آیا تھا کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ دونوں شہید کردیے گئے اور اُن کی لاشیں بازار میں پھرائی گئیں"۔

بلاشبہ یہ خبر امام حسینؑ کے لئے بہت اندوہناک تھی۔ ایک طرف مسلم کی جدائی کا صدمہ جو آپ کے چچازاد بھائی اور معتمد خاص تھے۔ دوسری طرف اپنے مستقبل کے متعلق ظاہری تمام اُمیدوں کا ختم ہوجانا لیکن ایک رئیس قوم اور سردار کی حیثیت سخت موقع پر بہت ذمہ دارانہ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ تمام لوگوں کی نظریں اُسی پر ہوتی ہیں۔ اگر کہیں اُس کو اضطراب ہوا تو پھر تمام رفقا اور ساتھیوں پر مایوسی کا چھا جانا اور اضطراب کا پیدا ہوجانا لازمی امر ہے۔ اسی لیے اس موقع پر جب یہ اچانک خبر امام حسینؑ کو پہونچی تو آپ نے صرف اتنا کیا کہ چند بار کہا انا للہ وانا الیہ راجعون رحمۃ اللہ علیہما اور بس خاموش ہوگئے (۱)

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۲۵۔ ارشاد ص ۲۳۱۔ ۲۳۲

دینوری نے کلمۂ استرجاع کے بعد ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ عند اللہ نحتسب انفسنا (یعنی) "ہم اللہ کے یہاں حساب کرتے ہیں اپنی جانوں کا"[1] مطلب اس کا یہ ہوا کہ اُسی کی راہ میں ہم ان جانوں کو نثار کرتے ہیں اور وہی معاوضہ دینے والا ہے۔

اسدی جو ایک رات تک اس وحشت ناک خبر کو اپنے دل میں رکھ کر اس کے پورا پورا اثر لے چکے تھے اور نتائج کو ہر طرح سوچ کر دل ہی دل میں رائے قائم کر چکے تھے اُن سے اپنے دل کی بات چھپائی نہ گئی اور وہ بے ساختہ بول اُٹھے کہ "خدا کا واسطہ اپنی اور اپنے گھر بھر کی جان کو خطرہ میں نہ ڈالیے، یہیں سے پلٹ ہو جائیے کیونکہ کوفہ میں آپ کا نہ کوئی مددگار رہے نہ دوست بلکہ ہمیں خوف ہے کہ پورا کوفہ آپ کے خلاف ہی ہو گا" ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک ہنگامی اضطراب اور تاثر کے جذبہ سے جو ہمدردی کا مشورہ دیا جائے اُس کا جواب زیادہ سنجیدہ دلائل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ حضرت امام حسینؑ خود پہلے ہی سے انجام پر مطلع تھے اور آپ کا سفر جن نتائج کو پیش نظر رکھ کر تھا اُن میں اس خبر کے آنے سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی لیکن دوسرے افراد کے لیے وقتی جذبات کے مقابل میں عقلی دلائل کے پیش کرنے کا محل نہیں ہوا کرتا۔ اس لیے حضرت نے اس ہنگامی جذبہ کے ماتحت مشورہ کا جواب بالکل متضاد ایک فطری جذبہ کے احساس سے دینا چاہا اور اُس کے لیے ایک نظر اولاد عقیل پر ڈالی اور فرمایا "تمہاری کیا رائے ہے مسلم تو شہید ہو گئے" تمام عقیلی جوان کھڑے ہو گئے اور کہا خدا کی قسم ہم تو واپس نہ ہوں گے جب تک مسلم کے خون کا بدلہ نہ لیں یا وہی موت کا ساغر ہم بھی نہ چکھ لیں جو مسلم نے چکھا" حضرت متوجہ

---

(۱) الاخبار الطوال صد ۲۴۶

ہوئے۔ دونوں اسدیوں کی طرف اور فرمایا "جب یہ نہ ہوئے تو ہم زندہ رہ کر کیا کرینگے!" (۱) حاضرین میں سے ایک شخص نے یہ بھی کہا کہ آپ کی اور مسلم کی برابری نہیں۔ آپ کوفہ میں پہونچ جائیں تو کوفہ کے لوگ آپ کی مدد کے لیے دوڑ پڑیں گے۔" حضرت نے اس خیال کی کوئی تائید نہیں کی اور خاموشی اختیار فرمائی۔ (۲)

رات یہیں گزاری گئی۔ سحر کے وقت آئندہ کی منزلوں کے لیے کافی پانی ساتھ لینے کے بعد آگے روانہ ہوئے یہاں تک کہ زبالہ پہنچے (۳)

(۷) **زبالہ** اس منزل پر ایاس بن عثل طائی جو شعرا میں سے تھا، محمد بن اشعث کا بھیجا ہوا خط لے کر امام کے پاس پہنچا۔ چونکہ جناب مسلم نے دشمن کے ہاتھوں میں گرفتار ہونے اور اپنی شہادت کا یقین ہو چکنے کے بعد یہ وصیت کی تھی کہ میرے بعد حضرت امام حسینؑ کو اطلاع دیدی جائے کہ کوفہ کی یہ حالت ہے اور آپ کے مددگار اب کوفہ میں موجود نہیں ہیں اس لیے آپ اب یہاں آنے کا ارادہ نہ کیجیے چنانچہ یہ خط بھیجا گیا اور منزل زبالہ پر امام کے پاس پہونچا (۴)

اس قاصد نے یہ بھی اطلاع دی کہ قیس بن مسہر قتل کیے گئے (۵)

قرائن بتلاتے ہیں کہ وہ افراد جن کی موجودگی میں جناب مسلم کی خبر شہادت بیان کی گئی تھی واقعی نہایت مخصوص راز دار ہستیاں تھیں، اسی لیے اس مجمع کے روبرو مسلم کی خبر شہادت ظاہر ہونے کے بعد پھر بھی عام اہل قافلہ سے وہ راز ہی کی حیثیت سے مخفی رہی مگر حضرت نے اب ان واقعات کو اہل قافلہ سے مخفی رکھنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ آپ جانتے تھے کہ راستے کے بہت سے عرب آپ کے ساتھ اس غلط خیال کے ماتحت ہو گئے ہیں کہ آپ ایک ایسے ملک کی طرف

(۱) الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۶ - طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۵ - ارشاد صفحہ ۲۳۳ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۵ ارشاد صفحہ ۲۲۳
(۳) طبری ج ۶ صفحہ ۲۱۱ (۴) طبری ج ۶ صفحہ ۲۰۳ (۵) الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۶

جا رہے ہیں۔ جہاں لوگ آپ کی سلطنت تسلیم کر چکے ہیں لہذا آپ کو یہ منظور نہ ہوا کہ وہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا رہیں اور حقیقت حال سے تاریکی میں رہنے کی وجہ سے آپ کا ساتھ دیں۔ آپ کو یقین تھا کہ جب آپ صورت حال کا اظہار کر دینگے تو بس وہی جان نثار آپ کے ساتھ رہ جائیں گے جو حقیقۃ آپ کے مقصد کے ساتھ ہمدردی رکھتے اور آپ کی نصرت میں جان تک سے ہاتھ دھونا پسند کرتے ہیں،

چنانچہ آپ نے حسب ذیل بیان کے ذریعہ سے تمام اہل قافلہ کو صورت حال سے مطلع فرمایا:۔

"ہمیں یہ دردناک خبر معلوم ہوئی ہے کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ قتل کر ڈالے گئے اور ہماری اطاعت کے دعویداروں نے ہماری نصرت سے ہاتھ اٹھا لیا اس لیے جو شخص تم میں سے واپس جانا چاہے وہ واپس چلا جائے ہماری طرف سے اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ والسلام!"

نتیجہ وہی ہوا جو معلوم تھا کہ اس اعلان کے ساتھ ہی لوگ متفرق ہونا شروع ہوئے اور تقریباً سب داہنے بائیں روانہ ہو گئے، یہاں تک کہ زیادہ تر وہی لوگ جو مدینہ سے آپ کے ساتھ آئے تھے باقی رہ گئے۔ (۱)

(۸) **بطن عقیق** (۲) اس منزل پر قبیلۂ عکرمہ کا ایک شخص (۳)۔ عمرو بن لوذان (۴) ملا اور اس نے بتایا کہ ابن زیاد کی جانب سے قادسیہ اور عذیب کے درمیان ناکہ بندی ہو گئی ہے اور اس نے کہا کہ برائے خدا واپس جائیے۔ آپ کے سامنے سوائے تلواروں اور نیزوں کے کوئی چیز آنے والی

---

(۱) الاخبار الطوال صـ۲۴۷۔ طبری ج ۶ صـ۲۲۶۔ ارشاد صـ۲۳۳ (۲) شیخ مفید نے اس منزل کا نام بطن عقبہ لکھا ہے (ارشاد صـ۲۳۳ (۳) الاخبار الطوال صـ۲۴۷ (۴) ارشاد صـ۲۳۳

نہیں ہے اور خطوط لکھنے والوں پر بھروسا نہ کیجیے۔ وہی لوگ سب سے پہلے آپ سے لڑنے کے لیے آئیں گے۔ امام حسین نے اُس کی خیر خواہی پر اُسے دعائے خیر دی اور آگے روانہ ہوئے (۱)

بظاہر یہ سننے کے بعد کہ قادسیہ کے ناکے پر فوجوں کا پہرہ ہے اور وہاں پہنچنا اپنے کو یقینی طور پر دشمن کے ہاتھ میں گرفتار کرا دینا ہے آپ نے سمت سفر میں ذرا تبدیلی فرمائی اور اسی لیے قادسیہ کہ جس کا ہر کوفہ جانے والے کے محل گزر میں واقع ہونا ضروری تھا اور جہاں قیس بن مسہر گرفتار کیے گئے تھے آپ کے منازل سفر میں واقع نہیں ہوا اور آپ کا اُس فوج سے تصادم نہیں ہوا جو حصین کی سرکردگی میں قادسیہ کے حدود میں مقیم تھی۔

(۹) سراۃ بطن عقیق سے روانہ ہو کر امام نے یہاں رات بسر کی (۲)

(۱۰) شراف طبری اور شیخ مفید کی تصریح کے مطابق ثعلبیہ و زبالہ کے بعد اس منزل پر امام نے حکم دیا کہ پانی بھر لو اور مشکیں اور چھاگلیں پُر کر لو (۳)

اس منزل سے آگے بڑھے اور اب غالباً محرم ۶۱ھ کا چاند فلک پر نمودار ہو چکا ہے پہلی تاریخ دوپہر کو امام حسین کا قافلہ منزل شراف کے حدود سے آگے بڑھا تھا۔ قادسیہ سے تین میل کے فاصلہ پر (۴) کہ آپ کے اصحاب میں کسی نے کہا "اللہ اکبر" امام نے فرمایا بے شک اللہ سب سے بڑا ہے مگر اس وقت تکبیر کہنے کی وجہ؟ اس نے کہا مجھے خرمے کے درخت دکھائی دے رہے ہیں اس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی آبادی نزدیک ہے۔ اصحاب میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ اس جگہ تو کبھی ہم نے درخت خرما دیکھے نہیں۔ حضرت نے فرمایا پھر تم ہی دیکھو، کیا دکھلائی دیتا ہے؟ انھوں نے کہا

---

(۱) الاخبار الطوال ص ۲۴۶۔ ارشاد ص ۲۳۳۔ ۲۳۴ھ (۲) الاخبار الطوال ص ۲۴۶

(۳) طبری ج ۲ ص ۲۲۶ ارشاد ص ۲۳۳۔ ۲۳۴ھ (۴) طبری ج ۲ ص ۲۲۶

ہم کو تو گھوڑوں کی گردنیں (۱) یا کنوتیاں (۲) نظر آتی ہیں۔ حضرت نے فرمایا میں بھی یہی دیکھتا ہوں۔

(۱۱) **ذوحسم** مخالف فوج کو ادھر متوجہ پاکر امام حسینؑ نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ یہاں کوئی ایسی محفوظ جگہ ہے جسے ہم اپنی پشت پر قرار دے کر دشمن سے سامنے کی جانب سے مقابلہ کریں۔ مطلب یہ تھا کہ چاروں طرف سے گھرنے کا امکان نہ باقی رہے۔ لوگوں نے کہا یہ ذوحسم (۳) پہاڑ موجود ہے جو آپکے بائیں پہلو کی طرف ہے۔ آپ اس کی طرف متوجہ ہو جیے۔ اگر ہم دشمن کے پہلے اس حد تک پہونچ گئے تو مقصد حاصل ہو جائے گا۔ حضرت نے اس رائے کو پسند فرمایا اور بائیں طرف کا رخ کیا آنے والی سپاہ نے جو یہ دیکھا تو اُس نے بھی اُسی طرف کا رخ کر دیا۔ مگر امام وہاں پہلے پہونچ گئے تھے اصحاب کو حکم دیا کہ خیمہ نصب کر دیے جائیں۔ فوراً تعمیل کی گئی۔ اتنی دیر میں وہ فوج بھی قریب پہنچ گئی۔ معلوم ہوا کہ حُر بن یزید ریاحی ایک ہزار کی فوج کے ساتھ سدّ راہ ہونے کے لئے آیا ہے (۴) چونکہ امام کوفہ کے عام راستے پر نہیں جا رہے تھے جو قادسیہ سے ہو کر گزرتا تھا۔ اس لیے حصین کی فوج سے تصادم نہوا جو قادسیہ میں پڑی ہوئی تھی مگر جاسوسوں نے حصین کو آپ کے اس طرح بچ کر آگے بڑھ جانے کی اطلاع دے دی تھی اس لیے حصین نے حُر کو اس ایک ہزار کی فوج کے ساتھ آپ کا راستہ روکنے کے لیے آگے روانہ کیا (۵) دوپہر کا وقت اور گرمی کا موسم (۶) اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ناکہ بندی پر معین فوج کے حلقہ سے بہت دور دور جا رہے اس لئے حر کو آپ تک پہونچنے کے لیے غیر معمولی تگ و دو کرنا پڑی اور ریگستان

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۲۶ (۲) ارشاد ص ۲۳۴ (۳) دینوری نے ذوجشم لکھا ہے (الاخبار الطوال ص ۲۴۸
(۴) الاخبار الطوال ص ۲۴۸ طبری ج ۶ ص ۲۲۶ (۵) طبری ج ۶ ص ۲۲۶ - ۲۲۷ (۶) الاخبار الطوال ص ۲۴۷

میں بغیر پانی ساتھ لیے ہوئے بہت تیز چلنا پڑا اس لیے یہاں پہونچتے پہونچتے فوج کے سوار اور گھوڑے سب ہی کی پیاس کے مارے حالت تباہ تھی۔

امام اپنے اصحاب سمیت عمامے سروں پر رکھے۔ تلواریں حمائل کیے کھڑے تھے کہ دشمن کے ہانپتے ہوئے گھوڑے اور سوار سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ آثار پیاس کی شدت کے گواہ تھے اور صورت سوال حسینؑ ایک حساس دل رکھتے تھے جس میں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آپ کے لیے دشمن کی موجودہ حالت ناقابل برداشت تھی آپ نے اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ ان کو پانی پلاؤ اور تمام فوج کو پوری طرح سیراب کر دو حکم کی دیر تھی اطاعت امام پر کمربستہ جوان کھڑے ہو گئے اور سب کو سیراب کیا (۱) حالت یہ تھی کہ پیالے لگنیں، طشت پانی سے بھرتے تھے اور گھوڑوں کے پاس لے جاتے تھے، جب ہر گھوڑا تین، چار، پانچ دفعہ پی کر منہ ہٹا لیتا تھا تب دوسرے گھوڑے کے پاس لے جاتے تھے، یہاں تک کہ راکب و مرکب سب سیراب ہو گئے۔ علی بن طعان محاربی حُر کا ایک ساتھی تھا، وہ کہتا ہے کہ میری حالت پیاس سے بہت تباہ تھی اور سب سے آخر میں میں پہونچا جب امام حسینؑ نے میری اور میرے گھوڑے کی پیاس کو دیکھا، فرمایا "راویہ (یعنی شتر آبکش کو) بٹھا لو" میری زبان میں "راویہ" مشک کو کہتے تھے۔ اس لیے میں اس کے معنی نہ سمجھا۔ حضرت نے فرمایا "جمل (یعنی اونٹ) کو بٹھا لو" میں نے اونٹ کو بٹھایا۔ حضرت نے فرمایا اب پانی پیو، مگر میں اتنا بدحواس تھا کہ جتنا پینے کی کوشش کرتا پانی زمین پر بہتا اور مجھ تک نہ پہونچتا تھا۔ امام نے کہا مشک کے دہانے کو اپنی طرف موڑ لو۔ پھر بھی میری سمجھ میں نہ آیا تب حضرت خود اٹھے اور مشک کے دہانے کو ٹھیک کر کے مجھے دیا۔ میں نے خود بھی پانی پیا اور اپنے گھوڑے کو سیراب کیا۔ (۲)

---

(۱) الاخبار الطوال صہ ۲۴۳۔ طبری ج ۶ صہ ۲۲۶ (۲) طبری ج ۶ صہ ۲۲۶۔ ارشاد صہ ۲۴۳

امام حسینؑ کی اس بلند ظرفی کا جو اثر مخالف سردار یعنی حُر کے دل پر قائم ہوا اُس کے ظاہر ہونے کا ابھی وقت نہ آیا تھا لیکن کم از کم وہ ششدر رہ گیا ہوگا کہ اس احسان کے بعد اب اس بزرگ فطرت انسان سے کس طرح گفتگو کروں امام نے بھی اپنے فطری استقلال و اطمینان کی وجہ سے اس وقت کچھ نہ پوچھا کہ تم کیوں آئے ہو اور کیا مطلب ہے؟ فوج حُر کے سپاہی اپنے گھوڑوں کے سایہ میں باگیں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے بیٹھ گئے (۱) یہاں تک کہ ظہر کی نماز کا وقت آیا اور امام حسینؑ نے حجاج بن مسروق جعفی کو اذان کا حکم دیا اور انھوں نے اذان کہی۔ جب نماز جماعت کی صفیں تیار ہو گئیں تو امام اپنے نماز کے لباس میں خیمہ سے برآمد ہوئے اور اقامت کا حکم دیا۔ اس کے بعد آپ نے حر سے فرمایا کہ تم ہمارے ساتھ نماز پڑھوگے یا تم اپنے ساتھیوں کو الگ نماز پڑھانا چاہتے ہو؟ حر نے کہا نہیں آپ نماز پڑھایئے اور ہم سب آپ کے پیچھے نماز پڑھیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور دونوں جماعتوں نے امام کے پیچھے نماز ادا کی (۲)

نماز کے بعد حضرت نے اُس جماعت کی طرف رخ کیا اور حمد و ثنائے الٰہی کے بعد حُر اور اُس کی فوج کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد کیا "اے گروہ مردم! میں خدا کی بارگاہ میں اور تمہارے سامنے اپنی صفائی پیش کرتا ہوں۔ میں تمہاری طرف اُس وقت تک نہیں آیا جب تک کہ تمہارے خطوط میرے پاس نہیں گئے کہ آپ ہماری طرف آیئے۔ ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ شاید خدا آپ کے ذریعہ سے ہمیں ہدایت پر مجتمع کر دے اب اگر تم اپنی بات پر قائم ہو تو میں آ ہی گیا ہوں۔ اپنے ارادہ پر قائم رہوں اور اگر تم میرے

---

(۱) الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۷ (۲) الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۹ طبری ۶ صفحہ ۲۲۶

آنے سے ناراض ہو تو میں واپس چلا جاؤں وہیں جہاں سے آیا ہوں۔" اس تقریر کے بعد خاموشی چھائی رہی اور کوئی جواب نہیں ملا۔ (۱) آخر حضرت اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے اور آپ کے اصحاب آپ کے خیمہ میں مجتمع ہو گئے۔ حُر اس خیمہ میں جو اُس کے لیے لگایا گیا تھا داخل ہوا اور اس کے کچھ ساتھی اُس کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ دوسرے لوگ متفرق طور پر اُسی میدان میں اُسی شان سے کہ سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں ہاتھوں میں لے لیں اُن ہی کے سایہ میں دوپہر کا وقت گزرنے تک بیٹھے رہے (۲) عصر کا وقت ہوا تو امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ روانگی کی تیاری کرو۔ پھر آپ نے باہر آ کر عصر کی نماز کا اعلان کیا اور اُسی صورت سے حضرت کی اقتدا میں دونوں گروہوں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد آپ نے پھر مجمع کی طرف رخ کیا اور حمد و ثنائے الٰہی کے بعد فرمایا۔ "اگر تقوٰے اختیار کرو اور حقدار کا حق پہچانو تو خدا کی رضامندی حاصل کرو گے۔ حقیقۃً ہم اہلبیت امت اسلامیہ کی فرمانروائی کے اُن لوگوں سے زیادہ مستحق ہیں جو آج اس منصب کے غلط دعویدار ہیں اور مسلمانوں پر ستم ڈھاتے ہیں لیکن اگر تم ہم کو ناپسند کرتے ہو اور ہمارے حق کا اقرار نہیں رکھتے ہو اور اُس رائے کے خلاف ہو جو تمہارے خطوط اور قاصدوں کے بیانات سے ظاہر ہو رہی تھی تو میں واپس چلا جاؤں گا۔" (۳) اب حُر کی مہر خاموشی ٹوٹی اور اُس نے کہا "ہمیں تو بخدا خبر بھی نہیں کہ یہ خطوط کیسے ہیں جن کا آپ حوالہ دے رہے ہیں۔"

امام نے عقبہ بن سمعان سے فرمایا لاؤ وہ تھیلے جن میں ان لوگوں کے خطوط بھرے ہوئے ہیں عقبہ نے دو تھیلے خطوط سے بھرے ہوئے لا کر سامنے

---

(۱) الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۸ طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۸ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۸ (۳) طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۸ ارشاد صفحہ ۲۳۵-۱۳۶

رکھے اور ان میں سے خطوط نکال کر پھیلا دیے۔ حُر نے کہا کہ ہم تو ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنھوں نے آپ کو خطوط لکھے ہیں۔ ہم تو مامور کیے گئے ہیں اس پر کہ جہاں بھی آپ مل جائیں پھر ہم آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ یہاں تک کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس پہونچا دیں۔ یہ سننا تھا کہ امام نے زور سے کہا کہ "موت تمہارے لیے اس سے قریب تر ثابت ہوگی"۔ (۱)

اور اس کے بعد آپ نے کوفہ جانے کا ارادہ کلیۃً ترک کر دیا یعنی اس کے پہلے راستہ بدلنے کے بعد بھی آپ کا رُخ کوفہ ہی کی طرف تھا۔ لیکن اب کوفہ جانے کے خیال ہی کو ذہن سے نکال دیا۔ اس کے بعد آپ نے اپنے اصحاب کے سامنے ایک خطبہ ارشاد کیا جس میں حمد و ثنائے باری کے بعد فرمایا:۔ "صورت حال جو پیش آئی ہے وہ تم دیکھ رہے ہو یقیناً دنیا کا رنگ بدل گیا ہے اور اُس کی نیکی رخصت ہو چکی ہے اور اُس میں کچھ نہیں رہ گیا ہے سوائے ایسے تھوڑے حصّہ کے جو پانی کے بہنے کے بعد کسی ظرف میں بچ رہتا ہے اور ایک پست زندگی کے جو مثل زہریلی گھانس کے ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہوتا اور باطل سے علیحدگی نہیں اختیار کی جاتی اس صورت میں مومن یقیناً خدا کی ملاقات کا آرزومند ہوتا ہے۔ میرے نزدیک تو موت کی صورت میں شہادت کی سی نعمت ہے اور زندہ رہنا ان ظالموں کے درمیان وبال جان ہے"۔ اس خطبہ کا مقصد صرف اصحاب کو انجام کار کی طرف ایک مرتبہ پھر متوجہ کرنا اور اس طرح اُن اپنے عزائم کی پختگی کا دوبارہ جائزہ لینے کی دعوت دینا ہی قرار دیا جا سکتا تھا اور اس لیے ضرورت تھی کہ اس تقریر کو سن کر اصحاب کی جانب سے خلوص نیت اور پختگی عزم کا اقرار واقعی اظہار کر دیا جاتا چنانچہ امام کی تقریر ختم ہوتے ہی

---

(۱) الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۸ طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۹۔ ارشاد صفحہ ۲۲۹

زہیر بن قین کھڑے ہو گئے اور اس احساس کی بنا پر کہ میں اس جماعت میں تازہ شریک ہوا ہوں اس لیے مجھے ایسے مواقع پر سبقت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، دوسرے اصحاب سے ان الفاظ میں تقریر کی اجازت چاہی کہ آپ لوگ پہلے تقریر کرینگے یا میں کچھ کہوں؟ سب نے کہا کہ نہیں تم تقریر کرو۔ زہیر نے حمد و ثنائے الٰہی کے بعد کہا:۔

"اللہ آپ کو مقصد تک پہونچائے اے فرزند رسولؐ! ہم نے آپ کے ارشاد کو سنا بخدا دنیا اگر ہمارے لیے ہمیشہ باقی رہنے والی ہوتی مگر جدا ہونا اس سے محض آپ کی نصرت اور ہمدردی کی بنا پر ہوتا تو بھی ہم آپ کا ساتھ دینے کو دنیا میں ہمیشہ قیام پر ترجیح دیتے" یہ سنکر امام نے زہیر کو دعائے خیر دی اور ان کے خلوص کی تعریف کی (۱) اس کے بعد نافع بن ہلال جملی کھڑے ہوئے اور انھوں نے حسب ذیل پرزور تقریر کی:۔

"فرزند رسول! آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے جد بزرگوار کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہوا کہ لوگوں کو اپنی محبت گھول کر پلا دیں اور لوگ حضرت کی اس طرح اطاعت کرنے لگیں جس طرح کہ حضرت چاہتے تھے اور حضرت کے ساتھ والوں میں بہت سے منافق تھے جو حضرت سے نصرت کا وعدہ کرتے تھے مگر دماغ میں غدّاری کا خیال مضمر رکھتے تھے وہ باتیں تو ایسی بناتے تھے جو شہد سے زیادہ شیریں ہوتیں مگر کردار سے مخالفت کرتے ایسی جو انتہائی تلخ ثابت ہوتی یہاں تک کہ رسول اللہؐ کا انتقال ہو گیا اس کے بعد آپ کے والد بزرگوار حضرت علیؑ کو بھی اسی صورت سے دوچار ہونا پڑا۔ کچھ لوگ اُن کی نصرت پر متفق ہوئے اور اُن کا ساتھ دیتے ہوئے

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۹

۔۔۔۔۔۔۔ ناکثین وقاسطین و مارقین (جمل صفین اور نہروان والوں) سے جنگ کی اور کچھ لوگوں نے مخالفت کی۔ یہاں تک کہ حضرت کی وفات ہو گئی اور آج ہمارے سامنے آپ کے لیے وہی صورت درپیش ہے۔ لہذا جو شخص اپنے عہد کو توڑے گا اور نیت کو خراب کریگا وہ خود اپنا برا کرے گا۔ اور خدا آپ کو اس سے لا پرواہ کر دے گا۔ بسم اللہ جلیے ہم کو لے کر خیر و سلامتی کے ساتھ چاہے مشرق کی طرف اور چاہے مغرب کی جانب۔ ہم بخدا خدا کے مقرر فیصلہ سے خوفزدہ نہیں ہیں اور نہ اپنے رب کی ملاقات (موت) سے کراہت رکھتے ہیں۔ ہم اپنی نیتوں اور اعتقادوں پر قائم ہیں۔ موالات رکھتے ہیں۔ اس شخص سے جو آپ کے ساتھ موالات رکھے اور دشمن ہیں اس کے جو آپ سے دشمنی کرے"۔

پھر بریر بن خضیر ہمدانی نے تقریر کی :-

"خدا کی قسم اے فرزند رسول! یہ خدا کا ہم پر احسان ہے کہ اس نے ہم کو موقع دیا۔ اس بات کا کہ ہم آپ کے سامنے جنگ کریں اور آپ کی نصرت کے سلسلہ میں ہمارے اعضاء و جوارح قطع کیے جائیں یہاں تک کہ آپ کے جد بزرگوار روز قیامت ہمارے شفاعت خواہ ہوں کیونکہ وہ جماعت کبھی نجات نہیں پا سکتی جس نے اپنے نبی کے نواسے کو تہ تیغ کیا ہو اور وائے ہو اُن کے لیے وہ خدا کو کیا منہ دکھائیں گے اور اُن کا کیا حال ہوگا اُس دن جب وہ آتش جہنم میں نالہ و فریاد کرتے ہوں گے"۔ (۱)

اس گفتگو کے بعد امام نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ اپنی سواریوں پر سوار ہو جاؤ اور سب لوگ یہاں تک کہ خواتین بھی اپنی عماریوں میں بیٹھ

---

(۱) طبری ج ۶ صد ۲۲۹

ہو گئیں آپ نے حکم دیا کہ چلو جس راستے آئے ہیں اُسی راستے پر واپس چلو۔ جب اصحاب نے ارادہ پلٹنے کا کیا حُر کی سپاہ سامنے آکر سدِ راہ ہوئی۔ اس پر امام نے دریافت کیا کہ "تمہارا مطلب کیا ہے"؟ حُر نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس لے جاؤں"۔ حضرت نے فرمایا "خدا کی قسم یہ نہیں ہوگا"۔ حُر نے کہا "پھر میں بخدا آپ کو چھوڑوں گا بھی نہیں"۔ یونہی تین مرتبہ ردّ و بدل ہوئی۔

آخر میں حُر نے کہا کہ "میں آپ سے جنگ کرنے پر مامور نہیں ہوا ہوں، مجھے تو بس یہ حکم ہے کہ آپ کے ساتھ ساتھ رہوں یہاں تک کہ آپ کوفہ پہنچیں، اب اس صورت میں کہ آپ کوفہ جانے ہی سے انکار کرتے ہیں تو ایک ایسا راستہ اختیار کیجئے جو نہ کوفہ کی طرف جاتا ہو اور نہ مدینہ کی طرف بس میرے اور آپ کے درمیان انصاف کا یہی ایک طریقہ ہے اس وقت تک کہ جب تک مجھے حاکم کی رائے معلوم ہو"۔ حضرت کو حُر کی یہ بات معقول معلوم ہوئی اور آپ قادسیہ و عذیب کے راستے سے بائیں سمت کی طرف متوجہ ہو گئے اور حُر بھی آپ کے ساتھ ساتھ چلا۔ تاریخ میں صراحت ہے کہ یہاں سے اور عذیب تک ۳۸ میل کا فاصلہ تھا(۱)

راستے میں امام حسینؑ اور حر کے درمیان جو گفتگو ہوتی جاتی تھی، وہ بھی بڑی معنی خیز تھی۔ حُر نے کہا "میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ اپنے اوپر رحم کریں اس لیے کہ اگر آپ نے جنگ کی تو یقیناً آپ قتل کر دیئے جائیں گے اور تباہ ہوں گے"۔ حضرت نے جواب دیا "کیا تم مجھے موت سے ڈراتے ہو؟ کیا تم اس سے زیادہ کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو؟ اس

(۱) الاخبار الطوال صـ۲۴۸ - ۲۴۹، طبری ج ۶ صـ۲۲۸ - ۲۲۹، ارشاد صـ۲۳۶

کے بعد حضرت نے قبیلۂ اوس کے ایک شاعر کا وہ شعر پڑھا جس کا مضمون یہ
تھا کہ میں اپنے ارادہ پر قائم رہوں گا اور موت سے دوچار ہونے میں جوانمرد
کے لیے کوئی عار و ننگ نہیں ہے جبکہ اُس کی نیت میں سچائی ہو اور وہ راہ
حق میں جہاد کر رہا ہو۔"

حُر اس انتہائی عزم و استقلال کا اظہار سن کر حسینی قافلہ سے کچھ
دور ساتھ ساتھ ہو کر راستہ طے کرنے لگا۔۔۔۔(۱)

(۱۰) بیضہ

اس مقام پر امام حسینؑ نے فوج حُر اور اپنے اصحاب کے
سامنے ایک تقریر فرمائی جس میں اسلام کے تعلیمات کے
حوالہ سے اپنے فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ "ایہا الناس پیغمبر
اسلامؐ نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی بادشاہ کو دیکھے کہ وہ ظلم و جور کرتا ہے
محرمات الٰہیہ کو حلال بنائے ہوئے ہے۔ خدائی عہد و پیمان کو توڑ دیا ہے
سنت رسولؐ کی مخالفت کرتا ہے اور بندگان خدا میں معصیت کا طرز اختیار
کیے ہوئے ہے مگر یہ شخص ان باتوں کو گوارا کرے اور اصلاح کی کوشش
نہ کرے اپنے قول اور اپنے عمل سے تو وہ مستحق ہوگا اس کا کہ اللہ اُس کو
بھی اُسی بادشاہ کے درجہ میں محسوب کرے۔"

اس کے بعد موجودہ صورت حال پر تبصرہ کی حیثیت سے فرمایا:۔
"تمہیں معلوم ہوگا کہ ان بنی اُمیہ نے اطاعت شیطان کو اپنا راستا
بنا لیا اور اللہ کی اطاعت سے روگردانی کی ہے۔ مسلمانوں کے اموال کو اپنا
لیا ہے اور حرام خدا کو حلال اور حلال خدا کو حرام قرار دے لیا ہے
اس صورت میں مجھ سے زیادہ کس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اصلاح کی

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۲۹۔ ارشاد ص ۲۳۶۔ ۲۳۷

کوشش کرے" (۱)

(۱۲) عذیب الھجانات(۲)

اس منزل پر امام حسینؑ اور حر کے لشکر نے ایک تیر کی مسافت کا فاصلہ درمیان میں چھوڑ کر الگ الگ قیام کیا (۳) اسی اثناء میں کوفہ کے پانچ آدمی اپنے مرکبوں پر سوار وارد ہوئے جن کے ساتھ ایک کوتل گھوڑا تھا۔ ان کے راستا بتانے والے طرماح بن عدی ساتھ تھے۔

یہ پانچ آدمی عمرو بن خالد اسدی صیداوی، اُن کے غلام سعد، مجمع بن عبد اللہ عائذی، اُن کے فرزند عائذ بن مجمع اور جنادہ بن حارث سلمانی تھے۔ حر نے جو امام کی نقل و حرکت کا نگراں تھا بڑھ کر کہا کہ "یہ کوفہ کے لوگ ہیں اور آپ کے ساتھ آنے والوں میں سے نہیں ہیں لہٰذا میں انھیں قید کروں گا یا کوفہ واپس کر دوں گا۔" امام نے فرمایا "اب جب یہ میرے پاس پہنچ گئے ہیں تو ان کی حفاظت میرے ذمہ ہے اور اب وہ میرے انصار و اعوان کی جماعت میں داخل ہو گئے ہیں۔" حر خاموش ہو گیا۔

حضرت نے ان سے اہل کوفہ کی کیفیت دریافت کی۔ مجمع بن عبد اللہ عائذی نے کہا کہ بڑے آدمیوں کو رشوتیں دی گئی ہیں اور مال و دولت سے پر کر دیا گیا ہے اس لیے وہ سب آپ کے خلاف متفق ہیں۔ رہ گئے دوسرے لوگ اُن کے دل آپ کی طرف ہیں مگر تلواریں اُن کی آپ کے خلاف ہی بلند ہوں گی۔ انھوں نے قیس بن مسھر کی شہادت کے حالات بھی بیان کیے جس پر امام کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے اور آپ نے قرآن کی آیت

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۹ (۲) یہ نام اس مقام کا اس لیے ہو کہ نعمان بن منذر بادشاہ حیرہ کی ہجائن یعنی اونٹنیاں اس مقام پر چرا کرتی تھیں (طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۰)

پڑھی :- فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر وما بدلوا تبديلا۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ اس راستے پر چلے گئے اور ہمیں بھی اسی راستے پر جانا ہے۔ طرماح نے امام سے ابن زیاد کے افواج کی کثرت بیان کی اور کہا: "کوفہ سے باہر نکلنے کے پہلے میں نے پشت کوفہ پر اتنا عظیم لشکر دیکھا ہے جتنا آج تک تو میری نظروں سے نہیں گزرا تھا اور میں نے دریافت کیا تو بتلایا گیا کہ یہ سب اس لیے اکٹھا ہیں کہ ان کا جائزہ لیا جائے گا اور پھر حضرت امام حسینؑ سے مقابلہ کے لیے روانہ ہونگے۔"

یہ بیان دینے کے بعد انھوں نے کہا کہ "اس جماعت سے مقابلہ آپ کے لیے ممکن نہیں لہٰذا آپ میرے ساتھ کوہ اجا پر چلئے جہاں شاہان غسان وحمیر اور اور نعمان بن منذر ایسے زبردست بادشاہ تک ہم پر قابو نہیں پا سکے۔ وہاں میں ذمہ داری لیتا ہوں کہ قبیلۂ طے کے بیس ہزار سپاہی آپ کی مدد کے لیے تیار ہوں گے۔"

امام نے طرماح کی مخلصانہ پیش کش پر انھیں دعائے خیر دی لیکن ان کے مشورہ پر عمل کرنے سے معذوری ظاہر فرمائی۔ (۱)

(۱۳) قصر بنی مقاتل

عذیب الہجانات سے امام حسینؑ کوفہ کے راستے کو چھوڑ کر داہنے ہاتھ کی سمت روانہ ہوئے یہاں تک کہ قصر بنی مقاتل پہنچے۔ یہاں پہنچکر آپ نے اور ساتھ ہی ساتھ حُر نے بھی قیام کیا (۲)

اسی منزل پر کوفہ کے بہادروں اور شہسواروں میں سے ایک شخص عبید اللہ بن حُر جعفی قیام پذیر تھا۔ حضرت نے اتمام حجت کے لیے اُسے نصرت کی دعوت

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۰-۲۳۱ (۲) اخبار الطوال صفحہ ۲۴۹

دی مگر اُس کی قسمت میں یہ سعادت نہ تھی اور اُس کی قوت ارادی ابھی اس پختگی تک پہنچی ہوئی نہ تھی۔ اس نے حیلہ حوالہ کرکے اس موقع کو ہاتھ سے دے دیا (۱) جس پر اسے عمر بھر افسوس رہا اور بعد میں خون امام کے انتقام لینے میں شریک ہوا۔

یہاں سے روانگی کے قبل رات کے آخری حصہ میں حضرت نے اپنے قافلہ کے جوانوں کو پانی بھر کر ساتھ لینے کا حکم دیا جس کی تعمیل ہوئی۔ پھر سب آگے روانہ ہوئے (۲)

ابھی تھوڑا راستہ طے ہوا تھا کہ امام پر کچھ غنودگی سی طاری ہوئی۔ آنکھ کھلی تو آپ فرما رہے تھے "انا للہ وانا الیہ راجعون والحمد للہ رب العالمین" دو تین مرتبہ آپ نے یہی کلمات زبانِ مبارک پر جاری فرمائے۔

اس وقت آپ کے فرزند علی اکبر گھوڑا بڑھا کر آپ کے قریب آئے اور اس وقت ان کلمات کے زبان پر جاری کرنے کا سبب دریافت کیا۔ حضرت نے فرمایا "ابھی میری آنکھ لگ گئی تھی۔ میں نے ایک سوار کو دیکھا جو کہہ رہا تھا کہ لوگ تو راستے پر جا رہے ہیں اور موت ان کی طرف آرہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح ہماری موت کی اطلاع دی گئی ہے۔" علی اکبر نے عرض کیا "بابا خدا آپ کو رنج کی صورت نہ دکھلائے، کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟" امام نے فرمایا "کیوں نہیں؟ یقیناً قسم اُس خدا کی جس کی جانب تمام خلق کی بازگشت ہے ہم حق پر ہیں"۔ علی اکبر نے کہا "جب ہم حق پر ہیں تو پھر ہمیں موت کی کیا پرواہ ہے" امام نے فرمایا "بیٹا تمہیں خدا جزائے خیر دے۔ بہترین جزا جو کسی بیٹے کو اُس کے باپ کی طرف سے مل سکتی ہو" (۳) یہ غربت نفس،

---

(۱) طبری ج ۶ صہ ۲۳۱ الاخبار الطوال صہ ۲۴۹ (۲) طبری ج ۶ صہ ۲۳۱ (۳) طبری ج ۶ صہ ۲۳۱-۲۳۲۔ ارشاد صہ ۲۳۷-۲۳۸۔

اطمینان قلب اور ثبات ضمیر کا عجیب مرقع تھا۔

(۱۳) نینوا

قافلہ راستہ قطع کر رہا ہے۔ امام آگے بڑھتے جا رہے ہیں اور حُر کی طرف سے بھی اب کوئی مزاحمت نہیں کیجا رہی ہے، یہاں تک کہ "نینوا" کی زمین تک پہنچنا ہوا۔ یہاں ایک سوار مسلح کوفہ کی طرف سے آتا دکھائی دیا اور سب ٹھہر کر اُس کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ پہونچا تو اُس نے حُر اور اُس کے اصحاب کو تو سلام کیا لیکن حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کو سلام کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ یہ ابن زیاد کا قاصد تھا جو حُر کے نام خط لایا تھا، اُس خط میں لکھا تھا کہ تم کو لازم ہے کہ جہاں پر تم کو یہ خط پہنچے وہیں پر حسینؑ کو آگے بڑھنے سے روک دو اور انھیں ایسی جگہ قیام کرنے پر مجبور کرو جہاں آب و گیاہ موجود نہ ہو اور نہ کوئی قلعہ یا جائے پناہ ہو اور میں نے اپنے فرستادہ کو حکم دے دیا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ساتھ رہے اور تمہاری کارگزاری کی مجھے اطلاع دے (۱) اور تم سے جدا نہ ہو جب تک کہ میرے حکم کی تعمیل نہ ہو جائے والسلام (۲) معلوم ہوتا ہے کہ امام کے ساتھ حُر کے رکھ رکھاؤ روادارانہ برتاؤ کی اطلاع ابن زیاد کو ہو گئی۔ اُس کا امام کے پیچھے اپنی فوج سمیت نماز پڑھنا، اور پھر کوفہ نے جانے کے مطالبہ سے دست بردار ہو کر یہ صورت تجویز کرنا کہ مدینہ اور کوفہ کے علاوہ دوسرا کوئی راستا اختیار کیا جائے یہ باتیں وہ ہو سکتی ہیں جن سے حُر کی وفاداری ابن زیاد کی نگاہ میں مشکوک بن جائے اور شاید اسی بنا پر اُسے ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنے حکم کی تعمیل میں حُر کی نگرانی اپنے قاصد سے کرائے۔ حُر جو کچھ بھی ہو ابھی تک دنیا کا بندہ

---

(۱) الاخبار الطوال ص ۲۴۹-۲۵۰ - (۲) طبری ج ۶ ص ۲۳۲ ارشاد ص ۲۳۸

تھا۔ اس لیے ہزار ناچاری و مجبوری اور ناخواستگی طبع کے ساتھ سہی مگر اس نے امام اور آپ کے اصحاب کے روبرو آکر یہ اعلان کیا کہ یہ امیر ابن زیاد کا خط ہے جس میں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ جہاں بھی مجھے یہ خط پہونچے وہیں پر میں آپ کو اترنے پر مجبور کروں اور یہ ابن زیاد کا قاصد ہے جسے حکم ہے کہ وہ مجھ سے بغیر اس حکم کی تعمیل کرائے ہوئے الگ ہی نہ ہو اس طرح حُر نے واقعی صورت حال کو صفائی کے ساتھ پیش کر دیا۔ اس کے بعد امام نے نہ چاہا کہ اُس کی ضمیر کی طاقت کا زیادہ امتحان لیا جائے۔ آپ نے اتنا کہا کہ اچھا ہم کو ذرا آگے بڑھ کر اس قریہ میں قیام کرنے دو جس کا نام "غاضریہ" ہے یا اس دوسرے قریہ میں جس کا نام شفیہ ہے (۱) مگر حُر نے کہا کہ مجھے اس کا اختیار نہیں ہے۔ مجھے تو حکم ہے کہ میں آپ کو ایسے خشک صحرا میں اُتاروں جہاں آب و گیاہ نہ ہو اور یہ شخص مجھ پر نگران مقرر کیا گیا ہے کہ یہ میرے طرزِ عمل کی جا کر اطلاع دے۔ اس جواب پر اصحاب امام میں جوش پیدا ہو گیا اور زہیر بن قین نے کہا کہ "فرزند رسولؐ ان سے جنگ کر لینا ہمارے لیے آسان ہے بہ نسبت اُن لوگوں سے جنگ کرنے کے جو اِن کے بعد آئیں گے کیونکہ اس کے بعد اتنی فوجیں آئیں گی اُن کے مقابلہ کی ہم میں طاقت نہ ہوگی۔" مگر امام نے فرمایا کہ "نہیں میں جنگ میں ابتدا کرنا نہیں چاہتا (۲)"

آخر امام حسینؑ نے حُر سے فرمایا کہ اچھا کچھ تو چلنے دو اور حُر خاموش ہو رہا۔

کربلا

امام ذرا بائیں طرف مڑ کر تھوڑا سا ہی چلے تھے کہ سپاہ حُر سامنے آکر سدِّ راہ ہو گئی اور کہا کہ بس یہیں اتر پڑیے۔ فرات یہاں سے دور نہیں ہے، امام نے نام پوچھا معلوم ہوا کربلا۔ فرمایا "اچھا کرب و بلا کی یہی منزل ہے" یہ کہہ کر گھوڑے سے اتر پڑے (۳) یہ دوسری محرم سنہ ۶۱ھ پنجشنبہ کا دن تھا (۴)

---

(۱) دینوری نے سفبہ لکھا ہے (الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۰) (۲) الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۰۔ طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۲۔ ارشاد صفحہ ۲۳۳۔ صفحہ ۲۳۹ (۳) طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۲ ارشاد صفحہ ۲۳۹ (۴) دینوری نے چہارشنبہ یکم محرم لکھا ہے (الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۰)

اب جبکہ امام کا سفر منزلِ آخر تک پہونچ گیا تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر کے مختلف پہلوؤں پر ایک سیر حاصل تبصرہ کر دیا جائے۔ تاکہ اُس کی اہمیت اور ضرورت کچھ اور واضح ہو جائے۔

یہ تو پہلے بیان ہو چکا ہے کہ امام کا مقصد یزید سے اُس طرح کی جنگ کرنا نہ تھا جیسی دنیا میں ہوا کرتی ہے آپ کو نہ سلطنت کا حاصل کرنا مقصود تھا، نہ براہ راست یزید کی سلطنت کا ختم کرنا بلکہ آپ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیں اور اُن میں ایک ایسا انقلاب ذہنی پیدا کر دیں کہ وہ یزید کے کردار کو اُس کی اصلی شکل میں دیکھنے لگیں اور اُس کے ظاہری دعوائے اسلام سے دھوکا نہ کھائیں۔ اس کے لیے آپ نے مدینہ سے روانگی اختیار کی۔ جہاں تک مدینہ سے نکلنے کا تعلق ہے پورے طور سے اس پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اگر آپ مدینہ میں قیام کرتے اور وہاں رہ کر یزید کے مقابلہ میں جنگ کرتے یا قربانی پیش کرتے تو اُسے وہ نوعیت پیدا ہی نہ ہوتی جو آپ کو مدنظر تھی۔ یا زہر کام کرتا اور یا تلوار مگر تلوار کیسی جس کی ذمہ داری کسی حکومت یا سلطنت پر عائد نہ ہو سکتی بلکہ کوئی خارجی نکلتا ابن ملجم کا سا جس نے علیؑ کو شہید کیا تھا یا کوئی تیر آتا آدمی نہیں بلکہ جنوں کی طرف سے جیسا کہ اسلامی تاریخ میں سعد بن عبادہ کا شام میں خاتمہ ہوا تھا۔ یہی ہوتی ہیں عام حکومتوں کی شعبدہ کاریاں جن کا نام دنیا نے "سیاست" رکھا ہے۔ حضرت امام اس طرح کی سیاست کے گُر کو خوب سمجھتے تھے چاہے خود اخلاقی و اسلامی پابندیوں کی وجہ سے اختیار نہ کریں۔ انھوں نے مدینہ اس لیے چھوڑا کہ اُن کا واقعۂ شہادت کوئی اچانک اور بے سان گمان کا حادثہ نہ سمجھا جائے ——— جا کر قیام کیا، کہاں؟ مکۂ معظمہ میں جو قلب جزیرۃ العرب تھا اور جہاں حج کے لیے بہرحال ہر طرف سے کھنچ کھنچ کر مسلمان جمع ہوتے تھے۔ علاوہ فریضۂ حج کے جو اسلامی شریعت کی رو سے ہر مستطیع مسلمان پر واجب ہے خود عرب کے قدیم روایات

اور سابقہ عملدر آمد کی وجہ سے جو صدیوں سے قائم تھا عرب کے اس خطہ کو تمام مختلف الخیال قبائل عرب کا محل اجتماع ہونا ضروری تھا وہ مشہور کانفرنس جو شعر و سخن اور خرید و فروخت کے لیے قائم ہوتی تھی۔ جن کو "اسواق العرب" کہا جاتا تھا، ذیقعد سے لے کر محرم تک مکہ و طائف اور مدینہ کے درمیان ہی قائم ہوتی تھیں۔ امام حسینؑ کی شخصیت دنیائے عرب میں کوئی اجنبیت نہ رکھتی تھی۔ اگرچہ مذہبی احساسات مردہ ہو گئے تھے اور حضرت کو آپ کے پورے مراتب کے ساتھ لوگ نہ پہچانتے تھے لیکن رسول کے نواسے، سلطانِ حجاز و عراق کے فرزند، ملک عرب کے سب سے بڑے سخی جس کے در سے کوئی سائل محروم نہیں پھرا، بنی ہاشم کے بزرگ خاندان اور اسلام کے سب سے بڑے عالم یہ عنوان وہ تھے جن سے کوئی بھی ناواقف نہیں تھا۔ حسینؑ نے یہی خاص زمانہ کہ جو تمام قبائل عرب کے اجتماع کا تھا مکہ میں اپنے قیام کے لئے تجویز کیا۔ امام حسینؑ کا یہاں خاموشی کے ساتھ قیام بھی تمام اطراف ملک میں آپ کی بیعتِ یزید سے کنارہ کشی کے اعلان کے لیے کافی تھا اور یہی سب سے بڑی وجہ وہ تھی جس کی بنا پر آپ کی زندگی سیاست وقت کے لیے یہاں بھی ناقابل برداشت ثابت ہوئی چنانچہ یزید کی طرف سے حاجیوں کے بھیس میں آدمی بھیجے گئے تاکہ وہ آپ کو گرفتار کریں یا قتل کر دیں۔

امام حسینؑ جیسا کہ مکہ سے روانگی کے وقت فرما دیا تھا یہ نہ چاہتے تھے کہ آپ مکہ کے اندر شہید کئے جائیں جس کی بنا پر خانۂ کعبہ کی حرمت زائل ہو۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ خانۂ کعبہ کے گرد و پیش حج کے زمانہ میں ہر قسم کے لوگ ہر طرف سے آئے ہوئے ہوتے ہیں اور امام حسینؑ کے لیے یہ غیر ممکن تھا کہ آپ عرفات، منی، مشعر، مقام ہر جگہ اپنے ساتھ محافظ رکھتے۔ ایسی صورت میں بہت آسان

تھا کہ حجرِ اسود کے استلام کے وقت، عرفات میں وقوف کی حالت میں، مشعر کی طرف واپسی کے دوران میں، منیٰ میں قربانی کے موقع پر، مقام ابراہیم میں نماز پڑھنے کی حالت میں، کسی وقت آپ پر قاتلانہ حملہ ہو جاتا اور قاتل موجودہ ہنگامۂ وازدہام کے اندر گم ہو جاتے۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا تھا کہ حسینؑ کا قاتل حقیقۃً یزید یا اس کا کوئی فرستادہ ہے۔

اس شدید خطرہ کی بنا پر امام حسینؑ نے مکہ کو چھوڑا اس طرح کہ حج کو بھی تکمیل نہ کیا جس کا سبب وہی ہنگامی صورتِ حال تھی جو پیدا ہو گئی تھی مگر جیسا کہ علامہ سید ہبتہ الدین شہرستانی نے "نہضۃ الحسین" میں لکھا ہے اس طرح دفعۃً ایسے موقع پر امام کی روانگی نے تمام قبائل عرب کے نمائندوں میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑا دی۔ اور اگر کوئی تاریخ اس موقعہ کی مکمل اسی وقت قلم بند کی گئی ہوتی تو اس میں ضرور نظر آتا کہ اس موقع پر کن خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ حسینؑ بن علیؑ کہاں چلے گئے؟ حج بھی نہ کیا؟! آخر تمام اہل و عیال و اقربا کے ساتھ اپنے نانا کے قبر کے جوار کو کیوں چھوڑ دیا؟

"یزید کے خوف سے"۔

کیوں؟ یزید کیا چاہتا ہے؟

"حسینؑ سے بیعت کا طالب ہے"۔

لاحول ولاقوۃ۔ بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟ فرزند رسول ساحق آشنا یزید ایسے شرابخوار اور زناکار کی بیعت کرے! اچھا پھر مکہ معظمہ میں کیوں قیام نہ کیا؟ کس لیے حج کو بھی تکمیل نہ کیا؟!

"جان کا خطرہ تھا شاید مکہ میں حسینؑ کو قتل کرنے لیے شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے تھے" توبہ! توبہ! اس سے بڑھ کر سفاکی اور ظلم کیا ہو گا۔ ارے فرزند

رسول کو حرم میں بھی چین نہ لینے دیا۔ کم و بیش اس قسم کے تذکرے ہوں گے جو مکہ معظمہ اور اس کے اطراف و جوانب میں اکثر باخبر حلقوں میں بڑی قوت کے ساتھ ہو رہے ہونگے۔ اُس زمانہ میں جب مراسلت و مخابرت کے طریقے محدود تھے اور تار، ٹیلیفون ریڈیو وغیرہ خبر رسانی کے ذرائع نایاب اس سے بہتر کوئی صورت واقعات کی اشاعت کے لیے نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے کہ بعد اختتام حج جو شخص بھی اپنے شہر میں واپس آتا اُس کو تازہ واقعات کے ضمن میں حسینؑ کی نقل و حرکت اور اُس کے اسباب و علل کا بیان کرنا ضروری تھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ امام کی موافقت میں کسی لشکر کے جمع ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا بلکہ یہ کہ پہلے سے ان حالات کی اشاعت ہو جانے کی وجہ سے آپ کی شہادت نامعلوم اسباب و علل کا نتیجہ قرار نہیں دی جا سکی اور حکومتِ شام کو اُس کے متعلق اپنے سیاسی مفاد کے لحاظ سے مخصوص وجوہ تراشنے کا موقع نہیں مل سکا اور امام حسینؑ کی مظلومیت و حقانیت پر پردہ نہ ڈالا جا سکا لیکن اگر ایسا ہوتا تو سلطنت یزید کی طرف سے امام کی شہادت کو طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے اور آئین و شعائر اسلام کے تحفظ کا وہ بلند مقصد جو امام کے پیش نظر تھا اتنے کامیاب طریقہ پر حاصل نہ ہوتا۔ مگر یہ امامؑ کے انتہائی مدبرانہ طریقۂ کار کا نتیجہ تھا کہ اِدھر امام شہید ہوئے اور اُدھر تمام دنیا نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ آپ ناحق قتل کیے گئے شام کا حاکم اور اس کے وزراء اور ہوا خواہ کسی تہمت کے تراشنے کا موقع نہ پا سکے۔ اس لیے کہ امام حسینؑ نے اپنی نقل و حرکت کے اسباب کو اپنی شہادت کے پہلے ہی عالم اسلام میں شایع کر کے دشمنوں کی زبانیں بند کر دیں اور اپنی حقانیت کے سامنے دنیا کا سر خم کرا لیا۔

نتیجہ کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ حسینؑ کا قافلہ جو مکہ سے نکل کر جا رہا تھا ایک خاموش مبلغ تھا۔ اس لیے کہ حج کی وجہ سے عراق، یمن، طائف وغیرہ سب طرف سے قبائل مکہ میں آ رہے تھے۔ اور اِدھر امام حسینؑ اپنے اہل

واقربا۔ انصار و اصحاب کی جماعت کیساتھ خیمہ و خرگاہ تمام اسباب ساتھ لیے ایک قافلہ کی صورت میں مکہ سے جارہے تھے۔ عالم مسافرت میں زندگی گزارنے والے واقف ہیں کہ راستے میں چار پانچ آدمیوں کا بھی قافلہ نظر آئے تو کھوج پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آتے ہیں؟ اور کیوں؟ پھر کہاں امام حسینؑ اور آپکے اصحاب و انصار کا شاندار قافلہ، حج کو صرف دو دن باقی رہتے ہوئے مکہ معظمہ کی طرف سے آرہا ہو جبکہ دنیا مکہ معظمہ کی طرف حج کیلیے جارہی ہو یہ وجوہ یقیناً جاذب نظر اور باعث توجہ تھے اور ایک اجنبی شخص کو یہ پوچھنا ناگزیر تھا کہ یہ کون جماعت ہے اور کہاں جارہی ہے؟ اور حسینؑ کا نام معلوم ہونے پر اسی قسم کا مکالمہ جیسا اوپر درج ہو چکا ہے اُن کے درمیان لازمی طور پر شروع ہو جاتا ہوگا۔ چنانچہ تاریخیں شاہد ہیں کہ فرزدق کی ملاقات امام سے یونہی ہوئی اور عبداللہ بن مطیع اور عمر بن عبدالرحمن مخزومی کی بھی کہ وہ مکہ کی طرف جارہے تھے اور امام مکہ کی طرف سے آرہے تھے، اس سے ظاہر ہے کہ حسین بن علیؑ اور ہاشمی جوانوں کا شاندار قافلہ جو خانہ خدا کو مجبوری چھوڑ کر دشت غربت میں راہ پیما تھا دور دور کے لوگوں کو حالات کی تحقیق اور حقیقت کے سمجھنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

مکہ سے نکلنے کے بعد آپ نے کوفہ کا رخ کیا۔ اس لیے کہ اہل کوفہ کے انتہائی اصرار کو عدم اعتماد کی بنا پر مسترد کر دینا اخلاقی و مذہبی حیثیت سے کسی طرح آپ کے نزدیک مناسب نہ تھا خصوصاً جبکہ آپ کے معتمد سفیر (مسلم بن عقیل) نے وہاں کے حالات کو قول و قرار کے موافق پاکر آپ کو اس کی اطلاع بھی دے دی تھی جس کے بعد امام کے لیے اُن کے مطالبۂ ہدایت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اتمام حجت کرنا ایک فریضہ تھا مگر اس ضمن میں اُس انقلاب کے لیے جو حضرت

کی شہادت سے پیدا ہونے والا تھا کچھ مزید اسباب کا اضافہ ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت امام حسینؑ وطن سے بےبسی اور بیکسی کے ساتھ نکلے تھے۔ مکہ میں بھی کوئی قابل اطمینان حالت نہ تھی مگر مکہ سے آپ کا سفر اختیار کرنا اہل کوفہ کے مہمان کی حیثیت سے تھا اور عرب کی غیرت و حمیت کا تقاضا مہمان کے بارے میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ عین موقع پر اہل کوفہ کثرت کے ساتھ امام حسینؑ کی نصرت کے لیے نہیں پہونچ سکے یا نہیں پہونچے مگر انسانی اور عربی فطرت کے لازمی نتیجہ کے طور پر یقینی تھا کہ بعد کو اہل کوفہ کے دل میں ایک عجیب بیقرار احساس پیدا ہو گا اس کا کہ ہم نے بلایا تھا اور مدد نہ کی اور یہی احساس آگے بڑھ کے اور پرورش پا کے ایک عظیم سیلاب کی صورت میں اُمنڈ یگا جو اس سلطنت کے بیڑے کو ہمیشہ کے لیے ڈبو کر چھوڑے گا۔ جس کا نتیجہ ہو گا امام کی فتح اور دشمن کی شکست بنی امیہ کی عداوت اور اُن کے وسیع ذرائع حکومت کو دیکھتے ہوئے یہ یا خیال پڑتا کہ امام حسینؑ تو ملک عرب میں جہاں جاتے آخر میں شہید ہوتے لیکن ظاہری حیثیت سے یہ نتیجہ مرتب نہ ہوتا جو کوفہ کی طرف آنے کی صورت میں ہوا۔ وہ لوگ جو مسلم کی شہادت کے بعد آپ کو واپسی کا مشورہ دے رہے تھے یقیناً نیک نیت اور اپنے نقطۂ خیال کے لحاظ سے حق بجانب بھی ہونگے مگر انھیں حسینی اقدام کی نوعیت کا اندازہ نہ تھا۔ عراق کا سفر اختیار کرنا اگر کچھ خوشگوار توقعات پر مبنی ہوتا تو بےشک اب اس ارادہ کو بدل جانا چاہیے تھا اس لیے کہ وہ توقعات اب مایوسی سے بدل گئے تھے لیکن جبکہ امام کے سامنے کوئی امیدوں کا سبز باغ نہیں تھا بلکہ اُس حد سے بڑھے ہوئے اصرار کی پذیرائی اور غیر معمولی طلب و دعوت کی قبولیت تھی جس سے اتمام حجت کا مقصد پورا ہوتا تھا تو اس ارادہ کو اتنے پر کہ آپ کو مسلم کی خبر شہادت

مل گئی متزلزل نہ ہونا چاہیے تھا۔ بلکہ استقلال و ثبات قدم، کوہ آسا عزم اور پختگی ارادہ، وعدہ کی پابندی اور اصول کے تحفظ کا تقاضا یہ تھا کہ آپ عملاً اس کا ثبوت پیش کر دیتے کہ آپ اپنے وعدہ پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ آگے بڑھتے میں خون ریزی اور نقض امن عامہ کے باعث ہوتے کا اندیشہ ہو گیا اس کے علاوہ ابھی مسلم کی شہادت کے تفصیلی حالات بھی تو عام طور پر لوگوں کو معلوم نہ تھے اور ظاہری اسباب کی بنا پر یہ ممکن تھا کہ وہ بڑی خونریز لڑائی کے بعد شہید ہوئے ہوں جسمیں اہل کوفہ نے پورے طور پر داد شجاعت دی ہو لیکن سرکاری فوج کے مقابلہ میں سر بر نہوئے ہوں اور ممکن ہے اُن کے دلمیں یہ ارمان ہوتا یا بعد میں کہنے کا موقع ملتا، کہ اگر امام حسینؑ آجاتے تو ہمیں تازہ قوت حاصل ہو جاتی اور حالات کا ورق بالکل پلٹ جاتا اس صورت میں آپ کا یہیں سے واپس ہو جانا جبکہ کوفہ کے بہت سے لوگ گویا آپ ہی کی خاطر سے ایک بڑی مصیبت اور کشمکش میں مبتلا ہو چکے، بڑی کمزوری اور کم ہمتی کا نمونہ سمجھا جا سکتا تھا۔ آپنے ارادہ میں تبدیلی کی بس اُس وقت جب حُر کا لشکر آپ سے دوچار ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ وہ آپ کو ابن زیاد کے پاس لے جانے پر مامور ہے اب امام نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اسلیے کہ اب آپ کا آگے بڑھنا دو ہی صورتوں سے ہو سکتا تھا ایک تو یہ کہ آپ جنگ آزمایانہ صورت سے فوجوں کو درہم و برہم اور راستے کو صاف کرتے ہوئے کوفہ پر حملہ آور ہوتے اور ابن زیاد کو کوفہ سے نکال کر وہاں اپنی عملداری قائم کرتے دوسرے یہ آپ صبر و خاموشی کے ساتھ جس طرح ابتک آرہے تھے اسی طرح کوفہ کی طرف اپنی رفتار کو جاری رکھتے۔

دوسری صورت موجودہ حالات میں غیر ممکن تھی کیونکہ ابتک آپ کا آگے بڑھنا خود مختارانہ حیثیت سے اور خود اپنے ارادہ سے تھا مگر حُر کی فوج کے اس قصد سے

آنے کے بعد کہ وہ آپ کو کوفہ ابن زیاد کے پاس لے جائے۔ آپ کا خاموشی کیساتھ آگے بڑھنا اس فوج کے ہاتھ میں اسیر ہونے اور ابن زیاد کا قیدی بنجانے کا مرادف ہوتا کیونکہ ابھی یہ حُر کی سپاہ ہے اور آگے بڑھ کر حصین کا فوجی مرکز ہے اور وہاں سے پھر افواج کے محاصرہ میں ابن زیاد کے پاس لے جایا جانا ہے جس کے بعد آپ کا معاملہ ابن زیاد کے ہاتھ میں ہے۔

اسی لیے آپ نے حُر کے اس اظہار کا کہ ہم آپ کو ابن زیاد کے پاس لے جانے کیلئے آئے ہیں انتہائی ترش جواب دیا کہ موت تمہارے لیے اس سے قریب تر ثابت ہوگی۔

بیشک پہلی صورت باقی تھی اور وہ یہ کہ آپ کوفہ پر حملہ آور ہوتے اور غنیم کی فوج کو پسپا کر کے وہاں اپنا قبضہ جماتے مگر ایک تو ظاہری اسباب کی بنا پر آپ کے ساتھ موجودہ فوجی طاقت ایسی نہیں تھی کہ وہ یزید کی منظم افواج کا مقابلہ کر سکتی اور بغیر ایسی طاقت کے موجود ہوئے ایک جگہ گھر لیے جانے کے بعد دفاعی حیثیت سے بہتر نفوس کو ساتھ لے کر تیس ہزار کا مقابلہ کر لینا تو عین شجاعت وہمت اور قابل ستائش طریقہ کار ہے مگر اس قلیل تعداد کے ساتھ غنیم پر جارحانہ طرز پر حملہ آور ہونا سوائے تہوّر اور ناعاقبت اندیشی کے اور کچھ قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ دوسرے یہ آپ کے اُس مسلک کے خلاف ہے جو آپ نے اختیار کر رکھا تھا کہ آپ کی اس مقاومت میں عوامی محاورہ کے لحاظ سے بغاوت اور شورش انگیزی کی صورت پیدا نہ ہونے پائے۔

اسی لیے آپ نے اپنی اُس گفتگو میں جو حُر کے ساتھ ہوئی تھی اپنے اس نقطۂ نظر کو واضح کر دیا تھا کہ میں بلایا ہوا آیا ہوں اگر میرا آنا ناپسند ہے تو میں واپس جاتا ہوں۔

چنانچہ فوج حُر کی اس مزاحمت کے بعد آپ نے کوفہ کا خیال ترک کر دیا اور حر کی معقول تجویز کے مطابق ایک دوسرا راستا اختیار فرمایا جس نے آگے بڑھ کر آپ کو میدان کربلا میں پہنچا دیا۔

اور یہی آپ کا اپنی طرف سے جنگ کی ابتدا نہ کرنے کا اصول اس کا بھی باعث ہوا کہ جب کربلا کی سرزمین پر پہنچکر فوج حر نے سختی کے ساتھ آگے بڑھنے سے روکا تو آپ نے وہیں پر خیمے نصب کرائے کیونکہ اب بغیر جنگ کیے ہوئے آگے بڑھنا ممکن نہ تھا پھر آگے بڑھنے کی صورت میں اگر کوئی اہم مرکز آپ کے پیش نظر ہوتا جہاں جا کر آپ اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتے تو ان لوگوں سے اپنے مقصد میں سدّ راہ ہونے کی بنا پر جنگ بھی کر لی جاتی لیکن جب آپ کے پیش نظر ایسا کوئی خاص مرکز نہیں تھا تو صرف اس بات پر جنگ کرنا کہ ہم یہاں نہیں ٹھہرینگے بلکہ کچھ آگے جا کر ٹھہرینگے ایک لاحاصل سی بات ہوتی۔

چنانچہ فوج مخالف کے مطالبہ پر آپ نے کربلا کی سرزمین پر فرات کے کنارے سے ہٹ کر خیمے نصب کر لیے۔ جس زمین کو اب کربلا کہا جاتا ہے یہ حقیقۃً مجموعہ ہے چند زمینوں اور قریوں کا جو اُس زمانہ میں بالکل پاس پاس واقع تھے۔ اس کی مثال زمینداریوں اور جاگیروں اور مواضعات کی حیثیت سے ہر ملک میں موجود ہے اور خصوصیت سے عرب میں ایسا پایا جاتا تھا کہ چھوٹے چھوٹے قطعات ارض کے مستقل نام ہوتے تھے جنھیں اگر ہر ایک کی خصوصیت کے لحاظ سے دیکھا جاتا تو وہ کئی مقام متصور ہوتے تھے اور اگر اُن کے باہمی قرب پر نظر کی جاتی تو وہ سب ایک قرار پاتے تھے اور اس طرح ایک جگہ کا واقعہ

دوسری جگہ کی طرف منسوب کیا جا سکتا تھا۔

جیسا کہ علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی نے "نہضۃ الحسین" میں لکھا ہے واقعہ کربلا کے محل وقوع کے ماتحت جو بہت سے نام گوش زد ہوتے ہیں۔ کربلا، نینوا، غاضریہ، شط فرات الغیس ایک ہی جگہ کے متعدد نام نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ وہ متعدد جگہیں تھیں جو باہمی قرب کی وجہ سے ایک ہی سمجھی جا سکتی تھیں اور اس لیے محل وقوع واقعہ کے اعتبار سے ہر ایک کا نام تعارف کے موقع پر ذکر کیا جانا صحیح قرار پاتا تھا۔

"نِینویٰ[1]" یہ ایک قریہ تھا جسے موجودہ زمانہ کے سدۂ ہندیہ کے قریب سمجھنا چاہیے، اس کے پہلو میں "غاضریہ" تھا۔ یہ قبیلہ بنی اسد کی ایک شاخ بنی غاضرہ کی طرف نسبت رکھتا تھا۔ اور ان ہی کا محل سکونت تھا یہ غالباً وہ زمین ہے جو اب حسینیہ کے نام سے مشہور رہے اسی جگہ ایک قریہ شفیہ تھا اور یہیں پر ایک قطعہ زمین کربلّہ[2] پایا جاتا تھا۔ وہ اب موجودہ شہر کربلا کے مشرقی حصہ میں جنوب کی طرف واقع ہے، اس کے متصل "عقر بابل" نام کا قریہ تھا جو غاضریات کے شمال مغرب میں واقع تھا۔ وہاں اب کھنڈر ہیں جن میں بہت اہم آثار قدیمہ کے انکشاف کی امید کیجاتی ہے اور یہ بالکل دریائے فرات کے کنارے پر تھا۔ اور اپنے قدرتی محل وقوع یعنی ٹیلوں میں گھرے ہونے کیوجہ سے ایک قلعہ کی حیثیت رکھتا تھا اس کے مقابل غاضریات کے دوسری جانب "نواویس" کا مقام تھا جو مسلمانوں کے فتوحات کے قبل ایک عمومی قبرستان کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے وسط میں زمین "حیر" تھی جو اب حائر کے نام سے معروف ہے اور جہاں حضرت امام حسینؑ کی قبر مبارک ہے۔ حیر ایک وسیع میدان کی

---

(۱) نون کے کسرہ کے ساتھ (۲) تشدید لام کے ساتھ

حیثیت رکھتا تھا جو تین طرف سے متصل اور پہلو بہ پہلو ٹیلوں سے گھرا ہوا تھا۔
ان ٹیلوں کا سلسلہ شمال مشرق کی طرف سے جدھر، حرم حسینی کا "باب السدر"
اور "منارۂ عبد" ہے شروع ہو کر غرب کی جانب باب زینبیہ کے حدود
تک پہونچتا تھا اور وہاں سے پیچیدہ ہو کر جنوب کیطرف در قبلہ کے مقام تک
آکر ختم ہوتا تھا ان متصل ٹیلوں کے اجتماع سے ایک نصف دائرہ کی شکل بنتی تھی
جو "ن" کی صورت سمجھی جاسکتی ہے۔ اس دائرہ میں داخل ہونے کا راستہ
مشرقی جہت میں اُس جانب سے تھا کہ جدھر روضۂ حضرت عباس میں جانے
کا راستہ ہے۔ تحقیقاتی انکشاف سے ابتک یہ بات پائی جاتی ہے کہ اُن مکانات
کے آثار میں جو قبر امام حسینؑ کے گرد ہیں شمالی اور مغربی جانب زمین کی قدیمی
بلندی کے قرینے موجود ہیں اور مشرقی جانب سوائے نرم مٹی کے جو پستی کیطرف
مائل ہے۔ کچھ نظر نہیں آتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کی قدیمی صورت ایسی
ہی تھی کہ شرق کی جانب سے ہموار اور شمال اور مغرب کیجانب ...... ہلالی شکل کے
طور پر بلند تھی۔ یہی ہلالی دائرہ وہ تھا جس میں امام حسینؑ کو گھیر کر شہید کیا گیا
تھا۔ فرات کی اصلی نہر جسے ہماری زبان کے اعتبار سے دریائے فرات کہا جاتا
ہے اُس کا براہ راست کوئی تعلق کربلا کی زمین سے نہ تھا۔ اُس کا خط سیر
حلّہ، مسیّب وغیرہ مقامات سے ہوتا ہوا کوفہ کے بیرونی حصّوں کی جانب جاتا
تھا۔ کربلا اور اُس کے درمیان بڑا فاصلہ تھا لیکن اس نہر یا دریائے فرات کی
ایک چھوٹی شاخ مقام "رضوانیہ" کے پاس سے نکل کر جدا ہوتی تھی جو کربلا کے
شمال مشرق جانب کے ریگستانوں اور نشیبوں سے ہوتی ہوئی اُس مقام سے
ہو کر گزرتی تھی جہاں علمدار حسینؑ ابوالفضل العباسؑ کی قبر ہے اور اس کے بعد
موجودہ مقام ہندیہ کیطرف سے ہوتی ہوئی اُس مقام کے شمال مغربی جانب

جس کا نام "قریہ ذی الکفل" ہے اصل دریائے فرات سے مل جاتی تھی۔ یہ چھوٹی نہر "علقمہ" کے نام سے موسوم تھی اور اُسے اپنی اصل کے اعتبار سے فرات بھی کہہ دیا جاتا تھا طف کے معنی ہیں "نہر کا کنارہ" خصوصیت سے دریائے فرات کے اُس کنارے کو جو جنوبی پہلو میں بصرہ سے ہیت تک تھا طف کہا جاتا تھا اور اسی مناسبت سے "فرات صغیر" یعنی نہر علقمہ کے اس کنارہ کو جس میں کربلا واقع تھا طف کہا جانے لگا اور اسی وجہ سے کربلا کے واقعہ کو "واقعۃ الطف" کہا جاتا ہے اور کربلا کو شط فرات کے نام سے بھی اسی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔

بیسواں باب

یزیدی حکومت کی سرگرمی اور کربلا میں فوجوں کی آمد

مسلم بن عقیل کی شہادت کے بعد کوفہ میں سخت گیری انتہا تک پہنچ گئی۔ ابن زیاد کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلم کی بیعت کرنے والے جو اُن کی امداد سے قاصر رہے وہ اب اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے کوئی انقلاب پیدا کریں لہٰذا اُس نے تلاش کر کے جن جن اشخاص کو حضرت امام حسینؑ کا ہمدرد سمجھا جا سکتا تھا یا اُن پر ایسا شبہ بھی ہو سکتا تھا انھیں قتل یا قید کرنا شروع کر دیا۔

میثم تمار اور رشید ہجری اسی دوران میں شہید کیے گئے۔

مختار بن ابو عبیدہ جو مسلم کے زمانہ میں کوفہ کے اندر موجود نہ تھے اور اسی دن اطلاع پا کر آئے لیکن ایسے وقت پہنچے کہ مسلم شہید ہو چکے تھے اور عمرو بن حریث نے رایت امان بلند کیا تھا کہ جو شخص اس کے نیچے چلا آئے گا اُس کا جان و مال محفوظ رہے گا۔ چنانچہ مختار موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے اُس جھنڈے کے نیچے چلے گئے مگر انھیں اس پر بھی امان نہ مل سکی اور پا بزنجیر کر کے قید خانہ بھیجدیے گئے اسی طرح عبداللہ بن حارث بن نوفل اور دیگر اشخاص۔

اُدھر یزید کو دمشق میں جناب مسلم کے جہاد کے قتل کی خبر کے ساتھ ہی حضرت امام حسینؑ کی مکہ سے روانگی کی اطلاع پہنچی تو اُس نے ابن زیاد کو خط لکھا۔

"مجھے خبر ملی ہے کہ حسینؑ بن علیؑ عراق کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں لہٰذا تم کو

لازم ہے کہ ہوشیاری کے ساتھ جاسوس مقرر کرو۔ مورچے مضبوط کرو اور
کسی شخص پر وہم وگمان بھی ہو تو اُس کا تدارک کرو اور فوراً گرفتار کر لو۔"

اب کیا تھا؛ جیلخانے قیدیوں سے چھلکنے لگے جس کا اظہار خود ابن زیاد نے
اس کے بعد ان الفاظ میں کیا کہ "کوئی ایسا شخص نہیں جس پر گمان ہو سکتا تھا
وہ حکومت کی مخالفت کریگا مگر یہ کہ وہ قید خانہ کے اندر ہے۔"

شہر کے اندرونی حالات پر اس طرح قابو پانے کے بعد اُس نے باہر کی طرف
توجہ کی اس لیے کہ اُسے اندیشہ تھا کہ کہیں بصرہ و مدائن اور دیگر اطراف کے لوگ
امام حسینؑ کی مدد کے لیے نہ آجائیں اس کے لیے حدود کی ناکہ بندی ہوئی اور
قادسیہ میں جو حجاز و عراق و شام کے خطوط سیر کا محل اجتماع تھا، چار ہزار سواروں
کے ساتھ حصین بن نمیر کو جواب تک کوتوال شہر کی حیثیت رکھتا تھا، مقرر کیا
گیا اور واقصہ سے لے کر قطقطانہ، لعلع اور خفان اور اطراف و جوانب میں جو شام
و بصرہ کے راستے تھے سب میں لشکر پھیلا دیا گیا یہاں تک کہ نہ کوئی شخص آسکتا
تھا اور نہ باہر جا سکتا تھا (۱) چنانچہ قیس بن مسہر صیداوی جو امام حسینؑ کا بھیجا ہوا
خط اہل کوفہ کے نام لیجا رہے تھے۔ اسی قادسیہ میں پہنچ کر حصین کے ہاتھوں گرفتار
ہوئے اور جب امام نے بطن عقیق کے بعد یہ سن کر کہ آگے فوج سد راہ ہے سمت سفر
میں تبدیلی فرمائی تو حر ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ اسی فوج میں سے بھیجا گیا جو قادسیہ
میں حصین کی سرکردگی میں موجود تھی —— جب حر نے ابن زیاد کے خط کی تعمیل
کرتے ہوئے حضرت امام حسینؑ کو کربلا میں اترنے پر مجبور کر دیا تو اُس نے ابن زیاد
کو اس کی اطلاع دی۔ یہ وقت وہ تھا کہ ملک عجم میں بغاوت ہو گئی تھی اور

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۲۳ و ۲۲۳ الاخبار الطوال ص ۲۴۳

"دستبنی" (۱) کے مقام پر قبیلۂ دیلم نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے مشہور فاتح عراق سعد بن ابی وقاص کے بیٹے عمر بن سعد کو چار ہزار فوج کا سردار بنایا گیا تھا اور اس کے لیے رے اور سرحد دستبنی و دیلم کی حکومت کا پروانہ لکھ دیا گیا تھا چنانچہ یہ فوج ایران جانے کے لیے باہر نکل بھی چکی تھی (۲) اور عمر بن سعد اس فوج کو ساتھ لیے کوفہ کے باہر مقام "حمام اعین" پر خیمہ زن تھا اور عنقریب آگے بڑھنے والا تھا (۳) اب امام حسینؑ کی مہم جو درپیش ہوئی تو ابن زیاد نے عمر بن سعد کو حکم دیا کہ پہلے اس مہم کو سر کر لے پھر ایران کی طرف روانہ ہو (۴)

عمر سعد صحابی تو نہیں مگر عام مسلمانوں کی اصطلاح کے مطابق تابعی ضرور تھا یعنی خلیفۂ دوم عمر بن خطاب کے انتقال کے دن اس کی پیدائش ہوئی تھی (۵) اور اس کے سن تمیز تک پہنچنے تک بہت سے صحابۂ رسول موجود تھے۔ یقینی ان کی زبانی اُس نے وہ احادیث بھی سنے ہوں گے جو پیغمبر اسلام نے حسنؑ و حسینؑ کے بارے میں فرمائے تھے۔ نیز امام حسینؑ کے ساتھ رسول کی انتہائی محبت کے واقعات بھی اُس کے گوش زد ہوئے ہوں گے پھر حضرت علیؑ بن ابی طالب کے

---

(۱) دستبنی کا نام تاریخ میں ہمدان اور رے کی فتح کے ساتھ ساتھ آتا ہے۔ نعیم بن مقرن نے ان مقامات کو ۲۱ھ یا ۲۲ھ میں فتح کیا۔ دستبنی چند اہل کوفہ میں تقسیم کر دیا گیا جن کے نام یہ ہیں عصمۃ بن عبداللہ ضبی، مہلہل بن زید طائی، سماک بن عبید عبسی، سماک بن مخرمہ اسدی اور سماک بن خرشہ انصاری۔ یہ لوگ مسلمانوں میں سب سے پہلے دستبنی کی چھاؤنیوں کے والی ہوئے اور انہوں نے دیلم سے جنگ کی۔ ایک قول یہ ہے کہ رے کو قرظہ بن کعب نے فتح کیا (طبری ج ۴ صـ۲۵۱) دستبنی ہمدان کا جزو تھا اور وہاں کی چھاؤنیاں ہمدان تک پھیلی ہوئی تھیں (طبری، ج ۴ صـ۲۵۲) نعیم نے فتح کرنے کے بعد رے کا قدیم شہر برباد کر دیا اور اُس سے ہٹ کر نئے شہر کی بنیاد قائم ہوئی (ایضاً صـ۲۵۳) (۲) الاخبار الطوال صـ۲۵۱ (۳) طبری ج ۶ صـ۲۳۲ (۴) طبری ج ۶ صـ۲۳۳ (۵) تقریب التہذیب صـ۱۹۰

زمانۂ خلافت میں جبکہ امام حسینؑ بھی کوفہ میں موجود تھے عمر بن سعد کا کچھ ایسا کم سنی اور بے شعوری کا دور نہ تھا۔ اسے یقینی قریب سے حضرت امام حسینؑ کے محاسن ذات اور بلند اوصاف واخلاق کے مشاہدہ کا موقع ملا ہوگا اور جب سے آپ مدینہ تشریف لے گئے تھے تو اتنک بیس برس کی مدت میں آنے جانے والوں کی زبان سے اُس نے امام کے زہد وتقویٰ عبادت وریاضت اور خوش اخلاقی وسخاوت کے کتنے ہی واقعات ضرور سنے ہوں گے۔

شاید انہی اُمور کا نتیجہ تھا کہ وہ حضرت امام حسینؑ سے جنگ کو پسند نہ کرتا تھا اور اسے ایک گناہ خیال کرتا تھا۔ چنانچہ اُس نے انکار کیا اور کہا کہ مجھے معاف کردیجئے تو بہتر ہے۔ ابن زیاد نے جواب دیا کہ اچھا تو ہمارا پروانۂ حکومت رے کا واپس کردو۔ یہ معاملہ سخت تھا۔ عمر سعد کو رے کی حکومت دل سے عزیز تھی۔ جاہ طلبی اور حق شناسی کے جذبوں میں کشمکش ہوئی یہاں تک کہ اُسے یکسوئی حاصل کرنے کے لیے ایک دن کی مہلت مانگنا پڑی۔ مہلت ملی اور عمر سعد نے اپنے مخصوص احباب واعزاء سے مشورہ کیا۔ سب نے مخالفت کی اور اس مہم کے لیے جانے سے منع کیا۔ حمزہ بن مغیرہ بن شعبہ نے جو اس کا بھانجا تھا حسب ذیل تقریر کی: "آپ حسینؑ سے جنگ کرنے کو نہ جایئے اور گناہگار ہونے کے ساتھ ساتھ رشتۂ قرابت کو قطع کرنے کے مرتکب نہ ہوجیے۔ خدا کی قسم اگر تمام دنیا کا مال ودولت اور دولت اور عالم بھر کی سلطنت آپ کے قبضہ میں ہو اور پھر وہ نکل جائے تو بہتر ہے اس سے کہ آپ حسینؑ کے خون کا بار اپنی گردن پہ لیں"(۱)

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۳۲

یہ وہ پہلو تھا جسے اُس کے پیچھے مشیر کار پیش کر رہے تھے لیکن دوسری طرف اُس کا جاہ طلبی کا جذبہ رہ رہ کر رے کی حکومت کا خیال دلا رہا تھا۔ وہ ایک دماغی کشمکش میں مبتلا تھا جسے شب کے تاریک پردہ میں اُس کے یہ اشعار ظاہر کر رہے تھے:۔

اأترك ملك الري والري رغبة ام ارجع مذموماً بقتل حسینؑ

وفی قتله النار التی لیس دونها حجاب وملك الري قرة عینی

(یعنی) کیا میں رے کی حکومت چھوڑ دوں در آنحالیکہ وہ مجھے دل سے پسند ہے یا میں حسینؑ کو قتل کر کے طوق مذمت میں گرفتار ہوں؟ اُن کو قتل کرنے میں دوزخ کی آگ ہے جس کے متعلق شک و شبہہ کی گنجائش نہیں اور رے کا ملک میری آنکھوں کے لیے ٹھنڈک ہے (۱)

بعض مورخین اس کے ساتھ مزید اشعار اور نقل کرتے ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ حسینؑ کے قتل کا جو کچھ جرم ہے اُس کا نتیجہ مرنے کے بعد نمایاں ہوگا جو معلوم نہیں صحیح بھی ہے یا نہیں پھر رے کی نقد حکومت کو چھوڑ کے آخرت کے راحت و آرام کی امید باندھنا کس سمجھدار آدمی کا کام ہو سکتا ہے؟!

غالباً ان اشعار کی روایت صحیح ہے اس لیے کہ نتیجۂ عمر بن سعد کے عمل سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ نتیجہ یہی تھا کہ دنیا کی وقتی دلفریبی غالب آئی اور اُس نے فرزند رسول سے جنگ کرنے پر کمر باندھ لی مگر ایک آخری بار ضمیر کی جھنکیوں نے اُسے پھر آمادہ کیا کہ وہ ابن زیاد سے کمزور الفاظ میں سہی معذرت کر لے چنانچہ اُس نے آ کر کہا کہ آپ مجکو دستبیٰ اور دیلم کے حدود کی طرف جانے پر مامور کر چکے ہیں۔ لوگوں کو اس کا علم بھی ہو گیا ہے اور میری فوج والوں نے

(۱) کتاب البلدان صد ۲۷۱

بھی وہیں جانے کی تیاری کی ہے۔ بہتر ہے کہ آپ مجھکو اُدھر ہی روانہ کیجئے اور حسینؑ بن علیؑ کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے کسی اور کو اشراف اہل کوفہ میں سے جو کسی طرح شخصیت وشہرت اور فن سپہگری و مہارت جنگ میں مجھ سے کم نہیں ہیں روانہ کردیجئے چنانچہ اُس نے چند آدمیوں کے سرداران اہل کوفہ میں سے نام بھی لے دیے مگر ابن زیاد برہم ہوگیا اور اُس نے کہا کہ تمہیں سرداران کوفہ کے نام مجھے گنوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اگر کسی کو بھیجنا ہوگا تو تم سے مشورہ لے کر نہیں بھیجوں گا۔ تم تو اپنے متعلق کہو کہ تمہیں جانا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جانا ہے تو ہمارا پروانہ حکومت رے کا واپس کرو۔ عمر سعد نے سمجھ لیا کہ بغیر قربانی کے اس جرم سے چھٹکارا ملنا ممکن نہیں اور قربانی کے لیے اُس کا نفس تیار نہیں ہوتا تھا۔ آخر اُس نے اقرار کرلیا کہ اچھا میں ہی جاؤں گا۔ چنانچہ وہی چار ہزار کی فوج جو ملک ایران جانے پر کمربستہ تھی کربلا کی طرف روانہ ہوگئی اور عمر سعد اس فوج کے ساتھ امام حسینؑ کے ورود کربلا کے دوسرے ہی دن (۱) یعنی تیسری محرم کو یہاں پہنچ گیا۔

کربلا میں حُر کے ساتھ ایکہزار کی فوج پہلے ہی سے موجود تھی۔ اب عمر سعد کی فوج ملا کر پانچہزار ہوئی۔ حضرت امام حسینؑ اور اُن کی مختصر جماعت کیلئے ظاہری حیثیت میں اتنا لشکر بہت تھا مگر امام حسینؑ کی خاندانی شجاعت، اور ان کی سچائی کی طاقت کا ابن زیاد کے دل پر اتنا رعب تھا کہ وہ فوج کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو بھی کم سمجھتا رہا چنانچہ حصین بن تمیم کو تو ان شہر کوفہ کی سرداری میں قادسیہ کے ناکے پر جو باقی تین ہزار فوج تھی وہ پوری کی پوری

---

(۱) اخبار الطوال صفحہ ۲۵۱ - طبری ج ۶ ص ۲۳۳

کربلا کی طرف منتقل کر دی گئی اس کے بعد کوفہ میں عام بھرتی کا اعلان کر دیا گیا اور ابن زیاد خود کوفہ سے باہر نکل کر نخیلہ میں جو کربلا کے راستہ پر تھا آکر خیمہ زن ہو گیا تاکہ اپنے سامنے افواج کا معائنہ کرکے پے در پے کربلا کی جانب روانہ کرے۔ اور بڑے بڑے سرداران کوفہ، حجار بن ابجر، شبث بن ربعی، عمرو بن الحجاج وغیرہ کو مامور کیا گیا کہ وہ اپنی جماعت کے ساتھ کربلا روانہ ہوں ان میں سے ہر ایک کثیر فوج کے ساتھ روانہ ہوتا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کا کوئی عذر بھی سنا نہیں جاتا تھا چنانچہ شبث نے بیماری کا عذر کیا تھا لیکن ابن زیاد نے کہا تم بیمار بن رہے ہو اگر تم ہماری اطاعت میں ہو تو ہمارے دشمن سے جنگ کے لیے روانہ ہو۔ مجبوراً شبث بھی روانہ ہوا بعض اشخاص ایسے بھی تھے کہ ابن زیاد کو اپنی صورت دکھا کر پھر کوفہ واپس چلے جاتے تھے۔ جب ابن زیاد کو اس کا علم ہوا تو اس نے سوید بن عبد الرحمن منقری کو کچھ سواروں کے ساتھ کوفہ روانہ کیا کہ جو شخص کوفہ میں نظر آئے اور وہ ابھی تک حسینؑ سے جنگ کرنے کو نہیں روانہ ہوا، اسے گرفتار کرکے میرے پاس لاؤ چنانچہ سوید نے کوفہ کے قبیلوں میں گردش کی۔ اتفاق سے ایک شخص شام کا رہنے والا اپنے کسی متروکہ کے جھگڑے میں کوفہ آیا تھا سوید نے اسے پکڑ کر ابن زیاد کے پاس بھیج دیا اس کی گردن مار دی گئی۔ اس واقعہ سے تمام لوگوں پر دہشت طاری ہو گئی اور سب امام حسینؑ سے جنگ کے لیے نکل کھڑے ہوئے (۱)۔ اس کے بعد تاریخ کے لحاظ سے مردم شماری کی ضرورت نہیں اور نہ علماء کے اقوال دیکھنے کی حاجت کہ بیس ہزار تھے جسے ابن طاؤس نے ترجیح دی ہے یا تیس ہزار جسکو علامہ مجلسی نے مانا ہے۔ یا پینتیس ہزار، جیسا کہ ابن شہر آشوب نے لکھا ہے یا ایک لاکھ تک مطابق بعض اہل مقاتل کی تحریر کے۔ بلکہ گزشتہ انتظامات ہی سے ظاہر ہے کہ کوفہ کی تمام قابل جنگ آبادی کربلا میں انڈیل دی گئی تھی جس کے بعد کربلا کی زمین فوجوں کی کثرت سے موجیں مارنے لگی تھی۔

اکیسواں باب

انصار امام حسینؑ انکی قلتِ تعداد اور اُسکے اسباب

سابقہ ابواب میں ان واقعات وحالات کا تذکرہ ہو چکا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ کی اُس جماعت میں سے جو حضرت امام حسینؑ کی ہمدردی رکھتی اور اور جنھیں آپ کی نصرت کا فریضہ محسوس ہو سکتا تھا۔ ایک کثیر تعداد پابزنجیر کر لی گئی تھی۔ نیز حدود کی ناکہ بندی (۱) نے اطراف وجوانب کے رہے سہے اشخاص کے لیے حضرت تک پہنچنا دشوار سے دشوار تر بنا دیا تھا اور کوفہ سے اگر کوئی آنے کا قصد کرتا۔ تو نخیلہ میں جہاں ابن زیاد نے اپنا پڑاؤ ڈالا تھا گرفتار کر لیا جاتا اور کسی دوسری طرف سے آنا چاہتا تو قادسیہ وخفان وقطقطانہ، لعلع وغیرہ کی کسی نہ کسی منزل پر وہ مقید ہو جاتا۔

اس کے علاوہ کربلا میں آپ کا ورود اچانک طور پر تھا اس لیے اطراف وجوانب میں اُسکی اطلاع تک ممکن نہ تھی جبکہ بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ اُس وقت تک بھی کہ جب امام حسینؑ شہید ہو چکے ہیں اور اسیروں کو کوفہ لے جایا گیا ہے بہت سے اشخاص ان واقعات سے بیخبر تھے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ آپکے پاس کوئی بڑی جمعیت نصرت کے لیے پہنچ جاتی خصوصاً جبکہ آپنے پہلے ہی نے اپنے ساتھ تعداد کے بڑھانے کی کوئی

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۲۲

کوشش بھی نہ فرمائی تھی ـــــ پھر بھی مذکورۂ بالا تمام مشکلات کے باوجود شیعیان کوفہ کی وفاداری اور اولوالعزمی کا ایک بڑا تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ وہ افراد جو امام حسینؑ کے کوفہ کی طرف تشریف لانے کی تحریک کے ذمہ دار تھے، جنھوں نے حضرت مسلم بن عقیل سے اُن کے ورود کے موقع پر پہلے جلسہ میں وفاداری کا اقرار اور جانبازی کا عہد کیا تھا وہ کسی نہ کسی طرح حسینؑ بن علیؑ تک پہنچ گئے اور اپنی جانیں آپ کے قدموں پر نثار کر دیں اور جو لوگ اس جماعت میں سے حسینؑ کی نصرت کے لیے نہ پہنچے یا نہ پہنچ سکے اُن میں سے بھی کسی متنفس کی امام حسینؑ کے خلاف معرکۂ کربلا میں موجودگی ہرگز پائی نہیں جاتی۔

بلکہ کچھ کمزور عزم و ایمان رکھنے والے اشخاص جو بظاہر ضعیف العمر بھی تھے اس لیے ابن زیاد کی فوج میں جانے سے بھی مستثنیٰ ہو سکے تھے اُس وقت جب کربلا میں جہاد ہو رہا تھا بیرونِ کوفہ ٹیلے پر کھڑے آنسو بہا رہے تھے اور دعائیں مانگ رہے تھے کہ خداوندا اپنی نصرت نازل فرما اہلبیتِ رسولؐ اور ان کے انصار پر۔ جنہیں اس طرح دیکھ کر راوی کو غصہ آیا اور کہا اے کم بختو تمہارے جذبات یہ ہیں تو آخر خود جا کر نصرت کیوں نہیں کرتے (۱)

مگر یہ توقع ہر شخص سے کرنا کہ وہ عزم و ہمت میں مسلم بن عوسجہ اور حبیب بن مظاہر ہی ثابت ہو ایک دور از کار بات ہے۔ بہر حال ان کمزور نفوس والے افراد کے بالمقابل اُن پُرجگر اور باوفا افراد کی تعداد جنھوں نے امام حسینؑ کا اُس نازک موقف میں ساتھ دیا اور وہ کوفہ ہی کے باشندہ تھے بجائے خود قلیل ہونے کے باوجود تاریخ عالم کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے ہرگز کم نہیں ہے۔

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۲۲

یہی وہ پہلو ہے جسے اہل کوفہ کی حمایت میں پیش کیا گیا اُس وقت جب ابوالعباس سفاح کے سامنے ابوبکر ہذلی بصری اور ابن عیاش میں بصرہ اور کوفہ کی باہمی فضیلت کے بارے میں مناظرہ ہوا اور ابن عیاش نے شجاعت کے تذکرہ میں کچھ شہسواران کوفہ کے نام لیے اور ابوبکر ہذلی نے دکھتی ہوئی رگ کو دباتے ہوئے کہا کہ "کوفہ والوں کی بہادری کا کیا کہنا کہ اُن میں جتنے بھی تھے وہ یا امام حسینؑ اور اُن کے اقربا و انصار کے قاتل تھے یا عدم تعاون کرنے والے یا اُن کا مال و اسباب لوٹنے والے یا اُن کی لاشوں کو پامال کرنے والے۔ یہ سُنکر ابن عیاش نے کہا کہ جو فخر کا پہلو ہے وہ تم نے چھوڑ دیا اور طعنے دینے پر اتر آئے۔ تم نے امام حسینؑ کے والد بزرگوار حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کو قتل کیا ابن ملجم بصرہ کا رہنے والا تھا رہ گئے اہل کوفہ۔ اُن میں سے حضرت امام حسینؑ کے ساتھ روز شہادت چالیس آدمی تھے جبکہ آپ کے سپاہیوں کی مجموعی تعداد تقریباً ستر تھی اور کوفہ کے یہ جتنے آدمی تھے اُن میں سے کوئی ایک بھی زندہ واپس نہیں گیا بلکہ سب نے امام پر اپنی جان نثار کی اور ہر ایک نے قتل ہونے سے پہلے کچھ نہ کچھ اپنے دشمنوں کو بھی قتل کیا (۱)

حقیقت یہ ہے کہ فوج عمر سعد میں کوفہ کے عوام تھے اور اطراف و جوانب کے قبائل جن کا مسلک صرف اطاعت شیوخ تھا اور کچھ نہیں۔ ان میں سے اکثر کا نصب العین قتل امام حسینؑ میں صرف حکم حاکم کی تعمیل اور اپنی فوجی ذمہ داری کا پورا کرنا اور جائزہ و انعام کی ہوس تھی۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو حضرت امام حسینؑ سے جنگ کرنے پر خوشی سے رضامند نہ تھے

---

(۱) کتاب البلدان ص ۱۷۵

مگر اُن میں اتنی قوت ارادی نہ تھی کہ وہ حکومت کے خلاف اپنے اختیار سے کام لیں۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ اُن میں بہت سے ایسے جوان اور نو عمر بھی ہوں جو حسینؑ کی شخصیت سے آگاہ ہی نہ ہوں اور وہ صرف سمجھتے ہوں کہ ہم کو حاکم کی طرف سے ایک باغی سے مقابلہ کرنے کے لئے روانہ کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف حضرت امام حسینؑ کے ساتھ کوفہ کے جتنے آدمی تھے وہ وہاں کی خلقت کے دل و دماغ تھے وہ وہ تھے جو دنیا کے تمام محرّکات کے مقابل میں اپنے شعور اور ارادہ کے مالک ثابت ہوئے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ ان میں سے بہت سوں سے کوفہ کے عوام واقف بھی تھے اور اُن کی شخصیت سے متاثر ہوتے تھے اور اُن کے لیے یہ عجیب معمہ بن گیا تھا کہ ایسے عابد و زاہد اور پرہیزگار لوگ آج کس طرح میدان جنگ میں آ گئے ہیں۔ ان شخصیتوں کا فوج مخالف کے افراد پر اتنا زبردست اثر پڑ رہا تھا کہ اُن کے دلوں کی طاقت نے جواب دے دیا تھا۔ واقعۂ کربلا کی جنگ میں بارہا تاریخ کے اوراق پر نظر آتا ہے کہ فوج مخالف نے حسینی مجاہدین کے سامنے سے فرار کیا۔ حقیقۃً یہ فرار مادی قوت کی کمی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس میں سب سے زیادہ ضمیر کی کمزوری کا دخل تھا۔

درحقیقت یہ ایک مارے باندھے کا سودا تھا جو کیا جا رہا تھا جس کیلئے آخر وقت تک فوج کی اکثریت سپر انداختہ ثابت ہو رہی تھی اور کچھ افسران فوج کی زبردستیاں اور جائزہ و انعام وغیرہ کے ترغیبات اور عتاب حکومت کے تازیانے ہی تھے جو اُن کے جذباتِ صداقت کی کمزوری کے باعث اُن کے رُکتے ہوئے قدموں کو بار بار آگے بڑھاتے تھے۔ اس کے برخلاف حسینی سپاہیوں کا ضبط و نظام ایک بے مثال نمونہ ہے۔ یہاں نہ بڑھنے کے موقع پر قدم پیچھے ہٹنے کا امکان تھا، نہ بے موقع قدم آگے بڑھنے

کا سوال۔ اُن کا کوئی اقدام جوش کے ماتحت نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ برابر اپنے سالار کے اشارہ کے منتظر رہتے تھے اور جس وقت تک امام اتمام حجت کی منزلوں کو ختم کر کے جنگ کے اقدام کو حق بجانب نہ سمجھ لیں اُس وقت تک ایک سپاہی بھی ایسا نہ تھا جو حسینی نظام کے خلاف خود رائی یا خود سری سے کام لے۔ یہ بات صرف اس لیے تھی کہ یہ جتنے افراد تھے سب عارف حق امام کے تربیت یافتہ اور صاحبِ اخلاق تھے۔

بائیسواں باب

صلح کی باتیں

عمر سعد چاہتا تو تھا ہی کہ کسی طرح اس جرم عظیم سے جس میں وہ حرص دنیا کی بدولت اپنے ہاتھوں گرفتار ہوئے جا رہا ہے چھٹکارا حاصل کرے چنانچہ اس نے کربلا آکر ایک کوشش معاملات کے سلجھانے کی شروع کی۔ اس طرح کہ عزرہ بن قیس احمسی کو بلا کر یہ چاہا کہ وہ امام حسینؑ کے پاس جا کر آپ کے مقصد تشریف آوری کو معلوم کرے مگر عزرہ یہ ان سات آدمیوں میں سے تھا جنھوں نے وقتی سیاست سے متاثر ہو کر جماعت شیعہ کے خطوط جانے کے بعد اپنی جانب سے امام حسین کو ایک دعوتی خط لکھ دیا تھا۔ اس لیئے اُس کو آپ کے پاس جانے اور اس قسم کی گفتگو کرنے سے حجاب دامن گیر ہوا۔ اور اُس نے انکار کر دیا کہ میں نہیں جاؤنگا دوسرے ایسے اشخاص کو بھی جو خطوط لکھ چکے تھے جانے میں اسی صورت سے توقف ہوا اور آخر کثیر بن عبد اللہ شعبی۔ ایک درشت خو اور سخت آدمی یہ کہتا ہوا سامنے آیا کہ میں جانے کے لیے تیار ہوں بلکہ مجھے حسینؑ کے قتل کرنے کے لیے کہا جائے تو اس میں بھی عذر نہیں ہے۔ عمر سعد نے کہا نہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے۔ تم بس جا کر اتنا دریافت کر لو کہ آپ اس ملک میں کس لیئے آئے ہیں۔ کثیر خیمہ گاہ حسینی کی طرف روانہ ہوا۔ بہادر ابو ثمامہ

صائدی نے جو شاید اس وقت خیمۂ امام حسینؑ پر پہرا دے رہے تھے، اُسے دور سے دیکھ لیا اور امام سے عرض کیا کہ آپ کی طرف بد ترین خلق اور انتہائی سفاک و خونریز شخص آرہا ہے اس کے بعد وہ خود آگے بڑھ گئے۔ اور انھوں نے کثیر کو روک کر ہتھیار کھول کے رکھ دینے کا مطالبہ کیا۔ اس نے کہا نہیں، یہ نہیں ہوسکتا، میں پیغام لے کر آیا ہوں اگر تم مجھے موقع دو تو میں پیغام پہنچا دوں۔ نہیں تو واپس جاؤں۔ ابو ثمامہ نے کہا اچھا میں تمھاری تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھے رہوں گا۔ اور اس طرح تم کو امام کی خدمت میں لے جاؤں گا۔ کثیر نے اسے بھی منظور نہ کیا اور کہا میری تلوار کو تو تم ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ ابو ثمامہ نے کہا اچھا پھر اپنا پیغام تم مجھ سے کہہ دو۔ میں اُس کا جواب امام سے لا دوں گا۔ اس طرح گفتگو بڑھتے بڑھتے بالآخر سخت کلامی کی نوبت آگئی اور کثیر نے واپس جا کر عمر سعد کو اپنی سرگزشت سے مطلع کر دیا۔

اب اُس نے قرہ بن قیس حنظلی کو بلایا اور اُس سے کہا تم جا کر حسینؑ سے دریافت کرو کہ وہ اس سرزمین پر کس لیے آئے ہیں [1]۔ چنانچہ قرہ بن قیس روانہ ہوا۔ امام نے جو اُسے آتے دیکھا تو دریافت فرمایا کہ تم لوگ اسے پہچانتے ہو؟ حبیب بن مظاہر نے کہا جی ہاں۔ یہ قبیلہ حنظلہ کا ایک شخص ہے۔ بنی تمیم میں سے اور ننھیال کی طرف سے ہمارا عزیز ہوتا ہے۔ میں ایک عرصہ سے اس کو جانتا ہوں اور میرے خیال میں یہ سنجیدہ و فرزانہ شخص تھا۔ مجھے یہ خیال نہ تھا کہ یہ اس موقع

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۲ دینوری کا نے قرہ بن سفیان حنظلی درج کیا ہے (الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۱)

پر جنگ کے لیے ہمارے مقابل میں آئے گا۔ اتنی دیر میں وہ آگیا اور امام کی خدمت میں تسلیم بجا لاتے ہوئے اُس نے عمر سعد کا پیغام پہونچایا۔ وہی کہ آپ کی تشریف آوری کا مقصد کیا ہے؟ حضرت نے فرمایا۔ "مجھ کو تمھارے شہر کے لوگوں نے لکھا تھا کہ میں آؤں لیکن اب جب کہ وہ میرا آنا ناپسند کرتے ہیں تو میں واپس چلا جاؤں گا۔" جواب اتمام حجت کے مقصد کا حامل اور صلح پسندی کے مطابق ہونے کے ساتھ ساتھ بالکل صاف تھا۔ قاصد واپس جانے لگا۔ حبیب بن مظاہر کو موقع تبلیغ کا مل گیا۔ کہنے لگے "اے قرہ بن قیس ظالم جماعت کی طرف کہاں واپس جاتے ہو، آؤ اور اس مظلوم کی مدد کرو جس کے بزرگوں کی بدولت تمھاری اور ہماری ہدایت ہوئی ہے۔" قرہ نے کہا میں جو پیغام لایا تھا اُس کا جواب پہونچا دوں، پھر غور کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے جاکر عمر سعد سے جواب امام حسینؑ کا بیان کیا۔ اس جواب سے اُسے توقع پیدا ہوئی کہ اب صلح ہو جائے گی۔ لہذا اُس نے عبید اللہ بن زیاد کے نام خط لکھا کہ "میں نے یہاں پہونچ کر حسینؑ کے پاس اپنا نمائندہ بھیجا اور اُس کے ذریعہ سے دریافت کیا کہ وہ ادھر کیوں آئے ہیں، کیا چاہتے ہیں اور کیا مطالبہ رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ اس ملک کے لوگوں نے مجھ کو لکھا تھا اور میرے پاس اُن کے قاصد گئے تھے اور مجھے ادھر آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن اب جبکہ وہ میرا آنا ناپسند کرتے ہیں اور ان کے خیالات میں تبدیلی ہو گئی ہے تو میں جہاں سے آیا ہوں ادھر ہی واپس چلا جاؤں گا۔"

خط پہونچا۔ ابن زیاد نے پڑھا اور غرور و تکبر، فرعونیت اور ظلم د

سفاکی کے جذبہ کے ماتحت اُس نے یہ شعر پڑھ کر اپنی تاریک ذہنیت کا ثبوت دیا۔

الآن اذ علقت مخالبنا بہ   یرجوا لنجاة ولات حین مناص

(یعنی) "اب جبکہ ہمارے چنگل ان تک پہونچ گئے ہیں تو وہ نجات کے طالب ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اب وہ ہم سے بچ کر کہاں جائیں گے"۔

اس نے عمر سعد کو لکھا :۔ "خط پہونچا اور حال معلوم ہوا۔ تم حسینؑ کے سامنے یہ سوال پیش کرو کہ وہ اور اُن کے تمام اصحاب یزید بن معاویہ کی بیعت کر لیں جب وہ ایسا کر چکیں گے تو پھر ہم رائے قائم کریں گے"۔[1]

اس خط سے عمر سعد کی امیدوں کی دنیا میں ایک دفعہ پھر تاریکی چھا گئی۔ اس خط کے عنوان میں ابن زیاد کی مفسدانہ اور فتنہ پسند ذہنیت کا پورا پورا ثبوت موجود تھا۔ اول بیعت یزید کا امام حسینؑ سے مطالبہ ہی ایسا تھا جس کا قبول کرنا آپ کے لیے ناممکن تھا۔ پھر اُس پر طرّہ یہ کہ بفرض محال بیعت کر لینے کی صورت میں بھی حکومت کی طرف سے کسی خوش گوار نتیجہ کا وعدہ نہ تھا بلکہ یہ کہا جا رہا تھا کہ پھر ہم رائے قائم کریں گے۔ اس کے یہی معنی ہو سکتے تھے کہ اس کے بعد بھی حکومت امام حسینؑ کے گزشتہ انکار بیعت کی بنا پر آپ کے لیے کچھ سزا تجویز کرنے کا حق رکھے گی۔"

خط کا انداز بتاتا ہے کہ ابن زیاد حضرت امام حسینؑ کے اتمام حجت پر مبنی جواب کی صحیح نوعیت کو نہیں سمجھا اور اُس نے خیال کیا کہ

---

(۱) الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۳۔

کہ فوج کی کثرت کو دیکھ کر آپ ڈر گئے ہیں اور اس لئے کہہ رہے ہیں کہ میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں گا۔ مگر عمر سعد حسینؑ اور اُن کے اصحاب کے تیوروں کو قریب سے دیکھ رہا تھا۔ اور سمجھتا تھا کہ آپ کا جواب صرف امن پسندی اور سلامت روی کا نتیجہ ہے۔ کسی ہیبت اور خوف پر مبنی نہیں ہے۔ اس لیے اس نے ابن زیاد کے اس خط کو بالکل نامعقول سمجھتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ امیر ابن زیاد امن و سکون کے خواہاں نہیں ہیں"۔ (۱)

پھر بھی اُس نے یہ کیا کہ ابن زیاد کا خط امام حسینؑ کے پاس بھیجدیا۔ امام حسینؑ نے وہی کہا جو عمر سعد سمجھ چکا تھا۔ یعنی "یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ موت ہی تو ہے۔ میں اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہوں"۔ (۲) عمر سعد نے یہ جواب امام حسینؑ کا ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۴ ارشاد صفحہ ۲۳۹۔ ۲۴۰ الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۱
(۲) الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۲۔

تیئسواں باب

بندشِ آب اور غلبۂ تشنگی

حقیقت امر یہ ہے کہ امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب و اقربا یہاں تک کہ اطفال خورد سال پر پانی بند کرنے کا انتظام دوسری محرم ہی کو ہوگیا تھا۔ اُس خط کے ذریعہ سے جو ابن زیاد نے حُر بن یزید ریاحی کے پاس بھیجا تھا اور جس میں صاف صاف لکھا تھا کہ حسینؑ کے ساتھ سختی سے پیش آؤ اور اُنھیں ایک ایسی جگہ قیام پر مجبور کرو جہاں پانی موجود نہ ہو۔ اس حکم کے نفاذ میں اتنا اہتمام تھا کہ قاصد کو یہ ہدایت کردی گئی تھی کہ وہ حُر سے اُس وقت تک جدا نہ ہو جب تک اس حکم کی تعمیل نہ ہوجائے چنانچہ حُر نے امام کے سامنے اپنی اس مجبوری کا اظہار کرکے حضرت کو کربلا میں ایسی ہی بے آب مقام پر قیام کے لیے مجبور کیا (۱) اس کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ پہلے ہوچکا ہے۔

اس کے بعد اب صورت حال یہ تھی کہ امام حسینؑ، آپ کے اصحاب و اعزا، مخدرات عصمت اور اطفال ان سب کے خیمے نہر سے دور جلتی ہوئی ریت پر تھے۔ صحرائے عرب کا سورج دن بھر اپنی پوری قوت سے ان خیام

---

(۱) الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۲ ارشاد صفحہ ۲۱۳ کامل ابن اثیر ج ۴ صفحہ ۲۶ ابو الفداء ج ۱ صفحہ ۱۹۰۔

پر چمکتا تھا جس کے اندر رہنے والے یقیناً تمازت آفتاب کی گرمی شدت کے ساتھ محسوس کر سکتے تھے۔ نہر فرات فاصلہ پر رواں تھی اور وہاں دشمن فوج کا قیام تھا۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ابن زیاد کے خط کے جس جزو پر ہر دیکھنے والے کی نظر سب سے پہلے پڑتی ہے اور جسے حرؒ نے بھی خاص اہمیت دی۔ "بے آب مقام" اس کے مقصد کی طرف خود ابن زیاد کی فوج کے سپاہیوں کی نظر نہ گئی ہو گی۔ جبکہ ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ حکومت کے اقتدار اعلیٰ والے افراد فریق مخالف کے ساتھ جس سختی گیری کا حکم نہیں بھی دیتے، چھوٹے درجہ کے عمال اور سپاہی بربنائے تعصب اور نیز اپنے بڑوں کو ان کے مخالف کے ساتھ سختی کر کے خوش کرنے کے لیے اس کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ چہ جائیکہ حاکم کی طرف سے شدت کے ساتھ سختی کرنے کا حکم اور پھر صاف صاف پانی سے دور رکھنے کا فرمان بھی ہو گیا ہو۔ اس کے بعد یہ کسی طرح سمجھا ہی نہیں جا سکتا کہ اب حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کے لیے پانی باطمینان و سکون اور بالکل آسانی بغیر کسی رکاوٹ کے حاصل ہو جاتا ہو گا۔

ہاں ممکن ہے حرؒ اپنی ذات سے سختی نہ کرتا ہو چونکہ وہ پہلے ہی امام کی حقانیت سے کچھ متاثر ضرور تھا مگر جب ابھی وہ "بازمانہ بساز" پر عامل تھا اور حکومت وقت کی مخالفت پر کھل کر آمادہ نہ تھا تو دوسرے سپاہیوں کو وہ صاف صاف سختی و درشتی سے باز بھی نہ رکھ سکتا تھا۔ اور اس لیے اصحاب امام کے لیے پانی تک پہنچنا اور پانی بھر کر لانا ہر مرتبہ ایک خطرہ اور کشمکش کا مقابلہ کرنا تھا جسے اسی وقت اختیار کیا جاتا ہو گا جب بچوں کی پیاس بہت بڑھ جائے یا پوری جماعت پر پیاس کا شدید غلبہ ہو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں

بعض وقت جنگ بھی ہو گئی ہے۔ اور جنگ کر کے پانی حاصل کیا گیا ہے (۱)

ساتویں محرم وہ خاص تاریخ تھی جب ابن زیاد کا دوسرا خط عمر سعد کے پاس پہونچا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ

"حسینؑ اور اُن کے اصحاب پر پانی بند کر دو۔ اس طرح کہ انھیں ایک قطرہ بھی پانی ملنے نہ پائے جیسا عثمان بن عفان کیساتھ سلوک کیا گیا تھا۔" (۲)

عمر سعد نے اس خط کو دیکھتے ہی عمرو بن حجاج زبیدی کو پانچ سو سوار (۱) کی فوج کے ساتھ گھاٹ کے اوپر مقرر کر دیا۔ اور یہ تاکید کر دی کہ ایک قطرہ خیام حسینی کی طرف جانے نہ پائے۔

تاریخ میں تصریح ہے کہ: امام حسینؑ کی شہادت سے تین روز قبل کا واقعہ ہے۔ (۳)

پانی کی اس بندش کے بعد جماعت حسینی کے تمام افراد اور بالخصوص صغیر اطفال پر پیاس کا شدید غلبہ ہو گیا۔ (۴)

پھر دشمن کی یہ تنگ نظری تھی کہ اس ظلم و تشدد کے ساتھ زخم زبان بھی لگائے جا رہے تھے۔ جیسے یہ فقرہ کہ: "حسینؑ! دیکھتے ہو یہ پانی نیلا آسمانی رنگت کا کس طرح بہہ رہا ہے۔ مگر تم مرتے دم تک اس میں سے ایک قطرہ بھی نہیں پا سکتے۔" (۵)

---

(۱) الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ صفحہ ۱۸۷ (۲) الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۲۔ طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۴ ارشاد

(۳) الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۲۔ طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۴۔ ارشاد کامل ابن اثیر ج ۴ صفحہ ۲۷۔ تذکرہ خواص الامہ سبط ابن جوزی صفحہ ۱۳۰ (۴) لہوف سید ابن طاؤس (۵) طبری ج ۴ صفحہ ۲۳۴ ابن اثیر ج ۴ صفحہ ۲۷ ارشاد۔ تذکرہ سبط ابن جوزی صفحہ ۱۴۲۔

اور یہ کہ "اے حسینؑ! یہ پانی موجود ہے جس میں کتے تک منہ ڈالتے ہیں۔ اور عراق کے سور گدھے اور بھیڑیے تک اس میں سے پیتے ہیں۔ مگر تم اس میں سے بخدا ایک قطرہ چکھ بھی نہیں سکتے۔" (۱)

بعید نہیں ہے کہ فوج یزیدی کا خیال یہ ہو کہ جماعت حسینی سے کسی جنگ کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ پیاس کی شدت ہی ان کے ختم کرنے کے لیے کافی ہوگی۔ چنانچہ ایک موقع پر جب حضرت نے اتمام حجت کے لیے خطبہ پڑھا۔ اور پیغمبر اسلام کے ساتھ اپنے خصوصی تعلق کا اظہار کر کے اُن نام نہاد مسلمانوں میں احساس فرض پیدا کرنے کی کوشش فرمائی تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ "ہم یہ سب جانتے ہیں مگر اس کے باوجود تم کو چھوڑیں گے نہیں یہاں تک کہ پیاس کی شدت کی وجہ سے ہی تم دنیا سے رخصت ہو جاؤ۔" (۲)

حالانکہ حسینی اصحاب نے اپنی شجاعت سے یہ ثبوت دیدیا کہ ہم اب بھی جب چاہیں متقین گھاٹ سے ہٹا کر پانی حاصل کر لیں چنانچہ حضرت ابوالفضل العباس کے اس کے بعد بھی جہاد کر کے پانی لانے کا تذکرہ تاریخ میں ملتا ہے۔ (۳)

غالباً یہ ساتویں تاریخ گزر کے آٹھویں شب کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد آٹھویں، نویں اور دسویں تین دن کی مسلسل پیاس پھر بھی مسلم طور پر برقرار رہتی ہے۔

یہ اقرباؑ انصار حسینی کی یادگار وفاداری ہے کہ بغیر امام کے اُن میں سے

---

(۱) تذکرہ ص ۱۴۱ (۲) لہوف ابن طاؤس (۳) الاخبار الطوال ص ۲۵۲
طبری ج ۶ ص ۲۳۴ (۳) طبری ج ۶ ص ۲۴۴۔

ایک نے بھی باوجود نہر تک پہنچ جانے کے لب تر نہیں کیے اور صاف کہہ دیا کہ یہ ناممکن ہے کہ ہم پانی پییں اور حضرت امام حسینؑ پیاسے رہیں (۱) اور یہ امام کی بلند نظری تھی کہ پانی کے حاصل کرنے پر اپنی طاقت صرف نہیں کی بلکہ تین دن تک صرف اتمام حجت کے طور پر ان کے ضمیر کے بیدار کرنے کی کوشش "سوال آب" کی صورت میں کرتے رہے اور اصحاب کو بھی اسی کی اجازت عطا فرمائی چنانچہ جب شدت عطش کا عالم دیکھتے ہوئے بریر ہمدانی نے اجازت چاہی کہ میں ابن سعد کے پاس جاکر پانی کے باب میں گفتگو کروں ممکن ہے کہ اُس پر کچھ اثر ہو۔ حضرت فرمایا تمہیں اختیار ہے۔ بریر عمر بن سعد کے پاس گئے اور کہا "تم کیسے مسلمان ہو کہ آل رسول کے قتل پر تیار ہو کر آئے ہو پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ یہ آب فرات ہے جس میں سے عراق کے کتے اور سور تک پانی پیتے ہیں مگر یہ حسینؑ ہیں اور ان کے اہل حرم اور اعزا و اقارب کہ پیاس سے ہلاک ہو رہے ہیں اور وہ نہیں، فرات کے پانی تک پہنچنے نہیں دیا جاتا۔"

عمر سعد نے جواب میں گویا اقرار جرم کرتے ہوئے یہ عذر پیش کیا کہ "کیا کروں رے کی حکومت مجھ سے جاتی رہے گی اگر ابن زیاد کے خلاف کروں اور رے کی حکومت کا ترک کرنا میرے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہے" (۲)

صبح عاشور جب حر بن یزید لشکرِ شام سے جدا ہو کر جماعت حسینی کی طرف آگیا تو اُسے سب سے زیادہ فوج یزیدی کے جس ظلم و تعدی کا

طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۴ (۲) کشف الغمہ صفحہ ۱۸۹

احساس ہوا وہ پانی کا بند کرنا تھا اور ہونا بھی چاہیئے تھا اس لیے کہ امام حسینؑ نے اس کے پہلے اور اس کی جماعت کو انتہائی تشنگی کے عالم میں سیراب کیا تھا۔ پھر یہ کہ اسی نے ابن زیاد کے حکم سے خیام حسینی کو نہر کے کنارے برپا ہونے دیا اس لیے ایک طرح بندش آب کا وہ اپنے کو ذمہ دار سمجھتا تھا چنانچہ اُس نے امام حسینؑ سے عفو قصور کرانے کے بعد فوج مخالف کے سامنے جو تقریر کی اُس میں انتہائی پراثر انداز میں جماعت حسینی اور بالخصوص خواتین و اطفال کی عطش کا بیان اور بندش آب پر اعتراض کیا ہے۔

اس کا تفصیلی تذکرہ آئندہ آئے گا۔

جب اس تمام اتمام حجّت اور موعظہ و نصیحت کا اُس ستمگار اور قسی القلب فوج پر کوئی اثر نہوا تو امام حسینؑ اور آپ کے ساتھ کے ہر بچّہ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ راہ حق پر اُن کے قیام اور ثبات و استقلال میں کسی تشدد اور ایذا رسانی سے ذرہ بھر کمی نہیں ہو سکتی۔ اُنھوں نے شدّت تشنگی کی تکلیف کو برداشت کیا اور تین دن کی پیاس کے عالم میں فریضہ جہاد کو پورے طور سے ادا کرنے کے ساتھ شہادت کا خیر مقدم کیا۔

چوبیسواں باب

صلح کی آخری کوشش اور اُس کا انجام

حسینؑ اپنے دامن پر یہ دھبا لینا نہیں چاہتے تھے کہ آپ مسلمانوں کے درمیان خونریزی کو پسند کرتے ہیں —— اس لیے آپ نے اتمام حجت کے لیے دوبارہ خود اپنی جانب سے صلح کی گفتگو کا آغاز فرمایا اس طرح کہ عمرو بن قرظہ بن کعب انصاری کو عمر بن سعد کے پاس بھیجا کہ آج شب کو مجھ سے دونوں طرف کے لشکروں کے درمیان مل لینا —— چنانچہ عمر سعد کوئی بیس سوار اپنے ساتھ لے کر نکلا اور امام بھی اتنے ہی ساتھیوں کے ساتھ تشریف لے گئے مگر جب قریب پہونچے تو آپنے اپنے ساتھیوں کو ہٹادیا جسکے بعد ابن سعد نے بھی اپنے ساتھیوں سے علیحدگی اختیار کی۔ یہ مکالمہ بڑی رات گئے تک جاری رہا جس کے بعد امام اپنے خیام کی طرف واپس ہوئے اور ابن سعد اپنے لشکرگاہ کی طرف چلا گیا (۱)

یہ تمام گفتگو صیغۂ راز میں تھی۔ مختصر طور پر اتنا معلوم ہو سکا کہ امام حسینؑ اس پر آمادہ تھے کہ عراق میں قیام کے خیال کو ترک کر دینگے اور اگر ضرورت سمجھی جائے تو عرب کا ملک بھی چھوڑ دیں گے اور کسی دور

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۳۵

دور دراز مقام پر چلے جائیں گے (۱)

حقیقت کے لحاظ سے اس صورت میں بھی امام حسینؑ کی فتح تھی یعنی آپ کا ملک ترک کرنا بھی اُس مقصد کا ایک اعلان تھا جس کی خاطر آپ کو جان دینا پڑی پھر بھی آپ کا رویّہ اتنا نرم اور سلجھا ہوا تھا کہ یزیدی فوج کے افسر عمر سعد نے صاف اعتراف کر لیا کہ آپ صلح کے راستے پر گامزن ہیں اور اُس نے بہت خوش ہو کر ابن زیاد کو خط لکھا اور حضرت امام حسینؑ کی اس شرط مصالحت سے اطلاع دی ان الفاظ کے ساتھ کہ "الحمد للہ فتنہ کی آگ فرو ہو گئی اور مسلمانوں کا شیرازہ مجتمع رہنے کی صورت پیدا ہو گئی اور اُمت اسلامی کا معاملہ رو با صلاح ہو گیا۔ آخر میں اس نے اپنی رائے بھی لکھی کہ میرے نزدیک اب مخاصمت کی کوئی وجہ نہیں ہے اور اب اس معاملہ کو ختم ہونا چاہیئے"۔ (۲)

کہا جاتا ہے کہ ابن زیاد نے بھی اس رائے کو منظور کرنا چاہا اور کہا کہ عمر سعد کا یہ خط بہت خیر خواہانہ ہے۔ مگر شمر (۳) بگڑ گیا اور کہنے لگا "بھلا ایسا موقع جس کے ہاتھ آئے وہ اسے چھوڑ دے! حسین آپ کے پاس بہلا بلیں آگئے ہیں۔ اگر آج وہ چلے گئے اور انھوں نے آپ کی اطاعت اختیار نہ کی تو پھر یاد رکھیئے کہ قوت و عزت ان ہی کا حق ہوگا اور کمزوری و عاجزی آپ کا حصہ۔ میری رائے میں ان کی یہ خواہش کبھی منظور نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ بڑی ذلت کی بات اور کمزوری کی نشانی ہے۔ بے شک انھیں غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۳۵ (۲) طبری ج ۶ ص ۲۳۵ - ۲۳۶ ارشاد ص ۲۴۱

(۳) شمر کا اصلی نام تھا شرحبیل بن عمرو بن معاویہ۔ وہ بنی عامر بن صعصعہ میں آل وحید کلابی میں سے تھا۔ (الاخبار الطوال ص ۲۵۳ - ۲۵۴)۔

دینا اور آپ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ پھر اگر آپ انھیں ان کے جرم کی سزا میں قتل کرنا چاہیں تو آپ کو حق اس کا ہے اور اگر معاف کر دیں تو اس کا بھی اختیار ہے۔ رہ گیا عمر سعد اس کا کیا ذکر! میں نے تو سنا ہے کہ پوری پوری راتیں وہ حسینؑ کے ساتھ باتوں میں گزار دیتا ہے۔" (۱)

یہ خوشامد آمیز، غیرت انگیز، مفسدہ پرداز اور فتنہ پرور تقریر وہ تھی جس سے ایک طرف تو تفوق طلبی اور ظفرانجامی کے جذبہ میں حرکت پیدا ہوئی۔ دوسری طرف انانیت، غرور اور خود بینی کی رگ میں جنبش ہوئی اور تیسری طرف ابن سعد کی جانب سے بدگمانی ہو گئی اور وہ خلوص اور خیر خواہی کا قرینہ جو اس کی تحریر میں پایا جاتا تھا نیست و نابود ہو گیا۔ شمر بڑا خیر خواہ دوست اور سچا مشیر کار شمار کیا جانے لگا۔ اور عمر سعد پر غصہ آنے لگا کہ وہ لڑنے گیا تھا اور رات رات بھر بیٹھ کر دشمن سے باتیں کرتا ہے۔ حسینؑ سے مل گیا ہے اور ہم کو خواہ مخواہ دھوکا دیتا ہے۔ پھر ایسے مشتبہ شخص کا سردار لشکر باقی رکھنا کیسا؟ یقیناً شمر کو بھیجا جائے تاکہ ابن سعد کے طرز عمل کا تدارک اور حسینؑ کے ساتھ ہر قسم کی مصالحانہ گفتگو کا سدِ باب کر سکے۔ چنانچہ ابن زیاد نے اسی ذہنی الجھن کے عالم میں عمر سعد کے نام خط لکھا: "میں نے تم کو حسینؑ کی جانب اس لیے نہیں بھیجا ہے کہ تم اُن کے ساتھ مراعات کرو۔ یا ان کے ساتھ معاملات کو طول دو یا ان کو زندگی کی امیدیں دلاؤ یا میرے پاس اُن کی سفارش کرنے بیٹھو دیکھو اگر حسینؑ اور اُن کے اصحاب میرے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں اور اپنے کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیں تو اُن کو خاموشی کے ساتھ میرے پاس بھیج دو اور اگر وہ انکار کریں تو اُن پر حملہ کرو۔ اور ان کے انھیں قتل کر دو۔ (۲)

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۳۶ (۲) الاخبار الطوال ص ۲۵۳

اعضاء و جوارح کو قطع کرو کیونکہ وہ اسی کے مستحق ہیں (۱) اتنا ہی نہیں بلکہ اسلام کے نام کو بدنام اور انسانیت کی پیشانی کو عرقِ انفعال سے تر، اور تاریخ کو ہمیشہ کے لیے انگشت بدنداں کرنے والے یہ الفاظ تھے جو کسی اور کی نسبت نہیں۔ رسولِ اسلام کے سب سے پیارے راستباز نواسے حسینؑ کی نسبت لکھے جا رہے تھے کہ اگر حسینؑ قتل ہو جائیں تو ان کے سینہ اور پشت کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کرانا۔ کیونکہ وہ سلطنت کے باغی، مخالف اور حریف ہیں۔ میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ اس سے موت کے بعد ان کو کوئی نقصان پہونچے گا۔ لیکن یہ زبان سے کہہ چکا ہوں کہ اگر حسینؑ کو قتل کیا تو ان کے ساتھ یہ سلوک کروں گا۔ اگر تم نے ان احکام کا اجراء کیا تو خیر تمھیں معاوضہ ملے گا۔ جو ایک وفادار و فرمانبردار کو ملنا چاہیے۔ اور اگر تمھیں یہ منظور نہ ہو تو لشکر کی سرداری سے علیحدہ ہو جاؤ اور اس منصب کو شمرؔ کے سپرد کر دو۔ جسے ہم نے پورے طور سے مناسب ہدایتیں کر دی ہیں (۱) اس لیے یہ خط شمرؔ کے سپرد کیا اور زبانی بھی اس سے کہہ دیا کہ اگر عمر سعدؔ اس حکم کی تعمیل نہ کرے تو وہ معزول متصور ہوگا۔ اور تم اس کی جگہ سردار لشکر قرار پاؤ گے۔ تم حسینؑ سے جنگ کرنا اور عمر سعدؔ کو بھی قتل کر کے اس کا سر میرے پاس بھیج دینا۔ (۱)

یہ تعجیلی اور تنبیہی حکم نامہ شمرؔ کے ہاتھ عمر سعد کے پاس بھیج دیا گیا۔ اب جنگ کا التواء غیر ممکن سا ہو گیا۔ خود عمر سعد کو اس کا خوب اندازہ تھا کہ حسینؑ یزید کی بیعت یا ابن زیاد کی غیر مشروط اطاعت پر ہرگز آمادہ نہ ہوں گے۔ اس لیے جونہی اسے ابن زیاد کا خط شمرؔ کے ہاتھ پہونچا اور اس نے کھول

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۳۶ ۔ ارشاد ص ۲۴۱ ۔ ۲۴۲ ۔

کر اُسے پڑھا فوراً شمر سے کہنے لگا "کمبخت یہ تو نے کیا کیا؟ خدا تجھ سے سمجھے خدا تجھے غارت کرے اور اس پیغام کو غارت کرے جو تو میرے پاس لایا ہے۔ بخدا میں سمجھتا ہوں کہ تو نے ہی ابن زیاد کو میرے مشورہ پر عمل کرنے سے روک دیا اور اُس بات کو بگاڑ دیا جس کے بن جانے کی امید تھی۔ خدا کی قسم حسینؑ کبھی اپنے کو ابن زیاد کے رحم و کرم پر چھوڑنا پسند نہ کریں گے۔ یقیناً حسینؑ اپنے باپ کا دل اپنے سینہ میں رکھتے ہیں" (۱) شمر نے کہا کہ ان باتوں کو جانے دو؛ یہ بتاؤ کہ اب کرو گے کیا؟ اپنے امیر کے حکم پر عمل یا سرداری کو میرے سپرد کرو گے؟"

کمزور دل اور دنیا پر جان دینے والا عمر سعد اپنی تمام قلبی کیفیتوں اور ضمیر کی ہدایتوں کو اس وقت بھول جاتا تھا۔ جب دنیا کے وقتی اعزاز اور جاہ و ثروت کے اس کے ہاتھ سے جانے کا سوال پیش ہوتا تھا اور اس طرح وہ دنیا کے عشق میں اپنی تمام وجدانی کیفیتوں کے پامال کر دینے پر اس حد تک تیار ہو جاتا تھا کہ اس کے ذیل میں اُس کو بڑے سے بڑے جرم کا ارتکاب بھی گوارا ہو جاتا تھا۔ خطرہ بالکل قریب اور اس کا رقیب سرداری شمر سامنے موجود تھا اور صرف ایک ہاں یا نہیں کا جواب وہ تھا کہ جس پر تمام اُس کی آئندہ زندگی کا دار و مدار تھا جس میں فقط سرداری رہنے یا نہ رہنے کا سوال ہی نہ تھا۔ بلکہ ابن زیاد کے صرف بھی حکم کے مطابق جان جانے کا اندیشہ بھی تھا۔ اس کے لیے تو ویسے ہی جذبۂ حق پسندی کی ضرورت تھی جو راہ حق کے فداکاروں میں ہوا کرتا ہے مگر عمر سعد اس جذبے عاری اور ثبات و استقلال سے خالی تھا۔ لہٰذا شمر کے اس سوال پر اُسے کہہ دینا پڑا کہ نہیں میں ہی اس مہم کو سر کروں گا۔ (۲) ہاں تمہیں پیادوں کا افسر

---

(۱) ارشاد صـ ۲۴۲ (۲) اخبار الطوال صـ ۲۵۳۔

بنائے دیتا ہوں۔ (۱) اس کے بعد سے شمر کا وجود اس کے لیے سوہان روح ثابت ہو رہا تھا۔ ابن زیاد کی بدگمانی اس کی نسبت ظاہر ہو چکی تھی لہذا اسے اپنی وفاداری اور خیر خواہی کا ثبوت فراہم کرنا تھا۔ اس لیے اب جنگ میں ذرا بھی تاخیر اس کے نزدیک مناسب نہ تھی۔

چنانچہ اس نے اسی وقت حملہ کی تیاری کا حکم جاری کر دیا اور روز پنجشنبہ نویں تاریخ کی شام ہونے نہیں پائی تھی کہ امام حسینؑ پر حملہ کر دیا گیا۔ یہ حملہ بالکل بغیر اطلاع تھا۔ امام حسینؑ عصر کی نماز کے بعد خیمہ کے دروازے پر تلوار کا سہارا لیے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھے تھے اور آپ کی آنکھ لگ گئی تھی کہ ایک مرتبہ گھوڑوں کی ٹاپوں اور فوج کے غل کی آواز جناب زینبؑ کے کان میں گئی۔ آپ گھبرا کر پردے کے پاس آئیں اور امام حسینؑ کو مخاطب کیا کہ دیکھئے فوج دشمن کی آوازیں بہت نزدیک سے آ رہی ہیں۔ آپ نے سر اٹھایا اور فرمایا میں نے ابھی خواب میں دیکھا رسول اللہؐ کو حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ تم عنقریب ہمارے پاس آیا چاہتے ہو۔ ادھر اچانک دشمنوں کے حملہ سے زینبؑ کا دل پریشان تھا ہی۔ ادھر جو امام نے یہ خواب بیان کیا تو جناب زینبؑ مضطرب ہو گئیں دونوں ہاتھوں سے منھ پیٹ لیا۔ اور کہا "ارے یہ غضب!" امام نے بہن کو تسکین دی، فرمایا اے بہن غضب تمہارے دشمنوں کے لیے، خاموش رہو۔ خدا مالک ہے۔" ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ابو الفضل العباسؑ نے آکر اطلاع دی کہ فوج اعدا نے چڑھائی کر دی ہے۔ حضرت یہ سن کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور فرمایا کہ عباس سوار ہو ان کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو کہ اس

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۳۶ ۔ ۲۳۷ ۔

وقت حملہ کا سبب کیا ہے؟ جناب عباسؑ بیس سواروں کے ساتھ تشریف لے گئے اور آپ نے فوج مخالف سے خطاب کرتے ہوئے دریافت کیا کہ تمھاری رائے میں کیوں تبدیلی ہوئی اور اب تم کیا چاہتے ہو؟ جواب ملا کہ امیر ابن زیاد کا حکم آیا ہے کہ تم لوگوں سے امیر کی اطاعت قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے اور نہیں تو پھر جنگ شروع کر دی جائے۔" آپ نے فرمایا کہ اچھا پھر جلدی نہ کرو۔ میں امام کے پاس جا کر تمھارا مطالبہ پیش کرتا ہوں، اس کے بعد جیسا کچھ امام فرمائیں گے اس سے تم کو مطلع کر دوں گا۔ جناب عباسؑ گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے امام حسینؑ کی خدمت میں واپس گئے اور آپ کو واقعہ کی اطلاع دی (۱) حضرت نے فرمایا اگر ممکن ہو تو آج کی شب کی ان سے مہلت حاصل کر لو تاکہ آج رات بھر ہم عبادت الٰہی اور دعا و استغفار میں بسر کر لیں۔ اللہ ہی واقف ہے کہ میں اس کی نماز و عبادت، تلاوت قرآن اور دعا و استغفار سے کتنی محبت رکھتا ہوں (۲)، ادھر اس دوران میں ـــــــ

حبیب بن مظاہر اور زہیر بن قین فوج مخالف سے گفتگو اور حضرت امام حسینؑ پر بلاوجہ ظلم و ستم کرنے پر ان کو قائل معقول کرتے رہے یہاں تک کہ جناب عباسؑ واپس آئے اور امام کے ارشاد کے مطابق ان سے ایک رات کی مہلت طلب کی (۳) عمر سعد گزشتہ واقعات کی بنا پر شمر کی موجودگی کو اپنے لیے انتہائی خطرناک سمجھتا تھا اس لیے اب وہ امام حسینؑ کے متعلق خواہ مخواہ بھی تشدد سے کام لینا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ شمر کی طرف متوجہ ہوا اور کہا تمھاری اس بارے میں کیا رائے ہے۔ شمر نے جواب دیا کہ جیسا

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۳۸ (۲) طبری ج ۶ ص ۲۳۷ - ۲۳۸ و ارشاد ص ۲۴۲ - ۲۴۳

آپ مناسب سمجھیں اس لیے کہ آپ افسر ہیں اور آپ کی رائے معتبر ہے
عمر سعد نے سمجھ لیا کہ شمر کا یہ جواب طنزیہ انداز کا حامل ہے، اُس
نے کہا "میں تو چاہتا ہوں کہ مہلت نہ دی جائے"، مگر چونکہ دراصل
اُس کا ضمیر اس کے خلاف تھا۔ اس لیے اب وہ متوجہ ہوا دوسرے
سرداروں کی طرف اور اُن سے دریافت کیا کہ کیوں تمہاری کیا رائے
ہے۔ عمرو بن حجاج زبیدی ہانی بن عروہ کے برادر نسبتی نے جو اُن
کے قتل کی غلط خبر سن کر فوج لے کے دار الامارہ پر چڑھ دوڑا تھا۔ کہا
"سبحان اللہ! اگر یہ لوگ قبیلۂ ترک و دیلم سے بھی ہوتے اور اتنی مراعات
کے طالب ہوتے تو تمہیں اُن کے ساتھ یہ مراعات لازم تھی"، قیس
بن اشعث نے بھی یہی مشورہ دیا کہ مہلت دینی چاہیئے (۱) حضرت
عباس کے ضبط و صبر کا بے نظیر نمونہ تھا یہ کہ یہ تمام گفتگو میں آپس میں
ہوتی رہیں اور آپ خاموش نتیجہ کے منتظر کھڑے رہے۔ آخر کو مہلت
کا مسئلہ طے پایا اور جناب عباس واپس ہوئے اس طرح کہ آپ کے
ساتھ عمر سعد کی طرف کا ایک نمایندہ بھی تھا اور اُس نے آکر کہا کہ ہم
آپ کو کل تک کی مہلت دیتے ہیں۔ اگر کل آپ نے ہتھیار ڈال دیے
تو ہم آپ کو اپنے امیر عبید اللہ بن زیاد کے پاس بھیج دینگے اور اگر آپ
نے انکار کیا تو پھر جنگ یقینی ہوگی (۲)

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۳ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۳۔ ارشاد صفحہ ۱۴۲

پچیسواں باب

شب عاشور یعنی محرم کی دسویں رات

کوشش کے ساتھ اس رات کی مہلت اس لیے نہیں لی گئی تھی کہ جنگ کی کوئی خاص تیاری کر لی جائے۔ نہ یہ کہ کہیں سے کسی امداد کے آنے کی کل تک امید ہو اور نہ یہ کہ امام چاہتے تھے کہ اپنے اہلبیت اور پسماندگان کو آئندہ کے لیے کچھ وصیتیں فرما دیں اور انھیں آئندہ کے لیے تیار کر دیں یا اپنے بعد اُن کی حفاظت کا کوئی سامان کرنا منظور تھا۔

ان میں سے کوئی بات نہ تھی بلکہ ایک تو مقصد اس مہلت کا وہی تھا جو خود آپ نے جناب عباس سے ظاہر فرمادیا تھا اُس وقت جب اُنہیں مہلت لینے کے لیے بھیجا ہے۔ وہ یہ تھا کہ "ہم آج کی رات اپنے پروردگار کی خوب عبادت کرلیں اور دعا و استغفار میں مصروف رہیں" چنانچہ آپنے اور آپکے اصحاب نے تمام شب اس عالم میں گزاری کہ وہ مسلسل نماز اور دعا اور دعا اور استغفار اور بارگاہ الٰہی میں تضرع وزاری میں مصروف تھے (۱)

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۲

دوسری بڑی مصلحت اس ایک شب کی مہلت میں یہ مضمر تھی کہ آپ خطرہ کے یقینی ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کو اپنی اپنی طبیعتوں کے ٹٹول لینے کا موقع دینا چاہتے تھے اور ایک بار اور یہ کہہ دینا چاہتے تھے کہ جو آپ کا ساتھ چھوڑ کر جانا چاہتا ہو۔ وہ چلا جائے تاکہ عین موقع پر کوئی ایک متنفس بھی ایسا باقی نہ رہنے پائے جو خطرہ کے ہنگامی ہجوم کی وجہ سے بادل ناخواستہ آپ کا ساتھ دینے پر مجبور ہوا ہو چنانچہ آپ نے شام ہوتے ہوتے اپنے ساتھیوں کو مجتمع کر کے یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

"تمام تعریفیں خدا کے لیے ہیں۔ راحت و تکلیف ہر حال میں اُس کا شکر ہے۔ بار الٰہا تیرا شکر ہے کہ تو نے ہم کو نبوت کی عزت عطا کی، قرآن کا علم دیا، دینی معلومات کا خزانہ مرحمت فرمایا اور ہمیں گوش شنوا، چشم بینا اور دل دانا کی نعمتوں سے مالا مال کیا۔"

اس کے بعد حضرت نے فرمایا "معلوم ہونا چاہیے کہ میں دنیا میں کسی کے ساتھیوں کو اپنے ساتھیوں سے زیادہ باوفا اور ان سے بہتر نہیں جانتا اور نہ اپنے اعزا سے زیادہ نیکوکار اور ادائے حق کرنے والے اعزا کسی کے مجھے معلوم ہیں خدا تم سب کو میری طرف سے جزائے خیر دے۔ آگاہ ہو کہ دشمن کل ضرور جنگ کرے گا۔ میں بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ جہاں تمہارا جی چاہے چلے جاؤ میں بیعت کی ذمہ داری تم سے ہٹاتا ہوں۔ رات کا پردہ پڑا چاہتا ہے اسی کو اپنا مرکب بنا کر روانہ ہو جاؤ تم ہی کو بس جانے کیلئے نہیں کہتا بلکہ ہر ایک تم میں سے میرے عزیزوں میں سے بھی ایک ایک شخص کا ہاتھ پکڑ لے اور اپنے ساتھ لیتا جائے اس لیے کہ یہ لوگ صرف میرے طالب ہیں اگر مجھے قتل کر ڈالیں تو پھر کسی دوسرے کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے"(۱)

(۱) ارشاد ص۲۳۳-۲۴۴- طبری ج ۶ ص۲۳۸-

اس تقریر کو سن کر سب سے پہلے حضرت ابوالفضل العباس کھڑے ہوئے اور کہا "کس لیے ہم ایسا کریں؟ کیا اس لیے کہ آپ کے بعد ہم زندہ رہیں؟ ہرگز نہیں۔ خدا ہم کو یہ روز بد نصیب نہ کرے۔" دوسرے تمام اعزا بھی حضرت عباس کے ساتھ ہم آواز ہوئے اور متفق اللہجہ ہو کر یہی الفاظ زبان پر جاری کیے جس کے بعد امام نے خاص طور سے اولاد عقیل کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ "تمہارے لیے تو مسلم کا قتل ہو چکنا بہت کافی ہے۔ تم چلے جاؤ۔ میں تمہیں اجازت دیتا ہوں۔" ان سب نے متفق اللہجہ ہو کر کہا "ہم ایسا نہیں کریں گے۔ آپ کے بعد زندہ رہنے کا کوئی مزہ نہیں۔"

اس کے بعد اصحاب میں سے مسلم بن عوسجہ کھڑے ہوئے کہا کہ "ہم آپ کو چھوڑ دیں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ خدا کی قسم میں ان دشمنوں سے نیزہ کے ساتھ جنگ کروں گا یہاں تک کہ میرا نیزہ اُن کے سینوں میں ٹوٹ جائے اور تلوار چلاؤں گا جب تک کہ اس کا قبضہ میرے ہاتھ میں ٹھہر سکے اور میں آپ سے کسی طرح جدا نہ ہوں گا۔ اگر ہتھیار نہ ہوں گے کہ جن سے جنگ کروں تو میں انہیں پتھر ماروں گا اور آپ کی حمایت کروں گا یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر اس جان کو نثار کر دوں۔"
اسکے بعد سعید بن عبد اللہ حنفی نے کہا "بخدا ہم آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ خدا کی بارگاہ میں یہ ثابت نہ کرلیں کہ ہم نے رسالتمآب کے غائبانہ حق کو آپ کے بارے میں ادا کر دیا۔ بخدا اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ میں قتل ہوں گا پھر زندہ کیا جاؤں گا۔ پھر جیتے جی جلا دیا جاؤں گا پھر میری خاک ہوا میں منتشر کیجائے گی اور ایسا ہی میرے ساتھ ستر مرتبہ ہوگا تب بھی میں آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گا جب تک کہ آخری مرتبہ بھی آپ کے قدموں پر موت نہ آئے۔ چہ جائے کہ یہ تو ایک مرتبہ کا قتل ہونا ہے اور اس کے بعد وہ دائمی عزت ہے جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔" زہیر بن قین نے کہا "بخدا میری تو آرزو یہ ہے کہ میں قتل کیا جاؤں پھر

زندہ ہوں اور پھر قتل کیا جاؤں۔ ایسا ہی ہزار مرتبہ ہو مگر کسی طرح آپ سے اور آپ کے خاندان کے ان نوجوانوں سے یہ مصیبت دفع ہو جائے" دیگر اصحاب نے بھی ملتے جلتے الفاظ میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا اور سب کا متفق اللہجہ مطلب یہی تھا کہ یہ غیر ممکن ہے کہ ہم آپ سے جدا ہو جائیں بلکہ اپنی جانیں آپ پر فدا کر دیں گے۔ ہاں جب ہم مر جائیں تو پھر جاہے جو ہو۔ ہم تو اپنا فرض ادا کر چکے ہوں گے (۱) امام نے دعائے خیر دی اور اپنے خیمہ میں واپس تشریف لے گئے (۲)

یہ تھا مجاہد کربلا کی حقانیت کا ایک بے مثال مظاہرہ۔ آپ زور تقریر سے جوش و خروش پیدا کرنے والے بیانات اور خوش آیند دلفریب توقعات سے اپنے ساتھ والوں کو ساتھ رکھنا نہیں چاہ رہے تھے بلکہ ان کے سامنے حقیقت حال کو واضح کر کے غلط فہمیوں کو دور کر رہے تھے ـــــ یہ کوشش شب عاشور ہی تک نہیں رہی بلکہ اس کا آپ کی جانب سے مظاہرہ روز عاشور بھی ہوا اس طرح کہ جب بشر بن عمرو حضرمی کو جو انصار امام میں سے ایک تھے یہ خبر پہونچی کہ ان کا فرزند عمر ورے کی سرحد پر قید ہو گیا ہے انھوں نے کہا کہ خدا پر چھوڑتا ہوں اس کو بھی اور اپنے آپ کو بھی۔ بےشک اگر مجھے زندہ رہنا ہوتا تو یہ پسند نہ کرتا کہ وہ قید میں رہے۔ امام کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ تم میری بیعت سے آزاد ہو، جاؤ اور اپنے فرزند کی رہائی کی فکر کرو۔ وفادار مجاہد نے جواب دیا کہ "مجھے جیتے جی درندے کھا جائیں اگر میں آپ سے جدا ہوں یہ بھلا کیوں کر ہو سکتا ہے"۔ حضرت نے فرمایا! "اچھا اپنے فرزند محمد کو بھیجدو اور یہ کپڑے اُس کو دیدو کہ ان کی قیمت سے اپنے بھائی کی رہائی کا سامان کر سکے"۔ آپ نے پانچ برد مرحمت کیے جن کی قیمت ہزار اشرفی کے

---

(۱) طبری ج ۶ صـ ۲۳۹ (۲) ارشاد صـ ۲۴۴

قریب تھی۔ اس سب کے بعد جتنے جاں نثار امام کے ساتھ رہ گئے تھے وہ وہی ہو سکتے تھے جو موت کو اپنے لیے یقینی سمجھتے ہوئے دل و جان سے مقصد حسینؑ کی حمایت کے لیے آمادہ تھے۔ اور ان کے کردار میں کمزوری کے شائبہ کا امکان بھی نہ تھا۔

تیسری مصلحت اس ایک رات کی مہلت میں یہ ہو سکتی تھی کہ آپ دشمن کو ایک موقع اور اپنے کردار کے جائزہ لینے کا دینا چاہتے تھے تاکہ اگر کسی میں صلاحیت راہ راست پہ آنے کی ہو تو وہ آجائے۔ چنانچہ عمر سعد کی فوج کا ایک بڑا افسر حُر بن یزید ریاحی جو سب سے پہلے حسینؑ کو گھیر کر کربلا میں لانے کا ذمہ دار تھا اپنے ضمیر کی ہدایت کی بنا پر فوج مخالف سے علیحدہ ہو کر اصحاب حسینؑ میں داخل ہو گیا اور اس نے بھی آپ کی نصرت میں اپنی جان دی۔ اسی طرح اور بھی چند سپاہی نصرت باطل چھوڑ کر نصرت حق پر آمادہ ہو گئے۔

حقیقت میں ایک داعی حق کی بڑی کامیابی یہی قرار پا سکتی ہے کہ وہ کسی ایک متنفس کو ہی سہی حقیقی معنی میں راہ ہدایت دکھا سکے۔ اور حضرت امام حسینؑ کی یہ ایک بڑی کامیابی اس رات کی مہلت کا نتیجہ تھی جو آپ نے دشمن سے مانگ کر حاصل کی تھی۔

گزشتہ خطبہ کے بعد تمام رات امام اور اصحاب امام نے عبادت خالق میں بسر کی۔ اس کے ساتھ آپ نے جنگ کے ہنگام کے لیے امکانی حد تک تحفظی تدابیر بھی کیے۔ آپ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ خیموں کو بالکل ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیں اور ہر خیمہ کی طناب کو دوسرے خیمہ کے ساتھ باندھ دیں۔ (۱)

اس کے علاوہ آپ نے پشت کی جانب ایک ایسے نشیب کو جو ایک نالی کی طرح سے تھا کھدوا کر خندق تیار کرا دی اور اس میں لکڑیاں جمع کرا دیں کہ جب ان میں آگ دی

---

(۱) ارشاد صہ ۲۴۵

جائے تو اُس طرف سے دشمن کے حملہ کا اندیشہ نہ رہے۔

یہ تیاریاں شب عاشور مکمل ہو گئیں اور صبح کو اس خندق میں آگ روشن کر دی گئی۔ اس طرح فوج دشمن کو بالکل گھیر کر چاروں طرف سے حملہ کرنے کا موقع باقی نہ رہا۔
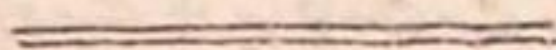
چھبیسواں باب

دسویں محرم سنہ ۶۱ھ

اتمامِ حجت اور آغازِ حرب

عاشور کی رات اپنی تمام کیفیتوں سمیت ختم ہوئی۔ یقین کرنا چاہیے کہ اس شب کربلا کے میدان میں کسی کی آنکھ لگنے نہ پائی ہوگی۔ اس طرف عبادتِ خدا اشتیاق شہادت، بی بیوں میں بے تابی، بچوں میں پریشانی اور سب سے بڑھ کر پیاس کا غلبہ اور اُس طرف جنگ کی تیاری، اسلحہ کی درستی، تدابیرِ جنگ کے متعلق مشورے اور اپنے ظالمانہ ارادوں کی تکمیل کے لیے صبح کا انتظار۔

بہرحال رات ختم ہوئی اور سپیدۂ سحری نمودار ہوا حضرت امام حسینؑ نے اصحاب و اقربا کے ساتھ نمازِ صبح بجماعت ادا کی، وہ نماز جس کے تعقیبات میں کربلا کا جہاد تھا۔

عام انسانی دل و تجربہ کے معیار کو پیشِ نگاہ رکھتے ہوئے ظاہر بیں افراد خیال کر سکتے ہیں کہ اس وقت احبابِ حسینؑ پر عجیب ہراس کا عالم طاری ہوگا۔ سامنے نظر جاتی ہوگی تو اُن کو دشمن کی فوج کا عظیم سمندر موجیں لیتا ہوا نظر آتا ہوگا اور اپنی ہستی اس میں حباب کی سی نظر آ رہی ہوگی، مگر نہیں، حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ ان کے دل اطمینان سے معمور تھے۔ اُن کے سینوں میں خوشی اور مسرت کی لہریں تھیں اور اُن کے چہروں پر فرحت و انبساط کی سُرخی تھی۔ وہ جیسے کبھی خوش نہیں تھے۔ ویسے آج خوش نظر آ رہے تھے جیسی یہ مذاق باتیں کبھی نہ کرتے تھے ویسی آج کر رہے تھے۔

چنانچہ عبدالرحمن بن عبدا ربہ انصاری اور بریر بن خضیر ہمدانی کا واقعہ ہے کہ بریر نے عبدالرحمن سے کچھ مزاح کیا۔ عبدالرحمن نے کہا: "چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔" بریر نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میرے قوم وقبیلہ والے اچھی طرح واقف ہیں کہ مجھے جوانی سے لے کر اس عمر تک کبھی مذاق سے دلچسپی نہیں رہی ـــــــ مگر میرا دل اس وقت مستقبل کے تصور سے محظوظ ہو رہا ہے: خدا کی قسم ہمارے اور سعادت ابدی کے درمیان بس اب اتنا فاصلہ ہے کہ یہ دشمنان دین تلواریں لے کر ہم پر ٹوٹ پڑیں اور مجھے تو تمنا ہے کہ کسی طرح وہ وقت جلد آئے کہ ان کی تلواریں ہم پر پڑنے لگیں۔" (۱)

بے شک یہ حقانیت پر اعتماد اور اخروی کامیابی کے کامل یقین ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ یہی چیز کمزور دل میں طاقت پیدا کرتی اور مایوسیوں کی ظلمت میں امید کی شمع روشن کرتی ہے۔

اتنی دیر میں فوج مخالف میدان جنگ میں آگئی، پرے جمائے گئے اور لشکر کی ترتیب ہوئی۔ میمنہ پر عمرو بن حجاج زبیدی۔ میسرہ پر شمر بن ذی الجوشن سواروں کا سردار عزرہ بن قیس احمسی اور پیادوں کا افسر شبث بن ربعی یربوعی اور علم عمر سعد نے اپنے غلام ورید کے سپرد کیا۔ (۲)

امام حسینؑ بھی میدان جہاد میں آگئے۔ یقیناً تاریخ ایک ایسے سپہ سالار کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جس نے ایسی چھوٹی سی جماعت کو کم از کم بلبس بیس ہزار فوج کے مقابلہ میں جنگ کے لیے کھڑا کیا ہو۔

ایک تاریخی صراحت کے مطابق یہ بتیس[۳۲] سوار اور چالیس پیادوں سے زیادہ نہیں تھے (۳) اور اسی لئے شہدائے کربلا کیلیے بہتر کی لفظ زبان زد خلائق ہے۔

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۱ (۲) الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۴ طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۱ ارشاد صفحہ ۲۴۶
(۳) الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۴ طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۱ ارشاد صفحہ ۲۴۶

مگر کربلا کے حالات جنگ اور مجاہدین کے ناموں کی تفصیل اور دوسرے متعلقہ واقعات سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ تعداد ۷۲ سے زیادہ اور دو سو سے کم تھی (۱) ممکن ہے کہ عام طور پر تاریخ میں جو تعداد درج اور عموماً زبان زد خلق ہے۔ اور جو اس کتاب میں بھی بعض جگہ نظر آئے گی۔ اُن جانبازوں کی ہو جو فوجی انداز پر تربیت یافتہ تھے لیکن سلسلۂ جہاد میں بہت سے ایسے افراد بھی میدان میں آ گئے جو فوجی حیثیت سے سپاہی نہ سمجھے جا سکتے تھے۔

میدان جنگ میں آنے کے بعد پہلے امام نے اپنے ہاتھ درگاہ احدیت میں بلند کیے اور یہ مناجات زبان پر جاری کی۔ کیا نسبت دی جا سکتی ہے نبی خدا حضرت عیسیٰ کی آواز کو جو بائیبل (عہد جدید) کی نقل کے مطابق صلیب پر بلند ہوئی تھی اس انداز سے کہ "ایلی ایلی لما سبقتنی" "اے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" فرزند رسولؐ امام حسینؑ کی اس مناجات کے ساتھ جو اس سیلاب مصیبت کے اندر آپ کے لبوں پر جاری ہو رہی تھی۔

"خداوندا تو میرا سہارا ہے ہر تکلیف میں اور میرا قبلۂ امید ہے ہر سختی میں اور تجھ پر مجھے ہر مہم میں جو درپیش ہو بھروسا ہے۔ کتنے ہی صدمے ایسے ہیں جن کے برداشت کرنے سے دل کمزور ثابت ہوتا ہے اور حیلہ و تدبیر کی راہیں بند نظر آتی ہیں۔ دوست ان میں ساتھ چھوڑ دیتے اور دشمن ان میں طعنہ زنی کرنے لگتے ہیں۔ میں ان کو تیرے حضور میں پیش کرتا اور تیری بارگاہ میں عرض معروض کرتا ہوں اس لیے کہ میں تجھے چھوڑ کر کسی اور سے لو

---

(۱) عمار دہنی کی روایت ابو جعفرؑ سے اس کے مطابق ہے۔ اس میں ہے کہ جماعت حسینی ۴۵ سوار اور سو پیادوں پر مشتمل تھی (طبری ج ۶ ص ۲۲۰)۔

لگانا ہی نہیں جانتا۔ تو اُس تکلیف کو دور کرتا اور اُس کا تدارک کرتا ہے۔ یقیناً تو ہی ہر نعمت کا مالک اور احسان کا مرکز اور ہر مطلب کے لیے آخری جائے پناہ ہے"۔ (۱)

اس کے بعد آپ نے اپنے چھوٹے سے لشکر کو ترتیب دیا۔ میمنہ پہ زہیر بن قین میسرہ پہ حبیب بن مظاہر اور علمدار **عباس** بن **علی** قرار دیے گیے۔ (۲)

چونکہ امام حسینؑ کی جد و جہد کا مقصد یہ تھا کہ دین و آئین شریعت کی حقانیت کو ظاہر کرتے ہوئے اپنے دشمن کی سیرت و کردار کے متعلق دنیا کے سامنے اس حقیقت کو ثابت کر دیں کہ اُنہیں اسلام سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ ایک تو آپ کے کردار میں کوئی ایسا شائبہ بھی نہ آنے پائے جو آپ کے خلاف تشدد کے جواز کی دلیل بن سکے۔ اسی لئے آپ نے مصالحت کی گفتگوئیں کیں۔ ملک عرب کو چھوڑنے اور در بدری کی زندگی بسر کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور اسباب اشتعال پیدا کیے جانے کے باوجود بھی اپنے ساتھیوں کو جنگ میں سبقت سے روکے رکھا۔ اور لڑائی کی مکمل تیاری ہو چکنے کے بعد بھی اپنی طرف سے پہل نہ ہونے دی چنانچہ صبح عاشورا بھی جب خیام امام کے ساتھ خندق میں آگ بھڑک رہی تھی تو اُدھر کا ایک سوار سر سے پیر تک لوہے میں غرق اس طرف سے گذرا اور اس خندق کی آگ کو شعلہ ور دیکھ کر ایک انتہائی اشتعال انگیز جملہ کہا ـــــ معلوم ہوا کہ شمر بن ذی الجوشن ہے۔ مسلم بن عوسجہ نے امام سے عرض

---

(۱) طبری ج ۶ صـ ۲۴۱ ارشاد صـ ۲۴۶

(۲) طبری ج ۶ صـ ۲۴۱ ارشاد صـ ۲۴۶ الاخبار الطوال صـ ۲۵۳۔

کہا کہ اجازت ہو تو اس کو تیر کا نشانہ بنا لوں کیونکہ یہ بڑا فاسق و فاجر شخص ہے اور اس وقت بالکل تیر کی زد پر ہے۔ حضرت نے فرمایا "نہیں ایسا نہ کرو۔ میں جنگ میں پہل نہیں کرنا چاہتا۔" (۱)

یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ ایک تیر جو اس وقت کمان سے رہا ہو جاتا تو نوعیت جنگ کو تبدیل کر دیتا ——— امام نے اس کا سختی کے ساتھ لحاظ رکھا۔

دوسرے اس کی ضرورت تھی کہ آپ کے خلاف دشمنوں کے طرز عمل میں تاویل کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ سب سے بڑی تاویل کسی ناروا عمل کے متعلق اس کا بے خبری اور ناواقفیت پر محمول کیا جاتا ہے۔ بنی امیہ نے اپنے حدود مملکت میں یہ پروپگنڈا کیا تھا کہ پیغمبر اسلام نے اپنے بعد کوئی اولاد نہیں چھوڑی اور ہم اُن کے وارث جائز ہیں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ امام حسینؑ اپنے نام و نسب اور خاندانی خصوصیات نیز اپنے بارے میں اسلامی روایات کو فوج مخالف پر اس طرح واضح کر دیں کہ اُن میں سے کسی ایک فرد کے لیے بھی ناواقفیت کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہ جائے اور آپ کے خلاف جو ظلم ہو رہا ہے اُس کے جرم کی اہمیت ہر ایک پر بالکل روشن ہو جائے تاکہ ان میں سے ہر ایک نہ خود اپنے نفس کو دھوکا دے سکے۔ اور نہ دوسروں کو اُن کی نسبت کسی "حسن ظن" یا "حمل بر صحت" کا راستہ مل سکے۔

امام حسینؑ دیکھ چکے تھے کہ ان کے پہلے اُن کے والد بزرگوار حضرت علیؑ کا مقابلہ کیا گیا اور اس مقابلہ کو "خطائے اجتہادی" کا پردہ ڈال کر قابل معافی سمجھ لیا گیا۔ حسینؑ کے خلاف تلوار اٹھانے والوں کے عمل میں اگر کہیں سے اس طرح کی گنجائش ہوتی تو سادہ لوح افراد یا ہوا خواہان بنی اُمیہ اُس سے فائدہ اٹھانے سے چوکتے تھوڑے ہی اور اس سے مقصد اور مفاد دینی کو سخت نقصان پہنچ جاتا۔ اسی سے تحفظ کے لیے امام حسینؑ نے وہ سب کچھ کیا جسے اتمام

حجّت" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کے بعد دشمن کے "اصرار گناہ" یا باطل پر ضد کی حیثیت اتنی نمایاں ہو گئی کہ کسی تاویل یا حمایت کا موقع باقی نہ رہا۔

تاریخی بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ صبح عاشور دونوں طرف کی صف بندی ہو چکنے کے بعد کافی وقت تک آغاز جنگ نہیں ہوا۔ اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ دشمن اس کا موقع ڈھونڈ رہا تھا کہ کسی صورت سے حسینی جماعت کی طرف سے کوئی ایسا اقدام ہو جو بنائے جنگ بن سکے اور امام حسینؑ کا منشأ یہ تھا کہ میری طرف سے آغاز جنگ ہونے نہ پائے بلکہ اس کے برخلاف آپ نے دشمن کو راہ راست پر لانے کی پُر امن کوشش کر کے چاہا کہ اتمام حجّت فرما دیا اس لیے آپ نے ناقہ طلب فرمایا اور اس پر سوار ہوئے۔ قرآن اپنے سامنے رکھا۔(۱) پھر صفوف دشمن کے قریب آ کر بلند آواز سے ارشاد فرمایا "اے گروہ مردم میری بات سنو! جلدی سے کام نہ لو۔ یہاں تک کہ مجھ پر جو تمہارا حق ہے اُس کے ماتحت تم کو نصیحت و ہدایت کا فرض ادا کر دوں اور تمہارے سامنے یہ حقیقت حال بیان کر دوں کہ میں تمہاری جانب کیوں آیا۔ اگر تم نے میرے بیان کو صحیح سمجھتے ہوئے تسلیم کر لیا اور میرے ساتھ انصاف سے کام لیا تو یہ تمہاری خوش قسمتی ہو گی اور تمہیں معلوم ہو گا کہ تمھیں میری مخالفت کی کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی اور اگر تم نے میرے بیان کو قبول نہ کیا اور انصاف سے کام نہ لیا تو شوق سے مجتمع کر لو اپنی طاقتوں کو اور اکٹھا کر لو جس جس کو چاہو اپنے ہم خیالوں میں سے اور کوئی کوشش اٹھا نہ رکھو۔ پھر پوری طاقت سے بغیر ایک دم کی بھی مہلت دئے ہوئے میرا خاتمہ کر دو۔ میرے لیے وہ پروردگار کافی ہے۔

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۴۱۔

جس نے قرآن کو نازل کیا اور وہی اپنے نیک اعمال بندوں کا مددگار ہے۔" امام حسینؑ کی آواز خیمہ میں پہنچنا تھی کہ اہل حرم میں گریہ و بکا کا شور بلند ہوا۔ حضرت نے جناب عباسؑ و علی اکبرؑ کو بھیجا کہ انہیں خاموش کرو۔ رونے کا وقت بعد کو آئے گا۔ جب آواز گریہ کی موقوف ہوگئی تو حضرت نے حمد الٰہی ادا فرمائی اور خدا کے اوصاف ذکر فرمائے پھر جناب رسالتمآبؐ پر درود بھیجا اور آنحضرتؐ کے اوصاف و فضائل دیر تک بیان فرماتے رہے۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے حسینؑ کے پہلے اور حسینؑ کے بعد کوئی متکلم نہیں دیکھا جو فصاحت و بلاغت میں آپ سے بڑھا ہوا ہو حمد و صلوٰۃ ادا کرنے کے بعد حضرت نے فرمایا "ذرا میرے نام و نسب پر غور کرو اور دیکھو تو میں کون ہوں پھر اپنے گریبانوں میں منھ ڈالو۔ غور کرو کہ تمہارے لیے میرے خون کا بہانا اور میری ہتک حرمت کرنا جائز ہے؟ کیا میں نہیں ہوں تمہارے نبی کا نواسا اور اُن کے وصی، اُن کے چچا زاد بھائی اور اُن پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور اُن کی تصدیق کرنے والے کا فرزند؟ کیا حمزہ سید الشہداء میرے باپ کے چچا اور جعفر طیار خود میرے ہی چچا نہیں تھے۔ کیا یہ حدیث جو زبان زد خلائق ہے تمہارے گوش زد نہیں ہوئی کہ حضرت رسول خداؐ نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ دونوں جوانانِ اہل جنت کے سردار ہیں؟ اگر تم میری بات کو سچ سمجھتے ہو اور حقیقتہً وہ سچ ہی ہے، اس لیے کہ کبھی میں نے غلط بات نہیں کہی، پھر تو کوئی بات نہیں اور اگر تم میری بات کو غلط سمجھو تو اسلامی دنیا میں ابھی ہیں ایسے اشخاص جن سے اگر تم پوچھو تو وہ بتلا دینگے۔ پوچھ لو جابر بن عبداللہ انصاری سے، ابو سعید خدری سے، سہل بن سعد ساعدی سے، زید

بن ارقم سے، انس بن مالک سے وہ تمہیں بتائیں گے کہ اُنھوں رسالتمآب سے اپنے کانوں سے اس حدیث کو سنا ہے پھر کیا یہ تمہیں میری خونریزی سے روکنے کے لیے کافی نہیں ہے (۱) اس موقع پر شمر آپ کا کلام قطع کرتے ہوئے بول اٹھا کہ میں اللہ کی عبادت ایک حرف پر کرتا ہوں اگر میری سمجھ میں آتا ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو" (قرآن میں منافقین کی نسبت آیا ہے ومن الناس من یعبد اللہ علیٰ حرف لہذا اُس کا مقصود تھا کہ میں مسلمان نہیں، منافق ہوں اگر کچھ سمجھتا ہوں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں)

اصحاب خاموش کھڑے ہوئے امام کی تقریر سُن رہے تھے۔ انھیں شمر کی یہ بدتمیزی اور حضرت کے خطبہ میں مداخلت سخت ناگوار ہوئی۔ حبیب بن مظاہر نے پکار کر جواب دیا" بخدا میں جانتا ہوں کہ تو خدا کی عبادت ستّر حرفوں پر کرتا ہے۔ (یعنی انتہائی مکّار اور عبادت کے معاملہ میں فریبی ہے۔) اور میں گواہی اس کی بھی دیتا ہوں کہ تو سچ کہتا ہے تیری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت کیا کہہ رہے ہیں۔ خدا نے تیرے دل پر مہر لگا دی ہے" امام نے پھر سلسلۂ تقریر جاری فرمایا" اگر تمھیں اس حدیث کی صحت میں پھر بھی شک ہے تو کیا اس میں بھی شک ہے کہ میں تمھارے رسولؐ کا نواسا ہوں۔ خدا کی قسم مشرق و مغرب عالم میں کوئی بھی نبیؐ کا نواسا میرے سوا موجود نہیں ہے نہ تم میں اور نہ تمھارے سوا دوسرے اقوام میں اور میں تو خود تمھارے ہی نبیؐ کا نواسا ہوں۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ میرے قتل پر تم کس لیے آمادہ ہوئے ہو؟ کیا کسی اپنے مقتول کا قصاص لینا چاہتے ہو جسے میں نے قتل

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۴۲۔

کردیا ہو یا کسی اپنے مال کا مطالبہ رکھتے ہو جسے میں نے تلف کیا ہو۔ یا کسی زخم کا بدلہ چاہتے ہو۔ جو میرے ہاتھ سے کسی کو لگا ہو؟ ایک خاموشی سی چھائی رہی اور ان میں سے کسی سے کچھ جواب دیتے نہ بن پڑا۔ (۱) دیکھیے تو کہ ایک انسان ایک طرف اور ہزاروں زبانیں دوسری طرف۔ بے شک حق میں ایسی طاقت ہونا چاہئے اور ایک انسان اپنی سچائی اور حسنِ عمل پر اتنا اعتماد رکھتا ہو۔ حسینؑ اس وقت جبکہ اپنا کوئی گواہ نہ تھا اور مجمع دشمن تھا۔ مجمع سے اپنی بے جرمی کا اقرار لے رہے تھے۔ تمام لشکر کو دعوت دی جا رہی تھی۔ کہ کوئی شخص کسی جرم کا پتہ دے دے۔ ہوتا کوئی جرم کسی کی نگاہ میں تو اس تیس ہزار کے مجمع میں کوئی زبان کھولتا۔ کیا دنیا کی کوئی مادی طاقت زبانوں کو روکنے والی تھی؟ مگر معلوم ہوتا ہے کہ سچائی کی طاقت تھی جو دہنوں پر قفل اور زبانوں پر گرہ لگائے ہوئے تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک یکہ و تنہا انسان ہزاروں آدمیوں کو مخاطب کر رہا تھا۔ اور کسی کو اُس کے خلاف زبان کشائی کی جرأت نہ تھی۔

فوجِ مخالف کے سکوت کو ملاحظہ فرمانے کے بعد آپ نے نام بنام اُن لوگوں کو پکارا جن کے اس خط پر دستخط موجود تھے۔ اور یہ لوگ معمولی درجہ کے سپاہی بھی نہ تھے۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک کم از کم ہزار پانچ سو آدمیوں کا سردار تھا۔ آپ نے فرمایا "اے شبث بن ربعی۔ اے حجار بن ابجر۔ اے قیس بن اشعث۔ اے یزید بن حارث کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ کھیتیاں لہلہا رہی ہیں، چشمے پانی سے چھلک رہے ہیں۔ آیئے لشکر آپ کی مدد

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۴۳ ارشاد ص ۲۴۸

کے لیے تیار ہیں" (۱) اب معاملہ ان اشخاص کے لیے انتہائی نازک تھا۔ چار آدمیوں کی بابت نام لے لے کر یہ انکشاف کیا جا رہا تھا کہ انھوں نے بھی آپ کو خط بھیجا تھا۔ گویا یزیدی افواج اور ان کے سالار عمر سعد کے سامنے ان لوگوں کی سازش دو رنگی اور حکومت سے ایک طرح کی بغاوت کا ثبوت مہیا کیا جا رہا تھا حالانکہ وہ کوفہ کے سربرآوردہ اشخاص تھے اور ابن زیاد کی طرف سے بڑے بڑے معزز عہدوں پر فائز تھے۔ انھوں نے تو وہ خط جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے محض سازشی انداز میں ہوا کے رخ کو دیکھ کر لکھا تھا۔ اس خیال سے کہ حسینؑ کے نام اتنے کثرت سے خطوط جا رہے ہیں اور بلایا جا رہا ہے۔ اگر کہیں حسینؑ آ گئے اور فضا ان کے موافق رہی تو ہمارے لیے بھی جگہ باقی رہنا چاہیے اس لیے انھوں نے یہ خط بھیجا تھا مگر اس وقت اپنے گواہوں کے سامنے ان کی سازش منکشف ہو رہی تھی اور اندیشہ تھا کہ واقعۂ کربلا کے بعد ابن زیاد کے ہاتھ سے ان لوگوں کا فیصلہ ہو جائے اور سلطنت بنی امیہ کی جانب سے راندہ بارگاہ قرار پا جائیں اس لیے بربنائے ضرورت ان کو اس موقع پر بے غیرتی کے ساتھ بولنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تحریروں سے انکار کیا اور کہا کہ ہم نے اس طرح کے خطوط نہیں لکھے تھے" امام نے فرمایا "اللہ اکبر! اتنا کھلا ہوا حقیقت سے انکار! تم نے لکھا تھا اور ضرور لکھا تھا اچھا اگر بفرض محال نہیں بھی لکھا تھا اور تم لوگ میرا آنا حقیقتہً نہیں بھی چاہتے تھے تو مجھے واپس چلا جانے دو کسی ایسی جگہ جہاں میں امن و امان کی زندگی گزار سکوں"

---

(۱) طبری ج ۶ صـ ۲۴۳ ارشاد صـ ۲۴۸

قیس بن اشعث نے (جس کی بہن جعدہ بنت اشعث نے حکومت شام کے ساتھ سازش میں شریک ہو کر امام حسنؑ کو زہر دیا تھا اور جس کا بھائی محمد بن اشعث حضرت مسلمؑ کے قتل کا ذمہ دار تھا) پکار کر کہا "آپ یزید کی بیعت کیوں نہیں کر لیتے؟" حضرت نے فرمایا "تم ایسا کیوں نہ کہو گے؟ تم محمد بن اشعث ہی کے تو بھائی ہو۔ کیا تم اپنے کو کافی نہیں سمجھتے کہ مسلم بن عقیل کے خون کی ذمہ داری تم پر ہے۔ خدا کی قسم میں ذلت کے ساتھ اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں نہ دوں گا۔ اور نہ غلاموں کی طرح خطرہ سے اپنی جان بچا کر بھاگوں گا۔"

فوج مخالف کے متاثر ہونے کی پہلی ہی سے امید نہ تھی۔ اپنا فرض پورا کرنا تھا وہ پورا ہو گیا۔ حضرت نے ناقہ کو بٹھا دیا۔ اتر پڑے اور عقبہ بن سمعان کو حکم دیا کہ اسے باندھ دیں۔ (۱)

چونکہ اصحاب حسینؑ آپ کے مقصد سے واقفیت حاصل کر چکے تھے اس لیے وہ بھی مسلک حسینی ہی کو پیش نظر رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور افواج یزید کی اکثریت عوام اہل کوفہ پر مشتمل تھی اس لیے کوفہ کے ممتاز افراد کی تقریروں کا ان پر کافی اثر ہو سکتا تھا۔ پھر ان میں بھی حبیب بن مظاہر وغیرہ جو ہمیشہ سے شیعۂ علی ہونے کی حیثیت سے مشہور تھے اور حضرت کو کوفہ کی جانب دعوت دینے والوں میں سے تھے ہوا خواہان بنی امیہ کے لیے ان کی تقریر ایسی موثر نہ ہو سکتی تھی جیسی زہیر بن قین کی جو کہ ابھی

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۳ ارشاد صفحہ ۲۰۸۔

قریبی زمانہ تک "عثمانی" گروہ میں شمار ہوتے تھے اور اب مکہ اور کربلا کے راستے
ہی میں امام کے پاس آکر شریک ہوئے تھے اس لیے فوج مخالف کے
سامنے سب سے زیادہ تقریریں انھوں نے کی ہیں جن کا ظاہری حیثیت سے
اس وقت کوئی نتیجہ مرتب ہوا ہو یا نہیں۔ لیکن یہی نتیجہ کیا کم ہے کہ افواج
مخالف پر ہر ممکن ذریعہ سے اتمام حجت ہو گیا۔ چنانچہ امام حسینؑ کے مذکورہ
بالا خطبہ کے بعد زہیر بن قین گھوڑے پر سوار، سر سے پاؤں تک لوہے میں
غرق صف سے باہر نکلے۔ پکار کر کہا: "کوفہ والو! خدا کے عذاب سے
ڈرو۔ ایک مسلمان کی گردن پر اُس کے اسلامی بھائی کا یہ حق ہے کہ وہ اسے
خیر خواہانہ نصیحت کرے اور ہم آپس میں بھائی بھائی اُس وقت تک
ہیں اور ایک ہی ملت کے تابع کی حیثیت رکھتے ہیں جب تک کہ ہمارے
تمہارے درمیان تلوار چلنے نہیں لگی ہے۔ یعنی جب تک باقاعدہ جنگ
شروع نہیں ہو جاتی ہم میں اور تم میں رشتۂ اخوت قائم ہے اور تم ابھی ہماری
طرف سے نصیحت کے مستحق ہو۔ بے شک جب تلوار چلنے لگے گی تو یہ رشتہ
خود بخود ٹوٹ جائے گا اور ہم علیحدہ علیحدہ ملتوں کے تابع قرار پا جائیں گے
یقیناً اللہ نے ہماری اور تمہاری آزمائش کی ہے اپنے نبی محمد مصطفےٰ
صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اولاد کے ذریعہ سے تاکہ وہ دیکھے کہ ہم اُن کے ساتھ
کیا کرتے ہیں اور تم کیا سلوک کرتے ہو۔ ہم تم سب کو دعوت دیتے ہیں
کہ ان کی مدد کرو اور عبیداللہ بن زیاد کا ساتھ چھوڑ دو۔ یزید اور ابن
زیاد سے تم کو اُن کی حکومت کے تمام دور میں کبھی سوائے برائی کے کوئی
اچھا سلوک نظر نہ آئے گا۔ وہ تمہاری آنکھوں میں سلائیاں پھرواتے، تمہارے
ہاتھ پاؤں قطع کراتے، تم کو سولیاں دلواتے اور تمہارے نیک اعمال حفاظ

قرآن مثلاً حجر بن عدی اور ان کے ہمراہیوں اور ہانی بن عروہ وغیرہ کے ایسے اشخاص کو قتل کرتے رہے ہیں۔" (۱)

مضمون کے لحاظ سے امام حسینؑ کے خطبہ اور زہیر بن قین کی تقریر میں بہت نمایاں فرق ہے۔ اُس کا انداز خاص طور پر انفرادی حیثیت سے حقیقت حال کو واضح کرنے اور اپنی شخصیت کے تعارف پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور اس میں موجودہ حکومت کے متعلق ایک سیاسی تبصرہ ہے جس میں یزید سے زیادہ ابن زیاد کی حکومت کے کردار پر تبصرہ کیا گیا۔ اس مصلحت سے کہ مخاطب کوفہ کے باشندے تھے اور ان کو براہ راست ابن زیاد کے مظالم سے سابقہ پڑ رہا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ زہیر بن قین کو اپنی تقریر کے سلسلے میں سخت مزاحمت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس طرح کہ ابن زیاد کے ہواخواہوں اور خوشامدیوں نے خود زہیر کی مذمت اور ابن زیاد کی مدح شروع کر دی۔ اور کہا "ہم اُس وقت تک دم نہ لیں گے جب تک تمھارے سردار اور اُن کے تمام ساتھیوں کو قتل نہ کر لیں یا گرفتار کر کے ان کو ابن زیاد کے پاس لے جائیں" زہیر اس کے بعد بھی خاموش نہ ہوئے اور ان کو ہدایت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ شمر نے تیر لگایا اور کہا "بس خاموش۔ خدا تیری زبان کو چپ کرے" مگر زہیر نے تیر کی بھی کوئی پرواہ نہیں کی اور شمر سے مصروف کلام ہو گئے۔ شمر کے اس کہنے پر کہ "دیکھو تھوڑی دیر میں تم اور تمھارے سردار سب قتل ہوا چاہتے ہیں" زہیر نے بڑی جگرداری اور قوت ایمانی کے ساتھ جواب دیا۔ "تو مجھے موت سے خوف دلاتا ہے؟ ۔ خدا کی قسم اُن

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۴۳

کے ساتھ مرنا مجھے تم لوگوں کے ساتھ زندگی جاوید حاصل کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔" اس کے بعد پھر وہ لشکرِ مخالف کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا۔ "اے اللہ کے بندو! ایسے بندگانِ زر کے کہنے میں نہ آؤ۔ خدا کی قسم پیغمبر خدا کی شفاعت اُن لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہو سکتی جنھوں نے پیغمبر خدا کی اولاد کا خون بہایا ہو اور اُن کے مددگاروں کو قتل کیا ہو۔" امام حسینؑ نے یہ دیکھ کر کہ باتوں کا جواب تیر سے دیا جا رہا ہے اور اتمام حجت کا فرض ادا ہو چکا ہے کسی سے پکار کر کہلوایا کہ "زہیر! واپس چلے آؤ اگر مومن آل فرعون نے اپنی قوم کو نصیحت کر کے اپنے فرض کو ادا کر دیا تھا تو یقیناً تم بھی اپنا فرض پورا کر چکے۔ اور نصیحت کا حق ادا کر دیا مگر نصیحت و تبلیغ کا کوئی فائدہ بھی تو ہو۔"[1] اس آواز کو سن کر زہیر واپس چلے آئے۔

ان مصلحانہ رجحانات، ان حقیقت ریز بیانات اور بصیرت افروز نصائح و اظہارات کا کوئی اثر ہو رہا تھا یا نہیں۔ یہ امر بالکل تاریکی میں تھا۔ جب تک کہ حُر کے باطن نے پردہ الٹ کر اپنے کو ظاہر نہیں کیا۔ ہماری کتاب کے ناظرین کے لیے یہ نام کوئی اجنبی حیثیت نہیں رکھتا یہی حُر وہ تھا جس نے ایک ہزار فوج کی جمعیت کے ساتھ آکر کوفہ کے راستے میں امام حسینؑ کو روکا تھا جو آپ کو گھیر کر کربلا لایا تھا اور جس نے ابن زیاد کا خط آنے کے بعد اتنی سختی برتی تھی کہ خیام حسینی کو دریا کے کنارے برپا ہونے نہ دیا تھا۔ اس کے بعد محرم کی دوسری تاریخ سے دسویں تک اس کی کیا حالت رہی تھی اس کا بعد کی صورت حال

---

(۱) طبری ج ۶ صـ۲۴۳ - ۲۴۴

اور خود حُر کے اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ جس وقت سے وہ امام حسینؑ کو کربلا میں پہونچا کر ابن زیاد کو مطلع کر چکا اُس وقت سے برابر خاموشی کے عالم میں مگر بے چینی کے ساتھ حالات کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔

اس کے قبل اُس نے راستے ہی میں اس طرح کی سلسلہ جنبانی کرنا چاہی تھی کہ کسی طرح امام حسینؑ اور یزید یا ابن زیاد کے درمیان کچھ خط و کتابت ہو اور معاملات رو با صلاح ہو جائیں اس کے بعد میدان کربلا میں پہونچنے کے بعد بھی اُسے یہ توقع تھی کہ بیچ میں کوئی ایسا مشترک نقطہ پیدا ہو جائے گا جہاں امام اور اُن کے مخالف مجتمع ہو جائیں اور جنگ کی صورت پیش نہ آئے۔ اُسے کوفہ سے متواتر فوجیں آنے سے انتشار ضرور پیدا ہوتا ہو گا مگر عمر بن سعد کا طرز عمل اُس کے لیے اُمید افزا تھا جو خود صلح کی گفتگوئیں کر رہا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح جنگ نہ ہو۔ ایسا بھی وقت آیا جب سلسلۂ گفتگو ایسے نقطہ پر پہونچا جہاں عمر سعد تک نے یہ طے کر لیا کہ اب معاملہ یکسو ہو گیا اور مقابلہ کی ضرورت نہیں باقی رہی۔ پھر ایسی صورت میں حر کو یہ سمجھنے کی کیا وجہ تھی کہ جنگ ضرور ہو گی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ امام کا طرز عمل روادارانہ ہے۔ آپ اپنی جانب سے معقول شرائط پیش کر رہے ہیں جن پر صلح نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ توقعات تھے جو اُس کے دل و دماغ پر نویں محرم کی سہ پہر تک چھائے رہے ہونگے۔ مگر ۹ محرم کی شام کو یہ سب اُمیدیں منقطع ہو گئیں ابن زیاد کے اُس خط سے جو شمر بن ذی الجوشن کے ہاتھ عمر سعد کے پاس پہونچا جس کے بعد عمر سعد مجبور تھا کہ وہ اُسی وقت حسینی جماعت پر حملہ

آور ہوا اور بدقت تمام حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ کو صرف ایک شب کی مہلت عبادت خدا کے لیے دینا منظور کرے۔ یقیناً یہ وہ وقت تھا کہ جب حقیقتاً حر کے سامنے امام حسینؑ سے کھل کر جنگ کرنے اور آپ کے قتل ناحق میں شرکت کرنے کا سوال صریحی طور پر پیدا ہو گیا اور اس کو یہ نظر آنے لگا تھا کہ میں نے اس کے پہلے حسینؑ کے خلاف جتنے بھی اقدامات کیے تھے وہ اس مظلوم مقدس ہستی کو فنا کی منزل سے قریب کرنے کے سامان تھے۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور اس کے بعد پھر اب کیا مجھ کو اس سے بڑے اقدامات میں شرکت کرنا چاہیئے؟ کیا میں حسینؑ کے خون میں اپنے ہاتھوں کو رنگین کر سکتا ہوں؟ اُس کا ضمیر سختی سے انکار کرتا تھا کہ ہر گز نہیں۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ اُسے اب سب کچھ یاد آتا ہو گا کہ حسینؑ وہ تھے جنھوں نے اُس سخت موقع پر مجھے اور میری تمام فوج کو پانی سے سیراب کیا تھا۔ اب اُن پر اور اُن کے ننھے ننھے بچوں تک پر پانی بند ہے اور یہ بڑی حد تک میری ہی وجہ سے اس لیے کہ میں نے ہی انھیں اُس بے آب و گیاہ مقام پر اترنے کے لیے مجبور کیا۔ یہ سوچ کر اُس کے قلب میں خود اپنی ہستی سے انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہو گا یا کم از کم اُس کی کسی صورت سے تلافی کی صورتوں پر غور کرتے ہوئے وہ خیال کرتا ہو گا کہ اگر میں حسینؑ کے پاس جا کر اپنی اُس خطا کو معاف کرنے کی درخواست کروں تو کیا اتنا بڑا جرم دنیا میں معافی کے قابل بھی ہے؟ پھر اگر حسینؑ نے میری خطا کو معاف نہ کیا تو میں کہاں کا رہا؟ نہ دنیا ملی نہ آخرت۔ پھر بھی اُس کا ضمیر کہتا ہو گا کہ چل کر معافی مانگنا تو چاہیئے۔ اپنا امکانی فرض تو بہر حال انجام دینا ضروری ہے پھر میں جب اپنی جان اُن کے قدموں

پر ڈال دوں گا۔ تو وہ کریم النفس ہیں۔ ضرور معاف کردیں گے۔ قرائن کی بنا پر یقین کیا جا سکتا ہے کہ یہ خیالات تھے جو اُس کے دماغ میں ایک تلاطم برپا کیے ہوئے تھے اور وہ شب عاشور ہی تھی جس کی سیاہی کے بے پناہ سمندر میں اُس کے خیالات کی کشتی تھپیڑے کھا رہی تھی۔

ہُو مارتا ہوا جنگل اور رات کا سناٹا! صفحۂ تاریخ بھی سنسان ہے کون مورخ ہے جو اُس معرکہ کی داستان قلم بند کرے جو حر کے دل و دماغ میں برپا تھا۔ بے شک سچا شاعر اکثر حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔ میر انیس علیہ الرحمہ اور اُن کے خاندان کے دو ایک باکمال مرثیہ گویوں نے جس طرح اس رات کو حُر کی حالت کی خیالی تصویر کشی کی ہے وہ یقیناً ایک ایسا بیان حال ہے جس کی روایت خاموش فطرت کے واسطے سے شاعر کے دل تک پہونچی ہے اور واقعات کے قرائن اُس کی تصدیق کرتے ہیں۔

بہر طور رات کسی طرح گزری اور صبح ہوئی۔ حُر کو پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اب کیا ہوتا ہے۔ کیا واقعی جنگ ہی ہوگی یا کوئی اور صورت رونما ہوگی۔ اُس نے انتہائی صبر و ضبط کے ساتھ دیکھا کہ افواج کی ترتیب ہوئی۔ اُسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ایک حصۂ فوج کا افسر قرار دیا گیا ہے۔ اُس نے امام کا بے نظیر، موثر خطبہ سُنا جس نے اُس کے دل میں گھر کر لیا۔ مگر پھر اُس نے انتظار کیا کہ اس کا اثر فوج مخالف پر کیا پڑتا ہے۔ اسی اثناء میں زہیر بن قین نے بڑھ کر تقریر کی اور ناصحانہ انداز میں اہل کوفہ کو مخاطب کیا ان تمام باتوں کے بعد بھی اُسے محسوس ہوا کہ افواج یزید کے ارادوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور وہ جنگ پر آمادہ ہیں۔ بس اس کے بعد حر کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک گیا اور وہ خیال جو اُس کے دل میں پرورش

پا رہا تھا اب رازداری کے حدود سے آگے بڑھ گیا۔ وہ عمر سعد کے پاس آیا اور کہا "کیا تم ان سے واقعی جنگ کرو گے؟" (۱) اسی ایک سوال کے انداز میں وہ سب قلبی کیفیتیں مضمر تھیں جن میں حر کئی روز سے دل ہی دل میں غلطاں و پیچاں تھا۔ اُسے یہ یقین آنے کے قابل بات ہی نہیں معلوم ہوتی تھی کہ فرزند رسول سے جنگ عملی شکل بھی اختیار کرے گی۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے آثار و قرائن کو جنگ کے قطعی پا رہا ہے مگر پھر بھی اس کی آرزو رکھتا ہے کہ یہ سب نمائشی ہو اور اس کو واقعیت سے کوئی واسطہ نہ ہو عمر بن سعد اُس کے ضمیر کے اندرونی کیفیات بالکل بیگانہ تھا۔ اُس نے حر کے سوال کا فوجی انداز میں بڑے اطمینان کے ساتھ جواب دیا "ہاں، قسم بخدا، ایسی جنگ جس کا بہت ادنی نتیجہ یہ سمجھنا چاہیے چاہیے کہ سروں کی بارش ہو اور ہاتھ قلم ہو کر زمین پر گریں"۔ حُر نے کہا "اور کیا اتنی صورتیں مصالحت کی جو حسینؑ نے پیش کیں ان میں سے کوئی تم لوگوں کے نزدیک منظوری کے قابل نہیں ہے؟" (۲) اس سوال سے صاف ظاہر ہے کہ وہ صلح کی گفتگو کو پورے غور سے نتیجہ کی جستجو کے ساتھ سن رہا تھا اور یہ یقین رکھتا تھا کہ ان صورتوں میں سے کوئی ضرور مان لی جائے گی۔ عمر بن سعد نے کہا کہ "خدا کی قسم اگر معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں ضرور منظور کر لیتا مگر کیا کروں؟ تمہارا حاکم نہیں مانتا"۔ (۳) عمر سعد کا یہ جواب خود کمزوری کا پہلو لیے ہوا تھا اور اُس کا عنوان حُر کی رائے اور خیال کو مزید تقویت دینے والا تھا اس لیے کہ وہ تسلیم کر رہا تھا کہ حسینؑ کا مسلک صلح جوئی کا حامل ہے اور ابن زیاد کی ہٹ دھرمی ہے کہ وہ قتل

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۴ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۴ (۳) طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۴

حسینؑ سے کم کسی بات پر رضامند نہیں۔ اس کے بعد حرؑ کچھ گفتگو کرنا بے کار سمجھا اور اب یہ وقت آگیا تھا کہ وہ اپنے اس فیصلہ کو جو بہت مشکل سے اُس کے دل و دماغ کے انتہائی کشمکش کے نتیجہ میں طے پاسکا تھا عملی لباس پہنائے۔

حُر کو یہ اندیشہ قطعی تھا کہ اگر فوج سے نکلنے کے پہلے یہ ظاہر ہوگیا کہ میری نیت کچھ اور ہے تو مجھے فوراً گرفتار کر لیا جائے گا اور میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ وہ اُس وقت بہت احتیاط سے کام لے رہا ہوگا۔ اُس کے قبیلہ کا ایک شخص قرۃ بن قیس اس وقت اُس کے نزدیک تھا۔ (۱) غالباً یہ وہی شخص ہے جو عمر بن سعد کا پیغام لے کر امام کی خدمت میں گیا تھا اور حبیب بن مظاہر کے نصیحت کرنے پر اُس نے کہا تھا کہ میں جو پیغام لایا ہوں جاکر اُس کا جواب دے دوں تو پھر غور کروں گا کہ خود مجھے کس کا ساتھ دینا چاہیے۔ حُر کو اُس کا اپنے پاس رہنا ناگوار ہو رہا تھا، وہ چاہتا تھا کہ یہ کسی طرح میرے پاس سے ہٹ جائے مگر کچھ بنتا نہ تھا۔ آخر اُس نے پوچھا کہ "قرہ! تم نے آج اپنے گھوڑے کو پانی نہیں پلایا؟" اُس نے کہا "نہیں ابھی نہیں" کہا "پھر پلاؤ گے نہیں؟!" (۲) انسان کا چہرہ، اُس کی بات چیت، اُس کے چہرہ کا رنگ سب ہی اُس کے خلاف جاسوسی کرتے ہیں۔ حُر لاکھ چھپائے مگر دل کا اضطراب چھپنے کی چیز نہیں۔ قرۃ کچھ نہ سمجھا ہوا تھا تو سمجھ لیا کہ یہ مجھے اپنے پاس سے ٹالنا چاہتے ہیں۔ بعد میں اُس کا بیان تھا کہ اگر حُر مجھ سے بتلا دیتے کہ میں امام حسینؑ کی طرف جا رہا ہوں تو میں بھی یقیناً

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۴۴ (۲) طبری ج ۶ ص ۲۴۴

اُن کے ساتھ ہو لیتا اور نکل جاتا،، (۱) مگر یہ کہنے کی باتیں ہیں اور نخواہ مخواہ کے عذر ہیں جو احساس گناہ بر وقت نکلنے کے بعد پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر ایسی اخلاقی جرأت اُس میں موجود ہوتی تو حُر کے بے کہے چلے جانے پر بھی قرّہ کے لیے راستہ نہیں بند ہو گیا تھا۔ وہ جانا چاہتا تو چلا جاتا بہر حال یہ محسوس ہوتے ہوئے کہ حُر کو میرا اپنے پاس رہنا ناگوار ہے، اُس نے اُس کے پاس ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ حُر نے اپنے خیال کے مطابق اُس کو ہٹا کر ایک رکاوٹ کو اپنے راستے سے دور کر دیا اور آہستہ آہستہ گھوڑا اپنا جماعت حسینی کی طرف بڑھانا شروع کیا۔ نفسیاتی حیثیت سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت اُس کا دل دھڑک رہا ہو گا اُس کے سینہ میں طوفان برپا ہو گا اور یقیناً وہ محسوس کر رہا تھا کہ اب میں کہیں اور ہوں۔ اس پر اُس وقت ایک خود فراموشی اور مدہوشی کا عالم طاری ہو گا۔ اُس وقت کسی کا ٹوک دینا! معاذ اللہ۔

مہاجر بن اوس اُس کے قبیلہ کا ایک شخص کہنے لگا "کیوں حُر! کیا ارادہ ہے؟ کیا حملہ کرنا چاہتے ہو؟،، (۲) حُر اس کا کیا جواب دیتا؟ اس نے پھر بھی سکوت کر کے پردہ داری کی کوشش کی۔ کچھ جواب نہیں دیا۔ مگر جسم میں لرزہ سا پیدا ہو گیا۔ مہاجر نے کہا "حُر تمھاری یہ کیا حالت ہے؟ میں نے تمہاری یہ کیفیت کبھی نہیں دیکھی۔ مجھ سے پوچھا جاتا کہ کوفہ میں سب سے زیادہ بہادر کون ہے تو میں تمہارے سوا کسی کا نام نہ لیتا مگر اس وقت میں تمہاری عجیب حالت دیکھ رہا ہوں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟،، یہ سن کر حُر نے مزید رازداری کی کوشش کو بے سود

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۴ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۴

سمجھا۔ کہا "میرے سامنے اس وقت بہشت و دوزخ کا سوال ہے۔ میں تو بہشت پر کسی چیز کو مقدم نہ سمجھوں گا، چاہے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں اور آگ میں جلا دیا جائے۔" یہ کہتے کہتے اُس نے گھوڑے کو چابک لگایا اور اصحاب حسینؑ کی طرف پہونچ گیا (۱)

اس موقع پر شاید حرؓ کو اندیشہ ہُوا کہ اُس کے اس طرح بے تحاشا گھوڑا اُڑائے ہوئے آنے سے کہیں انصار امام کو پریشانی نہ پیدا ہو اور اُس کی مزاحمت نہ کی جائے اس لیے اُس نے اُن کے قریب پہونچتے ہی اپنی سپر کو پلٹ کر ہاتھ میں لے لیا (۲) یہ طرز عمل عرب کے دستور کے مطابق تھا اس لیے کہ جب کسی کو حملہ کرنا مقصود ہوتو اُس کے ایک ہاتھ میں کھینچی ہوئی تلوار اور دوسرے ہاتھ میں حفاظت کے لئے سپر ہوتی لیکن اگر کوئی تلوار نیام میں رکھے اور پلٹی ہوئی سپر کو ہاتھ میں لیے آتا دکھائی دیتا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ امان کا طالب ہے یا کچھ پیغام لے کر آرہا ہے (۳) حُر نے اس طرح اصحاب حسین پر واضح کر دیا کہ وہ جنگ کا ارادہ نہیں رکھتا ہے۔ چنانچہ بلا روک ٹوک وہ سیدھا امام کے سامنے آیا اور کہنے لگا فرزند رسولؐ میری جان آپ پر فدا۔ میں وہی گنہگار ہوں جس نے آپ کو واپس جانے سے روکا۔ راستے میں آپ کے ساتھ ساتھ رہا اور آپ کو اس جگہ ٹھہرنے پر مجبور کیا۔ قسم ہے اُس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں کہ مجھے یہ گمان ہرگز نہیں تھا کہ یہ لوگ آپ کے تمام شرائط کو جو آپ پیش کریں گے مسترد کر دیں گے اور نوبت یہاں تک پہونچے گی۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا تھا کہ کیا حرج ہے۔ میں کسی حد تک ان لوگوں کا ساتھ دوں اور معلوم ہو کہ میں ان کی اطاعت سے باہر ہوں۔ پھر یہ لوگ اُن شرائط کو تو قبول ہی کر لیں گے

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۴ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۴ (۳) ابصار العین صفحہ ۱۱۹

گے جو امام ان کے سامنے پیش کریں گے۔ بخدا اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ یہ لوگ ان شرائط کو آپ کے منظور نہیں کریں گے تو میں کبھی آپ کے ساتھ یہ طرز عمل اختیار نہ کرتا۔ اچھا اب میں حاضر ہوا ہوں انتہائی شرمساری کے ساتھ توبہ کرتا ہوا اپنے گناہ سے خدا کی بارگاہ میں اس غرض سے کہ جان و دل سے آپ کا شریک مصیبت رہوں، یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر نثار ہو جاؤں کیا اس طرح میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟" حضرت نے بلا توقف فرمایا "ہاں ہاں۔ خدا تمھاری توبہ قبول کرے گا۔ اور تمھیں بخش دے گا۔ مبارک ہو۔ واقعی تم حُر (آزاد منش) ہو ویسے ہی جیسا تمھاری ماں نے نام رکھا ہے۔ تم آزاد ہو انشاء اللہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ (۱) گھوڑے سے تو اترو۔" حُر نے کہا "میرا آپ کی نصرت میں گھوڑے پر سوار رہنا نیچے اترنے سے بہتر ہے۔ چاہتا ہوں تھوڑی دیر ان سے جنگ کر لوں، پھر تو (مر کر) گھوڑے سے نیچے اترنا ہی ہے۔" امام نے یہ دیکھ کر کہ حُر کو جہاد کا ولولہ ہے۔ فرمایا "اچھا جو تمھاری خوشی ہو وہ کرو۔ خدا اپنی رحمت تمھارے شامل حال رکھے۔" (۲) وہ ضبط بہت کر چکا تھا۔ امام سے خطا معاف کرا کے اس کا دل بڑھ چکا تھا۔ اب اُسے حق محسوس ہوتا تھا کہ وہ افواج یزید کے سامنے جا کر اُن کو بھی حق کے راستے پر آ جانے کی دعوت دے چنانچہ وہ فوراً میدان میں آ گیا۔ پہلے تو اُس نے ملائم الفاظ میں صفوف اہل کوفہ سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بھائیو! آخر حسینؑ کی ان باتوں میں سے جن کو وہ پیش کرتے ہیں کسی ایک بات کو تم کیوں نہیں منظور کر لیتے تاکہ تمھیں اُن کے مقابلہ میں جنگ کرنے سے نجات ملے۔" لشکریوں نے کہا کہ امیر عمر سعد موجود ہیں۔ جو کچھ تمھیں کہنا ہے اُن سے کہو۔ حُر نے عمر سعد سے مخاطب

ہو کر پھر بھی الفاظ کہے اور ویسا ہی جواب ملا جو اس کے نبل مل چکا تھا کہ اگر مجھے ممکن ہوتا تو میں ضرور ایسا کرتا۔" یہ سن کر حُر کو غصہ آگیا اتنے تلخ الفاظ میں جس کا اُسے خود اُسی فوج کے ایک نمایاں افسر ہونے کی بنا پر پورے طور سے حق حاصل تھا۔ اُس نے کہا۔ "اے کوفہ والو۔ خدا تمھیں غارت کرے تم نے اس بزرگوار کو بلایا اور جب وہ آیا تو تم نے اسے دشمن کے سپرد کر دیا۔ تم نے خیال ظاہر کیا تھا کہ تم ان پر جان نثار کرو گے۔ پھر تم نے خود ان پر چڑھائی کر دی اور ان کے قتل پر آمادہ ہو گئے۔ تم نے ان کے نفس کی آمد و شد کو مسدود کر رکھا ہے اور گلا گھونٹنے پر آمادہ ہو۔ اور چاروں طرف سے انھیں گھیر رکھا ہے۔ تم نے ان کو خدا کی چوڑی چکلی زمین میں جدھر وہ امن کا راستہ پائیں اُدھر جانے سے روک دیا ہے اور وہ تمھارے ہاتھ میں قیدی کے مثل ہو گئے ہیں۔ اور بے بس کر دیئے گئے ہیں اور تم نے ان کو، ان کے اہل حرم اور بچوں کو اور ان کے اصحاب کو فرات کے اس بہتے ہوئے پانی سے روک دیا۔ ہے۔ جس کو یہودی اور مجوسی اور نصرانی تک پیتے ہیں اور عراق کے سور اور کتے تک اس میں لوٹتے ہیں مگر یہ لوگ ہیں کہ پیاس کی شدت نے ان کو جاں بلب کر رکھا ہے حقیقۃً کیا برا وہ سلوک ہے جو تم نے محمد مصطفےٰؐ کے بعد ان کی اولاد کے ساتھ جائز رکھا ہے تم کو اس شدت والی پیاس کے دن سیراب نہ کرے اگر تم آج ابھی اسی دم توبہ نہ کرو اور اپنے طرزِ عمل سے پشیمان ہو کر باز نہ آ جاؤ۔"

حُر کی تقریر دشمن کے مفاد کے خلاف بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی اس

لیئے تیراندازی کو حکم دیا گیا اور انھوں نے کچھ تیر چلائے۔ یہ دیکھ کر حُر نے تقریر موقوف کردی اور چونکہ جنگ باقاعدہ شروع نہ ہوئی تھی، وہ واپس آکر امام کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ (۱)

جیسا کہ شب عاشور کی مہلت پر بحث کے سلسلہ میں کہا جاچکا ہے یہ امام حسینؑ کی ایک بہت بڑی فتح تھی جو عین موقع جنگ پر خود آپ کی آنکھوں کے سامنے اور آپ کے دشمنوں کی نگاہوں کے سامنے ظاہر ہوگئی۔ کیونکہ ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ جس قدر ہمت بڑھانے اور دلوں کو اپنی طرف جذب کرنے کے مادی اسباب ہوسکتے ہیں۔ سب فوج یزید کی طرف تھے کثرت تعداد، طاقت وقوت، یقین کامیابی، آسائش وراحت، آب وغذا کا اطمینان پھر جائزہ وانعام اور بارگاہ حکومت میں تقرب کے توقعات اس کے برخلاف جتنے ہمت شکن اور جی چھڑانے والے اسباب ہوسکتے ہیں وہ سب اصحاب حسینؑ میں مجتمع تھے۔ قلت تعداد، بے کسی وبے بسی۔ یقینی بربادی اور تین دن کی بھوک پیاس اور حکومت کا عتاب جس کا نتیجہ اپنے ہی لیے نہیں بلکہ اپنے بعد اپنے پس ماندگان اور اولاد کے لیے بھی ہمت شکن اور طاقت ربا ہونے کے لیے کافی ہے۔ اس سب کے باوجود تاریخ یہ بتانے سے عاجز ہے کہ ان میں سے کوئی ایک معمولی سپاہی بلکہ بچہ بھی الگ ہو کر فوج مخالف سے جا کر ملا ہو۔ نہ حسینؑ کی زندگی میں اور نہ حسینؑ کے بعد۔ اس کے برخلاف فوج مخالف کا کوئی معمولی شخص نہیں بلکہ ایک نمایاں افسر جنگ شروع ہونے سے قبل ہی ادھر سے ٹوٹ کر ادھر آگیا۔ یہ وہ غیر معمولی فتح تھی جس نے فوج مخالف کو دنگ کردیا اور شاید فوج کا رنگ بے رنگ پا کر ہی سالار فوج نے مزید تاخیر کو خطرناک پایا۔

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۴۵ ارشاد ص ۲۵۰

اب دھوپ کافی چڑھ چکی تھی اور دن کا اچھا خاصہ حصہ گزر گیا تھا۔ عمر سعد نے لشکر کو آگے بڑھایا اور اپنے غلام دُرَید کو جو علمبردار لشکر تھا آواز دی کہ جھنڈا اپنا میرے قریب لاؤ۔ دُرید رایت جنگ لیئے اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ عمر سعد نے تیر اپنا چلۂ کمان میں جوڑ کر فوج حسینی کی طرف رہا کیا۔ اور لشکر یزید کو مخاطب کرتے ہوئے پکار کر کہا۔ "گواہ رہنا کہ سب سے پہلا تیر میں نے لگایا ہے" (۱)

سپہ سالار لشکر ان الفاظ کو اپنی زبان پر جاری کرتے ہوئے تیر رہا کرے اور لشکریوں میں جوش و خروش پیدا نہ ہو، یہ ناممکن ہے۔ یقیناً ہزاروں کمانیں کڑکیں، ہزاروں چلے کھنچے اور ہزاروں تیر روانہ ہو گئے۔

نہیں سمجھا جا سکتا کہ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ والی قلیل جماعت اس اچانک حملہ کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی طریقہ پر تیار ہو سکتی تھی مگر انھیں تیاری کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ان کے تنے ہوئے سینے تیروں کے استقبال کے لیے موجود اور اُن کے دل و جگر شوق شہادت میں ناوکوں کو ہاتھوں ہاتھ لینے پر آمادہ تھے۔

یزیدی لشکر والوں کو اندازہ تھا اور خوب اندازہ کہ اگر حسینی جماعت سے وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ سہی دست بدست مقابلہ کیا گیا تو کربلا کی جنگ صرف عاشور کے دن کے ساتھ ختم نہیں ہو سکے گی اور وہ اس کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جنگ کا طول کھینچنا ان کے لیے انتہائی اندیشہ کا باعث ہے۔ اسلیے کہ امام کی مکہ سے روانگی کی اطلاع بصرہ میں ہو چکی ہے۔ اور وہاں سے مدد پہنچنے کی توقع ہے۔ کوفہ کے بہت سے افراد جو ابھی تک نہیں پہونچ سکے ہیں۔۔۔ ۔۔۔ یقیناً موقع کے منتظر اور نصرت حسینؑ کے لیے بے چین ہوں گے یزید بھی

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۵ ارشاد صفحہ ۲۵۰۔

کہ ایران کچھ دور نہیں ہے اور وہاں کے بھی کچھ افراد کا امام حسینؑ کے ساتھ عقیدت رکھنا یقینی ہے خصوصاً جبکہ ان کے ساتھ علی بن الحسینؑ بھی موجود ہیں جو ننھیالی رشتہ سے مملکت ایران کے شہزادے کی حیثیت رکھتے ہیں لہذا بہت امکان ہے کہ قومی تعصب ہی ایرانیوں کو حسینؑ کی حمایت پہ آمادہ کر دے۔ یہ بھی خبر ہو سکتا تھا کہ اجاؤ سلمیٰ پہاڑ بھی بہت فاصلہ پہ نہیں ہیں جہاں کا قبیلہ طے کافی اہمیت اور طاقت کا مالک ہے۔ اور طرماح بن عدی امام حسینؑ سے وعدہ بھی کر چکے ہیں کہ اگر آپ اپنے کو وہاں پہنچا دیں تو آپ کی مدد کے لیے ہزار دو جوان قبیلۂ طے کے بالکل تیار پائے جائیں گے پھر خود طرماح صحرائے کربلا قریب حضرت سے یہ کہہ کر رخصت ہوئے ہیں کہ میرا کچھ غلہ ہے اسے گھر پہ رکھ آؤ تو آتا ہوں۔ ممکن ہے وہ آئیں تو اپنے ساتھ کچھ جوانان طے کو لیتے ہوئے آئیں۔ بہر حال اسباب جو کچھ بھی ہوں مگر بظاہر فوج یزید کو بہت جلدی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ یہ مہم جلدی سر ہو جائے۔ مگر تیروں کی اس ابتدائی بارش سے جماعت حسینؑ کو خاص نقصان نہیں پہونچا ہے تاہم وہ عملی طور پر ایک جنگ کا اقدام تھا جس کے فوج دشمن کی طرف سے ہو گئی اور یہ ایک آخری حجت تھی جس کے تمام ہونے کے امام منتظر تھے۔

چنانچہ بغیر کسی ہراس اور پریشانی کے امام متوجہ ہوئے اپنے اصحاب کی طرف فرمایا "کھڑے ہو جاؤ موت کے استقبال کے لیے جو بہر حال ضروری ہے۔ خدا اپنی رحمت تمہارے شامل حال رکھے یہ تیر نہیں بلکہ دشمن کے قاصد ہیں جو تمہاری طرف روانہ کیے گئے ہیں۔"

اصحاب حسینؑ جو حیرت انگیز ضبط و تنظیم کے ساتھ تیروں کی اس بارش کے بعد بھی اپنی اپنی جگہ برقرار تھے اور کسی قسم کا انتشار ان میں پیدا نہیں

تھا۔ امام کی جانب سے ان الفاظ میں اذن جہاد پاتے ہی فوراً مستعد ہو گئے اور انھوں نے تیروں کا جواب تیروں سے دیا جس کے معنی صرف مقابلہ کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار تھا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ہزاروں تیروں کے مقابلہ میں سو دو سو تیروں کے ادھر سے بھی چلے جانے سے افواج مخالف کو کوئی خاص نقصان پہونچ نہیں سکتا تھا مگر اُن کی اخلاقی حالت کو اس سے یہ محسوس کر کے صدمہ ضرور پہنچ سکتا تھا کہ اُن کی یہ تیروں کی سخت بارش ان مٹھی بھر انسانوں کو مرعوب نہیں کر سکی اور انھیں بہرحال ان سے جان توڑ مقابلہ کرنا پڑے گا ـــــ جس میں ہتھیاروں سے زیادہ دل کی طاقت کی ضرورت ہے اور ضمیر کے تزلزل سے یہی پہلو فوج یزیدی کا انتہائی کمزور ثابت ہو رہا تھا۔"

ستائیسواں باب

انصار امام کے حالات اور حیرت انگیز قربانیاں

چونکہ آغاز جنگ کے ساتھ ساتھ انصار حسینؑ کے مجاہدانہ خدمات کا عملی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے اس تذکرہ کے ساتھ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب و انصار کے مختصر حالات زندگی اور خصوصیات شخصی کا بھی جہاں تک کہ علم ہو سکا ہے تعارف ہوتا چلے اس لیے واقعات کی تاریخی ترتیب کو مد نظر رکھتے ہوئے جن انصار کے کارنامے آنکھوں کے سامنے آئے ہیں ان کے مختصر حالات سلسلہ کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔ انہی حالات کے ذیل میں جنگ کے تفصیلات اور واقعات کی ترتیب کا بھی بیان ہوتا جائے گا۔ اگرچہ شہدائے کربلا کے حالات کے متعلق عربی میں "ابصار العین فی انصار الحسینؑ" اور اردو میں "شہدائے کربلا" کے تین حصے مطبوعہ امامیہ مشن لکھنؤ مجامع اور مستند کتابیں موجود ہیں مگر اس غرض سے کہ زیر نظر کتاب اس حیثیت سے تشنہ نہ رہ جائے یہاں ان حالات کا لب لباب واقعاتی ترتیب کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ جو لوگ مزید تحقیق و تفصیل یا مختلف روایات پر بحث تبصرہ کے طلب گار ہوں وہ مذکورہ کتابوں کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

(۱) عبداللہ بن عمیر کلبی

آغازِ جنگ کے بعد اصحابِ حسینؑ میں سے سب سے پہلے میدانِ کارزار میں یہی آئے تھے۔

ان کا پورا نام و نسب :- ابو وہب عبداللہ بن عمیر بن عباس بن عبد قیس بن علیم بن خباب الکلبی العلیمی تھا۔ کوفہ کے رہنے والے تھے اور قبیلہ ہمدان کے "بیر جعد" نام کے کنوئیں کے پاس اپنے ذاتی مکان میں سکونت رکھتے تھے۔ (۱) یہ مقام کوفہ کی گنجان آبادی سے بالکل باہر اُن باغاتِ خرما کے قریب تھا، جو "نخیلہ" کے حدود میں واقع تھے۔ ان کے ساتھ ان کی رفیقۂ حیات رہتی تھیں جو قبیلۂ نمر بن قاسط سے تھیں اور ام وہب بنت عبد کے نام سے یاد کی جاتی تھیں۔ (۱) اہلِ سیر کا قول ہے کہ وہ بڑے شہسوار، بہادر اور شریف تھے۔ شیخ طوسی نے کتاب الرجال میں اُن کا اصحاب حضرت علیؑ میں تذکرہ کیا ہے۔ کوفہ میں جناب مسلم بن عقیل کی شہادت ہو چکنے پر جب ابن زیاد نے قتل حسینؑ کی تیاری شروع کی اس زمانہ میں عبداللہ بن عمیر بیرون شہر اپنے مکان ہی میں مقیم اور موجودہ صورتِ حال سے بالکل بےخبر تھے۔ جب امام حسینؑ کربلا میں پہونچ گئے اور ابن زیاد نے اپنا لشکر نخیلہ میں قرار دیا تاکہ وہاں فوجوں کا معائنہ کرنے کے بعد کربلا کی جانب روانہ کرے تو اس غیر معمولی صورتِ حال کی طرف عبداللہ بن عمیر کو بھی

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۴۵

توجہ ہوی اور انھوں نے لوگوں سے واقعات کی نوعیت دریافت کی۔ انھیں
بتایا گیا کہ یہ فوجیں دختر رسول فاطمہ زہرا کے فرزند حسین سے جنگ کرنے کے لئے
بھیجی جا رہی ہیں۔ یہ سننا تھا کہ بہادر عبداللہ کے ایمانی جذبہ میں تلاطم پیدا
ہوا۔ انھوں نے خیال کیا کہ مجھے مشرکین سے جہاد کرنے کی حسرت رہی ہے۔ ان
لوگوں سے جہاد کرنا جو اپنے رسول کے نواسے کے ساتھ جنگ کر رہے ہوں،
یقیناً اللہ کے نزدیک مشرکین کے ساتھ جہاد کرنے سے کم درجہ نہیں رکھتا ہوگا۔
یہ بات دل میں ٹھان کر وہ اپنی زوجہ کے پاس گئے اور انھیں اپنے ارادہ سے
مطلع کیا۔ پاک عقیدہ اور پر حوصلہ بی بی نے آتش شوق کو اور ہوا دی اس
طرح کہ انھوں نے کہا تم بھی جاؤ اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ چنانچہ رات
کے وقت دونوں روانہ ہوئے اور کربلا پہنچ کر انصار حسین کے ساتھ ملحق ہو گئے۔

اس وقت جب فوج عمر سعد کی جانب سے تیروں کی بارش ہو چکی تھی
جو پیغام جنگ کی حیثیت رکھتی تھی تو یسار اور سالم دونوں زیاد اور ابن
زیاد کے غلام میدان جنگ میں آئے اور مبارز طلب ہوئے۔ فوج حسینی میں
سے حبیب بن مظاہر اور بریر بن خضیر جوش میں بھرے ہوئے آگے بڑھے
مگر امام نے ان کو روک دیا۔ بس عبداللہ بن عمیر کو تو ولولہ جہاد تھا ہی وہ
کھڑے ہو گئے اور اجازت جنگ چاہی۔ امام نے سر سے پیر تک ان پر نظر ڈالی
اور گندمی رنگ، لانبا قد، مضبوط کلائیاں اور بازو۔ کشادہ پشت اور سینہ
ملاحظہ کرتے ہوئے بطور خود فرمایا "بہادر اور جنگ آزما جوان معلوم ہوتا ہے"
پھر فرمایا "جاؤ اگر تمھارا دل چاہتا ہے" عبداللہ میدان جنگ میں

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۴۵

آئے۔ فریق مخالف نے نام و نسب پوچھا اور انھوں نے بتایا۔ اُس نے کہا ہم تم کو نہیں پہچانتے۔ ہمارے مقابلہ میں زہیر بن قین یا حبیب بن مظاہر یا بریر بن خضیر کو آنا چاہیے۔ بس یہ سن کر عبداللہ کو غصہ آیا اُس کا جواب سخت الفاظ میں دیتے ہوئے انھوں نے حملہ کر کے پہلے وار میں یسار کا کام تمام کر دیا۔ عبداللہ اُس کی طرف متوجہ ہی تھے۔ کہ سالم نے تلوار کا وار کیا جو سر پہ آ چکا تھا۔ جب ان کو خبر ہوئی۔ بہادر نے بائیں ہاتھ کو سپر بنا دیا جس سے اس ہاتھ کی انگلیاں قطع ہو گئیں۔ مگر عبداللہ نے اتنی دیر میں پلٹ کر ایک ضرب شمشیر میں اس کا بھی خاتمہ کیا۔ (۱) زخم خوردگی کے غصہ اور اپنے دونوں حریفوں پر فتح پانے کے جوش سے متاثر ہو کر عبداللہ بن عمیر رجز پڑھنے لگے جس کا مفہوم یہ تھا کہ "اگر مجھے نہ پہچانتے ہو تو پہچان لو کہ میں قبیلۂ کلب کا سپوت ہوں۔ میرے حسب و نسب کے لیے اتنا کافی ہے کہ خاندان علیم میں میرا گھرانا ہے۔ میں ایک سخت مزاج اور درشت خو انسان ہوں اور مصیبت کے وقت پست ہمتی سے کام لینے والا نہیں ہوں۔ اے ام وہب میں ذمہ داری کرتا ہوں تجھ سے کہ میں ان میں بڑھ بڑھ کر نیزے لگاؤں گا۔ اور تلواریں ماروں گا۔ اور اس طرح کی شمشیر زنی کروں گا جو خدا پر ایمان رکھنے والے جوان ہمت انسان کے شایان شان ہو۔" (۲)

ممکن ہے کہ یہ بہادران عرب کی اس عام رسم کی بنا پر ہو کہ وہ اپنے کارناموں کا گواہ اپنی شریک زندگی خواتین کو بنایا کرتے تھے۔ مگر عبداللہ کی زوجہ عام عورتوں کے مثل نہ تھیں۔ وہ اپنے سینہ میں شیرانہ دل رکھتی تھیں اور اس دل میں ایمان کی غیر معمولی تڑپ کے ساتھ اپنے شوہر سے بے انتہا محبت

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۵ - ۲۴۶ - ارشاد صفحہ ۲۵۰ - (۲) طبری ج ۶ ص ۲۴۶ -

بھی ممکن ہے کہ جب انھوں نے اپنے شوہر سے فرمائش کی تھی کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو تو اسی وقت وہ یہ نیت رکھتی ہوں کہ میں بھی شوہر کے ساتھ میدان جنگ میں داد شجاعت دوں گی اور اس وقت تک شاید وہ اپنے قلبی جذبات کو انتہائی بے چینی کے باوجود روکتی رہی ہوں اہل حرم اور ان کی ہمراہی خواتین کو دیکھ کر جو احکام اسلام کے تحت میدان جنگ سے کنارہ کش رہتے ہوئے خیموں میں جاں گزیں تھیں۔

مگر عبد اللہ بن عمیر کا میدان جنگ میں مذکورہ بالا اشعار پڑھنا جو ایک طرف ولولہ جنگ کے مظہر، دوسری طرف جوش ایمان کا مرقع اور تیسری طرف قلبی واردات اور تعلق روحانی کے ترجمان تھے اور ان سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ اس حرب وضرب کے عالم میں بھی اپنی شریکۂ حیات کی یاد اپنے دل میں اور اس کی تصویر اپنی آنکھوں میں لیے ہوئے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنی شجاعت اور سرفروشی کی داد اس سے لینا چاہتے ہیں۔ بس یہ اسباب تھے جن کی بنا پر ان اشعار نے "ام وہب" کے ضبط وصبر کے لیے "برق خرمن" کا کام کیا، اور وہ بے تحاشا ایک گرز ہاتھ میں لے کر میدان جنگ میں آگئیں اور پکار کر کہنے لگیں کہ میرے ماں باپ دونوں تم پر نثار۔ اولاد رسول کی نصرت میں کوتاہی نہ ہونے پائے۔ (۱)

دلیر و غیور عبد اللہ کے لیے یہ منظر انتہائی صبر شکن ثابت ہوا۔ وہ فوراً زوجہ کے پاس آئے اور چاہا کہ انھیں خیمہ کی طرف پہونچا دیں مگر وہ باتوں میں آنے والی نہ تھیں۔ عبد اللہ بن عمیر کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی جس سے دشمن کا خون ٹپک رہا تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیاں کٹ چکی تھیں جن سے

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۶

خود لہو جاری تھا۔ پھر بھی انھوں نے کوشش کی کہ وہ اپنی قوت سے انھیں خیمہ کی طرف واپس کر دیں مگر جوش میں بھری بہادر خاتون نے اپنا دامن عبداللہ کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور کہنے لگیں کہ میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں جب تک تمہارے ساتھ میں بھی قتل نہ ہو جاؤں" امام حسینؑ نے یہ ملاحظہ فرما کر اُن کو آواز دی کہ اللہ تم دونوں کو جزائے خیر دے۔ اے مومنہ اہل حرم کے پاس واپس جاؤ اور اُن کے ساتھ بیٹھی رہو کیونکہ عورتوں پر سے جہاد ساقط ہے۔"

ایمان اور اطاعت امام کا احساس تھا جو بے پناہ جذبۂ الفت اور جوش قربانی پر غالب آیا اور ام وہب خواتین کے پاس خیمہ میں واپس چلی گئیں (۱) اور اُس کے بعد عبداللہ بن عمیر بھی صف مجاہدین میں واپس آ گئے اُس کے بعد وہ میسرہ کے حملہ میں شریک ہوئے اور مسلم بن عوسجہ کے بعد شہادت پائی جس کی تفصیل بعد میں آئیگی۔

(۲) حُر بن یزید ریاحی

نام و نسب :- حُر بن یزید بن ناجیہ بن قعنب بن عتاب بن ہرمی بن ریاح بن یربوع بن حنظلہ بن مالک بن زید مناۃ بن تمیم التمیمی الیربوعی الریاحی یہ خاندان عرب میں قدیمی عزت کا مالک تھا۔ عتاب جو حر کی چوتھی پشت میں ہے نعمان بن منذر ملک حیرہ کے مخصوصین میں وہ درجہ رکھتا تھا کہ گھوڑے پر اُس کے "ردیف" کی صورت سے سوار ہوتا تھا عتاب کے دو فرزند تھے قیس اور قعنب باپ کے انتقال کے بعد یہ منصب قیس کو حاصل ہوا۔

---

(۱) طبری، ج ۶، ص ۲۴۴

بنی شیبان نے اُس سے منازعت کی جس کے نتیجہ میں "یوم الطخفہ" کی خونریز جنگ واقع ہوی۔ قیس کے سلسلہ میں احوص شاعر ایک صحابی تھے جن کا نام ونسب "زید بن عمر بن قیس بن عتاب" تھا۔ طبقہ کے لحاظ سے وہ حر کے باپ یزید کے چچا زاد بھائی اور حُر کے رشتہ کے چچا ہوتے تھے۔

حُر کوفہ کے روساؤں میں سے تھے اور ابن زیاد کی فوج میں افسر کی حیثیت رکھتے تھے اور غادسیہ کی فوج جو ناکہ بندی کے لیے تعینات تھی اُس میں یہ بھی داخل تھے اس کے بعد ان کا امام حسینؑ کو روکنے کے لئے بھیجا جانا امام کا اُن کی تمام فوج کو شدت سے پیاسا دیکھکر اپنے ساتھ کا کل پانی پلانا اور امام سے اُن کی گفتگو اور آپکے ارادۂ روانگی کے موقع پر سدّراہ ہونا۔ اور آپ کو گھیر کر میدان کربلا تک لانا اور ابن زیاد کا خط پاکر آپ کو یہاں قیام کرنے پر مجبور کرنا، اسکے بعد صبح عاشور اُن کا لشکر یزید سے علٰحدہ ہو کر اصحاب حسینؑ میں شامل ہونا یہ تمام واقعات اس کتاب میں پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

آغاز جنگ کے بعد جب عبداللہ بن عمیر کلبی ایک کارنمایاں انجام دے چکے یعنی دست بدست لڑائی میں اُنھوں نے یسار اور سالم کو قتل کردیا تو اُس شکست کے غصہ میں برافروختہ ہو کر عمرو بن الحجاج نے جو میمنۂ لشکر یزید پر تھا مجموعی قوت سے حسینی جماعت پر حملہ کردیا۔

اس سخت موقع پر حسینی مجاہدوں نے گھٹنے اپنے زمین پر ٹیک دیے اور نیزوں کی انیاں سامنے کردیں جن سے دشمن کے گھوڑے اپنی جگہ ٹھہر گئے اور آگے نہ بڑھ سکے اس کے بعد جب وہ لوگ واپس ہونے لگے تو انھوں نے اُن کو تیروں کا نشانہ بنایا جس سے چند آدمی اُن میں قتل اور چند زخمی ہوے۔ (۱)

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۱۱۶۔ ارشاد ص ۲۵۸

جنگ کی اس شدت کو دیکھ کر بظاہر حُر کو خیال ہوا کہ کہیں کوئی ناصر حسینؑ مجھ سے پہلے قتل ہو جائے۔ یہ سوچ کر انھوں نے خدمت امام میں عرض کیا۔ "فرزند رسولؐ چونکہ سب سے پہلے آپ سے لڑنے کو آیا تھا لہذا چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اجازت دیں کہ سب سے پہلے میں ہی آپ کے قدموں پر نثار ہوں۔ اور اس طرح دنیا سے جا کر آپ کے جدِ بزرگوار کی دست بوسی کا شرف حاصل کروں"۔ امام نے اجازت دے دی اور حُر میدان جنگ میں پہنچے اور کچھ اشعار رجزیں پڑھنے لگے۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ " میں حُر ہوں اور مہمانوں کا پناہ دینے والا ہوں۔ میں تمھاری گردنوں پر تلواریں ماروں گا۔ اس امام کی جانب سے جو سرزمین مکہ کا سب سے بہتر رہنے والا ہے۔ میں تم کو تہہ تیغ کروں گا اور ذرا بھی اس کو ظلم نہیں سمجھوں گا" اس رجز کے بعد انھوں نے حملہ کرتے ہوئے شمشیر زنی شروع کر دی۔ اس کے پہلے جب حُر لشکرِ عمر سعد سے جدا ہو کر اصحاب حسینؑ میں شامل ہوئے تھے تو یزیدی لشکر کے ایک سپاہی یزید بن سفیان تمیمی نے کہا تھا کہ " بخدا اگر میں حُر کو دیکھ لیتا اُس وقت جب وہ لشکر سے نکل کر جا رہا تھا تو ایک نیزہ میں اُس کا کام تمام کر دیتا" اب جو حُر تن تنہا اتنے بڑے لشکر کے مقابلہ میں جنگ کر رہے تھے۔ آگے بڑھ بڑھ کے تلواریں لگا رہے تھے اور عنترہ کا یہ شعر ان کی زبان پر تھا کہ

ما زلت ارمیھم بثغرۃ نحرہ ولبانہ حتی تسربل بالدم

(یعنی) " میں برابر اُن پر پھینکتا رہا اپنے گھوڑے کی گردن اور اس کے سینہ کو یہاں تک کہ اس گھوڑے نے سر سے پاؤں تک خون کی چادریں اوڑھ لیں" (۱)

---

(۱) طبری ج ۶ صہ ۲۴۸ ارشاد صہ ۲۵۱۔

اور یہ شعر حقیقتاً اُن کے حسب حال تھا کیونکہ ان کا گھوڑا زخمی ہو چکا تھا۔ اُس کے سر و چہرے پر تلواریں پڑ چکی تھیں اور خون بہہ رہا تھا۔ اس وقت حصین بن تمیم نے جو قادسیہ کی ناکہ بندی پر مامور فوج کا افسر تھا۔ یزید بن سفیان سے کہا کہ دیکھو حُر یہی تو ہے جس کے قتل کرنے کی تم آرزو رکھتے تھے اُس نے کہا "اچھا" یہ کہہ کر وہ باہر نکلا اور پکارا حُر کیا مقابلہ منظور ہے؟" حُر نے کہا "ہاں ضرور" اور یہ کہتے ہی سامنے آ گئے۔ خود حصین کا قول نقل کیا جاتا ہے کہ بس یہ معلوم ہوا جیسے یزید کی جان حُر کے قبضہ میں تھی۔ چنانچہ وہ دم کے دم میں قتل ہو گیا۔ (۱) یہ ایسا پر ہیبت منظر تھا کہ دشمن کا پرا بند ہو گیا اور حُر کے مقابلہ کو پھر کوئی نہ نکلا۔ آخر وہ اپنے گھوڑے کو جو بری طرح زخمی ہو چکا تھا موڑ کر اپنے مرکز کی طرف واپس ہو گئے۔

اس کے بعد پھر وہ جنگ مغلوبہ میں شریک ہوئے اور ظہر کی نماز کا وقت آنے کے بعد شہید ہوئے۔ تفصیل اس کی بعد میں درج کی جائے گی۔

(۳) مسلم بن عوسجہ اسدی

اصحاب حسینؑ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ نام و نسب:۔ ابو حجل مسلم بن عوسجہ بن سعد بن ثعلبہ بن دودان بن اسد بن خزیمہ اسدی سعدی۔ ممتاز و معزز اشراف عرب میں سے، سردار قوم، عابد و تہجد گزار تھے۔ اور انھوں نے رسولؐ کی زیارت کی تھی شعبی ایسے محدث نے ان سے روایت

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۸ - ۲۴۹

احادیث کی ہے۔ ان تمام خصوصیات کے ساتھ وہ فارس بھی تھے اور میدان کارزار میں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ ۲۰ھ میں جب حذیفہ بن الیمان کی سرکردگی میں فوج اسلام نے ایران کے ترکستانی علاقہ آذربایجان کو فتح کیا تھا تو اس میں مسلم بن عوسجہ بھی شریک تھے اور انھوں نے اس جنگ میں بہت سے مشرکین کو قتل بھی کیا تھا۔ میدان کربلا میں وہ سن رسیدہ اور ضعیف العمر ہو چکے تھے۔

مجاہدہ حسینی سے متعلق ان کے خدمات کا سلسلہ عاشور محرم کے بہت پہلے سے شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ جب ابن زیاد کے کوفہ پر مسلط ہونے کے بعد مسلم بن عقیل ہانی کے گھر میں فروکش ہوئے اور انھوں نے بیعت کرنے والوں کی از سر نو تنظیم شروع کی تھی تو مسلم بن عوسجہ ان کے نمائندۂ خاص کی حیثیت سے ان کی بیعت اور اہل بیت رسولؐ کے ساتھ وفاداری کا عہد و پیمان لیتے تھے مگر شہادت جناب مسلم بن عقیل کے بعد پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں گئے اور پھر کس طرح امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچ گئے۔

شب عاشور حضرت امام حسینؑ نے جو تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا تھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ تم سب مجھے چھوڑ کر علیحدہ ہو جاؤ اور مجھے تنہا ان سے مقابلہ کرنے دو اس کے جواب میں عزیزوں کے بعد سب سے پہلے مسلم بن عوسجہ ہی کھڑے ہوئے تھے اور تاریخ انسانی کے لیے یادگار جوش اور خلوص میں بھرے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے کہ "بھلا ہم اور آپ کو چھوڑ کر چلے جائیں اور خدا کے سامنے جواب دہی کا سامان نہ کریں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ بخدا میں اتنا لڑوں گا کہ ان کے سینوں میں اپنے نیزہ کو توڑ دوں گا۔ اور تلوار میں لگاؤں گا۔ جب تک کہ اس کا قبضہ میرے ہاتھ میں سنبھل سکے گا۔ مگر آپ سے کبھی جدا نہ ہوں گا۔ یہاں تک کہ اگر میرے

پاس ہتھیار نہ ہوں گے جن سے جنگ کر سکوں تو انھیں پتھر ماروں گا۔ آپ کی نصرت میں یہاں تک کہ آپ ہی کے ساتھ رہتے ہوئے دنیا سے چلا جاؤں۔"

صبح عاشور شمر نے خیام حسینی کی پشت پر خندق میں آگ کے شعلے بھڑکتے دیکھ کر جو گستاخی کا تخاطب کیا تھا۔ اس کے جواب میں بھی مسلم بن عوسجہ نے غیظ میں آکر اس کو اپنے تیر کا نشانہ بنانا چاہا تھا۔ مگر امام کے مانع ہونے کی وجہ سے خاموش ہو گئے تھے۔

اب جنگ چھڑنے کے بعد کہاں ممکن تھا کہ معرکۂ کارزار میں وہ کسی سے پیچھے رہ جاتے۔ وہ بڈھے ضرور تھے مگر نصرت حسینؑ میں ان کا جوش و ولولہ جوانوں سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اصحاب امام میں سب سے پہلے وہی درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

اُس وقت جب عبداللہ بن عمیر دست بدست جنگ کر چکے اور حُر بھی میدان جنگ میں دادِ شجاعت دے چکے تو نافع بن ہلال جملی نے آگے بڑھ کر لڑنا شروع کیا اور وہ کہتے جاتے تھے کہ "میں قبیلۂ بنی جمل سے ہوں۔ میں علیؑ کے دین پر ہوں۔" اُن کے مقابلہ پر ایک شخص آیا جس کا نام مزاحم بن حریث تھا اُس نے کہا کہ "میں عثمان کے دین پر ہوں۔" نافع نے غصہ میں بھرے ہوئے جواب کے ساتھ اُس پر حملہ کیا اور اس کو قتل کر دیا۔ (۱)

ان پیہم نقصانات سے جو افواج مخالف کو برابر ہو رہے تھے، سرداران لشکر یزید پریشان ہو گئے۔ عمرو بن الحجاج نے جو اس کے پہلے ہی ایک حملہ کر کے ناکام واپس جا چکا تھا۔ زور سے اپنی فوج کو للکارا اور بلند آواز سے کہا "بے وقوفو! تم جانتے بھی ہو کہ کس سے جنگ کر رہے ہو یہ ملک کے خاص شہسوار اور جانوں پر کھیلے ہوئے افراد ہیں۔ تم میں سے کوئی شخص انفرادی

---

(۱) طبری ج ۶ صہ ۲۴۹ ارشاد صہ ۲۵۱

طور پر ان سے جنگ کے لیے نہ نکلے۔ ہاں چونکہ ان کی تعداد بہت کم ہے اس لیے یہ بہت تھوڑی دیر زندہ رہ سکتے ہیں۔ اگر تم سب مل کر فقط پتھر ہی ان پر برساؤ تو بھی ان کو قتل کر سکتے ہو۔"

یہ مشورہ کہ دست بدست جنگ نہ کی جائے۔ عمر سعد کو بھی پسند آیا اور تمام لشکر میں فرمان جاری کر دیا گیا۔ کہ کوئی شخص مبارز طلبی کے لیے میدان میں نہ نکلے۔ پھر عمرو بن الحجاج نے آگے بڑھ کر تمام لشکر میں جوش پیدا کرانے کے خیال سے ایک تقریر کی اور کہا "اے اہل کوفہ اطاعت اور وفاداری کے پابند رہو۔ اور اپنی جماعت سے الگ نہ ہو اور ذرا بھی شک و شبہہ نہ کرو ان لوگوں کے قتل کے بارے میں جو دین سے نکل گئے ہیں اور امام وقت (یزید) کے مخالف ہیں۔"

امام حسینؓ نے یہ گمراہ کن الفاظ سن کر جواب دینا ضروری سمجھا اور ارشاد کیا کہ "اے عمرو بن الحجاج تو لوگوں کو میرے خلاف آمادہ کرتا ہے! کیا ہم دین سے نکل گئے ہیں اور تم دین پر قائم ہو؟ قسم بخدا عنقریب اُس وقت جبکہ تمہاری جانیں ان جسموں سے جدا ہوں گی اور تم اپنے ان اعمال پر دنیا سے جاؤ گے معلوم ہو گا کہ کون دین سے نکلا تھا اور کون آتش جہنم میں جلنے کا مستحق تھا۔"

بہر طور عمرو بن الحجاج نے اپنی فوج کو آمادہ کر ہی لیا تھا۔ چنانچہ اُس نے پورے جوش و خروش سے میمنہ کی فوج کے ساتھ فرات کی جانب سے جماعت حسینی پر حملہ کیا۔ اس جماعت کے چھوٹے سے میسرہ نے ایسی پامردی سے مقابلہ کیا کہ دشمن کو پھر واپس ہونا پڑا مگر غبار کا دامن چاک ہوا تو مسلم بن عوسجہ خاک و خون میں غلطاں نظر آئے۔ امام حسینؓ فوراً مسلم بن عوسجہ کے سرہانے پہنچے جبکہ ان میں رمقِ جان باقی تھی آپ نے اُن کے لیے دعائے خیر

کرتے ہوئے اس آیت کی تلاوت فرمائی کہ فمنھم من قضٰی نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا (یعنی) "کچھ جانے والے گزر گئے اور کچھ وقت کے منتظر ہیں مگر کوئی اپنی بات سے ہٹا نہیں"۔

حبیب بن مظاہر جو امام کے ساتھ ساتھ تھے مسلم بن عوسجہ کے قریب گئے اور ان سے کہا کہ تمہارے ساتھ چھوٹ جانا بڑا صدمہ ہے۔ مگر میں تمھیں جنت کی مبارکباد دیتا ہوں۔ مسلم نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ "تمھیں بھی ہر طرح کی خیر و برکت کی مبارکباد قبول ہو"۔ حبیب نے کہا اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ میں بھی عنقریب تمہارے پیچھے پیچھے آتا ہوں تو کہتا کچھ وصیت کرو اور میں اس وصیت کو پورا کردوں"۔ (۱) مسلم نے جواب میں حسینؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا وصیت جو کچھ بھی ہے وہ اسی ذات سے متعلق ہے۔ مطلب یہ تھا کہ تم بھی ان ہی پر اپنی جان نثار کرنا۔ حبیب نے کہا "ضرور خدا کی قسم ایسا ہی ہوگا"۔

عمرو بن حجاج کے ساتھ کی بدحواس فوج اس مختصر سی جماعت کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر بے تحاشا بھاگی تھی۔

اُسے خبر بھی نہ تھی کہ کون قتل ہوگیا مگر مسلم بن عوسجہ کے ساتھ ان کے اہل و عیال موجود تھے۔ جب ان کی شہادت کی خبر خیمہ میں پہونچی تو ایک کنیز نے چیخ مار کر کہا۔

"ہائے ابن عوسجہ۔ ہائے میرا آقا"۔ اس آواز کو سن کر لشکر مخالف میں خوشیاں ہونے لگیں کہ ہم نے مسلم بن عوسجہ کو قتل کیا"۔ اس پر شبث بن ربعی کو غصہ آگیا اور اس نے کہا" غضب کی بات ہے کہ مسلم بن عوسجہ کا سا شخص قتل ہو اور تم لوگ خوشیاں مناؤ۔ بخدا میں نے خدمت اسلام میں اس شخص کے کارنامے دیکھے ہیں۔ آذربائیجان کی جنگ میں میرا چشم دید

واقعہ ہے کہ ابھی مسلمانوں کے لشکر کی پوری صف بندی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس بہادر نے چھ آدمی فوج مشرکین کے قتل کر دیے تھے۔ ایسا شخص تمہارے ہاتھ سے مارا جائے اور تم خوش ہو؟ (۱)

ظاہر بیں نگاہوں کو یہ باتیں معمولی معلوم ہوتی ہونگی مگر حقیقۃً یہ امام حسینؑ کی حقانیت کے وہ صریحی علامات تھے جو دوران جنگ میں برابر آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔

عبداللہ بن عمیر کی شہادت

بہرحال اس دوسرے اجتماعی حملہ کی اس کامیابی نے جو قتل مسلم کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی لشکر مخالف کا دل بڑھا دیا تھا۔ اس لیے اسکے بعد شمر بن ذی الجوشن نے میسرۂ فوج کو لے کر حسینی میسرہ پر حملہ کیا اور اس طرف بھی اصحاب حسینؑ نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ اس موقع پر عبداللہ بن عمیر نے جن کے حالات پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ بڑی جانفشانی سے کام لیا اور دو سپاہی دشمن کے بھی قتل کیے مگر اس کے بعد وہ ہانی بن ثبیت حضرمی اور بکیر بن حی تیمی کے ہاتھ سے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے طبری نے تصریح کی ہے کہ وہ اصحاب حسینؑ میں دوسرے مقتول تھے (۲)

زوجہ عبداللہ بن عمیر جنھوں نے اپنی زندگی کی تمام کائنات کو اپنے جذبۂ ایمانی پر قربان کر دیا تھا، یہ معلوم کر کے کہ اُن کا عزیز شوہر ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہو گیا اور وہ کربلا کی تپتی زمین پر اپنے خون کی سرخ چادر اوڑھے موت کی نیند سو رہا ہے ایک مرتبہ پھر بے چین ہو کر اس ارادہ سے نہیں کہ وہ جنگ

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۴۹ (۲) طبری ج ۶ ص ۲۴۹

کرینگی یا اپنے شوہر کے خون کا بدلا لیں گی بلکہ صرف اس لیے کہ وہ اپنے شوہر کی لاش کو دیکھ لیں، میدان میں پہنچیں دیکھا وہ شوہر کے سرہانے بیٹھ کر ان کے چہرہ سے گرد و غبار صاف کرتی۔ اور کہتی جاتی تھیں کہ "تمہیں جنت مبارک ہو بہشت کی سیر کرنا مبارک ہو۔ مگر دشمن کا ظلم و تشدد اس حد پر تھا کہ شمر نے اپنے غلام کو جس کا نام رستم تھا آواز دی کہ اس کا بھی کام تمام کر دے، وہ بڑھا اور اس نے ان ستم رسیدہ اور دل خستہ خاتون کے سر پر ایک ایسا گرز مارا کہ وہ شہید ہوگئیں (۱) اور اس طرح کربلا کے خونیں مرقع میں ایک قابل احترام خاتون کا مقدس لہو بھی شامل ہو گیا۔

(۴) بریر بن خضیر ہمدانی

سن رسیدہ تابعی، عبادت گزار اور حافظ قرآن، حضرت علی بن ابی طالبؑ کے اصحاب میں سے، کوفہ کے باشندہ اور قبیلۂ ہمدان کے اشراف میں سے، ابو اسحٰق ہمدانی سبیعی مشہور محدث و حافظ کے ماموں تھے۔ مسجد کوفہ میں لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ لوگ اُن کو سید القراء (حفاظ قرآن کا سردار) کہتے تھے۔ راستے میں کہیں پہ پہنچ کر اصحاب حسینؑ کے ساتھ ہو گئے اور حر کی ملاقات کے بعد جو خطبہ امام نے ارشاد فرمایا تھا اُس کے جواب میں زہیر بن قین اور نافع بن ہلال کی تقریروں کے بعد انھوں نے بھی ایک مختصر سی تقریر کی تھی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے عبد الرحمٰن بن عبد ربہ سے اُن کی اطمینانی گفتگو کا تذکرہ بھی اس کے قبل اس کتاب میں آ چکا ہے۔ جب بریر نے کچھ مزاح کیا اور عبد الرحمٰن نے کہا "یہ مذاق کا

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۵۱

کا وقت نہیں ہے تو بریر نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میرے قوم و قبیلہ والے اس
سے واقف ہیں کہ مجھے جوانی سے لے کر اس عمر تک کبھی مذاق سے دلچسپی نہیں رہی
مگر اس وقت تو اپنے مستقبل کے تصور سے میری خوشی کی انتہا نہیں کہ ادھر
میدان جنگ میں تلوار چلی اور بس نتیجہ میں ہمارے لیے آخرت کی زندگی اور سعادت
نصیب ہوئی۔

اس سے بریر کے شوق شہادت کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی جذبۂ
بے قرار کا نتیجہ تھا کہ وہ جنگ میں سبقت کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ سب سے
پہلے جو دو غلام زیاد و ابن زیاد کے لشکر یزید سے نکلے اور انھوں نے مبارز طلبی
کی تو حبیب اور بریر کھڑے ہو گئے تھے مگر امام نے ان کو روک دیا تھا۔
جماعت حسینی میں [illegible] ان کا نمایاں حیثیت رکھنا اس سے بھی ظاہر ہے
کہ جب عبد اللہ بن عمیر میدان میں گئے تھے تو ان دونوں غلاموں نے
کہا کہ ہم تم کو نہیں جانتے، ہمارے مقابلہ کے لیے زہیر بن قین یا حبیب
بن مظاہر یا بریر بن خضیر کو آنا چاہیے۔ گزشتہ جنگ مغلوبہ کے بعد دست
بدست مقابلے کے لیے یزید بن معقل لشکر یزید میں سے میدان جنگ
میں آیا۔ اس سے اور بریر سے پرانی ملاقات تھی اور مذہبی نوک جھونک
بھی ہوا کرتی تھی۔ اس لیے اس نے میدان جنگ میں بریر کو آواز دی
کہ "دیکھا تم نے خدا نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا"، بریر نے کہا "خدا نے
میرے ساتھ تو بڑا اچھا سلوک کیا۔ ہاں تو اپنی کہہ کہ بڑا بدنصیب ثابت
ہوا ہے"، یزید بن معقل نے جواب دیا۔ جھوٹ کہتے ہو حالانکہ اس کے پہلے
تمہیں جھوٹ بولنے کی کبھی عادت نہیں تھی۔ خیر یہ بتاؤ کہ تمہیں یاد ہے! ایک
دن ہم اور تم بنی لوذان کے کوچے سے ہو کر گزر رہے تھے اور تم کہہ رہے تھے کہ

عثمان گنہگار تھے اور معاویہ خود گمراہ اور دوسروں کا گمراہ کرنے والا ہے اور امام بحق بس علیؑ بن ابی طالبؑ ہیں"۔ بریر نے کہا کہ "میں اب بھی اپنے اسی خیال پر قائم ہوں"۔ یزید نے کہا "میں گواہی دیتا ہوں کہ تم گمراہ ہو"۔ بریر نے کہا "اچھا اس پر تیار ہو کہ میں تم سے مباہلہ کروں اور ہم تم دونوں مل کر خدا سے دعا کریں کہ وہ جھوٹے پر لعنت کرے اور جو حق پر ہو اس کے ہاتھ سے باطل پرست کو قتل کرا دے پھر میں تم سے جنگ کروں"۔ یزید معقل نے اس کو منظور کر لیا۔ دونوں فوجوں کی آنکھیں لڑی تھیں۔ دونوں نے آمنے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور خدا سے دعا کی۔ پھر جنگ میں مشغول ہو گئے۔ بس صرف دو ضربوں کی ردوبدل ہونے پائی، اس طرح کہ پہلے یزید نے تلوار لگائی جو بریر پر اچٹتی ہوئی پڑی اور کوئی صدمہ انھیں نہیں پہونچا۔ پھر بریر نے تلوار ماری جو خود کو کاٹتی ہوئی اُس کے دماغ تک پہونچی اور وہ گھوڑے سے زمین پر گر پڑا اس حالت سے کہ بریر کی تلوار اُس کے کاسۂ سر میں درآئی ہوئی تھی اور وہ اُسے باہر کھینچ رہے تھے۔ اسی حالت میں رضی بن منقذ عبدی نے اُن پر حملہ کر دیا وہ بریر سے لپٹ گیا اور کشتی لڑنے لگا۔ بریر اُس کو گرا کر سینہ پر سوار ہو گئے۔ کمینہ اور بزدل دشمن چیخ اٹھا اور پکارنے لگا "کہاں ہیں جنگ جو پہلوان، کہاں ہیں مدافعت کرنے والے جوان"، دفعتاً کعب بن جابر بن عمرو ازدی بریر پر حملہ کے لیے آگے بڑھا لشکر یزید کے دوسرے سپاہیوں نے اُس کو منع بھی کیا کہ "یہ بریر حافظ قرآن ہیں جو مسجد میں حفظ قرآن کرایا کرتے تھے"، مگر اُس نے نہ مانا، اور پشت کی جانب سے بریر پر نیزہ کا وار کر دیا جو سینہ سے پار ہو گیا۔ اور بریر زمین پر گر گئے۔ پھر اُس نے تلوار لگا کر بریر کا کام تمام کر دیا۔ (۱)

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۴۷

(۵) منجح بن سہم

جماعت حسینی میں آزاد افراد کے ساتھ ساتھ غلاموں کی نمایندگی بھی کافی تھی۔ ان میں سب سے پہلے سلسلۂ شہدا میں جن کا نام آتا ہے وہ منجح ہیں۔

شیخ الطائفہ نے کتاب الرجال میں ان کا اصحاب امام حسینؑ میں شمار کیا ہے زمخشری نے ربیع الابرار میں لکھا ہے کہ حسینیہ حضرت امام حسینؑ کی کنیز تھی جسے آپ نے نوفل بن حارث بن عبدالمطلب سے خرید فرمایا تھا۔ اور اسکی شادی سہم سے کردی تھی اس طرح منجح کی ولادت ہوی اور چونکہ یہ کنیز علی بن الحسینؑ (زین العابدینؑ) کے گھر میں خدمات انجام دیتی تھی اسلئے حضرت امام حسینؑ عراق کی طرف روانہ ہوے تو وہ اپنے فرزند منجح سمیت آپ کے ہمراہ آئی کربلا میں ان کی شہادت اوائل جنگ میں ہی واقع ہوی اور وہ حسان بن بکر خنظلی کے ہاتھ سے قتل ہوے

(۶) عمر بن خالد

پورا نام عمر بن خالد بن حکیم بن حزام الاسدی الصیداوی تھا۔ کوفہ کے اشراف میں سے اور اہلبیت رسولؐ کے سچے محب تھے۔ شروع میں مسلم بن عقیل کی نصرت کے لیے نکلے تھے مگر جب اہل کوفہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو یہ بھی روپوش ہو گئے یہاں تک کہ امام حسینؑ عراق کے حدود میں پہونچے اور آپ نے قیس بن مسہر صیداوی کو اپنی آمد کی اطلاع کے ساتھ کوفہ روانہ کیا قیس راستے میں گرفتار ہو گئے اور انکے قتل کا حکم ہوا مگر انھوں نے مرتے مرتے حسینؑ کی سفارت کے حق کو ادا کر دیا۔ یہ اعلان کرکے کہ امام حسینؑ مقام حاجز تک پہونچ گئے ہیں، جس کو جانا ہو ان کے پاس چلا جائے۔ یہ خبر عمر بن خالد کو پہونچی تو وہ اپنے غلام سعد اور تین دوسرے

ہمراہیوں کے ساتھ غیر معروف راستے سے ہو کر بہت تیز رفتاری کے ساتھ منزل عذیب الہجانات پر امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچ گئے جب کہ حر بن یزید ریاحی امام کی نقل و حرکت کی نگرانی کے لیے پہونچ چکا تھا چنانچہ حر نے مداخلت کی اور کہا کہ یہ لوگ آپ کے ساتھ نہیں آئے تھے، اس لیے یا تو میں انھیں گرفتار کرونگا یا کوفہ واپس مگر امام نے فرمایا وہ اب جبکہ یہ میرے پاس پہونچ گئے اور میری امان میں آ گئے تو میں انھیں تمہارے سپرد نہیں کر سکتا۔"

روز عاشور جنگ چھڑنے کے بعد یہ اور ان کے ساتھی وہ پانچ آدمی تھے جنھوں نے بیک وقت فوج دشمن پر حملہ کیا اور لشکر میں گھس کر شمشیر زنی کرنے لگے۔ لشکر یزید نے ان بہادروں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور جماعت حسینی سے بالکل جدا کر دیا۔ یہ دیکھ کر امام حسینؑ نے اپنے بھائی ابو الفضل العباسؑ کو ان کی مدد کے لیے بھیجا۔ آپ نے جا کر تن تنہا فوج پر حملہ کیا اور تلوار چلانا شروع کی یہاں تک کہ لشکر کو منتشر کر دیا اور ان زخمی بہادروں کو دشمن کے حلقہ سے نکال کر اپنی جماعت کی طرف واپس لے چلے۔ ابھی راستہ پورا طے نہیں ہوا تھا کہ دشمن تعاقب کے لیے آتے نظر آئے۔ عباسؑ نے ان بہادروں کو اپنے آگے کیا اور آپ خود بغرض حفاظت پیچھے ہو گئے، تاکہ ان کو کوئی گزند نہ پہونچنے پائے مگر دشمن کے قریب پہنچتے ہی زخمی بہادروں کے جوش کی انتہا نہ رہی اور وہ عباسؑ کی حفاظت سے نکل کر دشمنوں پر جھپٹ پڑے اور باوجودیکہ زخموں سے بالکل بے حال تھے لیکن جان توڑ کر شمشیر زنی کی اور آخر ایک ہی جگہ پر گر کر شہید ہو گئے (۱) عباسؑ نے مجبوراً امام کی خدمت میں واپس آ کر اس واقعہ کی اطلاع دی۔ حضرت نے چند بار ان بہادروں کے لیے درگاہ باری سے رحمت طلب کی۔

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۵۵

(۷) سعد مولی عمر بن خالد

شریف النفس اور بلند ہمت غلام تھے جنھوں نے مالک عمر بن خالد صیداوی کا آخر وقت تک ساتھ دیا۔ وہ اپنے مالک کے ساتھ اُسی مختصر قافلہ میں آکر اصحاب حسینؑ سے ملحق ہوئے تھے جو منزل عذیب الہجانات پر خدمت امام میں پہنچا۔ اور جنگ میں وہ اپنے ہمراہیوں کے جتھے میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۸) مجمع بن عبداللہ

نام و نسب :۔ مجمع بن عبداللہ بن مجمع بن مالک بن ایاس بن عبد مناۃ بن سعد العشیرۃ المذحجی العائذی۔ وہ تابعین میں سے تھے رسول اللہؐ کے زمانہ میں متولد ہوئے تھے اُن کے باپ نے رسول اللہؐ کی صحبت کے شرف کو حاصل کیا تھا اور خود مجمع حضرت علی بن ابی طالبؑ کے اصحاب میں داخل تھے چنانچہ جنگ صفین کے واقعات کے ذیل میں اُن کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ یہ بھی اُن پانچ اشخاص میں سے تھے جو منزل عذیب الہجانات پر امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور جب آپ نے ان سے کوفہ کی حالت کے متعلق دریافت فرمایا تو مجمع نے حسب ذیل الفاظ میں اہل کوفہ کی تصویر کشی کی تھی :۔ "بڑے بڑے آدمیوں کو تو بڑی رشوتیں دی گئی ہیں اور گٹھریاں بھر بھر کر مال و دولت عطا کیا گیا ہے تاکہ وہ موافق رہیں اور خیر خواہی کرتے رہیں اس لیے وہ سب متفق ہیں آپ کے خلاف اور عوام، اُن کے دل تو آپ کی طرف جھکتے ہیں مگر تلواریں اُن کی کل آپ کے خلاف کھنچی ہوئی ہونگی۔"

روز عاشور انھوں نے بھی اپنے جتھے کے ساتھ دشمن سے جنگ کی اور درجہ

شہادت حاصل کیا

(۹) عائذ بن مجمع

مجمع بن عبداللہ عائذی کے فرزند تھے۔ اپنے باپ کے ساتھ منزل عذیب الھجانات پر امام حسینؑ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا تھا اور انہی کے ساتھ اپنے جتھے میں رہتے ہوئے جنگ میں شرکت کی اور شہید ہوئے۔

(۱۰) جنادہ بن حارث سلمانی

سلمان قبیلۂ مراد کی ایک شاخ اور مراد قبیلۂ مذحج کا ایک شعبہ ہے جنادہ بن حارث کوفہ کے باشندہ اور "مشاہیر شیعہ میں سے تھے۔ عہد رسول اکرمؐ کا ادراک کیا، پھر حضرت علی بن ابی طالبؑ کے ساتھ رہے اور جنگ صفین میں جہاد کیا۔ شیخ طوسی نے کتاب الرجال میں اُن کا نام اصحاب حسینؑ میں درج کیا ہے۔

جب مسلم بن عقیل کوفہ میں امام حسینؑ کی بیعت لے رہے تھے تو جنادہ نے وفاداری کے ساتھ بیعت کی اور مسلم کے ساتھ جہاد میں شریک بھی ہوئے مگر جب فضا مسلم کے خلاف ہوگئی تو وہ بھی مثل دیگر اشخاص کے مخفی ہوگئے اور آخر اُسی جتھے میں جو منزل عذیب الھجانات میں خدمت امام میں پہنچا تھا وہ بھی حاضر ہوئے اور اُسی جتھے کے ساتھ رہ کر جنگ بھی کی اور درجۂ شہادت حاصل کیا۔

(۱۱) جندب بن حجیر کندی خولانی

کوفہ کے باشندہ اور ممتاز شیعی افراد میں سے تھے۔ حضرت علیؑ بن ابی طالب کی

صحبت سے شرفیاب ہوئے اور جنگ صفین میں کندہ اور ازد کے رسالوں کے افسر تھے۔ جب امام حسینؑ کوفہ کی سمت راہ پیما تھے تو حر کی ملاقات سے پہلے ہی وہ خدمت امام میں پہنچ کر ہمراہی کے شرف سے بہرہ یاب ہوئے اور روز عاشورہ جنگ کے ابتدائی ہنگام میں جنگ کر کے شہید ہوئے۔

(۱۲) یزید بن زیاد بن مہاصر ابو الشعثاء کندی بہدلی

شیعیان کوفہ میں سے، شریف، بہادر اور جنگ آزما تھے۔ امام حسینؑ کی خدمت میں حُر کی ملاقات سے پہلے حاضر ہوئے اور پھر ہمراہ رکاب رہے تھے۔ جب کربلا کی سرزمین کے قریب پہونچ کر حُر کے پاس ابن زیاد کا قاصد یہ خط لایا تھا کہ جہاں یہ خط پہونچے وہیں حسین کو اُترنے پر مجبور کیا جائے" تو ابو الشعثاء نے اس قاصد کو پہچانا تھا کہ وہ مالک بن نسر بدی ہے۔ چونکہ وہ بھی قبیلۂ کندہ سے تھا۔ اس لیے ابو الشعثاء نے اُس کو نصیحت کرنا ضروری سمجھتے ہوئے اُس سے کہا کہ یہ تو نے کیا غضب کیا۔ اس کام کے لیے تو آیا؟ اُس نے کہا" میں نے اپنے امام کی اطاعت کے حق کو پورا کیا۔ ابو الشعثا نے جواب دیا کہ تو نے خدا کی نافرمانی کی اور اپنے امام کی اطاعت یقیناً تو نے اسطرح اپنے نفس کی ہلاکت کا سامان کیا اور ہمیشہ کے لیے ننگ و عار اور آتش جہنم کا مستحق بنا۔ خداوند عالم نے یہ فرمایا ہے کہ کچھ امام ایسے ہیں جو آتش جہنم کیطرف دعوت دیتے ہیں اور روز قیامت اُن کی کوئی فریاد رسی نہیں ہوگی، بے شک تیرا امام ایسا ہی ہے"۔

وہ بہت بڑے تیر انداز تھے۔ روز عاشور اپنے گھٹنے ٹیک کر وہ امام کے سامنے بیٹھ گئے اور آٹھ تیر لگائے جن میں سے پانچ تیر ٹھیک نشانہ پر پڑے اور پانچ آدمیوں کو دشمنوں میں سے ہلاک کیا۔ جب تیر ختم ہو گئے تو وہ تلوار لیکر

میدان آئے اور یہ رجز پڑھی۔

"میں یزید ہوں اور میرے باپ مہاصر تھے میں شیر بیشہ سے زیادہ بہادر ہوں خداوند اگواہ رہنا کہ میں حسینؑ کا ناصر اور ابن سعد سے بے تعلقی اختیار کرنیوالا ہوں"

آخر درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

تاریخ میں تصریح ہے کہ وہ ابتداء جنگ کے شہداء میں سے ہیں (۱)

حملۂ اولیٰ

حقیقۃً تاریخ کا یہ یادگار اور حیرت انگیز واقعہ ہے کہ تیس ہزار فوج مقابلے پر بہتر یا زیادہ سے زیادہ سو ڈیڑھ سو نفوس ہوں اور وہ بھی تین دن کے بھوکے پیاسے اور اس کے باوجود وہ فوج کثیر اس جماعت قلیل سے نقصان پر نقصان اور شکست پر شکست اٹھائے اور اس کے بنائے کچھ نہ بنے صبح سے دوپہر کے قریب تک کا وقت آجائے اور حسینی جماعت کی صف مثل ایک مضبوط و محکم آہنیں دیوار کے سامنے موجود رہے اس کے برخلاف افواج یزید میں اضطراب و بدنظمی کے آثار نمایاں ہوں اور وہ کسی ایک طریقۂ جنگ پر قائم نہ رہ سکیں راوی کا بیان ہے کہ اصحاب حسینؑ نے سخت جنگ کی اور اُن میں کے سواروں نے جو تعداد میں صرف بتیس ۳۲ تھے لشکر یزید پر تابڑ توڑ حملے کیے اور وہ جس صف پر حملہ کرتے تھے اس کو

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۵۵

منتشر کر دیتے تھے۔ (۱) چنانچہ جب عزرہ بن قیس نے جو لشکر یزید کے سواروں کی فوج کا افسر تھا یہ دیکھا تو اُس نے عمر بن سعد کے پاس عبد الرحمان بن حصن کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ "آپ دیکھتے ہیں کہ آج صبح سے اس چھوٹی سی جماعت کے ہاتھوں میری فوج کی کیا حالت ہے؟ اب آپ پیادوں کی فوج اور تیر اندازوں کے دستوں کو بھیجئے کہ وہ مقابلہ کریں،، لشکر یزید کے لیے کس درجہ شرم کا مقام تھا کہ اُس کے سواروں کا افسر ہمت ہار چکا اور کھلے ہوئے الفاظ میں اقرار شکست کر لیا۔ اُس کے بعد پیادوں کی طرف رجوع کی گئی اور شبث بن ربعی کو جو پیادہ فوج کا افسر تھا۔ عمر سعد کا یہ تہدیدی پیغام پہونچا کہ "تم آگے کیوں نہیں بڑھتے؟،، مگر اُس نے حقارت آمیز جواب یہ دیا کہ "افسوس ہے اس مہم کو سر کرنے کے لیے سواروں کی اتنی بڑی فوج ناکافی سمجھی جائے اور میرے ایسے بڑے سردار کو زحمت دی جائے اور پھر تیر اندازوں کی بھی ضرورت محسوس ہو رہی ہو، کیا میرے سوا کوئی اور اس مہم کو سر کرنے کے لیے نہیں ملتا؟ یہ سنکر مجبوراً عمر سعد نے حصین بن نمیم کو اُسی فوج کیساتھ جو قادسیہ کی سرحد میں ناکہ بندی کی غرض سے تعینات رہ چکی تھی پانچ سو تیر اندازوں کے اضافہ کے ساتھ مامور کیا کہ وہ آگے بڑھے اور خیمہ حسینی کے نزدیک جاکر پاس سے ان پر تیروں کا مینھ برسائے۔ (۲)

فن جنگ کے واقفکار اچھی طرح جانتے ہیں کہ تیروں کی زد کے لیے ایک محدود فاصلہ کا درمیان میں ہونا ضروری ہے۔ مقررہ فاصلہ سے زیادہ پر تیر اندازی ایک طرح سے ہوائی فائروں کی حیثیت رکھتی ہے جس سے گزند نہ پہنچنے کا قوی امکان ہوتا ہے۔ مگر تھوڑی مسافت سے تیروں کی ہنگامہ خیز بارش ایک بے پناہ حملہ ہے

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۰ - ارشاد صفحہ ۲۵۱ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۰

جس سے محفوظ رہنے کے لیے نہ فنون جنگ کام دے سکتے ہیں، نہ شجاعت و جرائت۔ اسی لیے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ یہ بزدلانہ طریقہ جنگ ہے اور شجاعان روزگار کے لیے ننگ۔ یہ ظاہر ہے کہ اصل لشکرگاہ دو متخاصم فریقوں کے ایک دوسرے سے کافی فاصلہ پر ہوتے ہیں یقیناً اُسی صورت پر کربلا میں بھی تھے

دونوں لشکروں کی صف آرائی بھی اس طریقہ پر ہوتی ہے کہ درمیان کافی وسیع مصاف باقی رہے اور یہ مسافت بھی کچھ کم نہیں ہوتی ہے پہلی مرتبہ کے تیروں کی بارش کا عنوان یہ تھا کہ عمر سعد نے اپنے لشکر ہی سے جس کی صف آرائی ہو چکی تھی تیر چلایا اور اُسی کے ساتھ اُس کے لشکر والوں نے بھی تیر رہا کیے لہٰذا ان تیروں سے جماعت حسینی کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوا تھا اور نہ ہونا چاہیے تھا سوائے اس کے کہ ان کے ذریعہ سے اعلان جنگ ہو گیا۔

اور عملی طور سے حرب و ضرب شروع ہو گئی۔ مگر اس وقت جس طریقہ سے تیر اندازی مقصود تھی اُس کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ اس لیے کہ اس مرتبہ پورے طور سے جماعت حسینی کو زد پر لا کر تیر برسائے جا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ تیر کی زد سے ڈھال یا نیزہ و شمشیر کے ذریعہ سے تحفظ ممکن نہیں ہے۔ البتہ تیر کو خالی دے کر اُس سے بچا سکتا ہے مگر یہ اُسی وقت کارگر ہو سکتا ہے جب ادھر اُدھر تیروں کی زد سے خالی جگہ موجود ہو لیکن تصور میں اس منظر کو سامنے لایا جائے کہ صرف سو ڈیڑھ سو نفوس پر مشتمل جماعت حسینی صف باندھے ایستادہ اور ان کے مقابلہ میں ہزاروں کی تعداد میں ایک فوج آ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور تیر برسانا شروع کرتی ہے۔ تو وہ کتنی زیادہ دور تک پھیلی ہوئی ہو گی۔ اور جب اس کی طرف سے ایک مرتبہ مجموعی طور پر یک جہت اور ہم آہنگ ہو کر ایک نشانہ

پر، ایک ہی مرکز کو سامنے رکھے ہوئے بہت دور سے نہیں بلکہ قریب سے تیر برسائے جا رہے ہیں تو کیا اس میں کوئی شک ہو سکتا ہے کہ ان تیروں نے ایک عظیم سیلاب ایک بڑے طوفان، ایک تیز آندھی یا لوہے کی ایک چادر کی طرح چپ و راست ہر طرف سے اس مختصر جماعت کو ڈھانپ لیا ہوگا۔ اور اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا باقی نہ ہوگا جو ان تیروں کی زد میں نہ آتا ہو۔ مگر انصار حسینؑ نے اس بے پناہ تیروں کے سیلاب کا یوں مقابلہ کیا کہ تلواریں سونت لیں اور لوہے کی ان چادروں کو اپنے سینوں سے ریلتے ہوئے دشمن کی فوج پر جا پڑے اور اس میں در آ کر شمشیر زنی کرنے لگے۔

یہی وہ عظیم الشان حملہ اور گھمسان کی جنگ ہے جو تاریخوں میں "حملہ اولیٰ" کے نام سے مذکور ہے اور یہ ظہر سے ایک گھنٹہ قبل کا واقعہ تھا۔

اصحاب حسینؑ نے پھر دشمن کو شکست دی اور فوج کو پسپا کیا مگر اس حملہ کا نتیجہ خود جماعت حسینی کے لیے بھی بہت دردانگیز ثابت ہوا۔ چنانچہ جس وقت میدان صاف ہوا اور گرد و غبار دور ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ مختصر تعداد اور زیادہ مختصر ہو چکی تھی اس لیے کہ پچاس آدمی انصار حسینؑ میں سے درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے تھے جن میں سے بعض تیروں کا نشانہ بنائے گئے تھے۔ اور بعض جنگ مغلوبہ میں شہید کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ جتنے گھوڑے اصحاب حسینؑ کی سواری میں تھے وہ سب بھی ختم کر دیے گئے تھے اور چند اصحاب حسینؑ بھی جو سوار تھے اب پیادہ ہو گئے تھے (۱)

چنانچہ حُر بن یزید ریاحی بھی جن کا گھوڑا اس کے پہلے ہی زخمی ہو چکا تھا اب پیادہ ہو گئے جس کا تذکرہ ان کے دشمن ایوب بن مشرح خیوانی نے اس طرح کیا ہے کہ میں ہی وہ شخص تھا جس نے حُرؑ کے گھوڑے کو پے کیا۔

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۵۰ ارشاد ص ۲۵۲

بس میں نے ایک تیر ایسا لگایا کہ فرس تھرا کر زمین پر گر گیا۔ اور حُر شیر کے مانند جست کر کے اُس کی پشت سے علیحدہ ہوئے۔ تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے اور اس مضمون کا شعر پڑھ رہے تھے کہ "اگر تم نے میرا گھوڑا پے کر ڈالا تو کوئی حرج نہیں، میں ایک شریف انسان کا فرزند ہوں اور شیر سے زیادہ شجاعت کا مالک ہوں"۔ دوسرے ایک مشاہد کا بیان ہے کہ اُن کا سا میں نے دوسرا کوئی شمشیر زنی کرنے والا نہیں دیکھا۔ (۱)

اس حملہ کے ذیل میں جو پچاس انصار حسینؑ شہید ہوئے ان میں نہیں کہا جا سکتا کہ کون پہلے شہید ہوا اور کون بعد کو، اس لیے ان کے حالات حروف تہجی کی ترتیب سے درج کئے جاتے ہیں۔

(۱۳) ادہم بن امیّہ عبدی بصری

قبیلۂ عبد قیس سے بصرہ کے باشندہ تھے۔ بصرہ میں ایک خاتون تھیں ماریہ بنت منقذ عبدیہ جو شیعہ علی اور محب اہلبیت نبوت تھیں اور اُن کے مکان پر اکثر شیعیان علیؑ کا اجتماع ہوتا رہتا تھا۔ جب امام حسینؑ نے مکہ معظمہ سے کوفہ کی روانگی کا قصد کیا اور ابن زیاد بصرہ سے کوفہ کی گورنری پر مامور ہوا اور بصرہ کے نئے گورنر کی جانب سے ناکہ بندی کا انتظام ہوا تاکہ کوئی شخص نصرت حسینؑ کے لیے بصرہ سے نہ جانے پائے تو ماریہ عبدیہ کے مکان پر یزید بن ثبیط قیسی نے نصرت حسینؑ

---

(۱) طبری ج ۶ صت۲۵

کی غرض سے کوفہ کی طرف جانے کا عزم ظاہر کیا۔ چونکہ صریحی طور پر ان کا یہ مقصد خطرے سے خالی نہ تھا کچھ زیادہ اشخاص ان کے اس عزم سے ہم آہنگ نہ ہوئے پھر بھی یزید بن شبیط کے دو فرزند اور چار دوسرے افراد وہ تھے جنھوں نے ان کے ساتھ اتحاد عمل کیا۔ چنانچہ ان سب نے اپنی جانوں پر کھیل کر مقام البطح پر جو کہ مکہ معظمہ ہی کے حدود میں تھا۔ امام کی ہمراہی اختیار کی۔ ان ہی چار اشخاص میں ایک ادہم بن امیہ بھی تھے جو روز عاشور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۱۴) امیّہ بن سعد بن زید طائی

قبیلۂ طے کے بہادر، جنگ آزما اور شہسوار تھے۔ حضرت علی بن ابی طالبؑ کے اصحاب میں محسوب ہوتے تھے۔ آپ کے ساتھ جنگ صفین میں شرکت بھی کی تھی۔ اور کار نمایاں انجام دیا تھا۔ اس کے بعد ان کا کوفہ میں قیام رہا۔ جب امام حسینؑ کے کربلا میں پہونچنے کی خبر ہوئی تو گفتگوئے صلح کے دوران میں کسی عنوان سے کوفہ سے کربلا پہونچے اور امام کی ہمراہی اختیار کی، یہاں تک کہ روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۱۵) جابر بن حجاج تیمی

قبیلۂ تیم اللہ بن ثعلبہ میں سے، عامر بن نہشل تیمی کے آزاد کردہ غلام

تھے۔ کوفہ کے باشندہ اور شہسوار تھے۔ پہلے مسلم بن عقیل کی حمایت کے لیے کمربستہ ہوئے تھے مگر حالات کے ناسازگار ثابت ہونے کے بعد مثل دوسرے بہت سے افراد کے وہ بھی اپنے قبیلہ میں روپوش ہو گئے تھے۔ جب امام کے کربلا میں وارد ہونے کی اطلاع ہوی تو وہ عمرسعد کی فوج کے ساتھ کربلا پہونچے اور خفیہ طریقہ پر اس سے علیحدہ ہوکر انصار امام حسینؑ میں شامل ہو گئے۔ اور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۱۶) جبلہ بن علی شیبانی

کوفہ کے باشندہ۔ بہادر اور شجاع تھے۔ جنگ صفین میں حضرت علی بن ابی طالبؑ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے تھے۔ حضرت مسلم بن عقیل کی نصرت کے لیے بھی کمربستہ ہوئے تھے مگر حالات کی ناسازگاری کے بعد وہ بھی اپنے قبیلہ میں روپوش ہو گئے۔ اور جب امام حسین کربلا میں پہنچ چکے تو وہ بھی کسی نہ کسی صورت سے کوفہ سے آکر انصار حسینی میں شامل ہوئے اور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۱۷) جنادہ بن کعب بن حارث انصاری خزرجی

امام حسینؑ کی ہمراہی میں مکۂ معظمہ سے متعلقین سمیت آئے تھے اور حملۂ اولیٰ میں جنگ کرکے شہید ہوئے۔

(۱۸) جوین بن مالک بن قیس بن ثعلبہ تیمی

قبیلۂ بنی تیم میں سکونت رکھتے تھے۔ اس لیے اُسی قبیلہ کی طرف منسوب ہوتے تھے۔ اور جب کوفہ کے تمام قبائل امام حسینؑ کے خلاف جنگ کرنے کے لیے بھیجے جا رہے تھے تو وہ بھی قبیلۂ بنی تیم کے ساتھ عمر سعد کی فوج میں شامل ہو کر میدان کربلا تک پہونچے اور جب امام حسینؑ کے پیش کردہ شرائط صلح نامنظور کر دیے گیے اور جنگ کا ہونا قطعی قرار پا گیا۔ تو وہ اسی قبیلہ کے چند دوسرے افراد کے ساتھ شب کے وقت عمر سعد کی فوج سے جدا ہو کر رفقائے امام کی جانب آ گئے اور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۱۹) حارث بن امرأ القیس بن عابس کندی

شجاعان روزگار میں سے اور عابد و زاہد تھے۔ اکثر لڑائیوں میں کار نمایاں انجام دے چکے تھے۔ اُن کے مذہبی احساس اور ثبات و استقلال کا اس واقعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ قلعۂ بجیر کا محاصرہ کرنے والوں میں شامل تھے جب مرتدین کو اس قلعہ سے باہر نکال کر قتل کیا جانے لگا۔

تو حارث نے اپنے حقیقی چچا پر حملہ کیا۔ اس نے کہا: "میں تو تمھارا چچا ہوں" حارث نے جواب دیا کہ مگر اللہ میرا پروردگار ہے اور اُس کا حکم مقدم ہے۔" یہ کہہ کر اُسے قتل کر ڈالا۔

کربلا میں وہ بھی عمر سعد کی فوج میں داخل ہو کر پہنچے تھے لیکن شرائط صلح کے نامنظور ہونے کے بعد اُس سے علیحدہ ہو کر اصحاب حسینؑ کے ساتھ ہو گئے اور روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۲۰) حارث بن نبہان

ان کے والد نبہان حضرت حمزہ بن عبد المطلب کے غلام، بہادر اور شہسوار تھے۔ جنگ احد میں حمزہ کی شہادت واقع ہوئی۔ اس کے دو برس بعد نبہان نے دنیا سے رحلت کی اس کے بعد سے حارث نے جناب امیرؑ کی خدمت میں رہنا اختیار کیا اور پھر امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی خدمت میں رہے۔ جب حضرت امام حسینؑ نے مدینہ سے ہجرت فرمائی تو حارث بھی ہمراہ رہے اور روز عاشور حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۲۱) حباب بن حارث

ابن شہر آشوب نے حملۂ اولیٰ کے شہداء میں ان کا بھی نام درج کیا ہے۔ حالات بالکل معلوم نہیں ہوئے۔

(۲۲) حباب بن عامر بن کعب تیمی

قبیلۂ تیم اللات بن ثعلبہ میں سے کوفہ کے باشندہ، شیعہ علیؑ تھے اور مسلم

بن عقیل کی بیعت کی تھی۔ جناب مسلم کی شہادت کے بعد وہ اپنے قبیلہ میں پوشیدہ ہو گئے۔ جب امام حسینؑ کی کوفہ کی جانب روانگی کی اطلاع ان کو ہوئی تو خفیہ طور پر کوفہ سے باہر نکلے اور راہ میں امام حسینؑ کی خدمت میں پہونچ کر ہمراہ رکاب ہوئے یہاں تک کہ روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۲۳) حبشہ بن قیس نہمی

پورا نام و نسب :۔ حبشہ بن قیس بن سلمۃ بن طریف بن ابان بن سلمۃ بن حارثہ ہمدانی نہمی تھا۔ حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ ان کے دادا سلمہ بن طریف صحابہ پیغمبر میں سے تھے اور خود حبشہ بن قیس راوی حدیث تھے۔ روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۲۴) حجاج بن زید سعدی تمیمی

قبیلۂ بنی سعد بن تیم میں سے بصرہ کے باشندہ تھے۔ امام حسینؑ نے مکہ معظمہ سے روانگی کے موقع پر چند خط رؤسائے بصرہ کے نام روانہ فرمائے تھے جن میں سے ایک مسعود بن عمرو ازدی کے نام تھا۔ مسعود نے اپنے قبیلہ کے تمام اقوام بنی تمیم۔ بنی حنظلہ بنی سعد اور بنی عامر کو مجتمع کر کے ایک تقریر کی جس میں اُن کو نصرت امام حسینؑ پر آمادہ کرنا چاہا۔ جس کے نتیجہ میں ایک جماعت نے نصرت امام کا وعدہ کیا۔ مسعود نے ایک خط امام

کے نام تحریر کیا جس میں حضرت کی تشریف آوری عراق پر اظہار مسرت کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ میں نے بنی تمیم اور بنی سعد کو تمام تر آپ کی نصرت پر آمادہ کر لیا ہے اور وہ سب آپ پر اپنی جان نثار کریں گے۔ یہ خط حجاج بن بدر سعدی کے ہاتھ روانہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ کربلا میں آ کر امام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور روز عاشور حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۲۵) حلاس بن عمرو ازدی راسبی

اصحاب حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ میں سے تھے اور حضرت کے زمانۂ خلافت میں کوفہ میں پولیس کے افسر کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ میدان کربلا میں عمر سعد کی فوج کے ساتھ آئے تھے مگر گفتگوئے مصالحت کے ناکام ہونے پر مخفی طریقہ سے شب کے وقت اصحاب حسینؑ میں شامل ہو گئے اور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۲۶) حنظلہ بن عمر شیبانی

ابن شہر آشوب نے ان کا بھی نام حملہ اولیٰ کے شہیداء میں ذکر کیا ہے حالات معلوم نہیں۔

(۲۷) زاہر بن عمرو اسلمی کندی

اصحاب رسولؐ میں سے راوی حدیث تھے اور بیعت رضوان کے شرف سے بہرہ اندوز ہوئے تھے۔ صلح حدیبیہ کے بعد جنگ خیبر میں شریک

جہاد بھی ہوئے تھے۔ شجاعت اُن کی ممتاز صفت اور نمایاں جوہر تھا اور اہل بیت رسولؐ کی محبت ان کے لیے سرنامۂ اعزاز۔ جب زیاد بن ابیہ معاویہ کی طرف سے کوفہ کا گورنر تھا اور عمرو بن الحمق الخزاعی نے اس کی مخالفت کا علم بلند کیا تھا تو زاہر بھی اُن کے ساتھ تھے جب معاویہ نے عمرو بن الحمق کی گرفتاری کا حکم بھیجا تو زاہر کے نام بھی وارنٹ جاری ہوا تھا۔ مگر وہ روپوش ہو گئے اور قبضہ میں نہ آسکے۔

۶۰ھ میں حج بیت اللہ الحرام سے شرفیاب ہوئے اسی سلسلہ میں امام حسینؑ سے ملاقات ہوئی اور وہ اصحاب حسینؑ میں شامل ہو گئے۔ یہاں تک کہ حضرت کی ہمراہی میں کربلا آئے اور روز عاشورا حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔ اصحاب ائمہ میں سے محمد بن سنان زاہری متوفی ۲۲۰ھ جو امام رضاؑ اور امام محمد تقیؑ کے رواۃ میں سے تھے انہی زاہر کی نسل سے تھے۔

(۲۸) زہیر بن بشر خثعمی

حملۂ اولیٰ کے شہداء میں ان کا بھی شمار ہے۔ حالات معلوم نہیں۔

(۲۹) زہیر بن سلیم بن عمرو ازدی

شب عاشور جب لشکر یزید نے امام حسینؑ کو شہید کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا تو وہ وہاں سے نکل کر اصحاب حسینؑ کی طرف آگئے اور آپ کی نصرت کرتے ہوئے حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۳۰) سالم مولیٰ عامر بن مسلم العبدی

اپنے مالک کے ساتھ اُسی قافلہ میں جو یزید بن شبیط قیسی کے ساتھ بصرہ سے مقام ابطح میں پہنچا تھا۔ امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۳۱) سلیم

امام حسنؑ کے باوفا غلام تھے اور کربلا میں نصرت امام حسینؑ کا حق ادا کرتے ہوئے حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۳۲) سوار بن ابی عمیر نہمی

پورا نام و نسب :۔ سوار بن منعم بن ابی عمیر بن نہم الہمدانی النہمی۔ راویان احادیث میں سے تھے۔ امام حسینؑ کے کربلا میں پہونچنے کے بعد گفتگوئے صلح کے دوران میں کربلا پہونچے تھے۔ روز عاشور حملۂ اولیٰ میں نصرت حسینؑ میں جنگ کا شرف حاصل کیا یہانتک کہ زخمی ہو کر گر گئے۔ دشمن اُن کو گرفتار کر کے عمر سعد کے پاس لے گئے، اُس نے چاہا کہ اُن کو قتل کر لوے مگر اُن کے ہم قبیلہ سپاہی مانع ہوتے اور انھیں بچا کر اپنے ساتھ لے گئے لیکن وہ زخمی اتنے ہو چکے تھے کہ جانبر نہ ہو سکے اور چھ مہینے تک اُنھی زخموں کے تکالیف مبتلا رہنے کے بعد انتقال کیا۔

---

(۳۳) سیف بن مالک عبدی

قبیلۂ عبد قیس سے بصرہ کے باشندہ اور اُن شیعیان علیؑ میں سے تھے جو ماریہ بنت منقذ عبدیہ کے مکان پر مجتمع ہوا کرتے تھے۔ یزید بن ثبیط قیسی کے ساتھ نصرت امام حسینؑ کے لیے روانہ ہوئے اور مقام ابطح پر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۳۴) شبیب بن عبد اللہ

حارث بن سریع ہمدانی جابری کے غلام، صحابی رسول اور حضرت علی بن ابی طالب کے ساتھ جمل، صفین اور نہروان کی تینوں لڑائیوں میں شرکت کا شرف حاصل کیے ہوئے تھے۔ کوفہ کے باشندہ تھے اور کربلا میں سیف بن حارث بن سریع اور مالک بن عبد بن سریع دونوں اپنے آقازادوں کی معیت میں امام حسینؑ کی خدمت میں پہونچے تھے روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۳۵) شبیب بن عبد اللہ نہشلی

طبقۂ تابعین میں سے حضرت علیؑ کے اصحاب میں محسوب ہوتے تھے اور آپ کے ساتھ تینوں لڑائیوں میں شریک رہے تھے۔ پھر امام حسنؑ اور اُن کے بعد امام حسینؑ کے اصحاب ہیں اور آپ کے مخصوصین میں سمجھے جاتے تھے۔ جب امام حسینؑ نے مدینہ کو چھوڑا اور سفر غربت اختیار کیا تو شبیب

بن عبد اللہ وہیں سے آپ کے ہمراہ رکاب رہے یہاں تک کہ کربلا میں آپ کے ساتھ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۳۶) ضرغامہ بن مالک تغلبی

اُنھوں نے کوفہ میں مسلم بن عقیل کی بیعت کی اور اُن کے شہید ہونے کے بعد وہ بھی روپوش ہو گئے۔ پھر عمر سعد کی فوج کے ساتھ میدان کربلا میں پہنچے اور پوشیدہ طریقہ پر اصحاب حسین سے ملحق ہو گئے۔ یہاں تک کہ حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۳۷) عامر بن مُسلم عبدی بصری

بصرہ کے باشندہ، اُنہی شیعیان علیؑ میں سے تھے جو ماریہ بنت منقذ کے مکان پر جمع ہوا کرتے تھے۔ یزید بن ثبیط قیسی کے ساتھ وہ بھی نصرت امام کے لیے روانہ ہوئے اور مقام ابطح پر آپ کی خدمت میں پہونچے پھر روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۳۸) عباد بن مہاجر بن ابی المہاجر جہنی

مکہ سے کوفہ کے راستے میں عرب کے اُن صحرائی قبائل میں سے جن کی طرف سے گزر ہوتا تھا بہت سے لوگ خوش آیند دنیوی توقعات کو پیش نظر رکھ کر اس قافلہ کے ساتھ ہو جاتے تھے چنانچہ "میاہ جہینہ" نام کے چشموں کے پاس سے قبیلۂ جہینہ کے بہت سے لوگ اسی طرح آپ کے ساتھ ہو گئے تھے۔ ان ہی میں سے عباد بن مہاجر بھی تھے۔ جب مُسلم و ہانی کے شہید ہو جانے

کی خبر سننے کے بعد امام حسینؑ نے منزل زبالہ پر لوگوں کو حقیقی صورت حال سے مطلع فرماتے ہوئے انجام سے ناواقف افراد کو اپنے قافلہ سے جدا ہونے کی ہدایت فرمائی اور اس کے نتیجہ میں سوائے اُن جان نثار رو کے جو آپ کے ساتھ مدینہ سے آئے تھے تقریباً سب منتشر ہو گئے تو عباد بن مہاجر اُن گنتی کے باوفا افراد میں سے تھے جنھوں نے امام کا ساتھ چھوڑ پسند نہیں کیا اور وہ حضرت کے ساتھ رہے یہاں تک کہ وہ روز عاشور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۴۹) عبدالرحمٰن بن عبدرب انصاری خزرجی

صحابۂ رسول میں سے حدیث غدیر کے راوی اور شاہد تھے (۱)
حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ کے مخصوص شاگرد تھے۔ حضرتؑ نے خود اُن کو قرآن کی تعلیم دی اور اُن کی تربیت بھی فرمائی تھی۔ امام حسینؑ کے ساتھ مکہ سے روانہ ہوئے اور میدان کربلا تک برابر ہمراہ رکاب رہے۔ صبح عاشور اُن ہی سے بریر کی مزاحیہ گفتگو ہوئی تھی جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے، انھوں نے بھی حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت حاصل کیا۔

(۵۰) عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کدن ارحبی

طبقۂ تابعین میں سے معزز بہادر اور جنگ آزما تھے۔ کوفہ سے جو دوسرا وفد امام حسینؑ کے پاس بھیجا گیا تھا جن کے ساتھ تقریباً ۵۳ عرضداشتیں امام کی خدمت میں ارسال کی گئی تھیں جن میں سے ہر ایک دو تین اور چار دستخطوں

(۱) تجرید اسماء الصحابہ الذہبی ص ۲۴۴

سے تھی۔ اس وفد میں قیس بن مسہر صیداوی اور عمارہ بن عبید سلولی کے ساتھ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بھی تھے۔ اس کے بعد امام حسینؑ نے مسلم بن عقیلؑ کو کوفہ بھیجا تو عمارہ اور عبدالرحمٰن کو ان کے ساتھ کردیا اس کے بعد عبدالرحمٰن بن عبداللہ کسی نہ کسی طرح کوفہ سے نکل کر میدان کربلا تک پہونچے اور امام حسینؑ کے اصحاب میں داخل ہو گئے یہاں تک کہ حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۴۱) عبدالرحمٰن بن مسعود

وہ مسعود بن حجاج تیمی کے فرزند تھے جن کا تذکرہ سلسلۂ شہداء میں بعد کو آئے گا۔ دونوں باپ بیٹے عمر سعد کی فوج کے ساتھ آئے تھے اور محرم کی ساتویں تاریخ امام کی خدمت میں سلام کرنے کے قصد سے حاضر ہوئے، پھر واپس نہیں گئے۔ عبدالرحمٰن روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۴۲) عبداللہ بن بشر خثعمی

پورا نام ونسب حسب ذیل تھا۔ عبداللہ بن بشر بن ربیعہ بن عمرو بن منارۃ بن قمیر بن عامر بن رئیسہ بن مالک بن واہب بن جلیحہ بن کلب بن ربیعہ بن عفرس بن خلف بن اقبل بن المنار الخثعمی

ان کے باپ بشر بن ربیعہ اپنے زمانے کے مشہور روزگار اور میدان جنگ کے نبرد آزما شہسواروں میں سے تھے۔ کوفہ کا مشہور احاطہ جو "جبانہ بشر" کہلاتا تھا ان ہی کے نام سے منسوب تھا۔ جنگ قادسیہ کے ذیل میں ان کا نام صفحات تاریخ پر نمایاں ہے۔ ان کے فرزند عبداللہ صفات شجاعت وجرأت ونام آوری میں ان ہی کے قدم بقدم تھے۔ میدان کربلا میں فوج عمر سعد کے ساتھ

پہونچ کر خفیہ طریقہ پر انصار حسینؑ میں شامل ہو گئے۔ یہاں تک کہ حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت حاصل کیا۔

(۴۳) عبداللہ بن یزید بن ثبیط قیسی

یزید بن ثبیط کے دس بیٹے تھے چنانچہ انھوں نے ان دسوں کے سامنے نصرت حسینؑ کا سوال پیش کیا۔ لیکن ان میں سے صرف دو تھے جنھوں نے اس اہم ارادہ میں باپ کا ساتھ دیا۔ ان ہی دو میں ایک عبداللہ تھے چنانچہ وہ اپنے باپ کی ہمراہی میں بصرہ سے نکلے اور مقام ابطح پر پہونچ کر خدمت امام میں حاضر ہوئے۔ روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۴۴) عبیداللہ بن یزید بن ثبیط قیسی

وہ یزید بن ثبیط کے دوسرے فرزند تھے جنھوں نے نصرت حسینؑ کے تہیہ میں ان کا ساتھ دیا اور وہ بھی حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۴۵) عقبہ بن صلت جہنی

"میاہ جہنیہ" کے اعراب میں سے جو اثنائے راہ سے قافلۂ حسینی کے ساتھ ہو گئے تھے۔ ایک وہ بھی تھے اور منزل زبالہ میں امام حسینؑ کے حقیقت حال کے اظہار پر مشتمل خطبہ کو سن کر جب سوائے خاص جان نثاروں کے اور سب نے اپنی اپنی راہ لی تو وہ امام کے ساتھ ہی رہے یہاں تک کہ روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۴۶) عمار بن ابی سلامہ دالانی

نام و نسب :- عمار بن ابی سلامہ بن عبد اللہ بن عمران بن راس بن دالان ہمدانی۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ انھوں نے رسالتمآبؐ کے زمانہ کا ادراک کیا تھا اور علی بن ابی طالبؑ کے ساتھ جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیوں میں شرکت کی تھی کربلا میں امام حسینؑ کے ساتھ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۴۷) عمار بن حسان طائی

نام و نسب :- عمار بن حسان بن شریح بن سعد بن حارثہ بن لام بن عمرو بن ظریف بن عمرو بن ثمامہ بن ذہل بن جذعان بن سعد بن طے مخصوص و ممتاز شیعیان علیؑ میں سے۔ مشہور بہادر و جنگ آزما تھے۔ ان کے باپ حسان بن شریح حضرت علی بن ابی طالبؑ کے اصحاب میں سے تھے اور جنگ صفین میں آپ ہی کی نصرت میں شہید ہوئے عمار امام حسینؑ کے ساتھ مکہ معظمہ سے آئے تھے اور روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے ان کی اولاد میں سے عبد اللہ بن احمد بن عامر بن سلیمان بن صالح بن وہب بن عمار بن حسان بن شریح طائی جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے جو اپنے والد کے ذریعہ امام رضاؑ سے روایت کرتے تھے اور کتاب القضایا والاحکام کے مصنف تھے۔

(۴۸) عمرو بن ضبیعہ بن قیس بن ثعلبہ ضبعی تیمی

بہادر، شہسوار اور جنگ کے میدان میں کارنمایاں انجام دیئے ہوئے تھے۔ عمر سعد کی فوج کے ساتھ میدان کربلا پہنچ پھر انصار امام حسینؑ میں شامل ہو گئے اور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۴۹) عمران بن کعب بن حارث اشجعی

ان کا شمار بھی حملۂ اولیٰ کے شہداء میں ہے۔ حالات معلوم نہیں۔

(۵۰) قارب مولی الحسینؑ

قارب بن عبداللہ بن اریقط اللیثی دؤلی۔ ان کی ماں فکیہہ امام حسینؑ کی حرم سرا میں رباب مادر سکینہ کی کنیز تھیں اور ان کی شادی عبداللہ بن اریقط کے ساتھ ہوئی اور اس طرح قارب کی ولادت ہوئی تھی وہ اپنی ماں کی ہمراہی میں امام حسینؑ کے ساتھ مدینہ سے مکہ اور پھر وہاں سے میدان کربلا تک پہنچے اور روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۵۱) قاسط بن زہیر بن حارث تغلبی

وہ اور ان کے دو بھائی مقسط اور کردوس حضرت علی بن ابی طالبؑ کے اصحاب میں سے تھے اور آپ کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے پھر امام حسنؑ کے ساتھ رہے۔ یہاں تک کہ آپ نے حجاز کی طرف مراجعت فرمائی۔ اس کے بعد وہ تینوں بھائی کوفہ میں قیام پذیر رہے یہاں تک کہ جب امام کربلا میں وارد ہوئے تو وہ تینوں بھائی کسی نہ کسی طرح امام کی خدمت میں پہونچے اور روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۵۲) قاسم بن حبیب بن ابی بشر ازدی

کوفہ کے شیعیان علیؑ میں سے بہادر، دلیر اور شہسوار تھے۔ عمر سعد کی فوج

کے ساتھ کربلا پہونچے پھر پوشیدہ طریقے پر امام کے انصار سے ملحق ہو گئے اور روز عاشور حملہ اولیٰ میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۵۳) کردوس بن زہیر بن حارث تغلبی

وہ اور ان کے بھائی قاسط بن زہیر اور دوسرے بھائی مقسط تینوں اصحاب حضرت علیؑ میں سے تھے اور آپ کے ساتھ لڑائیوں میں شرکت کی تھی۔ کربلا میں خفیہ طریقہ پر خدمت حسینؑ میں پہنچے اور حملہ اولیٰ میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۵۴) کنانہ بن عتیق تغلبی

کنانہ بن عتیق بن معاویہ بن جماعۃ بن قیس تغلبی کوفی شجاعان روزگار میں سے عابد و زاہد اور حافظ قرآن تھے لڑائی چھڑنے سے پہلے کربلا میں خدمت امام میں پہنچے اور روز عاشور حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۵۵) مجمع بن زیاد بن عمرو جہنی

میاہ جہینہ کے عراب میں سے تھے جو اثنائے راہ میں امامؑ کے ساتھ ہو گئے تھے اور جب منزل زبالہ میں امام کے خطبہ کو سن کر سوائے مخصوص جاں نثاروں کے دوسرے تمام لوگ متفرق ہو گئے تو مجمع بن زیاد امامؑ کے ہمراہ ہی رہے اور روز عاشور پہلے ان کا گھوڑا زخمی ہو کر بے ہوا پھر چند آدمیوں کو قتل کر کے وہ دشمنوں میں گھر گئے اور حملہ اولیٰ میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۵۶) مسعود بن حجاج تیمی

کوفہ کے بڑے مشہور شیعہ علیؑ اور لڑائیوں میں کام کیے ہوئے تھے اپنے فرزند عبدالرحمٰن بن مسعود کے ساتھ عمر سعد کی فوج میں میدان کربلا تک پہونچے اور ساتویں محرم کو امام کی خدمت میں سلام کرنے کے لیے حاضر ہوئے تو پھر واپس نہیں گئے۔ روز عاشور حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۵۷) مسلم بن کثیر صدفی ازدی

قبیلہ ازد شنوہ میں سے "اعرج" یعنی لنگ تھے۔ انھوں نے رسالتمآبؐ کا ادراک کیا تھا۔ جنگ جمل میں حضرت علی بن ابی طالبؑ کی نصرت میں شریک جنگ تھے کہ پنڈلی پر تیر پڑا جس کا اثر رہا۔ کوفہ سے نصرت امام حسینؑ کا تہیا کر کے روانہ ہوئے اور کربلا میں پہونچ کر آپ سے قدمبوس ہوئے۔ حملہ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۵۸) مقسط بن زہیر بن حارث تغلبی

وہ اور ان کے دو بھائی قاسط اور کردوس اصحاب حضرت علیؑ میں سے تھے اور آپ کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے وہ سب میدان کربلا میں خفیہ طریقہ پر امام حسینؑ کی خدمت میں پہونچے اور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۵۹) منیع بن زیاد

ان کا بھی شمار حملۂ اولیٰ کے شہدا میں ہے۔ حالات معلوم نہیں۔

(۶۰) نصر بن ابی نیزر

ابو نیزر نجاشی بادشاہ حبشہ یا کسی اور ملک عجم کے بادشاہ کی نسل سے تھے۔ بچپنے میں دین اسلام سے مشرف ہونے کا شوق پیدا ہوا رسول اللہؐ کی خدمت میں پہنچے اور مذہب اسلام اختیار کیا تو آنحضرتؐ نے اُن کی تربیت فرمائی اور آپ کی وفات کے بعد وہ حضرت علیؑ کی خدمت میں رہے اور آپ کے مملوکہ ایک نخلستان میں اصلاح و تربیت کے کام پر مامور ہوئے۔

ان کے فرزند نصر نے اپنی کمسنی اور نوجوانی کا زمانہ حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے ساتھ اور بقیہ زندگی کا دور امام حسینؑ کی خدمت میں گزارا۔ یہاں تک کہ سفر عراق میں آپ کے ساتھ مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا پہنچے۔ حملۂ اولی میں پہلے ان کا گھوڑا کام آیا پھر وہ خود درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۶۱) نعمان بن عمرو ازدی

کوفہ کے باشندہ، اصحاب حضرت علیؑ میں سے تھے اور آپ کے ساتھ جنگ صفین میں شریک بھی ہوئے تھے۔ وہ اور ان کے بھائی حلاس بن عمرو ازدی کربلا میں عمر سعد کی فوج کے ساتھ پہونچے تھے اور شرائط صلح مسترد ہونے پر اصحاب حسینؑ سے ملحق ہو گئے یہاں تک کہ حملۂ اولی میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۶۲) نعیم بن عجلان انصاری

نام و نسب:- نعیم بن عجلان بن نعمان بن عامر بن زریق الانصاری

الخزرجی وہ اور ان کے دو بھائی نضر اور نعمان اصحاب حضرت علیؑ میں سے تھے اور جنگ صفین میں کارنمایاں انجام دیے تھے اور تینوں شجاعان روزگار اور شعرا میں شمار ہوتے تھے۔

نعمان بن عجلان کو حضرت علیؑ نے عمرو بن ابی سلمہ مخزومی کو معزول فرما کے بحرین کا حاکم مقرر کیا تھا۔

نضر اور نعمان دونوں نے امام حسنؑ کی خلافت کے زمانہ میں انتقال کیا اور نعیم کوفہ میں مقیم رہے۔ جب امام حسینؑ سرزمین عراق پر پہونچے تو وہ کوفہ سے کسی نہ کسی طرح نکل کر آپ کی خدمت میں پہنچ گئے اور روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

یہاں پر حملۂ اولیٰ کے پچاس شہدا کی تعداد پوری ہو گئی۔ اب اُن افراد کا تذکرہ کیا جائے گا جو حملۂ اولیٰ کے بعد سے نماز ظہر تک شہید ہوئے تھے۔

خیمہ گاہ حسینی پر ہجوم

جب تک حسینی جماعت اپنی مختصر تعداد میں سہی پوری موجود تھی۔ اُس وقت تک دشمنوں کے لیے آگے بڑھنا ممکن نہ ہو سکا تھا لیکن اب جب حملۂ اولیٰ کے ذیل میں پچاس نفوس اس جماعت کے یکبارگی شہید ہو گئے اور جتنے انصار حسینؓ باقی رہ بھی گئے ان میں سے کسی کے پاس سواری کے لیے گھوڑا نہ رہا تو اب لشکرِ مخالف کو جرأت ہوئی کہ وہ خیام حسینی کا رخ کرے۔ اس موقع پر اگرچہ حسینؓ کے اصحاب کی تعداد بہت کم ہو چکی تھی۔ مگر پھر بھی ان کی شجاعت کا عالم یہ تھا کہ تاریخ کا بیان ہے" انھوں نے جنگ کی یہاں تک کہ دوپہر کا وقت ہو گیا۔ سخت ترین دنیا کی جنگ جو خلق خدا میں کبھی کسی کی نظر سے گزری ہو۔"

یزیدی لشکر کی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح پس پشت سے پہنچ کر ان بہادروں کو گھیرے میں لے لیں مگر پشت کی جانب ان کے خیمے تھے جنھیں امام کے حکم سے اس طرح ایک دوسرے سے متصل اور طناب اندر طناب کر دیا گیا تھا کہ اُنھوں نے ایک مضبوط دیوار اور حصار کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس لیے اس طرف سے حملہ غیر ممکن تھا عمر سعد نے یہ دیکھا تو حکم دیا کہ طنابیں کاٹ کر خیموں کو ان کے چوب و راست سے گرا دیا جائے تاکہ پورے طور سے محاصرہ کرنا ممکن ہو سکے۔ اصحاب حسینؓ نے جو یہ دیکھا تو متفرق طور پر اپنے اپنے خیموں کے اندر داخل ہو کر

منتظر ہے یہاں تک کہ جب کسی خیمہ میں کوئی داخل ہوتا کہ طنابیں کاٹ کر اُس کو گرائے تو فوراً وہ قتل کر دیا جاتا اور اس کی لاش باہر پھینک دی جاتی۔ جب عمر سعد کو اپنی اس تدبیر میں بھی ناکامی ہوئی تو اس نے کہا۔ کہ اچھا! کسی خیمہ کے اندر جا کر گرانے کی کوشش نہ کرو بلکہ ان سب خیموں میں آگ لگا دو۔ (۱)

ظاہر ہے کہ امام حسینؑ کا خیمہ اور حرم سرائے عصمت آپ کے اصحاب کے مسلسل خیموں کی قطار سے علیحدہ تھے دشمن کے سپاہی جب ان خیموں میں آگ لگانے لگے تو امام نے فرمایا کہ آگ لگا لینے دو۔ اس لیے کہ جب وہ آگ لگا دیں گے اور شعلے بھڑکنے لگیں گے تو پھر بھی وہ اس طرف سے تم پر حملہ نہ کر سکیں گے اور جو ان کا مقصد ہے وہ پورا نہ ہو گا۔ چنانچہ اصحاب حسینؑ نے مدافعت چھوڑ دی اور لشکر آگ لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر نتیجے نے ظاہر کر دیا کہ عمر سعد نے تدبیر جنگ کے لحاظ سے غلطی کی اور امام حسینؑ کی رائے دشمنوں کے تجربہ میں بھی بالکل صائب ثابت ہوئی یعنی آگ لگا دینے سے دشمن کے لیے اس طرف کا راستہ بند ہو گیا اور اس کے بعد بھی مقابلہ سامنے ہی کی جانب سے کیا جا سکا۔

اس تدبیر کے بھی ناکامیاب ثابت ہونے پر کینہ طینت شمر برافروختہ ہو گیا اور اس نے حملہ کر کے خاص خیمۂ امام حسینؑ پر نیزہ مارتے ہوئے کہا کہ آگ لاؤ تاکہ میں اس خیمہ کو اس کے رہنے والوں سمیت جلا دوں اس آواز کے سننے سے حرم سرائے عصمت میں ایک شور نالہ و فریاد کا بلند ہوا۔ امام حسینؑ نے اُس کو للکار کر فرمایا کہ "اے شمر تو آگ اس لئے منگا رہا ہے کہ میرے خیمہ کو میرے اہل و عیال سمیت جلا دے۔ خدا

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۵۰

تجھے آگ سے جلنا نصیب کرے"۔ لشکر یزید کے دوسرے سرداروں نے بھی شمر کو منع کیا اور شبث بن ربعی نے شمر کے پاس جا کر کہا "میں نے آجتک ایسی شرمناک بات نہیں سنی جیسی تم زبان سے نکال رہے ہو اور نہ اس سے بدتر اقدام دیکھا جس کا تم نے ارادہ کیا ہے۔ تم عورتوں کو خوفزدہ کرتے ہو؟" ان سب کی مخالفت سے مرعوب ہو کر شمر اپنے ارادہ سے باز آ کر خیمہ کے دروازہ سے ہٹ گیا۔

اتنی دیر میں زہیر بن قین نے دس بہادر ساتھیوں کو ساتھ لیکر حملہ کر دیا اتنا سخت حملہ کہ شمر اور اُس کے ساتھ والی فوج کو خیموں کے پاس سے دور کر دیا اور ابو غزہ ضبابی کو جو شمر کا خاص آدمی تھا قتل کر دیا۔ افواج یزید نے جو اپنے ایک سربرآوردہ ساتھی کو اس حملہ میں قتل ہوتے دیکھا تو وہ پورے جوش و خروش کیساتھ ان دسوں آدمیوں پر ٹوٹ پڑے اور سخت خونریز لڑائی ہوئی مگر ان بہادروں نے بھی بڑی پامردی سے مقابلہ کیا جس کے نتیجے میں دشمن کو شکست ہوئی۔

پھر بھی کثرت اور قلت کا مقابلہ ہی کیا؟ صورت یہ تھی کہ اس مختصر جماعت میں کے ایک دو بھی قتل ہوتے تھے تو اُس سے نمایاں کمی ظاہر ہونے لگتی تھی برخلاف افواج یزید کے جو کثیر تعداد میں تھے اس لیے جتنے بھی قتل ہوتے کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ (۱)

جو اصحاب حسینؑ اس کے بعد سے دوپہر کے وقت تک نماز ظہر کے ہنگامہ سے پہلے شہید ہوئے، اُن کے نام تاریخ میں حسب ذیل ملتے ہیں

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۵۱

(۶۳) بکر بن حی تیمی

عمر سعد کی فوج کے ساتھ کربلا آئے تھے مگر جنگ چھڑنے کے بعد توفیق الٰہی دستگیر ہوئی اور امام حسینؑ کی طرف آ کر شریک جہاد ہوئے اور حملۂ اولیٰ کے بعد درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۶۴) عمرو بن جنادہ بن کعب خزرجی

ان کے باپ جنادہ بن کعب کا تذکرہ حملۂ اولیٰ کے مقتولین میں ہو چکا ہے۔ عمرو بن جنادہ کا واقعۂ کربلا میں نو یا دس برس کا سن تھا۔ ان کی ماں بحریہ بنت مسعود تھیں جو اپنے شوہر کے ساتھ میدان کربلا میں موجود تھیں۔ جب جنادہ درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے تو ان کی بیوہ نے یتیم بچہ کو ہدایت کی کہ وہ بھی جائے اور امام حسینؑ کی نصرت میں جنگ کرے۔ بچہ خدمت امام میں آیا اور طالب اجازت ہوا آپ نے اجازت دینے سے انکار کیا۔ بچہ نے پھر رخصت طلب کی آپ نے اصحاب کی طرف رخ کر کے فرمایا، ابھی تو اس کا باپ معرکۂ جنگ میں قتل ہو چکا ہے۔ اب اگر یہ بھی قتل ہو گیا تو اس کی ماں کے دل پر کیا گزرے گی۔ یہ سن بچہ نے کہا کہ آقا میری ماں نے ہی تو مجھے بھیجا ہے اور انھوں نے ہی مجھے یہ جنگ کا لباس پہنایا ہے۔ بہر طور اجازت حاصل کر کے بچہ میدان میں آیا اور لڑ کر قتل ہوا۔ افواج یزید میں کسی بے رحم نے بچہ کا سر کاٹ کر جماعت حسینی کی طرف پھینک دیا۔ شیر دل ماں نے بچہ کا سر اٹھا لیا اور کہا "شاباش! بیٹا شاباش تو نے امام پر نثار ہو کر میرا دل خوش

اور میری آنکھوں کو خنک کیا۔" پھر اس نے سر کو فوج دشمن کی طرف پھینک دیا اور خود ایک گرزِ آہنیں لیکر دشمنوں پر حملہ آور ہوئی مگر امام نے اسے گوارا نہ کیا اور اس کو خیمہ کی جانب واپس فرما دیا۔

ظہر کا ہنگامہ اور نماز ظہر کا ہنگامہ

لشکر یزید کو اب یہ فکر تھی کہ کسی طرح مہم جلد سر ہو جائے اسی عالم میں ظہر کا وقت ہو گیا۔ ادھر ابو ثمامہ عمرو بن عبد اللہ صائدی نے امام کی خدمت میں عرض کیا کہ "مولا یہ لوگ اب آپ کے بالکل قریب آ گئے ہیں اور یہ یقینی ہے کہ آپ پر آنچ آنے سے پہلے میں قتل ہو جاؤنگا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس نماز کو کہ جس کا وقت آ گیا ہے آپ کے ساتھ پڑھ لوں اور اس کے بعد خدا کی بارگاہ میں جاؤں۔" امام نے آسمان پر نظر کرتے ہوئے فرمایا "تم نے نماز کو یاد کیا۔ خدا تم کو نماز گزاروں اور یاد رکھنے والوں میں محسوب کرے۔ ہاں یہ نماز کا اوّل وقت ہے"۔ پھر آپ نے فرمایا "ان لوگوں سے کہو کہ اتنی دیر جنگ سے ہاتھ روک لیں کہ ہم نماز پڑھ لیں"۔ (۱)

اللہ! رسول اللہ کا فرزند جس کے گھر سے نماز کی بنیاد قائم ہوئی وہ نماز کی خواہش کرے اور وہ پوری نہ کی جائے بلکہ مہلت کے سوال پر حصین بن تمیم صف سے باہر نکلے اور کہے کہ "تمہاری نماز قبول نہیں ہے"۔ (۲)

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۱ (۲) طبری جلد ۶ صفحہ ۲۵۱

(۶۵) حبیب بن مظاہر اسدی

نام ونسب :۔ حبیب بن مظاہر بن رئاب بن اشتر بن خجوان بن فقعس بن طریف بن عمرو بن قیس بن حارث بن ثعلبۃ بن دوران بن اسد۔ کنیت ابوالقاسم عرب کے مشہور شہسوار ربیعہ بن خوط بن رئاب کے چچازاد بھائی تھے۔ ابن کلبی کی روایت کے مطابق صحابی تھے اور رسول اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے۔ شیخ طوسی نے انھیں اصحاب حضرت علی بن ابی طالبؑ پھر اصحاب امام حسنؑ اور اصحاب حسینؑ ـــــ میں درج کیا ہے۔

حبیب بن مظاہر میثم تمار اور رشید ہجری کی طرح حضرت علی بن ابی طالبؑ کے ان صحابۂ با اختصاص میں سے تھے جنھیں آپ نے خاص طور سے علوم باطنی اور اسرار کی تعلیم دی تھی۔

سب سے پہلے جب معاویہ کے انتقال کی خبر کوفہ میں پہونچی تھی اور امام حسینؑ کو کوفہ کی طرف بلانے کا خیال بعض دماغوں میں پیدا ہوا تھا تو سلیمان بن صرد خزاعی کے مکان پر شیعیان کوفہ کا اجتماع ہوا تھا۔ اس جلسہ کی روئداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس موقع پر حبیب بن مظاہر بھی موجود تھے۔ صرف موجود ہی نہیں تھے بلکہ وہ اس جماعت میں نمایاں اور ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے تھے چنانچہ جو پہلا خط امام حسینؑ کے نام شیعیان کوفہ کی طرف سے بھیجا گیا تھا اس میں سلیمان بن صرد وغیرہ کے ساتھ ان کا نام بھی خصوصیت کے ساتھ ثبت تھا اور جب مسلم بن عقیل کوفہ میں وارد ہو کر مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے مکان میں فروکش ہوئے تھے تو سب سے پہلا اجتماع شیعوں کا جو ہوا تھا اس میں جناب مسلمؑ نے امام حسینؑ کا خط پڑھ کر سنایا تھا۔ اس

موقع پر سب سے پہلی تقریر عابس بن ابی شبیب شاکری نے کی تھی اور اُس کی تائید حبیب بن مظاہر نے کی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم دوسرے لوگوں کے متعلق ذمہ داری نہیں لیتے مگر جہاں تک ہماری ذات کا تعلق ہے ہر طرح امداد کے لیے آمادہ ہیں۔

میدان کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے پاس پہونچنے کے بعد سے وہ برابر ایسے مواقع کے منتظر رہتے تھے کہ دشمن کے ساتھ گفت و شنید کے ذریعہ نصیحت کے فرض کو انجام دے سکیں چنانچہ جب عمر بن سعد نے قرہ بن قیس حنظلی کو امام حسینؑ کے پاس بصیغۂ سفارت بھیجا تھا اور قرہ بن قیس نے امام کے پاس آکر عمر سعد کا پیغام پہنچا کر واپس جانا چاہا تھا تو حبیب نے کہا تھا "قرہ بن قیس ظالم جماعت کی طرف کہاں جا رہے ہو اس بزرگ کی نصرت کرو جس کے نانا کی بدولت خدا نے تم کو اور ہم کو اسلام کی عزت عطا کی"۔ قرہ نے کہا تھا "میں جا کر پیغام کا جواب کہہ دوں تو پھر اس مسئلہ پر غور کروں گا"(۱)

اس تقریر کا اثر قرہ کے دل پر ضرور ہوا تھا چنانچہ بعد میں وہ کہا کرتا تھا کہ اگر حر جاتے وقت اپنا ارادہ مجھ پر ظاہر کر دیتے تو میں بھی ان کے ساتھ نصرت حسینؑ کے لیے چلا جاتا۔ (۲) اس تاسف اور اظہار رنج سے ظاہر ہے کہ دل اُس کا احساس سے معمور ہو چکا تھا اور ضمیر آمادہ کر رہا تھا مگر اُس میں قوت ارادی اتنی نہ تھی کہ وہ حُر کی طرح اس خیال کو عملی جامہ پہنا سکتا وہ اس کے لیے سہارے کا محتاج تھا اور یہ اُس کی عملی کمزوری تھی کہ سہارا نہ ملنے سے اُس کے قدم رُک گئے۔

نویں تاریخ کی شام کو جب افواج یزید نے دفعۃً جماعت حسینی پر حملہ

(۱) ارشاد صفحہ ۲۱۰ (۲) ارشاد صفحہ ۲۲۹

کر دیا اور امام نے ابوالفضل العباس کو مقصد دریافت کرنے کے لیے بھیجا اور جناب عباس بیس سواروں کے ساتھ جن میں زہیر بن قین اور حبیب بن مظاہر بھی تھے اُن کے سامنے گئے اور پوچھا کہ اس بے وقت اقدام کا کیا منشا ہے اور جواب ملا کہ ابن زیاد کا حکم آیا ہے کہ یا تم سے بیعت لی جائے اور یا جنگ کی جائے۔

جناب عباسؑ یہ کہہ کر کہ میں امام سے دریافت کرلوں تو آکر تم کو جواب دوں امام کی خدمت میں واپس گئے ــــــــ

اور دوسرے اصحاب وہیں کھڑے رہے تو اس وقفہ کو بھی حبیب نے بیکار نہ جانے دیا۔ زہیر بن قین سے کہا کہ "ان لوگوں سے تم کچھ گفتگو کرو اور نہیں کہو تو میں کچھ بات چیت کروں"۔ زہیر نے کہا "نہیں آپ ہی گفتگو کیجئے"۔ اس وقت حبیب نے مخالف مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے حسب ذیل تقریر کی "سوچو تو کتنا برا انجام ہوگا پیش خدا اُس جماعت کا جو اُس کے سامنے جائے گی اس حالت میں کہ اُس نے اولادرسول کا خون بہایا ہو اور ملک کے اُن عبادت گزروں کو قتل کیا ہو جو پچھلے پہر سے اُٹھنے والے اور کثرت سے ذکر الٰہی کرنے والے ہوں"۔

عزرہ بن قیس نے جو ایک خفیف الحرکات مسخرا انسان تھا بات کاٹنے کے لیے پکار کر کہا "حبیب! تم اپنی طرف ہر موقع پر اشارہ کرتے رہتے ہو کہ میں بڑا عبادت گزار ہوں"۔ یہ بے موقع مداخلت سن کر زہیر کو غصہ آگیا اور اُنھوں نے کہا کہ "عزرہ! اس میں شک ہی کیا ہے؟ بلاشبہ حبیب کا نفس ایسا ہے جس کا خدا نے تزکیہ کیا ہے اور اُس کو صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا کی ہے" (۱)

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۳۷

شب عاشور حبیب بن مظاہر نے امام حسینؑ سے اجازت چاہی
کہ وہ جاکر قبیلۂ بنی اسد سے جو اطراف میں مقیم ہیں آپ کی نصرت کی خواہش
کریں چنانچہ امام نے اجازت دے دی اور حبیب نے بنی اسد کے مجمع
میں جاکر وعظ و نصیحت کے ذریعہ انھیں نصرت امام کے فریضہ کی طرف
توجہ دلائی۔ جس پر سب سے پہلے عبداللہ بن بشیر اسدی نے لبیک کہی اور پھر دوسرے
لوگ بھی آمادہ ہو کر حبیب کے ساتھ جماعت حسینی کی طرف روانہ ہوئے
مگر یہ کہ اس واقعہ کی خبر عمر سعد کو ہو گئی اور اس نے پانچ سو سوار سدّ راہ
ہونے کے لئے بھیجدیے جن کے مقابلہ کی یہ جماعت تاب نہ لاسکی اور سب
لوگ واپس چلے گئے ناچار حبیب خدمت امام میں تنہا واپس پہنچے۔

صبح عاشورا جب امام حسینؑ نے اپنا تاریخی خطبہ ارشاد کیا تھا
اور شمر نے انتہائی بے شرمی، بے حیائی اور کمینہ فطرتی سے آپ کی تقریر میں
مداخلت کی اور کہا کہ "میں منافق ہوں اور خدا کی عبادت ایک حرف پر کرتا
ہوں (یعنی صرف زبانی) اگر کچھ میری سمجھ میں آرہا ہو کہ آپ کیا کہتے ہیں"۔
تو حبیب بن مظاہر ہی تھے جنھوں نے اس گستاخی کا جواب
دیا یہ کہہ کر "بخدا میں سمجھتا ہوں کہ تو خدا کی ستر حرفوں پر عبادت کرتا ہے
(یعنی تیری عبادت مخلصانہ حیثیت سے یکرنگ نہیں بلکہ ہفتاد رنگ ہے)
اور میں اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ تو سچ کہتا ہے۔ تیری کچھ سمجھ میں
نہیں آتا کہ امام کیا فرماتے ہیں کیونکہ تیرے دل پر مہر لگ چکی ہے" (۱)

پھر جب امام نے اپنی مختصر جماعت کو ترتیب دیا تو میسرہ کا سردار
حبیب بن مظاہر کو قرار دیا (۲)

---

(۱) ارشاد صفحہ ۲۴۸ (۲) ارشاد صفحہ ۲۴۶

جب مسلم بن عوسجہ مجروح ہو کر گرے اور امام حسینؑ اُن کے سرہانے تشریف لے گئے تو حبیب نے جو آپ کے ساتھ تھے مسلم کو اُن کی شہادت پر مبارکباد دینے کے بعد کہا کہ اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ میں بھی بہت جلد تم سے آکر ملتا ہوں تو کہتا کہ کچھ وصیت کرو تاکہ میں اُس وصیت کو پورا کروں اور اس طرح جو تمھاری قرابت اور مذہبی خصوصیت کا حق ہے اُس کو ادا کروں۔ جواب میں مسلم نے امام حسینؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "اور تو کچھ نہیں وصیت بس یہ ہے کہ ان کی نصرت سے ہاتھ نہ اُٹھانا" ظاہر ہے کہ اس وصیت نے حبیب کے دہکتے ہوئے جذبۂ قربانی کے لیے ہوا سے کچھ کم کام نہ دیا ہوگا۔

پھر کہاں ممکن تھا کہ حصین بن تمیم کے اُس گستاخانہ کلام کو جو اُس نے حسینؑ کی جانب سے نماز ظہر کے لیے التوائے جنگ کی خواہش پر کیا تھا وہ ٹھنڈے دل سے گوارا کر لیتے؟ چنانچہ اُنھوں نے بے تاب ہو کر کہا "قبول نہیں ہے؟ رسول اللہ کے فرزند کی نماز تیرے خیال میں قبول نہیں ہے اور تیری نماز قبول ہے؟!" حصین نے یہ سُنکر حملہ کر دیا اور حبیب بھی مقابلہ پر آ گئے اور انھوں نے اُس کے گھوڑے کے منھ پر تلوار ماری جس سے وہ الف ہو گیا اور حصین زمین پر گر گیا۔ مگر اس کے ساتھیوں نے بڑھ کر اُسے اپنے حلقہ میں لے لیا اور حبیب کے ہاتھ سے بچا کر لے گئے۔

اب حبیب میدان جنگ میں آ ہی چکے تھے۔ ایمان کا جوش اور شجاعت کی اُمنگ۔ دشمن کی جرأت و جسارت کا غصہ اور اُس کے زندہ نکل جانے کا رنج۔ چنانچہ وہ اس مضمون کا شعر پڑھنے لگے :-

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہم اگر تعداد میں تمہارے برابر ہوتے یا تمہارے

آدھے بھی ہوتے تو تم ہمارے سامنے سے یقینی بھاگ جاتے۔ اے بدترین خلائق حسب ونسب اور اخلاق کے لحاظ سے،، (۱)

پھر انھوں نے دوسرے شعر پڑھے جن کا مضمون یہ تھا:۔

"میں حبیب ہوں اور میرے باپ کا نام مظہر ہے۔ میدان جنگ اور بھڑکتی ہوئی لڑائی کے ہنگام کا شہسوار ہوں تمہاری تعداد ہم سے زیادہ ہے اور لڑائی کا سامان تمہارے پاس فراوان ہے مگر ہم اپنی بات کے زیادہ دھنی اور مشکلات کے زیادہ برداشت کرنے والے ہیں۔ اس کے علاوہ حجت ہماری بالا، حقیقت نمایاں، فرائض کی پابندی زیادہ اور دامن صاف ہے"۔ (۲)

ان اشعار میں حبیب نے اصحاب حسینؑ کے کردار اور ان نفسیاتی خواص کو جو ان کے ثبات واستقلال کے ذمہ دار تھے صاف طور پر بیان کیا ہے۔

حبیب نے سخت جنگ کی یہاں تک کہ ایک تمیمی پہلوان نے جس کا نام بدیل بن صریم تھا حبیب پر حملہ کیا۔ حبیب نے ایک ضرب شمشیر میں اس کا کام تمام کیا۔ لیکن اسی کے ساتھ بنی تمیم کے ایک دوسرے شخص نے ان پر نیزہ کا وار کر دیا جس سے وہ زمین پر آرہے۔ ابھی وہ اٹھنا ہی چاہتے تھے کہ ان کے پہلے کے شکست خوردہ حریف حصین بن تمیم نے ان کے سر پر تلوار لگائی جس سے وہ بے جان ہو کر گر گئے۔ وہ تمیمی جس کے نیزہ کے وار نے حبیب کو زمین پر گرایا تھا ان کا سر کاٹنے کے لیے قریب آیا تو حصین نے کہا کہ "میں ان کے قتل میں شریک ہوں"۔ تمیمی نے کہا "نہیں، کام میں نے تمام کیا ہے"۔ آخر حصین نے کہا کہ "مجھے اتنا کر لینے دو کہ میں ان کا سر اپنے

(۱) طبری ج ۶ صہ ۲۵۱ (۲) طبری ج ۶ صہ ۲۵۱

گھوڑے کے گردن بند میں باندھ کر ایک دفعہ لشکر میں گردش کر لوں تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ میں نے ان کے قتل میں شرکت کی ہے۔ پھر تم اُس کو لے لینا اور ابن زیاد کے پاس لے جانا، وہاں سے جو انعام ملے گا اُس میں میں حصہ نہیں لوں گا"۔ پہلے تو تمیمی نے انکار کیا۔ مگر لوگوں کے کہنے سننے سے راضی ہو گیا۔ اس طرح گویا اُس پہلی شکست کی خفت مٹائی جو اُسے حبیب کے مقابلہ میں حاصل ہو چکی تھی۔

حبیب کی شہادت کا امام حسینؑ پر خاص اثر ہوا۔ (۱)

حر کی شہادت

حُر بن یزید ریاحی نے جن کے حالات میں پہلے درج ہو چکا ہے کہ وہ حملۂ اولیٰ میں اپنے گھوڑے کے بے ہونے کے بعد پیادہ ہو چکے تھے اور اس کے پہلے کئی مرتبہ لڑ بھی چکے تھے، اب حبیب کی شہادت کے بعد مضبوط

---

(۱) طبری ج ۶ صـ ۲۵۲ جب شہادت امام حسین کے بعد فوج والے کوفہ واپس ہوئے تو حبیب کا سر ان کے تمیمی قاتل نے لے کر اپنے گھوڑے کی گردن میں آویزاں کر لیا۔ اور اس طرح ابن زیاد کے محل کی طرف چلا۔ راستے میں حبیب کے فرزند قاسم کی نظر اس پر پڑی تو وہ اس شخص کے ساتھ ہو لیے اور اس سے منت سماجت کے ساتھ کہا کہ یہ میرے باپ کا سر ہے مجھے دیدو کہ میں دفن کر دوں۔ اس نے انکار کیا اور کہا یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ مجھے تو امیر ابن زیاد سے انعام لینا ہے۔ بچہ بے بسی کے ساتھ رہ گیا اور وقت کا منتظر ہو گیا۔ مصعب بن زبیر کے عہد حکومت میں جب باجمیرا (مقام) پر فوج کشی ہوئی ہے تو یہ تمیمی ظالم بھی فوج میں تھا۔ اس دوران میں ایک دن قاسم بن حبیب نے موقع پا کر اسے قتل کر دیا۔ (طبری ج ۶ صـ ۲۵۲)۔

ارادہ کر لیا کہ وہ شرف شہادت کو حاصل کر کے رہیں گے۔ چنانچہ انھوں نے میدان میں نکل کر یہ رجز پڑھنا شروع کیا۔ "میں قسم کھاتا ہوں کہ قتل نہ ہونگا جب تک دشمنوں کو قتل نہ کر لوں۔ اور مارا نہ جاؤں گا۔ مگر پیش قدمی کی حالت میں۔ میں آج تلواریں لگاؤں گا فیصلہ کن تلواریں، نہ میرے قدم پیچھے ہٹیں گے اور نہ کمزوری کا اظہار ہوگا"۔ کبھی کہتے تھے:۔

"میں شمشیر زنی کروں گا اُس بہترین خلائق کی طرف سے جن کے قیام نے سرزمین حرم کو عزت بخشی"۔ معلوم نہیں امام کا اشارہ تھا یا خود اپنی خواہش سے زہیر بن قین نے حُر کے ساتھ مل کر جہاد شروع کیا۔ حالت یہ تھی کہ جب یہ گھر جاتا تھا تو دوسرا بڑھ کر اس کے چھڑانے کی کوشش کرتا تھا۔ تھوڑی دیر یہی صورت قائم رہی لیکن اس کے بعد پیادوں کی فوج نے حر کو سختی سے گھیر لیا۔ (۱) اور زہیر کی مدافعت ناکام رہی۔ بہت سے لوگ ٹوٹ پڑے اور ایوب بن مسرح کے ساتھ ایک اور شخص نے کوفہ کے شہسواروں میں سے مل کر حر کو شہید کیا۔ (۲) امام نے اپنے اس ناصر کی یہ قدر کی کہ جب اس کی لاش میدان سے اٹھا کر لائی گئی اور حضرت کے سامنے رکھی گئی تو آپ خاک و خون حر کے چہرے سے صاف کرتے جاتے تھے اور فرماتے تھے "تم بے شک حر ہو۔ تمہارے والدین نے تمہارا نام حُر بہت ٹھیک رکھا تھا۔ تم دنیا میں بھی حر ہو اور آخرت میں بھی حُر"۔ مطلب یہ تھا کہ انسان کی حریت و شرافت کا جوہر اُس کے افعال ہی سے نمایاں ہوتا ہے۔ دنیاوی خواہشوں کی قید و بند میں گرفتار اور ہوا و ہوس میں اسیر ہو کر حق و ناحق کے امتیاز کو مٹا دینے والا ہرگز حریت ضمیر اور شرافت نفس کے جوہر کا مالک نہیں ہو سکتا۔ یقیناً حُر نے تمام دنیاوی توقعات کو ٹھکرا کر

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۵۲ (۲) طبری ج ۶ ص ۲۰۴ ارشاد ص ۲۱۵

حق کے راستے پر قدم رکھا تو وہ حُر ثابت ہوئے اور حریت کے اصل جوہر کو انھوں نے اپنے عمل سے نمایاں کر دیا۔

(۶۶) ابو ثمامہ صائدیؓ

نام و نسب:۔ عمرو بن عبداللہ بن کعب الصائد بن شرحبیل بن شراحیل بن عمرو بن جشم بن حاشد بن جشم بن حیزون بن عوف بن ہمدان الہمدانی الصائدی ابو ثمامہ ان کی کنیت تھی۔ وہ عرب کے شہسواروں میں سے اور شیعیان علیؑ کے ممتاز افراد میں سے تھے (۱) حضرت علیؑ کی صحبت سے شرفیاب ہوئے تھے اور آپ کے ساتھ تمام لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے۔ آپ کے بعد امام حسنؑ کی صحبت اختیار کی تھی۔ مگر حسنؑ کی مدینہ کی روانگی کے بعد انھوں نے کوفہ ہی میں قیام باقی رکھا۔

جب مسلم بن عقیل امام حسینؑ کے نمائندہ کی حیثیت سے کوفہ آئے تو ابو ثمامہ نے گرم جوشی کے ساتھ اُن کی تائید کی اور جب کوفہ پر ابن زیادؒ کا تسلط ہوا اور جناب مسلم کو خونریزی کے آثار نظر آئے تو انھوں نے ابو ثمامہ کو یہ خدمت سپرد کی کہ وہ زر اعانت اپنے پاس جمع کیا کریں اور اسلحۂ جنگ خریدیں اس لیے کہ وہ اس امر میں بڑی واقفیت رکھتے تھے۔

جناب مسلم کی شہادت کے بعد ابو ثمامہ مخفی طور سے کوفہ سے نکل کر نافع بن ہلال کے ساتھ عراق کے راستے میں جماعت حسینی سے ملحق ہوئے۔

ان کی وفاداری اور فداکاری کا یہ یادگار واقعہ تھا کہ جب عمر بن سعد نے

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۰۴ ارشاد ص ۲۱۵

کثیر بن عبد اللہ کو پیغام دے کر امام حسینؑ کے پاس بھیجا تو ابو ثمامہ نے اُس سے کہا کہ اپنی تلوار باہر رکھ دو جب وہ اس پہ تیار نہ ہوتے دکھائی نہیں دیا تو انھوں نے کہا کہ اچھا میں تمھاری تلوار کے قبضہ پہ ہاتھ رکھے رہوں گا۔ چونکہ اُس نے یہ بھی منظور نہ کیا۔ اس لیے اسے واپس جانا پڑا اور عمر سعد کو دوسرا قاصد بھیجنا پڑا۔ جس نے پیغام رسانی کے فرض کو انجام دیا۔

ظہر کی نماز کا وقت آنے پہ ان کی فرض شناسی کا بہترین نمونہ تھا۔ کہ اس سخت موقع پر بھی ان کے دل میں یہ خواہش جا گزیں تھی کہ میں نماز جماعت امام کی اقتدا میں پڑھ لوں پھر خدا کی بارگاہ میں جاؤں۔ امام حسینؑ اس پہ اتنا خوش ہوئے کہ آپ نے ان کو دعا دی۔ فرمایا کہ "تم نے اس وقت نماز کو یاد کیا۔ خدا تم کو نماز گزاروں میں محسوب کرے"

اس کے بعد امام نے اصحاب سے فرمایا کہ ان لوگوں سے کہو کہ اتنی دیر جنگ سے ہاتھ روک لیں کہ ہم نماز پڑھ لیں۔ اسی التوا کے سوال پہ ہنگامہ ہو گیا تھا۔ جس میں حبیب بن مظاہر اور حُر درجۂ شہادت پہ فائز ہوئے۔ جیسا کہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے یہ سوچ کر نہایت تکلیف ہوتی ہے کہ ابو ثمامہ کی یہ تمنا کہ وہ نماز ظہر امام کی اقتدا میں ادا کر لیں پوری نہیں ہوئی بلکہ اسی ہنگامہ میں اپنے قبیلہ کے ایک شخص کے ہاتھ سے جو فوج یزید میں تھا وہ شہید ہوئے۔

نماز ظہر

جنگ ملتوی نہیں ہوئی تھی۔ ایسے موقع کے لیے شرع نے مخصوص حکم

---

(۱) ارشاد ص ۲۳۹ طبری ج ۶ ص ۲۵۲

"نمازِ خوف" کا دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ فوج کے دو حصے ہو جائیں۔ ایک حصہ دشمن سے مقابلہ کرے اور دوسرا حصہ نماز میں شریک ہو۔ وہ ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھے اور باقی نماز تخفیف کے ساتھ فرادیٰ پڑھ کر تمام کرے اور جب یہ نماز ختم کر کے جائے اور دشمن کے سامنے کھڑا ہو جائے تو وہ پہلا حصہ فوج کا میدانِ جنگ سے آ کر نماز میں شریک ہو مگر یہ تو اُس وقت ہو سکتا ہے جب فوج کی اتنی تعداد ہو کہ اس کے ایسے دو حصے ہو سکتے ہوں کہ ان میں کا ایک دشمن کے ساتھ اتنی دیر مقاومت کر سکے کہ دوسرا حصہ واپس آ جائے مگر یہاں تو جماعت حسینی کی مجموعی تعداد بھی افواجِ مخالف کی کثرت کو دیکھتے ہوئے گویا کہ نہ ہونے کے برابر تھی مگر امام نے ان کی شجاعت پر اعتماد کامل رکھتے ہوئے زہیر بن قین اور سعید بن عبداللہ حنفی سے فرمایا کہ تم دونوں میرے سامنے کھڑے ہو جاؤ کہ میں نمازِ ظہر پڑھ لوں۔ چنانچہ یہ دونوں جاں نثار اصحاب کی تقریباً نصف جماعت کے ساتھ آگے بڑھے اور اپنے امام کے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ حضرت نے نمازِ خوف ادا کی۔ (۱)

(۶۷) سعید بن عبداللہ حنفی

کوفہ کے معزز شیعیانِ علیؑ میں سے تھے اور شجاعت و عبادت کی صفت سے موصوف تھے۔ اہلِ کوفہ کے جو دعوتی خطوط امام کے پاس مکہ بھیجے گئے تھے ان میں کے سب سے آخری خط کو لے کر آپ کی خدمت میں پہونچنے والے ہانی بن ہانی سبیعی اور سعید بن عبداللہ حنفی تھے (۲) حضرت امام حسینؑ نے ان خطوط کا جواب بھی انہی دونوں کے سپرد کیا تھا۔ چنانچہ اپنے خط میں ان کے

---

(۱) طبری ج ۶ صـ ۲۵۲ ارشاد صـ ۲۵۲ (۲) ارشاد صـ ۲۰۹۔

ناموں کا حوالہ بھی دیا تھا۔ اس طرح کہ "ہانی اور سعید میرے پاس تمھارا خط لے کر آئے اور یہ دونوں سب سے آخری تمھارے نمائندے تھے جو میرے پاس پہونچے۔" اس کے بعد آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ "میں تمھاری جانب اپنے چچازاد بھائی اور معتمد عزیز مسلم بن عقیل کو بھیجتا ہوں۔" یہ دونوں اس خط کو لے کر حضرت مسلم کے آگے روانہ ہو گئے۔ (۱)

جب مسلم بن عقیل کوفہ میں وارد ہو کر مختار کے مکان میں فروکش ہوئے اور کوفہ والے آپ کے پاس جمع ہوئے تھے اور آپ نے امام حسینؑ کا خط پڑھ کر سنایا تھا تو عابس بن ابی شبیب شاکری اور حبیب بن مظاہر کے بعد سعید بن عبد اللہ حنفی کھڑے ہوئے تھے اور انھوں نے بھی نصرت و وفاداری کا عہد کیا تھا۔

شب عاشور جب امام حسینؑ نے اپنا تاریخی خطبہ ارشاد کیا تھا کہ میں اپنی بیعت سے تمھیں آزاد کرتا ہوں۔ تمھارا جہاں جی چاہے چلے جاؤ تو اصحاب میں سے مسلم بن عوسجہ کے بعد سعید کھڑے ہو گئے تھے اور انھوں نے یہ جوش و ولولہ سے بھرے ہوئے الفاظ کہے تھے کہ "خدا کی قسم ہم آپ کا ساتھ ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ بخدا اگر میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں، پھر جیتے جی جلا دیا جاؤں پھر میری خاک ہوا میں منتشر کی جائے اور میرے ساتھ ستر مرتبہ ایسا ہی سلوک ہو تو بھی میں آپ سے جدا نہ ہوں گا۔ یہاں تک کہ آخری مرتبہ بھی موت مجھے آپ ہی کے قدموں پر آئے۔"

سعید کے لیے اپنی وفاداری و جاں نثاری کے دعووں کو پورا کر دکھانے

---

(۱) ارشاد صفحہ ۲۱۰

کا اب موقع آگیا کہ جب امام حسینؑ نمازِ ظہر میں مصروف تھے اور آپ نے سعید اور زہیر بن قین کو بطور محافظ اپنے سامنے کھڑا کیا تھا سعید نے یہ صورت اختیار کی کہ وہ خاص حضرتؑ کے سامنے کھڑے تھے اور جو تیر آپ کی طرف آنے لگتا تھا اُسے بڑھ کر اپنے اوپر روکتے تھے، یہاں تک کہ زخموں کی کثرت سے زمین پر گر کر جان بحق تسلیم ہوئے (۱) اس حالت میں کہ تیرہ ۱۳ تیر اُن کے جسم میں پیوست تھے۔

(۶۸) زہیر بن قین بن قیس بجلی

اشرافِ عرب میں سے، کوفہ کے باشندہ، بہادر تھے اور متعدد لڑائیوں میں شریک ہو چکے تھے۔ جمل اور صفین کی لڑائیوں کے بعد سے مسلمان "عثمانی" اور "علوی" نام کی دو ۲ جماعتوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ جو لوگ معاویہ کے طرفدار تھے اُن کو "عثمانی" کہا جاتا تھا اور جو حضرت علیؑ کی طرف تھے وہ "علوی" کہلاتے تھے۔ زہیر عام طور پر "عثمانی" جماعت سے متعلق سمجھے جاتے تھے اور بظاہر وہ اہلبیت نبوی کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہ رکھتے تھے۔

زہیر سنہ ۶۰ھ میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ مناسکِ حج بجا لانے کے بعد کوفہ کی سمت واپس جا رہے تھے کہ امام حسینؑ کا ساتھ ہو گیا۔ اگرچہ زہیر بظاہر امام حسینؑ کے ساتھ کوئی خاص عقیدت نہ رکھتے تھے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کی خاندانی وجاہت سے مرعوب ضرور تھے یعنی انھیں یہ احتمال تھا کہ اگر حسینؑ مجھ کو نصرت کی دعوت دیں گے تو میرے

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۲

لیے رو کرنا اُس کا ممکن نہ ہوگا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ حسینی قافلہ سے دو
دور رہتے تھے۔ مگر امام حسینؑ اُن کی فطری صلاحیتوں سے واقف
اس لیے منزل زرود پر امام نے زہیر کو بلا بھیجا جس کے بعد سے زہیر
بالکل حسینؑ کے ساتھ تھے (۱)

ذو حسم کے مقام پر جب حُر کا لشکر حسینی قافلہ کے سد راہ ہونے کی غرض
سے آچکا تھا تو امام نے اپنے اصحاب کو مخاطب کر کے جو خطبہ ارشاد کیا
اُس کے جواب میں زہیر نے والہانہ انداز سے فدا کارانہ جذبات کا اظ
کیا تھا

اس کے بعد جب حُر نے امام کو کربلا پہونچ کر روکنا چاہا تھا اور
کے قریب خیمے برپا کرنے دینے سے بھی انکار کیا تھا تو زہیر نے کہا تھا کہ
اتنی فوج سے جنگ کر لیجیے اس لیے کہ اس کے بعد اتنا لشکر آئے
کہ اُس سے مقابلہ کرنے کی ہم میں طاقت ہی نہ ہو گی۔ اس کے جواب میں ا
نے فرمایا تھا کہ میں جنگ میں ابتدا نہیں کرنا چاہتا۔ (۲)

پھر نویں تاریخ کی شام کو افواج یزید کے غیر متوقع حملہ کے موقع پر جب
ابو الفضل العباس بعد استفسار حالی امام سے صورت حال بیان کرنے
حبیب بن مظاہر نے افواج مخالف کو وعظ و پند شروع کیا تھا او
عزرہ بن قیس نے بد تہذیبی کے ساتھ دوران کلام میں مداخلت
کی تو زہیر نے اُس کا جواب دیا تھا کہ بے شک خدا نے اس کے نفس کو پا
کیا ہے اور اُس کی رہنمائی کی ہے۔ اے عزرہ میں تم کو نصیحت کرتا ہو
اور اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ تم اس جماعت کے ساتھ شریک نہ ہو جو

(۱) اس واقعہ کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے (۲) تفصیل سابق میں بیان ہوئی ہے
(۳) طبری ج ۶ ص ۲۳۷

کی حمایت کر رہی ہے اور پاک نفوس کو قتل کرتی ہے۔ زہیر کی یہ آواز تعجب کے ساتھ سُنی گئی تھی اور عزرہ نے انھیں پہچان کر کہا تھا کہ "زھیر تم اس گھرانے کے شیعہ نہیں تھے۔ تم تو عثمانی گروہ میں سے تھے" اور زھیر نے کہا تھا "کہ اس وقت میرے یہاں کھڑے ہونے سے تو تم کو سمجھ ہی لینا چاہیے کہ میں شیعہ علیؑ ہوں۔ خدا کی قسم میں نے نہ حسینؑ کو کبھی خط لکھا تھا نہ کوئی قاصد بھیجا تھا اور نہ نصرت کا وعدہ کیا تھا لیکن راستے میں اتفاق سے میرا اور اُن کا ساتھ ہو گیا۔ جب میں نے انھیں دیکھا تو رسول اللہؐ یاد آ گئے اور ان کی خاندانی خصوصیت کا مجھے خیال آ گیا اور مجھے احساس ہوا کہ حقیقۃً وہ دشمنوں کے ظلم و تعدی میں مبتلا ہیں۔ بس میں نے طے کر لیا کہ مجھے ان کی مدد کرنا چاہیے اور ان کی جماعت میں داخل ہو کر اپنی جان ان پر فدا کرنا چاہیے خدا اور رسول کے اس حق کو ادا کرنے کے لیے جسے تم لوگوں نے ضایع و برباد کر دیا ہے۔" (۱)

پھر شب عاشور جب امام حسینؑ نے اصحاب کو جمع کیا تھا اور انھیں اپنی بیعت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کرنے کا اعلان کیا تھا تو اصحاب میں سے مسلم بن عوسجہ اور سعید بن عبداللہ کے بعد زھیر نے بھی تقریر کی تھی اور کہا تھا "بخدا میں پسند کرتا ہوں کہ ایک دفعہ قتل ہوں۔ پھر زندہ ہوں پھر قتل ہوں۔ یوں ہی ہزار دفعہ ہو لیکن آپ اور نیز آپ کے خاندان کے یہ جوان قتل ہونے سے محفوظ رہ جائیں۔" (۲)

صبح عاشور جب امام حسین نے اپنی مختصر فوج کو ترتیب دیا تھا تو زھیر بن قین کو میمنہ کا افسر مقرر کیا تھا۔ اور زھیر نے میدان

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۳۷ (۲) ارشاد ص ۲۴۴

میں نکل کر فوج مخالف کے سامنے ایک معرکہ آرا تقریر بھی کی تھی پھر جب لڑائی شروع ہو گئی تھی اور افواج مخالف کے صفوف میں سے یسار اور سالم میدان جنگ میں آئے اور عبد اللہ بن عمیرؓ ہی مقابلہ کے لیے نکلے تھے تو ان دونوں نے کہا تھا کہ "ہم تم کو نہیں پہچانتے۔ ہمارے مقابلہ کے لیے زہیر بن قین یا حبیب بن مظاہر یا بریر بن خضیر کو آنا چاہیئے"۔ اس واقعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ زہیر فوج حسینی کے اُن نمایاں افراد میں سے تھے جو دشمنوں کے نزدیک ممتاز حیثیت کے مالک سمجھے جاتے تھے۔

اُن کی شجاعت کے کارنامے صبح عاشور سے ہنگام ظہر تک متعدد بار ظاہر ہو چکے تھے چنانچہ ظہر کے پہلے جب شمر نے مخصوص خیمہ حسینی پر حملہ کیا اور اپنا نیزہ خیمہ پر مار کر کہا تھا کہ "آگ لاؤ میں اس خیمہ کو اس کے رہنے والوں سمیت جلا دوں" تو زہیر نے اپنے دس بہادر ساتھیوں کے ساتھ حملہ کر کے اُس کی فوج کو پسپا کر دیا (۱) پھر جب حبیب شہید ہو چکے اور حُر میدان جنگ میں آئے تو زہیر نے حُر کے ساتھ مل کر جنگ کی اس کے بعد امام حسینؑ نے سعید بن عبد اللہ اور زہیر کو مامور کیا کہ تم میری حفاظت کرو یہاں تک کہ میں نماز ظہر ادا کر لوں چنانچہ سعید بن عبد اللہ نماز تمام ہوتے ہوتے اتنے زخمی ہو گئے کہ وہ جانبر نہ ہو سکے اور زہیر کے بھی دست و بازو جواب دے چکے تھے مگر پھر بھی نماز ظہر کے بعد جب دشمن بہت قریب آ گئے تھے تو زہیر بن قین نے اپنی آخری جنگ کی۔ اس وقت وہ بڑے جوش کے ساتھ کہہ رہے تھے:۔

"میں زہیر ہوں اور قین کا فرزند ہوں۔ میں اپنی تلوار سے دشمنوں

---

(۱) ارشاد ص ۲۵۲

کو حسینؑ کے پاس سے دُور کروں گا۔" یوں ہی تھوڑی دیر تک وہ شمشیر زنی کرتے رہے۔ آخر کثیر بن عبداللہ شعبی اور مہاجر بن اوس دونوں نے ایک ساتھ ان پر حملہ کیا اور اُنہی کے ہاتھ سے وہ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے[1]

(۶۹) سلمان بن مضارب بن قیس البجلی

زہیر بن قین کے چچازاد بھائی تھے، زہیر کے ساتھ ۶۰ھ میں حج کو گئے تھے۔ واپسی میں جب زہیر امام کی نصرت کے خیال سے آپ کے ساتھ ہولیے تو سلمان نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ روزِ عاشور ظہر کے بعد شہید ہوئے۔

(۷۰) عمرو بن قرظہ بن کعب انصاری

نام ونسب :- عمرو بن قرظہ بن کعب بن عمر بن عائذ بن زید مناۃ بن ثعلبہ بن کعب بن الخزرج الانصاری ان کے والد قرظہ بن کعب اصحابِ رسول اللہؐ میں سے تھے۔ جنگِ اُحد اور اُس کے بعد کی لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے۔

۲۳ھ میں خلیفۂ دوم کے زمانہ میں ریم ان کے ہاتھوں پر فتح ہوا تھا۔ اور حضرت علیؑ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں ان کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا تھا۔ پھر جب آپ جنگِ صفین کے لیے جانے لگے تھے تو ان کو اپنے ساتھ لے گئے تھے اور کوفہ کی حکومت ابومسعودؓ بدری کے سپرد کی تھی۔ قرظہ سب لڑائیوں میں حضرت علیؑ کے ساتھ رہے اور آپ ہی کے زمانہ خلافت

---

(۱) طبری ج ۶ صہ ۲۵۲ - ۲۵۳

میں کوفہ میں ان کا انتقال ہوا اور آپ ہی نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی - ایک قول یہ ہے کہ معاویہ کے ابتدائی زمانہ میں جب مغیرہ بن شعبہ کوفہ کا حاکم تھا انھوں نے انتقال کیا۔

ان کے دو فرزند تھے عمرو اور علی۔ کربلا میں عمرو امام حسینؑ کی طرف تھے۔ غالباً بڑے بھی تھے - اس لیے کہ ان کے والد قرظہ بن کعب کی کنیت ان ہی کے نام پر ابو عمرو تھی اور ان کا چھوٹا بھائی علی لشکر یزید میں تھا۔

عمرو بن قرظہ کوفہ ہی میں رہتے تھے۔ وہ امام کی خدمت میں میدان کربلا میں پہونچ گئے محرم کی ابتدائی تاریخوں میں جب جنگ ہونے کا قطعی فیصلہ نہ ہوا تھا۔ امام نے اُن کو عمر سعد کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا تھا کہ تم مجھ سے شب کے وقت دونوں لشکروں کے درمیان ملاقات کرو۔"

روز عاشور نماز ظہر کے بعد جب تمام اصحاب میں جذبۂ فداکاری تیز ہو گیا تھا اور شمع امامت کے پروانے جاں سپاری میں ایک دوسرے پر سبقت کر رہے تھے عمرو بن قرظہ نے جنگ کرنا شروع کی - وہ اس مضمون کے شعر پڑھ رہے تھے۔

"تمام انصار کی جماعت جانتی ہے کہ میں ذمہ داری کے حدود کی حفاظت کروں گا - ایسے جواں مرد انسان کی طرح شمشیر زنی کرتے ہوئے جو پیچھے ہٹنے والا نہ ہو۔ حسینؑ پر میری جان اور میرا گھربار سب فدا ہو۔"

کچھ دیر تلوار چلانے کے بعد پھر عمرو امام کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے جو تیر آتا اُسے اپنے اوپر روکتے اور جو وار ہوتا خود سپر بن جاتے - آخر زخموں سے چور ہو گئے اور امام سے مخاطب ہو کر کہا "کیوں! فرزند رسولؐ میں نے فرض کو ادا کیا۔" آپ نے فرمایا "ہاں تم جنت میں میرے آگے جاؤ گے، رسول خداؐ کو میرا اسلام پہونچا دینا - اور کہنا کہ میں بھی عنقریب آتا ہوں۔" بہادر جانباز زخموں

کی کثرت سے زمین پر گرا اور جاں بحق تسلیم ہوا۔

اُن کا بھائی علی بن قرظہ جو فوج عمر سعد میں تھا صف سے باہر نکلا اور امام کو ناشائستہ الفاظ میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم نے میرے بھائی کو گمراہ کیا اور در غلا کر قتل کرا دیا۔" امام نے فرمایا کہ "خدا نے تیرے بھائی کو گمراہ نہیں کیا بلکہ اُس کی ہدایت کی اور گمراہی میں تجھے چھوڑ دیا ہے۔" اُس نے کہا "خدا مجھے غارت کرے، اگر میں تمھیں قتل نہ کروں یا اس کوشش میں خود ہلاک نہ ہو جاؤں۔" یہ کہہ کر اس نے حملہ کیا۔ نافع بن ہلال نے آگے بڑھ کر اس پر نیزہ کا وار کیا جس سے وہ گر گیا۔ (۱)

(۱۷) نافع بن ہلال جملی

نام و نسب :۔ نافع بن ہلال بن نافع بن جمل بن سعد العشیرۃ بن مذحج اپنے قبیلہ کے سردار اور بہادر شخص تھے۔ حافظ قرآن بھی تھے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے اصحاب میں سے اور احادیث کے حامل تھے۔ آپ کے ساتھ جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیوں میں شریک بھی ہوئے تھے۔ عراق کی طرف امام کی روانگی کی اطلاع پا کر کوفہ سے روانہ ہوئے تھے اور راستے میں جماعت حسینی سے ملحق ہوئے تھے اُس وقت جبکہ جناب مسلم کی خبر شہادت بھی نہ آئی تھی ان کا ایک گھوڑا جس کا نام "کامل" تھا کوفہ میں رہ گیا تھا۔ اور اس کے متعلق انھوں نے ہدایت کر دی تھی کہ وہ بعد میں ان کے پاس پہونچا دیا جائے چنانچہ عذیب الہجانات میں عمرو بن خالد صیداوی۔ مجمع بن عبید اللہ عائذی اور جنادہ بن حارث سلمانی وغیرہ پانچ آدمیوں کا جو قافلہ حسینی جماعت سے ملحق ہوا تھا اُس کے ساتھ یہ گھوڑا بھی تھا۔

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۴۵

حُر سے ملاقات اور گفتگو کے بعد ذو حسم میں امام نے جو خطبہ پڑھا تھا، اُس کے جواب میں انھوں نے پرزور تقریر کی تھی۔

کربلا میں جب نہر پر دشمنوں کی مزاحمت شروع ہوی اور امام اور اُن کے ساتھیوں پر پیاس کا غلبہ ہوا، امام حسینؑ نے اپنے بھائی ابوالفضل العباس کو پانی لانے پر مامور کیا۔ جناب عباس بیس سوار اور بیس پیادوں کے ساتھ بیس مشکیزے لے کر آگے بڑھے اور نہر کے قریب پہونچے تو نافع بن ہلال نے علم اپنے ہاتھ میں لیا اور سب سے آگے ہو گئے۔ عمرو بن حجاج زبیدی نے جو نہر کا محافظ تھا ٹوکا اور کہا کون ہے جو نہر پر جا رہا ہے چونکہ عمرو بن الحجاج قبیلۂ زبیدہ سے تھا جو مذحج اور مراد کی ایک شاخ ہے اور قبیلۂ جمل جس سے نافع تھے، یہ بھی مراد کی ایک شاخ۔ اس لیے نافع نے جب اپنا نام بتایا اور قبیلہ کا پتہ دیتے ہوے کہا کہ ہم پانی پینے آئے ہیں تو عمرو نے کہا "تم شوق سے پیو۔ تمھیں پینا گوارا ہو۔" نافع نے جواب میں کہا "میں اکیلا تھوڑی ہی پیوں گا۔ درصورتیکہ حسینؑ اور اُن کے سب اصحاب پیاسے ہوں۔" یہ سنتے ہی فوج مخالف آگے بڑھی یہ کہتی ہوئی کہ "یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اُن تک پانی پہونچ سکے۔ ہم یہاں مقرر اسی لیے کیے گئے ہیں کہ پانی کا ایک قطرہ بھی جماعت حسینی تک نہ جانے دیں۔" نافع ان لوگوں سے گفتگو کے لیے آگے بڑھے اور انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم لوگ تیزی سے مشکیں پانی سے بھر لو۔ چنانچہ ساتھیوں نے جلدی جلدی پانی بھر لیا اور جب اُدھر سے نگہبانوں کی فوج آگے بڑھی تو ابوالفضل العباسؑ کے ساتھ نافع بن ہلال اور دوسرے بہادروں نے اُس کا مقابلہ کر کے پیچھے ہٹا دیا۔ اس دوران میں وہ لوگ جو مشکیں لیے ہوے تھے ساحل سے اوپر آ گئے تھے۔ چنانچہ بہادروں نے ان کو خیام حسینی کی طرف روانہ کر دیا اور خود وہیں کھڑے رہے۔ پاسبانوں کی فوج نے پھر بڑھ کر حملہ کیا۔

اس موقع پر نافع بن ہلال نے عمرو بن الحجاج کی فوج میں سے ایک شخص پر جو قبیلہ صدا سے تھا نیزہ کا وار کیا جس سے بعد میں وہ ہلاک ہوگیا۔ بہر طور اصحاب حسینؑ پانی لے کر خیام حسینی تک پہونچ گئے (۱) جو اتنی بڑی جماعت کے لیے جن کے ساتھ گھوڑے بھی تھے صرف ذرا ہی دیر تک کے لیے تسکین عطش کا باعث ہو سکتا تھا۔

روز عاشور جنگ چھڑنے کے بعد ہی سے نافع کا ولولہ جنگ کام کرنے لگا تھا۔ چنانچہ افواج مخالف کے ایک پہلوان مزاحم بن حریث کے ساتھ اُن کا دست بدست کامیاب مقابلہ ہوا تھا۔ اس کے بعد عمرو بن قرظہ کی شہادت کے موقع پر جب اُن کے بھائی علی بن قرظہ نے امام کی شان میں گستاخانہ کلمات کہے اور حملہ کیا تھا تو نافع نے اُس کا مقابلہ کر کے اُسے مغلوب کیا تھا۔

نافع تیر اندازی میں بڑے مشاق اور یگانۂ روزگار تھے اُنھوں نے اپنے تیروں کے سوفار پر اپنا نام لکھ دیا تھا۔ اور تیروں کو زہر میں بجھا لیا تھا۔ چنانچہ ظہر کے بعد انھوں نے تیر لگانا شروع کیے۔ وہ کہتے جاتے تھے کہ "میں جملی ہوں اور علیؑ کے دین پر ہوں۔" اور افواج مخالف کے بارہ آدمیوں کو اس طرح قتل کیا اور بہت سوں کو زخمی۔ یہاں تک کہ دشمنوں نے اُن کو چاروں طرف سے گھیر کر مارنا شروع کیا جس سے دونوں بازو اُن کے شکستہ ہو گئے۔ اور وہ گرفتار کر لیے گئے۔ شمر سپاہیوں کی ایک جمعیت کے ساتھ ان کو پکڑ کر عمر سعد کے پاس لے گیا۔ اس حالت میں کہ ان کی ڈاڑھی سے خون ٹپک رہا تھا۔ ان کو دیکھ کر اُس نے کہا "نافع یہ تم نے اپنے نفس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟" نافع نے کہا "میرے ضمیر سے خدا

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۳۴ - ۲۳۵

واقف ہے۔ خدا کی قسم میں نے بارہ آدمی تم میں سے جان سے مارے ہیں اور زخمیوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ میں نے اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اور اگر میرے بازو ٹوٹ نہ جاتے تو تم مجھے اس طرح ہرگز گرفتار نہ کر سکتے۔" شمر نے کہا کہ "اس شخص کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیئے۔" عمر سعد نے جواب دیا کہ "تم گرفتار کر کے لائے ہو، تم کو اختیار ہے۔" شمر تلوار کھینچ کر بڑھا تو نافع نے کہا "اگر تو مسلمان ہوتا تو کبھی ہم لوگوں کے خون میں ہاتھ نہ بھرتا۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس نے ہم لوگوں کی موت بدترین خلائق افراد کے ہاتھوں قرار دی۔" شمر نے تلوار لگائی۔ نافع شہید ہوئے۔ پست حوصلہ اور کمینہ فطرت شمر اس زخمی اور مجبور مجاہد کو قتل کر کے فتح مندی کا احساس کرنے لگا۔ اور رجز کے اشعار زبان پر جاری کر کے حسینؑ کے باقی ماندہ اصحاب پر حملہ آور ہوا۔ (۱)

(۲۷) شوذب بن عبداللہؓ

ہمدان کی ایک شاخ قبیلۂ شاکر کے غلام زادوں سے اور عابس بن ابی شبیب شاکری سے وابستہ تھے۔ شیعیان کوفہ میں اپنے اوصاف کی بناء پر نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اور ایک طرف تو میدان جنگ کے شہسوار تھے دوسری طرف احادیث کے حافظ اور حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے استفادہ کیے ہوئے تھے اور کوفہ میں اس باب میں مرجعیت رکھتے تھے، لوگ اُن سے احادیث حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔

جب عابس مسلم بن عقیل کا خط لے کر کوفہ سے کہ معظمہ روانہ ہوئے

---

(۱) طبری ج ٦ ص ۲۵۳

تھے تو شوذب بھی ان کے ساتھ تھے اور امام حسینؑ کے ہمراہ مکہ معظمہ سے پھر عراق آئے اور کربلا پہونچے تھے۔

روز عاشور عابس نے اپنے باوفا غلام سے کہا "کیوں شوذب! تمھارا کیا ارادہ ہے؟" شوذب نے کہا "ارادہ کیا ہے؟! یہی کہ آپ کے ساتھ رہ کر فرزند رسولؐ کی نصرت میں جنگ کروں اور قتل ہو جاؤں" عابس نے کہا۔ "شاباش مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اچھا تو پھر آگے بڑھو اور امام پر جاں نثار کرو۔ تاکہ امام تمھاری مصیبت بھی اُسی طرح دیکھ لیں جیسے اپنے دوسرے اصحاب کی دیکھی اور میں بھی تمھارے غم کو برداشت کر کے ثواب کا مستحق بنوں۔ یقیناً اگر اس وقت کوئی ایسا شخص میرے ساتھ ہوتا جس پر مجھے اس سے زیادہ اختیار حاصل ہوتا جتنا مجھے تم پر حاصل ہے تو میری خوشی یہ ہوتی کہ وہ میرے سامنے جائے تاکہ میں اُس کے غم کو برداشت کروں، کیونکہ آج وہ دن ہے جس میں انسان سے جتنا ہو سکے اُتنا اجر ثواب حاصل کر لے۔ اس لیے کہ آج کے دن کے بعد ہمارے عمل کا دفتر بند ہو جائے گا۔ اور حساب کے سوا کچھ رہ نہیں جائے گا۔" (۱)

یہ وہ الفاظ ہیں جنھیں اطمینانی حالت میں شاعری کے طور پر ہر شخص کہہ سکتا ہے لیکن عین مصیبت کے موقع پر واقعی طور سے اُن کا اس طرح کہنا کہ عمل سے ان کی تصدیق ہوتی ہو بہت مشکل ہے۔ الفاظ سے صاف ظاہر تھا کہ راہ حق میں مصائب اٹھانے کا ایک شوق ہے اور تکالیف کے برداشت کرنے کا ولولہ جو خود اختیاری طور پر عملی اقدامات کا محرک ہے۔

"بہر طور شوذب آگے بڑھے۔ امام حسینؑ کو سلام کر کے رخصت ہوئے اور جنگ

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۴

کر کے شہید ہوئے۔ (۱)

(۷۳) عابس بن ابی شبیب شاکری

نام ونسب :۔ عابس بن ابی شبیب بن شاکر بن ربیعہ بن مالک بن صعب بن معویتہ بن کثیر بن مالک بن جشم بن حاشد الہمدانی الشاکری۔ بنو شاکر قبیلۂ ہمدان کی ایک شاخ تھے اور ان ہی کی نسبت حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے جنگ صفین کے موقع یہ فرمایا تھا کہ اگر ان کی تعداد ایک ہزار ہو جائے تو خدا کی عبادت اُس طرح ہونے لگے جس طرح کہ ہونا چاہیے۔

یہ لوگ بڑے شجاع اور جنگ آزما تھے اور "فلتیان الصباح" کے لقب سے مشہور تھے۔ جس کے معنی ہیں "وقت صبح کے جواں مرد" چونکہ غارت گری اور جنگ کا مقابلہ زیادہ تر اوقات صبح میں ہوتا تھا۔ اس لئے اس وقت کی طرف نسبت دی گئی۔

ہمدان کی ایک دوسری شاخ بنو وادعہ کے پاس ان لوگوں نے جا کر قیام کیا تو یہ بھی اُنہا کی طرف منسوب ہونے لگے اور اسی لئے عابس شاکری بھی کہا جاتا تھا اور وادعی بھی۔

عابس شیعیان کوفہ میں سے رئیس قوم، بہادر، مقرر، عبادت گزار اور شب زندہ دار تھے۔ متعدد لڑائیوں میں کارنمایاں انجام دے چکے تھے۔ اور دلوں پر ان کی شجاعت کا سکّہ قائم تھا۔

جب مسلم بن عقیل کوفہ میں وارد ہوئے تھے اور آپ نے

---

(۱) طبری ج ۶ صد ۲۵۲

پہلا جلسہ منعقد کر کے امام حسینؑ کا خط سنایا تھا تو اُس وقت سب سے پہلے عابس ہی کھڑے ہوئے تھے اور انھوں نے کہا تھا کہ "میں دوسروں کا ذمہ دار نہیں مگر جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نے طے کر لیا ہے کہ آخری دم تک آپ لوگوں کا ساتھ دونگا۔"

اُن کی تقریر اتنی جامع اور پُر مغز تھی کہ حبیب بن مظاہر نے اُنکی تعریف کی تھی اور اُن ہی کی تائید میں اپنی نصرت و وفاداری کا عہد کیا تھا۔

جب کوفہ کے اٹھارہ ہزار آدمیوں نے مسلم کی بیعت کر لی اور آپ نے اس صورت حال سے مطمئن ہو کر امام حسینؑ کو اطلاع دینا چاہی تو آپ نے وہ خط عابس ہی کے ہاتھ مکہ بھیجا تھا۔ چنانچہ وہ اس خط کو لے کر امام حسینؑ کے پاس پہونچے اور پھر آپ سے جدا نہیں ہوئے۔

اُن کا غلام شوذب اُن کے ساتھ ساتھ تھا چنانچہ اُنھوں نے اپنے غلام کو اپنی طرف سے حسینؑ پر نثار کیا۔

جب شوذب درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے تو عابس نے امام کی خدمت میں عرض کیا "بخدا روئے زمین پر کوئی ایسا نہیں جو مجھے آپ سے زیادہ عزیز و محبوب ہو۔

اگر مجھے قدرت ہوتی کہ میں اپنی جان سے زیادہ کوئی عزیز شے آپ کی خدمت میں پیش کر دوں تو ایسا ہی کرتا مگر اب تو بس میری جان باقی ہے۔ بس اب اجازت دیجئے۔ میں آخری سلام عرض کرتے ہوئے خدا کو گواہ کرتا ہوں کہ میں آپ کے اور آپ کے پدر بزرگوار کے دین پر قائم ہوں۔"

ان الفاظ کو کہہ کر امام سے رخصت ہوئے اور تلوار کھینچے ہوئے صفوف مخالف کے سامنے پہونچے۔ اُن کی پیشانی پر اس وقت ایک زخم موجود تھا

جو شاید پہلے کسی حملہ میں آگیا تھا فوج کوفہ کا ایک شخص ربیع بن تمیم جو واقعہ کربلا میں موجود تھا بیان کرتا ہے کہ میں نے عابس کو آتے دیکھا تو پہچان لیا اس لیے کہ میں انھیں اس کے پہلے لڑائیوں میں دیکھ چکا تھا اور ان کی شجاعت سے واقف تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا "ایہا الناس یہ شیروں کا شیر ہے۔ یہ ابن ابی شبیب ہے۔ دیکھو کوئی ایک شخص تم میں سے اس کے مقابلہ کو باہر نہ نکلے"۔ عابس نے آواز دینا شروع کی "کیا کوئی مرد میدان نہیں جو ایک مرد میدان کے مقابلہ کو نکلے"۔ مگر فوج یزید میں سے ایک شخص بھی باہر نہ نکلا۔ عمر سعد نے کہا اس بہادر کو پتھروں سے مار لو چنانچہ ہر طرف سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ یہ عجیب طریقۂ جنگ دیکھکر عابس نے زرہ اور خود بکتر اُتار کر پھینک دیا اور تلوار سونت کر صفوف مخالف پر ٹوٹ پڑے جس صف کی طرف رُخ کرتے تھے سیکڑوں آدمی اُن کے سامنے سے بھاگتے نظر آتے تھے۔ تھوڑی دیر کی جنگ کے بعد فوج کے ایک بڑے حصہ نے اُن کو چاروں طرف سے گھیر کر قتل کر دیا۔ پھر اُن کا سر قلم کیا گیا اور بہت سے آدمیوں نے آپس میں جھگڑنا شروع کیا۔ ہر ایک کہتا تھا کہ اُس شخص کو میں نے قتل کیا ہے۔ بالآخر عمر سعد نے اس کا یہ کہکر فیصلہ کیا کہ جھگڑا نہ کرو۔ اس شخص کا قاتل کوئی ایک نہیں ہو سکتا۔ تم سب اس کے قاتل ہو۔ اس طرح یہ تنازع برطرف ہوئی۔ (۱)

(۴۷ و ۵۷) عبداللہ و عبدالرحمن فرزندان عروہ(۲) بن حراق غفاری

ابوذر غفاری کے قبیلہ سے حراق غفاری اصحاب حضرت علی بن ابی طالبؑ

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۵۳ (۲) بعض کتابوں میں "عزرہ" ہے (طبری ج ۶ ص ۲۵۲)

میں سے تھے اور آپ کے ساتھ جمل، صفین اور نہروان کے معرکوں میں شریک رہے تھے۔ ان کے دونوں پوتے عبداللہ اور عبدالرحمٰن اشراف و شجاعان کوفہ میں سے اور شیعیان علیؑ میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ دونوں بھائی امام حسینؑ کے پاس میدان کربلا میں پہونچے اور آپ کے انصار میں شامل ہوئے تھے۔

ظہر کے بعد وقت سخت سے سخت ہوتا جا رہا تھا۔ اصحاب حسینؑ میں سے ہر ایک کی اب یہ کوشش تھی کہ میں اپنی جان پہلے نثار کروں۔ چنانچہ ان دونوں بھائیوں نے امام کی خدمت میں عرض کیا "یا ابا عبداللہ! ہمارا سلام قبول کیجیے۔ دشمن اب آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں اور ہمارا بس نہیں چلتا۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ خود آپ کے سامنے قتل ہو جائیں اور آپ کی نصرت کا حق ادا کریں"۔ امام نے فرمایا "اللہ تمھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ آؤ میرے قریب آؤ"۔ یہ دونوں امام کے قریب ہی اُس فوج سے جو بڑھ آئی تھی برسرپیکار ہو گئے۔ وہ یہ رجز پڑھ رہے تھے کہ:۔

"تمام بنی غفار اور خندف و بنی نزار کے قبائل اس بات سے واقف ہیں کہ ہم فاسق و فاجر گروہ پر حملے کریں گے باڑھ دار بُران شمشیروں کے ساتھ۔ اے میرے رفیقو! آلِ رسولؐ کی حفاظت میں شمشیر و نیزہ کے ساتھ جنگ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھو"۔ آخر دونوں جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ (۱)

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۵۳۔

(۷۶) حنظلہ بن اسعد شبامی

نام ونسب :۔ حنظلہ بن اسعد بن شبام بن عبداللہ بن اسعد بن حاشد بن ہمدان الہمدانی الشبامی ۔

شیعیان کوفہ میں سے نامآور اور خوش تقریر، بہادر اور حافظ قرآن تھے امام حسینؑ کے پاس آپ کے میدان کربلا میں وارد ہونے کے بعد پہونچ گئے اور امام نے گفتگوئے صلح کے دوران میں اکثر ان کو عمر بن سعد کے پاس بسلسلۂ نامہ وپیام بھیجا تھا ۔

روز عاشور ظہر کے بعد جب حسینی مجاہدوں میں سے بہت سے شہید ہو چکے تو وہ امام کے سامنے آکر کھڑے ہوئے اور فوج کوفہ کو مخاطب کرکے باواز بلند کہنے لگے ۔

"اے میری قوم کے لوگو! مجھے تمہارے متعلق اندیشہ ہے اس روز بد کا جو بہت سی قوموں کو نصیب ہوا جیسے قوم نوح اور عاد اور ثمود وغیرہ ۔ اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتا بلکہ اُن کی بداعمالیوں ہی کا بدلہ دیتا ہے ۔ اے میری قوم! میں تمہارے لیے اندیشہ رکھتا ہوں قیامت کے دن سے جبکہ تم اس دنیا سے پشت پھراؤ گے اور کوئی تمہارا بچانے والا خدا کے عذاب سے نہ ہوگا اور جس کی ہدایت سے خدا ہاتھ اُٹھالے پھر اُس کی ہدایت کون کرسکتا ہے ۔ اے میری قوم! حسینؑ کو قتل نہ کرو ۔ نہیں تو خدا تم پر عذاب نازل کرے گا ۔ اور جھوٹ کہنے والوں کا انجام ناکامی ہے ۔" (۱)

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۴ ارشاد صفحہ ۲۵۲

دشمن پر ایسی تقریروں سے اثر ہی کب ہوتا تھا۔ امام نے پکار کر فرمایا۔
"اے ابن اسعد! خدا اپنی رحمت تمھارے شامل حال کرے۔ یہ لوگ عذاب کے مستحق تو اسی وقت ہو گئے جب انھوں نے حق بات کو قبول نہ کیا اور تم لوگوں کے خلاف فوج کشی کی، چہ جائیکہ اب! اب تو یہ تمھارے بہت سے نیک ساتھیوں کو قتل بھی کر چکے ہیں۔"

حنظلہ نے کہا "حضور سچ فرماتے ہیں۔ حضور سے بڑھ کر ان باتوں کو کون سمجھ سکتا ہے، اچھا تو اجازت دیجیے کہ ہم بھی جائیں خدا کی طرف اور اپنے ساتھیوں سے ملحق ہوں"۔ امام نے فرمایا "جاؤ دنیا و آخرت کی نیکی اور ایسی سلطنت کی طرف جس کو زوال نہیں ہے"۔ حنظلہ نے رخصتی سلام کیا، میدان جنگ میں گئے۔ لڑے اور شہید ہو گئے۔ (۱)

(۷۷و۷۸) سیف بن حارث بن سریع و مالک بن عبد بن سریع بن جابر ہمدانی

دونوں چچا زاد بھائی اور ایک ماں کی اولاد تھے (۲) ان دونوں میں کہ جب صلح کی گفتگو ہو رہی تھی۔ میدان کربلا میں پہونچ کر جماعت حسینی سے ملحق ہوئے تھے ان کا غلام شبیب بھی ان کے ساتھ تھا اور حملۂ اولی میں شہید ہوا تھا۔

روز عاشورا جب بازار شہادت گرم تھا تو یہ دونوں جوان امام کے

---

(۱) طبری ج ۶ صہ ۲۵۴ ارشاد صہ ۲۵۲ (۲) طبری ج ۶ صہ ۲۵۳

نزدیک کھڑے ہو کر رونے لگے۔ یہ ان کے دل کی بے چینی تھی جس نے الفاظ کو سرشکِ غم کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا اور اُن کے مُنہ سے رنج کی وجہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ ان کی اس حالت کا مشاہدہ کر کے امامؑ نے فرمایا کہ "کیوں! میرے بھائی کے فرزندو! روتے کیوں ہو؟ دیکھو تھوڑی دیر میں تمھارے لیے خوشی ہی خوشی کے سامان مہیا ہوں گے"۔ دونوں نے عرض کیا "ہماری جان آپ پر قربان! ہم اپنے لیے تھوڑی روتے ہیں۔ ہمیں تو آپ کی بیکسی پر رونا آ رہا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ اور پورے طور پر ہم سے آپ کی حفاظت کا امکان نہیں رہا ہے"۔ امام نے فرمایا "تمھیں اس صدمہ پر جو میری وجہ سے ہے اور اس ہمدردی پر جو میرے ساتھ ہے خدا بہترین جزا عطا فرمائے"۔ (۱)

حنظلہ بن اسعد شبامی کی شہادت کے بعد وہ دونوں حسینؑ کی خدمت میں سلام آخر بجا لائے اور لڑ کر شہید ہوئے۔ (۲)

(۷۹) جون (غلام ابوذر غفاری)

نام و نسب:۔ جون بن حوی بن قتادہ بن اعور بن ساعدۃ بن عوف بن کعب بن حوی مولیٰ ابی ذر الغفاری، حبشی نسل سے فضل بن عباس بن عبد المطلب کے مملوک تھے۔ حضرت علیؑ نے ڈیڑھ سو اشرفی کو انھیں خرید فرمایا تھا اور ابوذر غفاری کو ہبہ کر دیا تھا تا کہ اُن کی خدمت کریں۔ چنانچہ وہ ابوذر کے ساتھ رہے یہاں تک کہ ربذہ میں بحالت جلاوطنی بھی اُن

---

(۱) طبری ج ۶ صـ۲۵۳ (۲) طبری ج ۶ صـ۲۵۴

کے ساتھ رہے۔

جب ۳۲ھ میں ابو ذر کا انتقال ہوا تو جونؓ مدینہ واپس ہو کر پھر حضرت علیؑ کی خدمت میں رہنے لگے۔ اور آپ کی شہادت کے بعد امام حسنؑ اور پھر امام حسینؑ کے پاس رہے۔

روز عاشورا جب جنگ کے شعلے بلند ہو گئے تو جون نے بھی امام حسینؑ سے اجازت جہاد طلب کی، آپ نے فرمایا "تم ہمارے ساتھ راحت کے لیے تھے۔ اب ہماری وجہ سے کیوں مصیبت میں مبتلا ہوتے ہو۔" یہ سننا تھا کہ جون نے آپ کے قدموں پر گر کر عرض کیا "فرزند رسولؐ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ راحت کے زمانہ میں تو میں آپ کے یہاں کے پیالے چاٹنے اور اب سختی کے وقت میں آپ کا ساتھ چھوڑ کر چل دوں۔ خدا کی قسم میرے جسم سے بدبو آتی ہے، میرا حسب و نسب پست اور رنگ سیاہ ہے۔ آپ اپنے طفیل میں مجھے جنت کا مستحق بنا دیجیے کہ میری بو خوشبو سے بدل جائے، میرا حسب و نسب باوقار ہو جائے اور میرا رنگ سفید ہو جائے۔ بخدا میں آپ سے جدا نہ ہوں گا۔ جب تک کہ یہ سیاہ خون آپ بزرگواروں کے سفید خون میں مل نہ جائے۔" بہر طور اجازت جنگ ملنے پر جون نے میدان جنگ میں آکر رجز پڑھنا شروع کیا۔

"ذرا کفار دیکھیں تو کہ ایک سیاہ غلام شمشیر و نیزہ سے کس طرح جنگ کرتا ہے۔ آل رسولؐ کی نصرت و حمایت میں۔" اس کے بعد انھوں نے جہاد کیا اور درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

حضرت امام حسینؑ کے دل میں جون کے وہ الفاظ گھر کر چکے تھے، اس لیے آپ جب ان کی لاش پر تشریف لائے تو دعا کی "خداوندا! اس کے چہرہ کو روشن کر دے، اس کی بدبو کو خوشبو سے متبدل کر دے اور اسے

صالحین کے ساتھ محشور کر اور اسے محمد و آل محمدؐ کی حقیقی معرفت رکھنے والوں میں محسوب فرما۔"

(۸۰) غلام ترکی

حافظ قرآن، حضرت امام حسینؑ کے غلام تھے جن کو آپ نے اپنے فرزند علیؑ بن الحسینؑ (زین العابدین) کو ہبہ کیا تھا۔ انھوں نے امام سے اجازت جہاد مانگی تو آپ نے فرمایا کہ خیمہ میں جاکر اپنے آقا سے اجازت حاصل کرو۔ چنانچہ وہ اجازت حاصل کرنے کے بعد تمام اہل حرم کی خدمت میں سلام آخر بجا لاکر میدان جنگ میں آئے۔ اور یہ رجز پڑھنے لگے "سمندر میں میرے نیزہ و شمشیر کی گرمی سے آگ لگ جاتی ہے اور فضا میرے تیروں کی پرواز سے مملو ہو جاتی ہے۔ جب میری تلوار میرے ہاتھ میں چمکتی ہے تو مغرور حاسد کا دل شگافتہ ہو جاتا ہے۔"

جنگ کرکے انھوں نے بہت سے لوگوں کو قتل کیا۔ بالآخر زخمی ہو کر گر گئے امام حسینؑ ان کی لاش پر سرہانے تشریف لائے اور گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اور رخسارہ اپنا ان کے رخسارہ پر رکھ دیا۔ انھوں نے آنکھیں کھولیں اور اس عزت افزائی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

(۸۱) انس بن حارث اسدی

نام و نسب:۔ انس بن حارث بن نبیہ بن کاہل بن عمرو بن صعب بن اسد بن خزیمہ اسدی کاہلی اصحاب رسول میں سے۔ حدیث کے راوی تھے۔ وہ پیغمبر خدا کی زبانی شہادت حسینؑ کی خبر سن کر نصرت کے ارادہ سے اس دن کے منتظر رہنے لگے۔

واقعۂ کربلا کے موقع پر وہ بہت کبیر السن ہو چکے تھے مگر جذبۂ ایمانی ایسا رکھتے تھے کہ امام حسینؑ کے ساتھ کربلا پہونچے اور روز عاشورا اجازت جہاد حاصل کرنے کے بعد انھوں نے عمامہ سے اپنی کمر چست باندھی اور بھووں کو جو آنکھوں پر لٹک آئی تھیں اونچا کر کے رومال سے پیشانی پر باندھا۔ امام نصرت دین میں اُن کا یہ اہتمام دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے اور فرما رہے تھے شکر اللّٰہ لک یا شیخ یعنی اے بڈھے مجاہد خدا تیرے حسن عمل کی قدر کرے" بالآخر وہ جنگ کر کے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۸۲) حجاج بن مسروق جعفی

جعف بن سعد العشیرہ کی نسل سے، کوفہ کے معزز شیعہ تھے اور حضرت علیؑ بن ابی طالب کی صحبت سے شرفیاب ہوئے تھے۔ جب امام حسینؑ مکہ میں قیام گزیں تھے تو وہ کوفہ سے جاکر آپ کے ہمراہ رکاب ہوئے اور اوقات نماز میں اذان کی خدمت انجام دینے لگے۔

جب امام مکہ سے عراق کی طرف روانہ ہوئے تو وہ آپ کے ساتھ تھے چنانچہ اُس موقع پر جب حر کے لشکر سے ملاقات ہوئی تھی اور نماز ظہر کا وقت آیا تھا تو تاریخ میں یہ تصریح موجود ہے کہ حسینؑ نے حجاج بن مسروق کو اذان کا حکم دیا۔(۱) روز عاشورا انھوں نے بھی اذن جہاد حاصل کیا۔ میدان میں جاکر رجز پڑھا۔ جنگ کر کے بہت سے دشمنوں کو قتل کیا اور آخر جام شہادت نوش کیا۔

---

(۱) ارشاد ص ۲۳۵

(۸۳) زیاد بن عریب ہمدانی

نام ونسب :- ابو عامر زیاد بن عمرو بن عریب بن حنظلہ بن دارم بن عبداللہ بن کعب الصائد الہمدانی۔ ان کے باپ کو خدمت رسول خدا میں حضوری کا شرف حاصل تھا اور خود زیاد بڑے عابد وزاہد، شب زندہ دار اور تہجد گزار تھے اور شجاعت میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ روز عاشور سخت جنگ کرنے کے بعد درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۸۴) سالم بن عمرو بن عبداللہ مولیٰ بنی المدینۃ الکلبی

بنو المدینۃ قبیلۂ کلب قضاعہ کی ایک شاخ تھے۔ زید بن حارثہ صحابی اور محمد بن سائب کلبی صاحب تفسیر بھی اسی نسل سے تھے۔

سالم اسی خاندان کے غلام تھے اور شیعیان کوفہ میں ان کا شمار ہوتا تھا مسلم بن عقیل کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئے تھے اور آپ شہادت کے بعد گرفتار کر لیے گئے تھے مگر کسی طرح موقع پا کر رہا ہو گئے اور اپنی قوم میں مخفی ہو گئے تھے۔ جب امام حسینؑ کے میدان کربلا میں وارد ہونے کی خبر سنی تو قبیلۂ کلب کے لوگوں کے ساتھ وہاں پہنچ کر آپ کے انصار میں داخل ہوئے اور روز عاشور درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۸۵) سعد بن حارث مولیٰ امیرالمومنین

حضرت علی بن ابی طالبؑ کے غلام تھے۔ آپ کی شہادت کے بعد امام حسنؑ اور پھر امام حسینؑ کی خدمت میں رہے۔ مدینہ سے کربلا تک آپ کے ساتھ آئے تھے اور

روز عاشورا انھوں نے بھی اپنی جان آپ پر نثار کی۔

(۸۶) عمر بن جندب حضرمی

شیعیان کوفہ میں سے تھے۔ حضرت علی بن ابی طالبؑ کے ساتھ جمل اور صفین کے معرکوں میں شریک ہوئے تھے۔ سنہ ۵۱ھ میں جب حجر بن عدی کا حکومت بنی امیہ سے تصادم ہوا تھا تو وہ حجر کے اعوان میں داخل تھے اور اسی لیے جب حجرؓ کو گرفتار کرکے شام بھیجا گیا تو وہ روپوش ہو گئے تھے اور زیاد بن ابیہ کے ہلاک ہونے کے بعد کوفہ واپس آئے تھے۔ جب مسلم بن عقیل کوفہ میں وارد ہوئے تھے تو وہ ان کے انصار میں شریک ہو گئے تھے اور مسلم کی شہادت کے بعد مخفی طور پر امام حسینؑ کی خدمت میں پہونچے۔ روز عاشور درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۸۷) قعنب بن عمرو النمری

شیعیان بصرہ میں سے تھے۔ حجاج بن زید سعدی کے ساتھ امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور روز عاشور درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۸۸) یزید بن ثبیط العبدی

وہ شیعیان بصرہ اور ابوالاسود دؤلی شاگرد حضرت علی بن ابی طالبؑ کے مصاحبین میں سے تھے۔ جب امام حسینؑ مکہ سے عراق کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو ابن زیاد نے اپنے نائب کو جو بصرہ میں تھا خط لکھا تھا کہ بصرہ کے لوگوں پر ہوشیار رہنا۔ کوئی شخص نصرت حسینؑ کے لیے وہاں سے آنے نہ پائے۔ مگر بصرہ میں عبد قیس کے قبیلہ کی ایک خاتون ماریہ بنت منقذ تھیں

محب اہلبیت تھے اور ان کا مکان شیعیان بصرہ کے اجتماع کا مرکز تھا۔
چنانچہ انہی کے مکان پر ایک جلسہ کے دوران میں یزید بن ثبیط نے نصرت
حسین کے ارادہ کا اظہار کیا تھا اور اپنے دس فرزندوں کو بھی اس کی ترغیب
دلائی تھی مگر ان میں سے صرف دو تیار ہوئے تھے۔ عبداللہ بن ثبیط اور عبیداللہ
بن ثبیط ان کا تذکرہ اس کتاب میں پہلے ہو چکا ہے۔ اُن کے بہت سے
ساتھیوں نے جو اس مکان میں جمع ہوا کرتے تھے ان کو اس ارادہ سے باز
رکھنا چاہا مگر انہوں نے ان کے مشوروں کی طرف کوئی اعتنا نہ کی اور اٹھ
کھڑے ہوئے۔ کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھ ہو گئے اور یہ آخر عراق کے
راستے میں ابطح کی منزل پر امام وارد ہوئے تھے جب یہ لوگ اس مقام پر پہونچ کر امام حسینؑ کی
طرف شرف ملاقات حاصل کرنے کیلئے گئے تو امام خود ان کے آنے کی خبر سن کر ان سے ملنے کے
لئے دوسرے راستے سے ان کی جائے قیام پر تشریف لے جا چکے تھے۔ اور جب انھیں نہ پایا تو
وہیں انتظار کے لیے بیٹھ گئے تھے۔ ان لوگوں نے امام کو اپنے ہی یہاں بیٹھا پایا۔
اس وقت کی ان کی خوشی کا اندازہ غیر ممکن ہے۔ انھوں نے آیت قرآن
پڑھی کہ اللہ کے فضل و رحمت سے مومنین کو خوش ہونا چاہیے۔ اس کے بعد
امام کی خدمت میں سلام عرض کیا اور عزم نصرت کا اظہار کیا۔ امام نے
دعائے خیر دی۔

روز عاشور وہ اپنے فرزندوں کے بعد جنگ کرکے درجہ شہادت
پر فائز ہوئے۔ (۱)

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۱۹۸

(۸۹) یزید بن مغفل جعفی

اصحاب علی بن ابی طالبؑ میں سے تھے اور آپ کے ساتھ جنگ صفین میں شریک ہوئے تھے۔ خریت بن راشد ناجی نے جب سرزمین اہواز میں خروج کیا تھا تو حضرت علیؑ نے معقل بن قیس کی سرکردگی میں اس کی سرکوبی کے لیے لشکر روانہ کیا تھا۔ اس لشکر میں یزید بن مغفل میمنۂ فوج کے سردار مقرر ہوئے تھے۔

مرزبانی نے معجم الشعراء میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ تابعین میں محسوب ہیں۔ ان کے باپ صحابہ میں سے تھے۔ انھوں نے روز عاشورا امام حسینؑ کی نصرت کی۔ جنگ کے موقع پر وہ رجز پڑھ رہے تھے:

"اگر نہ پہچانتے ہو مجھے تو پہچان لو کہ میں مغفل کا فرزند ہوں۔ میدان جنگ کا شہسوار اور مکمل اسلحہ رکھنے والا ہوں...... میرے ہاتھ میں تیز شمشیر رہتی ہے جس کو میں غبار جنگ کے اندر شہسوار دشمن کے سر پر بلند کرتا ہوں۔" بالآخر درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

(۹۰) رافع بن عبد اللہ مولیٰ مسلم الازدی

مسلم بن کثیر اعرج کے غلام تھے۔ اپنے مالک کے ساتھ کربلا آئے تھے اور روز عاشورا بعد ظہر جنگ کر کے شہید ہوئے۔

(۹۱) بشر بن عمرو بن الاحدوث الحضرمی الکندی

نسل میں حضرموت کے رہنے والے تھے لیکن کوفہ میں محلہ بنی کندہ میں قیام

کرنے سے کنڈی مکھے جانے لگے۔ جب کربلا میں صلح کی گفتگو ہو رہی تھی اُس زمانہ میں آکر انصار حسینؑ میں شامل ہوئے تھے۔

روز عاشورا انھیں خبر ملی تھی کہ ان کا فرزند عمرو رے کی سرحد میں قید ہو گیا ہے۔ اس وقت امام حسینؑ نے اُن سے کہا تھا کہ تم خاص طور پر میری بیعت سے آزاد ہو جاؤ اور اپنے بیٹے کی رہائی کا بندوبست کرو مگر اُن کے جذبۂ ایمانی نے اُن کو اس کی اجازت نہ دی چنانچہ وہ امام حسینؑ کا ساتھ چھوڑ کر نہ گئے اور اصحاب حسینؑ کے سلسلہ میں تقریباً بالکل آخر میں شہید ہوئے۔

(۸۱) سوید بن عمرو بن ابی المطاع الخثعمی

ضعیف العمر، عابد و زاہد بزرگ تھے۔ نماز گزار تھے متعدد لڑائیوں میں شریک ہو کر کارہائے نمایاں انجام دے چکے تھے۔

روز عاشور شریک جنگ تھے اور اصحاب حسینؑ میں سب سے آخر میں وہی ایک باقی رہ گئے (۱) تھے چنانچہ بشیر بن عمرو حضرمی کے بعد انھوں نے میدان میں نکل کر جنگ کی اور بالآخر وہ اس درجہ زخمی ہو کر گرے کہ عام طور پر سمجھ لیا گیا کہ ان کی روح جسم سے مفارقت کر گئی مگر حقیقتہً ان میں جان باقی تھی چنانچہ جب امام حسینؑ شہید ہو چکے تو انھیں ہوش آیا اور اُن کے کان میں آواز گئی کہ حسینؑ قتل ہو گئے ہیں۔ وہ بیتاب ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی تلوار لوگ لے جا چکے تھے۔ ایک خنجر موجود تھا۔ اُس سے اُنھوں نے اپنے نزدیک کے دشمنوں پر حملہ کیا۔ آخر دشمن ٹوٹ پڑے۔ اور سر اُن کا جسم سے جدا کر لیا۔

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۵۶

اب جبکہ اصحاب حسینؑ کا بنی ہاشم کے علاوہ سلسلہ ختم ہوچکا ہے تو بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جماعت کی نوعیت اور حیثیت پر ایک نظر پھر ڈال لی جائے۔

ان اصحاب کے ان حالات سے جو سلسلہ وار پیش ہوئے ہمیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کچھ گمنام اور غیر معروف شخصیتوں کے مالک نہیں تھے۔ بلکہ اعداد و شمار کے ذریعہ یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ان میں مندرجہ ذیل اشخاص کو اصحاب رسولؐ ہونے کا شرف حاصل تھا۔

(۱) مسلم بن عوسجہ (۲) زاہر بن عمرو اسلمی کندی (۳) شبیب بن عبداللہ مولیٰ ہمدان (۴) عبدالرحمٰن بن عبدرب انصاری خزرجی (۵) عمار بن ابی سلامہ دالانی (۶) مسلم بن کثیر صدفی (۷) حبیب بن مظاہر (۸) انس بن حارث اسدی۔

وفات رسول اللہؐ سے واقعہ کربلا تک پچاس برس کا زمانہ گزر چکا تھا۔ اس لیے ان میں سے کسی کی عمر پچپن یا ساٹھ برس سے کم نہیں قرار پاسکتی اور ان میں سے بعض کی عمر اس سے یقیناً زیادہ تھی جیسے انس بن حارث، عبد الرحمٰن بن عبدرب، حبیب بن مظاہر، مسلم بن عوسجہ ان کے علاوہ سوید بن عمرو خثعمی۔ تمام انسانی طبیعت کے تقاضوں کے لحاظ سے ان بوڑھے مجاہدین میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کسی وقتی جوش یا ولولۂ جنگ کی وجہ سے میدان داری پر تیار ہوگئے تھے۔

حسب ذیل اصحاب حضرت علیؑ تھے جو اصطلاحاً تابعین میں داخل ہیں اور تابعین کا مرتبہ اصحاب کے بعد سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔

(۱) عبداللہ بن عمیر کلبی۔ (۲) مجمع بن عبداللہ مذحجی (۳) جنادہ بن حارث سلمانی

زبان پر سکتے۔

(۱) حر بن یزید ریاحی (۲) اسلم بن عوسجہ اسدی (۳) حارث بن امرء القیس کندی (۴) عبدالرحمن بن عبداللہ بن کدن ارحبی (۵) سعید بن عبداللہ حنفی (۶) مسعود بن حجاج تیمی (۷) زہیر بن قین بجلی (۸) عابس بن ابی شبیب شاکری (۹) زیاد بن عریب ہمدانی (۱۰) سوید بن عمرو بن ابی المطاع خثعمی۔

اس کے علاوہ عبادت اور زہد و تقوے میں تو ان میں سے اکثر افراد جنکے تذکرے بالاختلاف عناوین کے تحت یہاں درج کیے جا چکے ہیں شہرۂ آفاق تھے بلکہ بعض اپنی مخصوص شجاعت کے ساتھ عبادت و ریاضت کے لیے بھی مشہور تھے جیسے عابس بن ابی شبیب اور زیاد بن عریب جن کے متعلق تاریخ میں صراحت موجود ہے کہ وہ شب زندہ دار تھے اور سعید بن عبداللہ حنفی جن کے اوصاف میں عبادت کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا ہے۔

یہ سب کے سب وہ مایۂ ناز افراد تھے جن کی زندگیاں مکمل طور پر معیاری حیثیت رکھتی تھیں اور اسلامی اخلاق و اوصاف کی زندہ تصویریں تھیں۔

امام حسینؑ کو میدان کربلا میں ایسے ہی افراد کی ضرورت تھی۔ آپ جانتے تھے کہ ایک قائد کو اپنے ساتھ والوں کی وجہ سے کتنی کشمکش کا سامنا ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے آپ عوام کے مجمع کو اپنے ساتھ رکھنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے سفر عراق اور کربلا کے قیام کے دوران میں حتی کہ روز عاشور تک برابر ہر موقع پر یہ کوشش جاری رکھی کہ جن اشخاص میں کچھ بھی خامی ہو، وہ آپ کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں۔

درحقیقت آپ ایک ایسے اہم مقصد کی تکمیل کے لیے جو آپ کے پیش نظر تھا عوام پر بھروسا کر ہی نہیں سکتے تھے۔

حسینؑ کو جس طرح کا مقابلہ منظور تھا اُس کی نوعیت سطحی نظریں کبھی بھی ہی نہ سمجھ سکتی تھیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے جتنی بھی لڑائیاں کبھی لڑی گئیں ان کا مقصد فریق مخالف کو مادی طور پر شکست دینا ہوتا تھا۔ اس مقصد کے حاصل ہونے میں خرابی مانع نہیں ہوتی اگر ایک ہزار آدمیوں سے تنہا بھی ثابت قدم رہا بشرطیکہ وہ بہادری سے دشمن پر فتح حاصل کرنے میں کامیاب ثابت ہو جائیں۔ مگر امام حسینؑ کو طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرنا نہیں تھا بلکہ طاقت کا مقابلہ کردار سے۔ باطل کا مقابلہ حق سے، تشدد کا مقابلہ ثابت قدمی سے کرنا تھا۔ آپ کو اپنے خون کے چھینٹوں سے ایک ایسی دنیا کو خواب غفلت سے جگانا مقصود تھا، جس پر بے حسی اور بے ہوشی چھائی ہوئی تھی۔ آپ کردار کے ایسے نمونے پیش کرنا چاہتے تھے جو موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ بن سکیں۔ یہ مرحلہ بڑا نازک تھا۔ یہاں ساتھ والوں کے انتخاب کا مرحلہ بڑا اہم تھا۔

امام حسینؑ کو اگر طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرنا ہوتا تو آپ نے ویسے انتظام کیے ہوتے۔ مگر چونکہ آپ کا مقصد یہ نہ تھا بلکہ آپ یہ چاہتے تھے کہ بے ہوش اسلامی دنیا میں احساس و بیداری پیدا کریں۔ اس کے لیے آپ کے ساتھ ملک عرب کے چیدہ اور منتخب عابد زاہد متقی اور پارسا افراد ہی ہو سکتے تھے۔ آپ نے اپنے ساتھ ایسے ضعیف لیے جن کی عمروں کا بیشتر حصہ محراب عبادت میں گزر چکا تھا۔ کیونکہ ایسے ہی افراد کے کمریں کس کر تلواریں سونت کر میدان میں آنے سے مسلمانوں کی آنکھیں کھل سکتی تھیں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو سکتے تھے کہ اسلام پر کیا وقت آ پڑا ہے کہ ایسے ایسے عابد و زاہد بھی تلواریں کھینچ کر میدان جنگ میں آ گئے ہیں۔

حسینؑ کے ساتھیوں کی شخصیت کا صرف وہ پہلو مسلمانوں کے لیے ہی نہ تھا جو

غیر جانبدار یا خالی الذہن تھے بلکہ خود افواج مخالف پر جو مواد ہوس کے پنجوں میں اسیر اور حکومت کی کورانہ اطاعت کے شکنجہ میں گرفتار تھیں زبردست اثر پڑ رہا تھا جس کے مختلف شواہد و واقعات کی صورت میں نظروں کے سامنے آرہے تھے۔ مثلاً مسلم بن عوسجہ کی شہادت پر جب لشکر مخالف میں خوشیاں ہونے لگی تھیں تو شبث بن ربعی بول اٹھا کہ "کیا غضب کی بات ہے کہ مسلم بن عوسجہ کا سا شخص قتل ہو اور تم لوگ خوشیاں مناؤ۔ میں نے بچشم خود خدمت اسلام میں اس شخص کے کارناموں کا مشاہدہ کیا ہے۔" یا جب بریر ہمدانی جنگ کر رہے تھے اور لشکر یزید کی جانب سے ان پر حملہ کرنے کے لیے ایک شخص بڑھا تھا تو اس پر فوج کے دوسرے لوگوں نے منع کیا تھا کہ "ارے یہ تو بریر حافظ قرآن ہیں جو مسجد میں حفظ قرآن کرایا کرتے تھے۔" یا جب عابس بن ابی شبیب میدان میں آئے تھے تو صفوف مخالف سے یہ آواز بلند ہوئی تھی کہ "یہ شیروں کا شیر ہے، یہ عابس بن ابی شبیب ہے۔"

:

ظاہر ہے کہ اس قسم کے روایات دوسروں تک صرف مخالفین ہی کی زبانی پہونچ سکتے تھے اور اس لیے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نسبتاً اس قسم کے بہت کم واقعات ہم تک پہونچ سکے ہیں اور اس طرح ان سے اس عام اضطراب اور انتشار کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے جو حسینی مجاہدوں کے مقابلہ میں افواج یزید میں پایا جاتا تھا۔

ان اصحاب کی شرکت واقعہ کربلا کی نوعیت کو برقرار رکھنے کے لیے نہایت ضروری تھی۔ اگر امام حسینؑ صرف اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ کربلا کی سرزمین پر آگئے ہوتے تو یہ کہا اور سمجھا جاتا کہ یہ ایک خاندانی جنگ تھی جیسا کہ عام طور سے بتلایا جاتا ہے کہ امیہ اور بنی ہاشم ایک

بھی خاندان کی دو شاخیں تھیں اور ان میں برابر خانہ جنگی رہا کرتی تھی مگر امام حسینؑ کے ساتھ تقریباً ملک عرب کے ہر قبیلہ اور مختلف مقامات کے ممتاز اور سربرآوردہ افراد موجود تھے جن میں نقطۂ مشترک صرف اصول کا احساس اور ایک وجہ خاص یعنی فریضۂ دینی کا اتحاد ہی ہو سکتا تھا۔ اور بس۔

چنانچہ اس اصول نے مقصد کی اہمیت کو زیادہ نمایاں کر دیا امام حسینؑ کے اس طریقۂ کار نے کہ آپ نے ہر شخص سے یہ اصرار کیا کہ تم میرا ساتھ چھوڑ دو اور مجھے اس مہم کو تنہا سر کرنے دو۔ یہ صورت اس لیے اختیار کی گئی کہ عام طور پر عوام تمام خطرات سے آگاہ نہیں ہوتے تو بھی رائے عامہ ہموار ہو سکے وہ کیا ہو کی۔ اب اگر امام حسینؑ واقعات کی حقیقی نوعیت سے ہر ہر متنفس کو پورے طور پر آگاہ نہ کرتے تو یہ صرف آپ ہی کا اقدام سمجھا جاتا کیونکہ دوسرے لوگوں نے صرف آپ کے اثر اور دباؤ سے اس معاملہ میں آپ کا ساتھ دیا ہوتا۔ مگر امام حسینؑ یہ چاہتے تھے کہ ہر دماغ پر وزن ڈال کر اسے خود اس کے فعل کا محرک اور ذمہ دار بنا دیں۔ ایسا نہیں تھا کہ حسینؑ اپنے مقصد کے لیے ان سب کو نذر کر رہے ہوں۔ بلکہ حقیقۃً ان میں سے ہر ایک نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر حسینی مقصد پر خود نثار کیا۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک کا محرک انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے ہر طرح خود اس کا ضمیر تھا اور درحقیقت یہی ان سب کے ثبات قدم اور استقلال کا راز تھا۔

اٹھائیسواں باب

اقربائے امام یعنی بنی ہاشم کی قربانیاں

اصحاب کی شہادت کے بعد اب حسینؑ کے اعزا یعنی بنی ہاشم کی باری تھی حقیقت میں اصحاب کی وفاداری کا یہ ایک حیرت انگیز کارنامہ تھا کہ جب تک ان میں کا ایک بھی باقی رہا انھوں نے بنی ہاشم میں سے کسی ایک فرد کو بھی کوئی گزند نہیں پہونچنے دیا۔ حالانکہ اس درمیان میں جنگ مغلوبہ بھی ہوئی، تیروں کی بارش بھی ہوئی مگر اس سب میں کوئی ایک زخم تک بھی کسی ایک ہاشمی جوان یا بچہ کو لگنے کا تاریخ میں پتہ نہیں ہے۔

ان سب کی شہادت کے بعد امام حسینؑ کے بیٹے بھائی، بھتیجے اور بھانجے ایک ایک کرکے جام شہادت نوش کرنے لگے۔ چنانچہ ان کے حالات بھی ترتیب شہادت کے مطابق درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) علی اکبرؑ

آپ امام حسین کے فرزند تھے اور سلسلۂ بنی ہاشم کے شہداء میں یہ سب سے پہلے آپ کی ذات تھی (۱) آپ کی والدہ لیلیٰ بنت ابی مرہ بن عروہ بن مسعود بن معتب الثقفی

---

(۱) طبری جز ۶ صفحہ ۲۵۶ و اخبار الطوال صفحہ ۲۵۴

تھیں اور ان کی ماں میمونہ بنت ابی سفیان بن حرب۔

اس طرح علی اکبر باپ کی طرف سے بنی ہاشم میں داخل اور ماں کی طرف سے قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھتے تھے۔ نیز آپ کی والدہ امیر شام معاویہ بن سفیان کی بھانجی اور یزید کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ اس لحاظ سے آپ کو موافق اور مخالف سب ہی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور آپ کی عظمت کا احساس رکھتے تھے یہاں تک کہ دربار شام میں آپ کا تذکرہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ معاویہ نے اپنے حاضرین دربار سے پوچھا تھا کہ تمہارے نزدیک منصب خلافت کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ درباریوں نے خوشامد میں کہہ دیا تھا کہ "آپ" مگر خود معاویہ نے کہا "نہیں! سب سے زیادہ مستحق خلافت حسینؑ کے فرزند علی ہیں جن کے دادا رسول اللہؐ تھے۔ ان میں بنی ہاشم کی شجاعت، بنی امیہ کی سخاوت اور قبیلہ ثقیف کی خود داری کی صفتیں یکجائی حیثیت سے موجود ہیں۔"

اس دور کے اموی شعراء آپ کی تعریف و توصیف میں اشعار بھی نظم کیا کرتے تھے چنانچہ ابو عبیدہ اور خلف احمر نے جو دو بڑے ادیب ہیں، ان اشعار کو نقل کیا ہے جو علی اکبر کی شان میں اس زمانہ میں کہے گئے تھے ان کا مضمون یہ ہے:

"کوئی بھی زمین پر ان کے مثل آنکھوں سے دکھائی نہیں دیا۔ ان کے ضیافت خانہ میں مہمانوں کے لیے گوشت برابر پکتا رہتا ہے اور جب پک جاتا ہے تو مہمانوں سے عزیز نہیں کیا جاتا۔ جب ان کے مہمان خانہ کی آگ روشن ہوتی ہے تو ان کی عزت اور بزرگی اس آگ میں حرارت پیدا کرتی ہے۔ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس آگ کو مصیبت زدہ اور غریب آگ دیکھیں یا کسی ایسے شخص کی نظر پڑ جائے جو بیکس اور بے بس ہو اور اسے دیکھ کر مہمان خانہ میں چلا آئے۔ آپ کبھی دنیا کو

دین پر ترجیح نہیں دیتے اور نہ حق کو باطل کے عوض فروخت کرتے ہیں۔ یہ ارادے
سنگ لیلیٰ کے فرزند کی طرف ہے جو صاحب عطا و جود ہیں۔ وہ جو بڑے
حسب و نسب والی خاتون کے فرزند ہیں۔"

ممکن ہے کہ اموی سیاست کی بڑی امیدیں آپ کی ذات سے وابستہ ہوں
اس کے منصوبے ہوں کہ آپ کی ننہالی خصوصیت پر زور دیتے ہوئے آپ کے
و صفات و کمالات کو سراہ کر فطری حیثیت سے آپ کے دل میں یہ احساس
جاگزیں کیا جائے کہ آپ بنی ہاشم میں ایک علیحدہ شان اور حیثیت کے مالک ہیں
اور اس طرح خاندان بنی ہاشم میں پھوٹ پڑنے کے امکانات پیدا ہو جائیں۔

اگر علی اکبر کی جگہ کوئی کمزور نفس کا انسان ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ سیاست
ان چالوں کا شکار ہو جاتا مگر آپ کا بلند اور پاکیزہ نفس اس فریب میں آنے والا
نہ تھا۔ آپ نے کبھی ان باتوں کی طرف اعتنا بھی نہ کی اور اموی فریب کاریوں کی شکست
آپ نے میدان کربلا میں فرزند فاطمہ زہرا کی حمایت میں اپنا خون بہا کر کبھی
مٹنے والی مہر ثبت کر دی اور آپ کی والدہ گرامی لیلیٰ نے محبت آل رسول کی ان
ام پر روح فرسا مصائب و آلام کو جو واقعہ کربلا کے دوران اور اس کے بعد
اہل بیت نبوت کو متواتر پیش آتے رہے ۔۔۔ انتہائی صبر و استقلال کے ساتھ
برداشت کر کے ان کے ساتھ اپنی روحانی یگانگی اور اتحاد کا انمٹ ثبوت فراہم
کیا کہ ان سے متعلق اس حقیقت کا بیان کرنا کہ انہیں خاندان بنی امیہ سے
... کا تعلق تھا طبیعت پر بار گزرتا ہے۔

شکل، سیرت و صورت دونوں میں رسول اللہ کا نمونہ تھے اور بہت نمایاں
شباہت رکھتے تھے اس لیے امام حسینؑ کو اپنے فرزند کے ساتھ بڑی محبت تھی۔
بلا پہنچنے سے قبل قصر بنی مقاتل میں امام حسینؑ نے خواب میں ایک سوار کو دیکھا تھا

جو یہ کہہ رہا تھا کہ یہ لوگ جا رہے ہیں اور موت ان کی طرف بڑھ رہی ہے چنانچہ اسے سن کر علی اکبر نے آپ سے سوال کیا تھا کہ بابا! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ امام نے جواب دیا تھا کہ بیشک ہم حق پر ہیں۔ اس پر علی اکبر نے خوش ہو کر کہا تھا کہ پھر ہمیں موت کی کیا پرواہ ہے (۱) اس ایک واقعہ سے علی اکبر کے استقلال اور حق کی راہ میں فداکاری کا اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے۔

شیخ مفیدؒ کی تصریح کے مطابق علی اکبر کی عمر واقعہ کربلا میں انیس برس کی تھی اور حسن و جمال میں اپنی آپ مثال تھے (۲) وہ اکبر اس لحاظ سے کہے گئے کہ واقعہ کربلا میں شہید ہونے والے علی اصغر کے لحاظ سے بڑے تھے مگر اپنے باپ کی اولاد میں وہ امام زین العابدینؑ سے سن میں چھوٹے تھے۔ اس لیے آپکے اعتبار سے ان کو علی اصغر کہنا درست ہے۔ (۳)

حضرت امام حسینؑ نے کربلا میں اپنا ایک خاص گھوڑا جس کا نام لاحق تھا علی اکبر کی سواری کے لیے دیا تھا (۴)

آپ روز عاشور ہی سے بے چین ہو نگے کہ میدان جہاد میں جا کر ہاشمی شجاعت کے جوہر دکھائیں مگر حسینی تدبیر نے جو نظام عمل قائم کر رکھا تھا اس میں دراندازی کا کسی کو حق نہ تھا۔ جب سب اصحاب شہید ہو چکے تو سب سے پہلے علی اکبر نے اذن جہاد طلب کیا (۵) امام نے اپنے فرزند کو نرغۂ اعدا میں بھیجنے کے متعلق پس و پیش تو نہیں کیا مگر دل کی بے چینی نے جذبات میں تلاطم ضرور پیدا کر دیا۔ آپ نے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کرتے ہوئے بارگاہ الٰہی میں عرض

---

(۱) ارشاد ص ۲۲۷ (۲) ارشاد ص ۲۵۳ (۳) ارشاد ص ۲۶۵ (۴) طبری جز ۶ ص ۲۲۲ (۵) ارشاد ص ۲۵۳۔

گویا خداوند گواہ رہنا ان لوگوں کے ظلم پر کہ اب جا رہا ہے ان کی طرف وہ نوجوان جو صورت و سیرت اور گفتار میں تیرے پیغمبر کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔

جب ہم تیرے پیغمبر کی زیارت کے مشتاق ہوتے تو اس کا چہرہ دیکھ لیتے تھے۔ کوئی شک نہیں کہ اس مختصر مناجات کے الفاظ اس بے پایاں اندوہ کی پوری تشریح کر رہے ہیں جو اس وقت امام کے دل پر غالب تھا مگر اس کے ساتھ وہ اس عزتِ نفس اور بلندیِ نگاہ کے بھی حامل ہیں جو حسینؑ کی ذات سے مخصوص تھی۔ ان کو زیادہ قلق ہے تو اس بات کا کہ اس وقت میرے جد بزرگوار رسول اللہؐ کی تصویر مجھ سے جدا ہو رہی ہے۔

یہی وہ امتیازی شان ہے جس سے حسینؑ حقیقۃً حسینؑ معلوم ہوتے ہیں۔ "جا رہا ہے" کے الفاظ میں اذنِ جہاد لازمی طور پر مضمر ہے۔ چنانچہ اسی مناجات کے عنوان ہی سے علی اکبر سمجھ گئے کہ مجھے میدان جنگ میں جانے کی اجازت حاصل ہے۔ اب میدان میں آگئے اور یہ رجز پڑھنے لگے۔

"میں ہوں علی، حسینؑ کا بیٹا اور علیؑ کا پوتا۔ رب کعبہ کی قسم سب سے زیادہ ہم کو رسول اللہ کی وراثت کا حق پہونچتا ہے۔

"خدا کی قسم ہمارے بارے میں فیصلہ زنازادہ کی اولاد ہرگز نہیں کر سکتی[1]"

یہ رجز شہدائے کربلا میں سب سے الگ ایک خاص انداز کا حامل تھا دوسرے شہداء کے رجز میں زیادہ تر شجاعانِ عرب کے معمول کے مطابق اپنی شجاعت کا اظہار مقصود ہوتا یا امام سے اپنے عہدِ وفا کی تجدید لیکن علی اکبر کا رجز ایک تبلیغی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۶ ارشاد ص ۲۵۲

حیثیت دکھاتا تھا۔ اس کے مختصر الفاظ میں رسول اللہ کے ساتھ اپنی قرابت داری اور استحقاق وراثت اور اپنے مد مقابل کی پستی کو دکھاتے ہوئے اس کی اطاعت سے انکار پر زور دیا گیا تھا۔ گویا امام حسینؑ کے مقاصد جنگ کا اعلان کیا جا رہا تھا۔

جناب علی اکبرؑ کئی حملے کیے (۱) اور برابر یہی اشعار پڑھ رہے تھے۔ اس شدید جنگ میں آپ خود بھی بہت زخمی ہو گئے تھے مگر پھر بھی پے در پے حملے کیے جاتے تھے۔ فوج مخالف میں کے ایک سپاہی مرہ بن منقذ بن نعمان عبدی نے اپنے ساتھیوں سے کہا "اگر اب کی مرتبہ اس جوان نے پھر حملہ کیا اور میری طرف سے گزرا تو میں ضرور اس کے باپ کو اس کے غم میں مبتلا کر دوں گا" ایسا ہی ہوا۔ علی اکبر تلوار ہاتھ میں لیے دشمنوں پر حملہ آور ہوئے تھے کہ مرہ نے پشت کی طرف سے نیزہ مارا جو سینہ کے پار ہو گیا۔

علی اکبر گھوڑے سے زمین پر گرے اور دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر کر آپ کے جسم کو تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

فطری حیثیت سے علی اکبرؑ کی شہادت کا حسینؑ پر بڑا اثر ہوا۔ آپ نے فرمایا "خدا قتل کرے اس جماعت کو جس نے تجھے قتل کیا۔ اے میرے فرزند کتنی جرات بڑھ گئی ہے ان لوگوں کی خدا اور اس کے رسول کے مقابلہ میں! تیرے بعد دنیا کی زندگی پر خاک ہے" (۲)۔

آپ نے جوانان بنی ہاشم کی طرف متوجہ ہو کے فرمایا کہ "اٹھاؤ! اپنے بھائی کی لاش کو" اب نوجوان آگے بڑھے اور انھوں نے علی اکبر کی لاش کو لا کر اس خیمہ میں رکھ دیا جس کے بعد یا خیمہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

---

(۱) الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۴ - طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۶ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۶ - ارشاد صفحہ ۲۵۸ وسمو طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۶

(۲) عبداللہ بن مسلم بن عقیل

آپ کی والدہ رقیہ بنت علی بن ابی طالبؑ تھیں جو ام حبیب بنت عباد بن ربیعہ بن یحییٰ بن علقمہ تغلبیہ کے بطن سے تھیں جنھیں حضرت علیؑ نے جنگ یمامہ یا عین التمر کے اسیروں میں سے خرید فرمایا تھا اس اعتبار سے عبداللہ امام حسینؑ کے چچازاد بھائی کے فرزند بھی تھے اور بھانجے بھی۔

مسلم بن عقیل کی عالم غربت میں شہادت بھی ایک تازہ سانحہ کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کا اثر امام حسینؑ کے دل پر بہت زیادہ تھا چنانچہ، اسی لیے شب عاشور آپؑ نے اپنے اصحاب کو مجتمع کرکے جو تقریر فرمائی تھی اُس کے آخر میں اولاد عقیل سے خاص طور پر یہ خطاب فرمایا تھا کہ "تمھارے لیے مسلم کی شہادت کافی ہے۔ تم چلے جاؤ۔ میں تم کو اجازت دیتا ہوں" مگران سب نے متفق ہوکر کہا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہم سب بھی آپ پر اپنی جانیں نثار کرینگے۔" (۱)

ان میں سب سے پہلے شہید عبداللہ تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ بہت کمسن تھے علی اکبرؑ کی شہادت سے خیمۂ حسینی میں جو کہرام برپا ہوا تو کمسن بچے گھبرا کر باہر نکل پڑے۔ بے رحم دشمنوں کو موقع مل گیا۔ عمرو بن صبیح صدائی نے عبداللہ بن مسلم بن عقیل کو تیر لگایا (۲) جو آپ کی پیشانی کی طرف آیا آپ نے گھبراہٹ میں ہاتھ اپنا پیشانی پر رکھا۔ تیر نے ہاتھ کو پیشانی کے ساتھ چھید دیا۔ پھر دوسرا تیر آیا جو سینہ پر پڑا اور اُس نے کام تمام کردیا (۳) دوسری روایت یہ ہے کہ ایک ظالم نے نیزہ کا وار کیا اور سینہ پر مارا۔ اس سے آپ نے شہادت پائی (۴)

(۱) ارشاد صـ ۲۴۴ (۲) الاخبار الطوال صـ ۲۵۴ (۳) طبری ج ۶ صـ ۲۵۶
(۴) ارشاد صـ ۲۵۳

(۳) محمد بن مسلم بن عقیل

عبداللہ کے مختلف البطن بھائی تھے۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ آپکی والدہ امّ ولد تھیں، عبداللہ کی شہادت کے بعد اولاد ابی طالب نے ایک ساتھ حملہ کر دیا۔ امام حسینؑ نے آواز دی "ہاں میرے چچا کے فرزند موت کے مرحلہ کو سر کر دو" ان میں سے محمد بن مسلم ابو مرہم ازدی اور لقیط بن ایاس جہنی کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔

(۴) جعفر بن عقیل

عبداللہ بن مُسلم کی شہادت کے بعد جعفر بن عقیل نے جنگ کی، آپ یہ رجز پڑھ رہے تھے:۔ "میں مکہ کا رہنے والا ہوں! طالب کے خاندان کا ہاشم کی نسل اور غالب کے گھرانے سے۔ یقیناً ہم تمام قبائل کے سردار ہیں اور حسینؑ تمام پاکیزہ اشخاص میں سب سے زیادہ پاکیزہ"

بالآخر آپ کو عبداللہ بن عزرہ خثعمی نے تیر مار کر شہید کیا (۱)

(۵) عبدالرحمٰن بن عقیل

آپ میدان جنگ میں آئے۔ رجز پڑھی اور جہاد کیا۔ آخر عثمان بن خالد جہنی اور بشر بن خوط ہمدانی دونوں نے مل کر آپ کو شہید کر دیا (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ عبداللہ بن عروہ خثعمی نے تیر کا نشانہ بنایا (۳)

---

(۱) طبری ۶ ص ۳۵۶ (۲) طبری ۶ ج ص ۲۵۶ (۳) الاخبار الطوال ص ۲۵۴

(۶) محمد بن ابی سعید بن عقیل

آپ نے میدان کربلا میں جہاد کیا۔ اور لقیط بن یاسر جہنی نے آپ کی پیشانی پر تیر مارا جس سے آپ شہید ہو گئے۔

(۷) محمد بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب

آپ امام حسینؑ کے چچازاد بھائی کے فرزند تھے۔ آپ کی والدہ کا نام خوصاء بنت حفصہ بن ثقیف تھا اور وہ قبیلہ بنی بکر بن وائل سے تھیں آپ اور آپ کے بھائی عون جو جناب زینب بنت علیؑ کے فرزند تھے دونوں اپنے والد بزرگوار عبداللہ بن جعفر کے بھیجے ہوئے آ کر عراق کے راستے میں قافلۂ حسینی سے ملحق ہوئے تھے اس وقت جب امام مکہ سے باہر نکل چکے تھے۔

روز عاشور عبدالرحمن بن عقیل کے بعد آپ میدان میں آئے اور جہاد کیا اور بالآخر عامر بن نہشل تیمی کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ (۱)

(۸) عون بن عبداللہ بن جعفرؑ

آپ زینب بنت علیؑ کے بطن سے تھے اور اس طرح امام حسینؑ کے حقیقی بھانجے تھے اپنے بھائی محمد کے بعد آپ میدان کارزار میں آئے اور عبداللہ بن قطبہ طائی کے ہاتھ سے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے (۲)

(۹) قاسم بن الحسن

آپ امام حسینؑ کے بڑے بھائی حضرت امام حسنؑ کے فرزند تھے۔ ابھی

---

(۱) طبری ج ۶ صـ ۲۵۶ ارشاد صـ ۲۵۳ (۲) طبری ج ۶ صـ ۲۵۶ ارشاد صـ ۲۵۳

آپ حدِّ بلوغ کو نہ پہنچے تھے کہ معرکۂ کربلا درپیش ہوا اور حسن و جمال کا یہ عالم تھا کہ جب میدانِ جنگ میں آئے تو فوجِ دشمن کے ایک سپاہی کا بیان ہے یہ معلوم ہوا کہ جیسے چاند کا ایک ٹکڑا سامنے نمودار ہو گیا۔ اُن کے جسم پر زرہ بھی نہ تھی بلکہ صرف ایک پیراہن پہنے ہوئے تھے۔ پیر میں نعلین ایسے تھے جن میں سے ایک کا تسمہ ٹوٹا ہوا تھا (۱) ـــــ صاف ظاہر ہے کہ انھیں اسلحۂ جنگ سے مسلح نہیں کیا گیا تھا۔ صرف ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے وہ نصرتِ امام کے جوش سے میدان میں آ گئے اور حملہ کر دیا۔

عمر بن سعد بن نفیل ازدی کی نظر جو قاسم پر پڑی تو اُس نے کہا کہ اس بچہ کو میں قتل کروں گا۔ بعض لوگوں نے روکا بھی مگر اُس نے نہ مانا اور قاسم کے پاس آکر سر پر تلوار لگائی۔ قاسم منہ کے بھل زمین پر گر گئے اور اپنے چچا کو مدد کے لیے پکارا۔ حسینؑ غضبناک شیر کی طرح جھپٹ کر قریب پہونچے۔ عمر بن سعد بن نفیل جس نے قاسم کو قتل کیا تھا ابھی پاس ہی موجود تھا۔ آپ نے اس پر تلوار کا وار کیا جس سے اُس کا ہاتھ کہنی سے کٹ کر گر گیا۔ لشکرِ مخالف اُس کے بچانے کے لیے حسینؑ پر ٹوٹ پڑا مگر اس طرح چاروں طرف سے بے تحاشا گھوڑے دوڑا کر وہ لوگ اُس کی کمک کو آئے کہ وہ خود اپنے ہواخواہوں کے گھوڑوں سے پامال ہو کر ہلاک ہو گیا۔

جب مجمع منتشر ہوا تو حسینؑ قاسم کے سرہانے کھڑے ہو کر حسرت و اندوہ کے ساتھ فرمانے لگے :-

"تیرے چچا پر بہت شاق ہے یہ امر کہ تو اُسے پکارے اور وہ تیری خبر نہ لے سکے یا تیری آواز پر آنے کے بعد بھی تجھے کوئی فائدہ نہ پہونچا سکے"

(۱) طبری ج ۶ صہ ۲۵۶ - ارشاد صہ ۲۵۲ - ۲۵۱

اس کے بعد آپ نے خود قاسم کی لاش اٹھائی اس طرح کہ سینہ سے سینہ ملا ہوا تھا اور پیر زمین پر خط دیتے جاتے تھے اور جہاں علی اکبر اور دوسرے عزیزوں کی لاشیں پہلے سے موجود تھیں قاسم کی لاش کو بھی وہیں لا کر لٹا دیا (۱)

(۱۰) ابوبکر بن الحسنؑ

آپ امام حسنؑ کے فرزند تھے۔ آپ کی والدہ کا نام ام اسحٰق بنت طلحۃ التیمی تھا۔ عبد اللہ ابن عقبہ غنوی نے تیر مارا جس سے آپ شہید ہو گئے۔ (۲)

(۱۱) محمد بن علی بن ابی طالب

آپ حضرت علی بن ابی طالبؑ کے فرزندوں میں محمد بن الحنفیہ سے چھوٹے تھے اس لیے محمد الاصغر کہلاتے تھے۔ آپ کی والدہ بقولے اسماء بنت عمیس خثعمیہ اور بقولے ام ولد (۳) اور تیسرے قول کے مطابق لیلیٰ بنت مسعود وارمیہ تھیں (۴)

محمد اپنے والد بزرگوار کے بعد اپنے بھائی امام حسنؑ اور پھر امام حسینؑ کے ساتھ رہے اور روز عاشور میدان جہاد میں بہت سے دشمنوں کو قتل کیا۔ آخر قبیلہ بنی ابان بن دارم کے ایک شخص نے آپ کو تیر مارا جس سے آپ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے اور وہ آپ کا سر جدا کر کے عمر سعد کے پاس لے گیا (۵)

---

(۱) طبری ج ۶ صـ ۲۵۶، ارشاد صـ ۲۵۵ (۲) الاخبار الطوال صـ ۳۵۴ - ارشاد صـ ۲۵۴

(۳) طبری ج ۶ صـ ۸۹ (۴) ارشاد صـ ۱۸۹ (۵) طبری ج ۶ صـ ۲۵۷

(۱۲) عبداللہ بن علیؑ

آپ کی والدہ ام البنین فاطمہ بنت ابوالمجل حزام ابن خالد بن ربیعۃ بن الوحید بن کعب بن عامر ابن کلاب تھیں (۱) حضرت علی بن ابی طالبؑ نے اپنے بھائی عقیلؑ سے جو انساب عرب سے خوب واقف تھے یہ فرمائش کی تھی، کہ ایسے خاندان کی لڑکی تجویز کیجئے جو بڑے بہادران عرب کی نسل سے ہو، تاکہ اُس سے جو اولاد ہو وہ بھی بڑی بہادر اور جنگ آزما ہو۔ عقیل نے کہا تھا کہ ام البنین الکلابیہ سے عقد کیجئے جس کے باپ دادا بڑے شجاع و بہادر ہیں۔ چنانچہ آپ نے ام البنین سے عقد کرلیا تھا۔

ان کے سلسلۂ اجداد میں ملاعب الاسنہ ابوبراء اور طفیل فارس قرزل اور عاد بن طفیل، ملک عرب میں بہت مشہور سورما گزر چکے تھے۔

لبید بن ربیعہ شاعر جو معلقات میں سے ایک قصیدہ کا مصنف تھا وہ بھی اسی خاندان سے تھا چنانچہ اُس نے اپنے خاندانی خصوصیات پر نعمان بن منذر بادشاہ حیرہ کے بھرے ہوئے دربار میں ان الفاظ میں فخر کیا تھا:۔

نحن بنو امّ البنین الاربعہ ونحن خیر عامر بن صعصعہ
الضاربون الھام وسط المجمعہ

اس آواز کو تمام قبائل عرب کے نمائندوں نے خاموشی کے ساتھ سنا تھا ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ام البنین اس سلسلہ میں پہلے بھی کوئی

---

(۱) طبری ج ۶ صـ ۸۹ و ۲۲۶

مشہور خاتون گزر چکی تھیں اور ان کے بھی چار بیٹے تھے جو بڑی شہرت کے مالک تھے۔"

ام البنین کے بطن سے حضرت علیؑ کے چار فرزند تھے :-

(۱) ابو الفضل العباس جو اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے (۲) عبد اللہ جن کے حالات یہاں درج کیے جا رہے ہیں (۳) عثمان : (۴) جعفر جو سب سے چھوٹے تھے۔

عبد اللہ بن ابی المحل بن خیام بن حالد بن ربیعۃ بن عامر الوحید ام البنین کا بھتیجا تھا اور کوفہ کے بڑے عمائد میں شمار ہوتا تھا۔ اتفاق سے اُس وقت جب شمر عبید اللہ بن زیاد کا خط لے کر کربلا کی جانب روانہ ہو رہا تھا، وہ بھی دربار ابن زیاد میں موجود تھا۔ اس نے ابن زیاد سے کہا کہ ہمارے خاندان کی ایک لڑکی کے فرزند امام حسینؑ کے ساتھ ہیں۔ آپ اُن کے لیے امان نامہ لکھدیجئے۔ یہ استدعا ابن زیاد نے منظور کر لی اور عباس اور آپ کے بھائیوں کے لیے امان نامہ لکھ دیا جسے عبد اللہ بن ابی المحل نے اپنے ایک غلام کزمان نامی کے ہاتھ کربلا روانہ کر دیا۔ وہ اُس کو لے کر ان مجاہدین کے پاس پہونچا اور کہا کہ آپ کے ماموں زاد بھائی نے ابن زیاد سے حاصل کر کے بھیجا ہے۔ ان چاروں نے یکزبان ہو کر کہا کہ ہمارے بھائی کو ہماری طرف سے سلام کہدینا اور کہنا کہ ہم کو ابن زیاد کے امان نامہ کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا کی امان ہمارے لیے بہت کافی ہے۔(۱) خود شمر بن ذی الجوشن بھی اسی خاندان یعنی آل وحید کلابی نسل عامر بن صعصعہ سے تھا۔ چنانچہ کربلا پہنچ کر ابن زیاد کا خط عمر سعد تک پہنچانے کے بعد سب سے پہلا کام جو اُس نے کیا وہ یہی تھا کہ جماعت حسینی کے سامنے کھڑے ہو کر آواز دی کہ "کہاں ہیں ہماری بہن

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۳۶ (۲) الاخبار الطوال ص ۲۵۴

کے بیٹے"، یہ سن کر عباسؑ اور آپ کے تینوں بھائیوں نے سامنے آکر پوچھا کہ ہم سے کیا کہنا چاہتے ہو؟ اُس نے کہا "تم لوگ امان میں ہو"۔ مجاہدوں نے تیور بدل کر جواب دیا کہ "خدا لعنت کرے تجھ پر اور تیرے امان پر ہمارے لیے امان ہے اور فرزند رسول کے لیے امان نہیں ہے!" (۱)

چونکہ روز عاشور انصار واقربائے حسینؑ میں سے ہر فرد یہ چاہتی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے سے وابستگی رکھنے والی ہر عزیز ہستی کو خود اپنی زندگی میں راہ حق میں نثار کیا جائے اسی بنا پر جناب عباسؑ نے بھی ایک ایک کر کے اپنے بھائیوں کو اپنے پہلے میدان میں بھیجا اور فرمایا کہ "بڑھو اپنے آقا پر نثار ہو (۲) تاکہ تم کو قتل ہوتے ہوئے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں اور اس کو اپنے لیے توشۂ آخرت سمجھوں کیونکہ تمہارے تو کوئی اولاد ہے نہیں"، (۳) مطلب یہ تھا کہ اگر تمہارے اولاد ہوتی اور قابل جنگ ہوتی تو تم اُس کا انتظار کرتے کہ پہلے اُس کو اپنے سامنے قتل ہونے بھیج لیں تو خود جائیں۔ چنانچہ عبداللہ جو آپ کے بعد ان بھائیوں میں سب سے بڑے تھے میدان میں گئے اور شدید جنگ کے بعد ہانی بن ثبیت حضرمی کی تلوار سے شہید ہوئے (۴)

(۱۳) عثمان بن علیؑ

آپ ابوالفضل العباس کے دوسرے بھائی تھے، جب آپ کی ولادت ہوئی تو علیؑ ابن ابی طالبؑ نے آپ کا نام عثمان رکھتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں اپنے دوست عثمان بن مظعون کے نام پر اس مولود کا نام رکھ رہا ہوں۔ یہ عثمان

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۶۔ ارشاد صفحہ ۲۴۲ (۲) الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۵ (۳) ارشاد صفحہ ۲۵۵

(۴) طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۷۔ ارشاد صفحہ ۲۵۵۔ دینوری نے ہانی بن ثویب حضرمی لکھا ہے (الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۵

بن مظعون بڑے جلیل القدر صحابی تھے۔ رسول اللہؐ کے سامنے اُن کا انتقال ہوا تھا اور آپ نے اُن کو جنۃ البقیع میں دفن کیا تھا۔

جناب عباسؑ نے عبداللہ کے بعد عثمان کو میدان جنگ میں بھیجا چنانچہ آپ نے جہاد کیا اور بالآخر آپ خولی بن یزید اصبحی کے تیر سے زمین پر گرے اور بنی ابان بن دارم کے ایک شخص نے آپ کا سر جسم سے جدا کیا (۱)

(۱۴) جعفر بن علیؑ

آپ ام البنین کی اولاد میں سے سب سے چھوٹے تھے۔ عثمان کی شہادت کے بعد جناب عباس آپ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا "جاؤ! جیسے تمہارے دونوں بھائیوں کا صدمہ میں نے برداشت کیا ویسے تمہارا بھی برداشت کروں۔ کیونکہ تم میں سے کسی کے بھی اولاد نہیں ہے۔"

چنانچہ جعفر نے بھی جہاد کیا اور بالآخر ہانی بن ثبیت حضرمی کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ (۲)

ایک روایت کے مطابق عبداللہؑ کے بعد جعفر اور جعفر کے بعد عثمانؑ شہید ہوئے ہیں۔ (۳)

(۱۵) ابوالفضل العباس بن علیؑ

آپ کی ماں ام البنین کے خاندانی خصوصیات کا تذکرہ اس کے پہلے آپ کے بھائی عبداللہ کے حالات میں ہو چکا ہے۔

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۷۔ ارشاد صفحہ ۲۵۵ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۷۔ ارشاد صفحہ ۲۵۵

(۳) الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۵۔

سنہ ۲۶ھ میں آپ کی ولادت ہوئی تھی۔ چودہ(۱۴) برس آپ نے اپنے والد بزرگوار کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ سنہ ۴۰ھ میں حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد سے دس برس آپ اپنے بھائی امام حسنؑ کے زیر تربیت رہے اور سنہ ۵۰ھ میں امام حسنؑ کے زہر دغا سے شہید ہونے کے بعد سے عاشورِ محرم سنہ ۶۱ھ تک کا زمانہ آپ نے اپنے بھائی امام حسینؑ کی رفاقت میں بسر کیا۔ واقعۂ کربلا میں آپ کی عمر ۳۴ برس کی تھی۔

آپ حسن و جمال اور قوت و شجاعت میں اپنے زمانہ میں بہت ممتاز درجہ رکھتے تھے اور عام طور پر قمر بنی ہاشمؑ کے لقب سے مشہور تھے۔ آپ ایسے قدآور بھی تھے کہ اسپ دو رکابہ پر سوار ہونے کے باوجود آپ کے پاؤں زمین پر خط دیتے جاتے تھے۔

یہ تو آپ کی ظاہری شان تھی اور باطنی اوصاف کے متعلق امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے۔ کہ "ہمارے چچا عباس بن علیؑ بڑے دیندار اور کامل الایمان تھے۔ آپ نے حسینؑ بن علیؑ کا ساتھ دیتے ہوئے معرکۂ کربلا میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور آخر درجۂ شہادت پر فائز ہوئے"۔

نہر پر فوج مخالف کے قبضہ کے بعد جب اطفال حسینؑ پر پیاس کا غلبہ ہوا تو ابوالفضل العباس نہر سے پانی لانے پر مامور ہوئے۔ امام حسینؑ نے تیس(۳۰) سوار اور بیس(۲۰) پیادے بیس مشکوں کے ساتھ آپ کے ہمراہ کر دیے تھے چنانچہ جب نہر کے قریب پہنچے تو عمرو بن الحجاج جو نہر کا محافظ تھا مع اپنی سپاہ کے سدّ راہ ہوا۔ عباسؑ نے سواروں کی جماعت کے ساتھ اُس کا مقابلہ کیا اور پیادوں سے فرمایا کہ تم تیزی سے اپنی مشکیں پانی سے بھر لو۔ مختصر یہ کہ عباسؑ کی قیادت میں مشکیں پانی سے بھر کر خیام حسینی میں پہنچا دی گئیں(۱)

---

(۱) الاخبار الطوال ص ۲۵۳

اسی واقعہ کی بنا پر آپ کو "سقاء" کا لقب حاصل ہوا۔

ابن زیاد کی تحریری امان کا ٹھکرا دینا آپ کی وفا شعاری کا ایک بڑا کارنامہ تھا۔ اس واقعہ میں اگرچہ تمام بھائی مشترک حیثیت رکھتے تھے مگر بہر حال آپ کے چھوٹے بھائی سب آپ کے مطیع تھے۔ اس لیے یہ سمجھنا بالکل درست ہے کہ دیگر بھائیوں کی وفاداری میں جناب عباسؑ کی انتہائی پختگی اور جاں نثاری بہت بڑی حد تک اثر انداز تھی۔

جب محرم کی نویں تاریخ سہ پہر کے وقت عمر سعد نے اپنی فوج کے ساتھ انصار حسینؑ پر دفعۃً حملہ کر دیا تھا تو عباسؑ کو امام نے اس اچانک حملہ کا سبب دریافت کرنے پر مامور فرمایا (۱)

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ عباسؑ کی سنجیدگی، معاملہ فہمی، وفاداری اور شجاعت پر امام حسینؑ کو کتنا اعتماد تھا۔

چنانچہ عباسؑ نے انتہائی صبر و سکون کے ساتھ اس نازک مرحلہ کو سر کیا اور ایک شب کے لیے جنگ ملتوی کرا لی۔

شب عاشور جب امام نے اپنے تمام اصحاب کو جمع کر کے فرمایا تھا کہ میں اپنی بیعت سے تم سب کو آزاد کرتا ہوں، جس کا جدھر دل چاہے چلا جائے بلکہ تم میں کا ایک ایک میرے ایک ایک عزیز کو بھی اپنے ساتھ لیتا جائے تو عباسؑ بیتاب ہو گئے تھے اور سب سے پہلے آپ نے اس طرح اظہار خیال فرمایا تھا کہ "ہم ایسا کس لیے کریں؟ کیا اس لیے کہ آپ کے بعد زندہ رہیں؟ ہرگز نہیں خدا وہ روز ہم کو نہ دکھائے" آپ کے بعد دوسرے اعزّا نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا (۲)

---

(۱) ارشاد ص۲۴۳ (۲) ارشاد ص۲۴۳

صبح عاشور جب حسینؑ نے اپنی اس مختصر سی جماعت کو بھی لشکر کے عنوان سے ترتیب دیا تو علمداری کا شرف ابوالفضل العباس کو عطا ہوا اور آپ نے اس آن بان کے ساتھ حسینی پرچم کی عزت کو قائم رکھا جو دنیا کی تاریخ میں یادگار رہے۔

میدان جنگ میں عباس و علی اکبر سایہ کی طرح امام حسینؑ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے چنانچہ اُس وقت جب آپ نے اتمام حجت کی غرض سے ناقہ پر سوار ہو کر صفوف مخالف کو مخاطب کرتے ہوئے تقریر فرمائی اور آپ کی آواز خیام اہل حرم تک پہنچی اور ان میں سے شور رونے کا بلند ہوا تھا تو آپ نے عباس و علی اکبر کو بھیجا کہ انھیں خاموش کر دو رونے کا وقت بعد کو آئے گا۔

عباسؑ بن علیؑ کی شجاعت کا ایک بے نظیر مرقع وہ تھا جب عمر بن خالد صیداوی وغیرہ چار مجاہد ایک ساتھ صفوف مخالف پر حملہ آور ہوئے تھے اور لشکر میں گھس کر شمشیر زنی کرتے ہوئے چاروں طرف سے گھر کر انصار حسینؑ سے بالکل جدا ہو گئے تھے۔ یہ دیکھکر حسینؑ نے عباس کو اُن کی امداد کے لیے بھیجا تھا چنانچہ آپ نے تن تنہا حملہ کر کے ایسی تلوار چلائی کہ لشکر مخالف پراگندہ ہو گیا اور آپ ان زخمی مجاہدوں کو اپنے مستقر کی طرف واپس لے چلے تھے۔

حضرت ابوالفضل کی شہادت اصحاب و اعزا میں سے سب کے آخر میں ہوی ہے۔ دینوری کا بیان ہے کہ جناب عباسؑ حضرت امام حسینؑ کے سامنے کھڑے ہو کر تن تنہا آپ کی حفاظت میں مصروف ہو گئے اس طرح کہ جس طرف حضرت مڑتے تھے عباسؑ بھی رخ موڑ دیتے تھے یہاں تک

کہ آپ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے اور اس کے بعد امام بالکل اکیلے رہ گئے (۱)

دوسری روایت یہ ہے کہ جب عباسؑ اپنے تینوں بھائیوں کو امام پر نثار کر چکے اور سوائے عباسؑ اور حسینؑ کے کوئی ایسا باقی نہیں رہ گیا جو نصرت حق میں جہاد کرے تو ابو الفضل العباسؑ نے حسینؑ سے اذن جہاد طلب کیا۔

امام حسینؑ نے اپنے بھائی کے سراپا پر حسرت و یاس سے نظر کی اور فرمایا "تم تو میرے علمدار ہو!"، آپ نے عرض کیا "اب مجھ کو بالکل تاب ضبط باقی نہیں اور زندگی میرے لیے بار گراں ہو رہی ہے"۔ امام نے فرمایا "اچھا جاتے ہو تو پانی کی فکر کرنا"، عباسؑ نے مشکیزہ لے لیا اور نہر کی طرف روانہ ہوئے فوج دشمن نے مزاحمت کی۔ آپ نے حملہ کیا صرف اس لیے کہ نہر کا راستہ صاف ہو جائے۔

چنانچہ آپ اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے۔ نہر پر پہنچ کر مشکیزہ پانی سے بھر لیا۔ اور چونکہ خود بھی آپ بہت پیاسے تھے اس لئے فطری طور پر ایک چلو پانی کا لے کر منہ کے قریب لے گئے تھے اس طرح کہ جیسے پینا چاہتے ہیں مگر حسینؑ اور اطفال حسینؑ کی پیاس یاد آ گئی اور آپ نے پانی چلو سے پھینک دیا اور اسی طرح بھرا ہوا مشکیزہ دوش پر سنبھال کر نہر سے نکلے اور خیمہ گاہ حسینی کی جانب روانہ ہو گئے۔ افواج مخالف کو ایک فرد واحد کے مقابلہ سے گریز کرنے پر غیرت دلائی جا چکی تھی اور ان کو اب یہ کد بھی کہ پانی کسی طرح حسینؑ تک پہنچنے نہ پائے چنانچہ آپ چاروں طرف سے گھیر لیے گئے۔ اس وقت کے آپ کے مشکلات کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ دوش پر مشک واضح طور پر جنگ سے مانع تھی اور پھر ایک ہاتھ سے آپ کو حسینی نشان کا بلند رکھنا

(۱) الاخبار الطوال۔ ص ۲۵۵

بھی مقصود تھا مگر کیا کہنا آپ کی عدیم المثال جرأت و شجاعت کا کہ آپ نے اسی عالم میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ حملے کرنا شروع کر دیے۔ اور اُس وقت آپ کی زبان پر یہ شعر جاری تھے:۔ "موت کتنے ہی نعرے لگائے میں موت سے کبھی خوف زدہ نہیں ہوتا یہاں تک کہ تلواروں کے سایہ میں زمین پر گرا دیا جاؤں۔ میرا نام عباس ہے۔ مشک لے جاؤں گا اور ضرور لے جاؤں گا اور ہنگام جنگ موت کی کوئی پرواہ نہیں کروں گا۔"

اس امر کو دشمنوں کی بزدلی کا مکمل اعلان سمجھنا چاہیے کہ اُنھوں نے عباس کے ہاتھوں کی موجودگی اپنے لیے انتہائی خطرناک محسوس کی اور حکیم بن طفیل سنبسی نے آپ کے داہنے ہاتھ پر تلوار لگائی۔ چونکہ عباس کو اپنی جان سے زیادہ علم کا خیال تھا اس لیے آپ نے علم کو گرنے نہیں دیا بلکہ بائیں شانے پر لے لیا اور فرمایا۔ "حالانکہ تم نے میرا داہنا ہاتھ قطع کر دیا ہے مگر یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنے دین کی حمایت نہ کر سکوں گا۔ خدا کی قسم اس فرض کو میں ہمیشہ ہمیشہ انجام دیتا رہوں گا۔"

اس کے بعد زید بن ورقا جہنی نے موقع پا کر آپ کے بائیں ہاتھ پر تلوار لگائی اور وہ بھی قطع ہو گیا عباسؑ نے پشت فرس پر جھک کر علم کو سینہ سے روکنا چاہا ہی تھا کہ قبیلہ تمیم کے ایک شخص نے سر پر گرز کا وار کیا جس سے آپ زمین پر گر گئے اور بلند آواز سے پکارے کہ "بھائی میری خبر لیجئے۔"

امام حسینؑ پر اس آواز کا جو اثر نہ ہوتا کم تھا۔ آپ مثل شاہین کے جھپٹ کر بھائی کی لاش پر پہونچے تو دیکھا کہ عباسؑ زخموں سے چور دونوں ہاتھ قطع پیشانی شکستہ، ایک آنکھ میں تیر پیوست، زمین پر دم توڑ رہے ہیں۔

امام عالم رنج و ملال میں سرہانے بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ عباس کی روح

نے جسد سے مفارقت کی۔ اب کوئی ایسا نہیں رہ گیا تھا جسے امام اذن جہاد دیتے۔ آپ لاش سے اُٹھے اور آگے بڑھے۔ تلوار نیام سے لی رد اپنے اور بائیں دشمنوں پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ جب وہ آپکے سامنے سے بھاگنے لگے تو آپ فرماتے تھے "بھاگتے کہاں ہو تم نے میرے بھائی کو مار ڈالا ہے بھاگے کہاں ہو۔ تم نے میرے بازو شکستہ کر دیے ہیں"

اس کے بعد آپ اپنے مستقر پر واپس پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔

اب دشمنوں کی کثرت تھی اور اکیلے حسینؑ تھے۔ نصرت اسلام کا فریضہ تھا اور وہ مستحکم عزم تھا جو اتنے مصائب اور عزیزوں کے داغ اٹھانے کے بعد بھی پہلے ہی کی طرح کوہ گراں کی صورت اپنی جگہ قائم و برقرار تھا۔

سطحی نظر میں مجاہدین کی یہ ترتیب خلافِ قیاس سمجھی جا سکتی ہے۔ اس لیے کہ عملی رہنمائی کا تقاضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت امام حسینؑ خود میدان جہاد میں قدم رکھتے ہوئے عملی مثال پیش فرمانے۔ پھر آپ کے عزیز یکے بعد دیگرے جاتے اور آخر میں اصحاب کی نوبت آتی۔ حضرت علی بن ابی طالبؑ نے نہج البلاغہ میں رسول اللہؐ کے طریقہ جنگ کے متعلق فرمایا ہے کہ آپ خطرہ کے موقعوں پر اپنے اہلبیت اور اعزاء کو آگے رکھتے تھے اور انھیں اپنے اصحاب کی سپر بناتے تھے۔ مگر میدان کربلا میں ترتیب اس کے خلاف رکھی گئی۔ یہاں اصحاب پہلے میدان میں بھیجے گئے اور پھر اعزاء اور آخر میں خود امام حسینؑ تشریف لے گئے۔

مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ کربلا اور دوسرے معرکوں کی نوعیت میں بڑا فرق تھا۔ دوسرے ہر موقع پر یہ یقینی تھا کہ کچھ لوگ

قتل ہوں۔ اور کچھ صحیح وسلامت محفوظ رہیں۔ لہذا یہ کوشش کیجاتی
کہ زیادہ سے زیادہ خطرہ وہی برداشت کریں جو رسول اللہ صلعم کے ساتھ ذاتی
تعلقات رکھتے ہوں اور وہ لوگ زیادہ سے زیادہ محفوظ رہیں جو غیروں کی
حیثیت رکھتے ہوں۔ مگر معرکۂ کربلا میں عاشور کے دن یہ بالکل یقینی تھا
کہ زندہ بچنے والا کوئی نہیں۔ بہرحال جتنے بھی ہیں اُن سب کو شہید ہونا ہے۔
جہاں تک خطرہ سے بچانے کی کوشش کا تعلق تھا وہ شب عاشور آئی جا چکی
تھی اور اُس وقت حضرت امام حسینؑ نے باصرار تمام فرمایا تھا کہ مجھے
تنہا اس خطرہ کو قبول کر لینے دو۔ تم سب اپنی جانوں کو خطرہ میں مبتلا نہ
کرو مگر ہر ایک نے اعزا واصحاب میں سے انکار کرتے ہوئے اپنی جانیں
حسینؑ پر قربان کرنے کے عزم بالجزم کا اعلان کر دیا تھا اس کے بعد اب
یہ سوال تو باقی ہی نہیں رہا تھا کہ کون قتل ہو اور کون زندہ رہے۔ زندگی
کی دلفریبیاں تو بہت پہلے ٹھکرائی جا چکی تھیں۔ اب تو ہر ایک کے سامنے
بس موت ہی تھی اب اس صورت میں سوال تھا تو صرف قبل اور بعد کا۔
مگر واقعۂ کربلا کی نوعیت یہ تھی کہ جتنا وقت گزرتا جاتا تھا، امتحان سخت تر
ہوتا جاتا تھا۔ پانی بند تھا ہی اور روز عاشور دن چڑھنے اور تمازت آفتاب
میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ پیاس کی تکلیف لحظہ بہ لحظہ بہت بڑھتی
جاتی تھی۔ پھر اس حالت میں کثیر التعداد دشمنوں سے پیہم نبرد آزمائی،
ساتھیوں کی جدائی اور ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ جتنی بھی کسی مجاہد کی شہادت
میں دیر واقع ہوتی تھی اُس کا امتحان شدید تر ہوتا جاتا تھا۔

امام حسینؑ اپنے اصحاب اور اعزاء کی وفاداری پر کتنا ہی اعتماد کیوں
رکھتے ہوں مگر آپ اُن پر اتنا بار نہیں ڈالنا چاہتے تھے جو اُن کی قوت برداشت

سے باہر ہوتا۔ آپ کیلئے لازم یہی تھا کہ آپ دوسروں کے صبر و تحمل اور اپنی قوت برداشت کے امتیاز پر نظر رکھتے ہوئے نظام جنگ مرتب فرماتے۔

حقیقۃً حسینؑ کیلئے نسبتۃً یہ بہت آسان ہوتا کہ سب سے پہلے آپ اپنی جان کا ہدیہ راہ حق میں پیش کر دیتے۔ اس صورت میں آپ کی قربانی اپنی جان کی قربانی ہوتی اور اس کو کسی ایسے شہید کی قربانی سے بڑا درجہ نہ دیا جا سکتا جس نے کبھی بھی حمایت حق میں اپنے نفس کی قربانی پیش کی ہو۔

اس صورت میں آپ کی قربانی اس سے زیادہ وقیع نہیں سمجھی جا سکتی جتنی کہ بقول نصاریٰ حضرت عیسیٰ کی قربانی کہ آپ دین حق کی تبلیغ کی وجہ سے سولی پر چڑھا دیے گئے۔ یا سقراط کی قربانی کہ ان کو اصول کی حمایت میں زہر کا جام پینا پڑا اور حسینؑ کے لیے اس منزل سے گزر جانا مشکل ہی کیا ہوتا جب کہ آپ اس باپ کے بیٹے تھے جس کا قول یہ تھا کہ مجھے اسکی پرواہ نہیں کہ موت مجھ پر آ پڑتی ہے یا موت پر میں جا پڑتا ہوں اور نیز یہ کہ موت سے اس سے زیادہ مانوس ہوں جتنا کہ بچہ پستان مادر سے مانوس ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ آپ اس گھرانے کے بزرگ تھے جس کے بچوں کا یہ قول تھا کہ "موت شہد سے زیادہ شیریں ہے۔" بلکہ اس زمانہ میں ملک عرب کے ہر بہادر کا اصول زندگی یہ تھا کہ وہ موت کا تلوار کے سایہ میں آنا اپنے لیے باعث مباہات سمجھا تھا۔

مگر حسینؑ کی شہادت کو جو خاص امتیاز حاصل ہے وہ اسی لیے کہ آپ نے ایسی ہر ہر فرد کو جو آپ کی ذات سے دور یا قریب کا تعلق رکھتی تھی اپنی موجودگی میں راہ حق میں نثار کر دیا۔

انصاف سے دیکھا جائے تو تمام ساتھیوں کا ایک ایک کر کے جدا ہونا۔ بھتیجوں کا آنکھوں کے سامنے دم توڑنا، جوان بیٹے کا خاک پر ایڑیاں رگڑنا اور

جاں نثار بھائیوں کا عالم جوانی میں موت کی نیند سو جانا۔ یہ وہ مصائب تھے جن میں سے ہر ایک انسانی نفس کے لیے موت سے زیادہ ناقابل برداشت قرار پا سکتا ہے۔ حسینؑ کا کمال عمل محض یہی نہیں تھا کہ وقت اور موقع آنے پر آپ نے اپنی جان راہ خدا میں پیش کر دی بلکہ آپ کے نفس کا کمال یہ تھا کہ آپ نے جان سے عزیز ہستیاں رضائے حق کے راستے میں یکے بعد دیگرے قربان کر دیں اور جب تک صبر و تحمل کے ساتھ ان تمام دشوار گزار منازل کو طے نہ کر لیا اُس وقت تک خود اپنی جان کا ہدیہ پیش نہیں کیا۔

قوت برداشت کے اس خاص درجہ میں حسینؑ کے علاوہ کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ عملی حیثیت سے اس بلندی نفس کی توقع کیا امام حسینؑ کے سوا کسی اور سے کی جا سکتی تھی جو اُسے آپ اپنے بعد کے لیے چھوڑ دیتے؟

(۱۶) طفل شیر خوار

تمام اصحاب و اعزاؑ کی شہادت کے بعد غالباً دشمنان دین یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ حسینؑ کے صبر و تحمل اور اُن کے مقابلہ میں تشدد کی انتہا ہو چکی مگر ابھی ظالموں کے ترکش میں تشدد کا ایک زبردست تیر باقی تھا اور اس کے مقابلہ میں حسینؑ کو ایک زبردست قربانی پیش کرنا تھی جس پر ہر مذہب و ملت کا انسان یہ گواہی دینے پر مجبور ہے کہ یزیدیوں کو انسانیت سے کوئی دور کا بھی علاقہ نہ تھا۔

شیر خوار عبداللہ (۱) جو "علی اصغر" کے نام سے مشہور ہیں اور آپ کی والدہ رباب بنت امراءالقیس بن عدی کلبی تھیں جن کے بطن سے ایک صاحبزادی بھی متولد ہوئی تھیں جن کا نام سکینہ بنت الحسین تھا (۲)

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۷۔ ارشاد صفحہ ۲۶۹ (۲) ارشاد صفحہ ۲۶۹

انسانیت لرزہ براندام تھی جب اس بچہ کو حسینؑ اپنے ہاتھوں پر لیے ہوئے تھے اور اُس وقت ایک تیرِ ظلم نے باپ کے ہاتھوں پر بچہ کا کام تمام کر دیا (۱) یہ تیر مارنے والا قبیلۂ بنی اسد میں سے ایک ظالم تھا (۲)

ایک روایت کے مطابق امام حسینؑ نے اس بچہ کو ہاتھوں پر بلند کر کے پانی کا سوال کیا اور اُس وقت بجائے پانی پلانے کے سردار لشکر، عمر سعد کے حکم سے حرملہ بن کاہل اسدی نے تیر لگا کر اُس معصوم کو شہید کیا۔

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۲ و ۲۵۰ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۰ الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۵ ارشاد صفحہ ۱۵۲

انتیسواں باب

جہادِ آخر اور شہادت

یہ سب کچھ ہوا۔ اصحاب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ عزیز جدا ہو گئے بھتیجے قتل ہوئے۔ بیٹا تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔ بھائی تہ تیغ ہوئے مگر امام حسینؑ نے کوئی ایسی جنگ نہیں کی جسے حسینؑ کی جنگ کہا جائے۔ ظاہری اسباب کی بنا پر ناواقف آدمی یہ سمجھ سکتا ہے کہ آپ کو بذاتِ خود جنگ کرنے کا حوصلہ نہیں ہے، نبرد آزمائی کا ولولہ ہی نہیں۔ حالانکہ حقیقت میں امام حسینؑ کی جنگ کا لطف تو جب ہی تھا کہ جب آپ تلوار لے کر حملہ آور ہوتے اور ایک طرف عباسؑ دادِ شجاعت دیتے ہوتے ایک طرف علی اکبر معرکۂ جنگ میں جوہر دکھاتے ہوتے ایک طرف اصحاب حفاظت کے لیے ساتھ ساتھ ہوتے۔ اس صورت میں جنگ کا منظر دوسرا ہی ہوتا۔ مگر حسینؑ نے سب کو دنیا سے ایک ایک کر کے رخصت ہو جانے دیا اور اُن کے ساتھ مل کر جنگ نہیں کی۔ پھر اب جبکہ دن بھر کی دھوپ سر پر پڑ چکی۔ ساتھیوں اور عزیزوں کے غم نے دل کو شکستہ کر دیا۔ کمر عباس کے مرنے سے ٹوٹ چکی اور آنکھوں کی بصارت علی اکبر کے ساتھ گویا جا چکی۔ یہ ستاون ۵۷ برس کی بڑھاپے کی عمر کا انسان اب اس عالم میں بھلا تلوار کھینچ سکتا ہے اور جنگ کر سکتا ہے؟! مگر حسینؑ کو تو کربلا میں صبر و برداشت کی منزلوں کو طے کرنے کے ساتھ ساتھ فرائض کے حدود دکھلانا تھے۔ وہ شرع

اسلامی کے آئین کے محافظ تھے۔ اور ان ہی آئین و اصول کے لیے جنگ کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دشمن کے سامنے "سپردگی" آئین اسلام کے خلاف ہے۔ حفاظت خود اختیاری کے لیے دفاع آخری امکان کے درجہ تک ہر انسان کا فرض ہے۔ حسینؑ نے اس فرض کو اُس وقت انجام دیا جب کوئی دوسرا انسان اُسے انجام نہیں دے سکتا تھا۔

اب علی اصغر کو نذر راہ خدا کرنے کے بعد حسینؑ کے پاس کوئی ایسی قربانی نہ تھی جسے وہ حق کی بارگاہ میں پیش کرتے۔ اب بس ایک آخری مرحلہ تھا۔ جو آپ کے لیے پہلے ہی بہت آسان تھا۔ آپ نے اُسے خود اب تک اپنے لیے مشکل سے مشکل تر بنایا تھا اب جبکہ یہ تمام مشکلیں ختم ہو چکی ہیں، اب جبکہ منزل عمل کے درمیانی قلعوں کو تمام و کمال فتح کر چکے ہیں۔ ظاہری طور پر آپ سے بڑھ کر اُس وقت دل شکستہ کوئی نہیں مگر حقیقتہً آپ سے بڑھ کر اس وقت کامیابی کے احساس سے بالیدہ کوئی دوسرا نہیں۔ کسی کے قدم جن راستوں کے تصور سے ڈگمگا سکتے تھے انھیں آپ عملی طور پر استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ طے کیے ہوئے کھڑے تھے۔ آپ سے بڑھ کر اس وقت فتحمندی کا احساس کسی دوسرے کو ہو نہیں سکتا۔ اب آپ کے لیے اپنا سر شمشیر قاتل کے سپرد کر دینا تھا۔ یہ بالکل آسان تھا مگر وہ پیغمبر اسلام کے نواسے اور علیؑ کے بیٹے نہ ہوتے اگر اپنا سر جھکا کے خاموشی سے دشمنوں کو دعوت دیدیتے کہ آؤ یہ سر قلم کر لو۔ ہونے والا ہے آخر یہی مگر ذرا میدان جنگ کو بدر و احد، خندق و صفین کا کا نمونہ بن جانے دو۔ ذرا بھولی ہوئی دنیا کو علی کی یاد آ جانے دو۔ ذرا نہ دیکھی ہوئی آنکھوں کے سامنے حمزہ و جعفر کی تصویر کھنچ جانے دو ——

آج ہی تو موقع آیا ہے کہ حسینؑ اپنے نانا کے اس قول کو سچ کر دکھائیں

کہ حسینؑ کو میری جرأت اور سخاوت میراث میں ملی ہے۔ سخاوت کے مظاہرے بہت ہوئے تھے مگر جرأت کے عملی اظہار کا وقت اب آیا ہے ـــــ اور سچ پوچھیے تو رسول اللہؐ کو میدان جنگ میں کبھی تلوار لے کر خود جہاد کا موقع نہیں ملا۔ اس لیے کہ ساتھ والے موجود رہے، حسینؑ بھی جب تک ایک لائق جنگ مجاہد بھی ساتھ رہا، اپنے نانا رسول اللہؐ کی بالکل تصویر بنے رہے مگر اب جبکہ آپ کی حمایت میں تلوار کھینچنے والا کوئی باقی نہیں رہا تو حسینؑ نے یہ دکھلا دیا کہ اگر ضرورت ہوتی تو میرے نانا رسول اللہؐ بھی عملی حیثیت سے کس پایہ کی شجاعت و جرأت کا مرقع کھینچتے۔

آپ رخصت آخر کے لیے خیمہ میں آئے اور ایک یمنی چادر کو جابجا سے چاک کر کے باقی لباس کے نیچے پہنا (۱) شاید اس لیے کہ بعد شہادت جب لباس کو لوٹا جائے تو یہ بوسیدہ کپڑہ جسم پر رہ جائے۔ اس کے بعد میدان جنگ میں تشریف لے گئے۔

تاریخ شاہد ہے کہ حسینؑ غمزدہ، دل شکستہ، تشنہ و گرسنہ ہونے کے باوجود تن تنہا جب تلوار کھینچ کر فوج مخالف پر حملہ آور ہوئے تو تمام گزشتہ بہادروں کے کارنامے محو ہو گئے اور انسانی حافظہ میں قیامت تک اس شجاعت و جرأت کی تصویر محفوظ رہ گئی۔

مگر یہ غیر مساوی جنگ ظاہری اعتبار سے اب عنقریب ختم ہونے والی تھی اس لیے کہ ایک کا ہزاروں سے مقابلہ کہاں تک جاری رہ سکتا تھا۔ تاہم آپ نے اپنے دشمنوں کے دلوں میں وہ دھاک بٹھا دی تھی کہ اُن میں سے کوئی بھی آپ کا مقابلہ کرنے کی جسارت نہ کرتا تھا۔ یزیدی افواج کی اس سراسیمگی کو دیکھ کر شمر نے فوج کو للکارا اور نئے سرے سے ترتیب لشکر کو درست کر کے سواروں

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۵۹

کو پیادوں کے پیچھے کھڑا کیا اور تیر اندازوں کو حکم دیا کہ وہ تیر باراں کریں اتنی شدت سے تیر برسائے گئے کہ جسم حسینؑ سیاہی کے کانٹوں کی طرح ہو گیا (۱)

اس وقت دوبارہ شمر نے چلا کر کہا خدا تم سے سمجھے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو انھیں قتل کرو۔ خدا کرے تمہاری مائیں تمہیں روئیں،،

اس طرح غیرت دلائے جانے کے بعد وہ لشکر بے کراں حسینؑ پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑا (۲) اور آپ پر تیروں، تلواروں اور نیزوں کا مینھ برسنے لگا جس سے یقین ہے کہ گھوڑا ابھی کافی زخمی ہو گیا ہو گا اور اس سے مجبور ہو کر آپ پشت فرس سے زمین پر تشریف لائے مگر پیادہ ہونے کے بعد بھی آپ نے مقابلہ جاری رکھا۔

اثنائے جہاد میں ایک موقع ایسا آیا کہ حضرت تمام فوج کو بھگا کر نہر تک پہنچ گئے۔ دشمنوں کو اندیشہ ہوا کہ آپ کہیں پانی سے سیراب نہ ہو جائیں۔ اس وقت حصین بن تمیم نے تیر لگایا جو آپ کے دہن پر پڑا اور خون منھ سے ابلنے لگا۔ آپ نے چلو میں خون لیا۔ آسمان کی طرف اچھال دیا اور پھر شکر خدا ادا کیا۔ (۳)

اسی اثنا میں بے حیا لشکر یزید کا ایک دستہ اپنی شکست کی خفت کو مٹانے کے لئے شمر کی قیادت میں خیام حسینی کی طرف جس میں اہل حرم تھے غارت گری کے ارادہ سے متوجہ ہوا اور آپ کے اور خیام کے بیچ میں حائل ہو گیا۔ یہ دیکھنا تھا کہ آپ نے پوری فوج کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر تمہیں مذہب کا پاس اور آخرت کا کوئی تصور نہیں ہے تب بھی دنیا میں اپنی قومی شرافت کا ثبوت دو۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ میرے خیام

---

(۱) ارشاد ص۲۵۰ (۲) ارشاد ص۲۵۰ (۳) طبری ج ۶ ص ۲۵۸

سے تعرض نہ کرو۔ شمر اپنی حرکت پر شرمندہ ہوا اور خیام کی طرف سے پلٹ آیا (۱)

اب شمر نے پیادوں کو اپنے ساتھ لے کر خود آپ کا محاصرہ کر لیا مگر عالم یہ تھا کہ جس طرف آپ رخ کرتے تھے اُدھر کی جماعت منتشر ہو جاتی تھی (۲) غالباً اسی موقع کا تذکرہ فوجِ دشمن کے ایک سپاہی نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ میں نے کوئی ایسا انسان نہیں دیکھا جو زخمی ہو چکا ہو اور اس کے اولاد، عزیز اور ساتھی سب قتل ہو چکے ہوں اور پھر وہ حسینؑ کا ایسا مطمئن اور ثابت قدم نظر آئے اور ان کے سی جرأت دہمت سے مقابلہ کرے۔ حالت یہ تھی کہ پیادے چاروں طرف سے اُنھیں گھیرتے تھے اور تلوار لے کر اُن پر حملہ کر دیتے تھے تو وہ سب داہنے بائیں سے یوں ہٹتے تھے جیسے گوسفندوں کا غول بھیڑیے کے حملہ کے وقت منتشر ہو (۳)

اس وقت آپ کی زبان پر یہ تاریخی الفاظ تھے جن سے ایک طرف فریضۂ ہدایت پورا ہو رہا تھا اور دوسری طرف نتائج کی طرف صاف اشارہ تھا:۔

"یاد رکھو کہ اللہ میرے قتل سے انتہائی ناراض ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ تمہارے ذلت دینے سے اللہ مجھے عزت دیگا اور پھر میرا بدلا تم سے اس طرح لیا جائیگا جس کا تمہیں اس کے قبل تصور بھی نہ ہوگا۔ یاد رکھو کہ مجھے قتل کرنے کے بعد خود تمہارے درمیان تفرقہ پڑ جائے گا۔ خانہ جنگیاں ہوں گی اور بالآخر تمہارا خون بھی بہایا جائیگا۔ پھر اس کے بعد

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۵۸ (۲) طبری ج ۶ ص ۲۵۹ (۳) طبری ج ۶ ص ۲۵۹ ۔ ارشاد ص ۲۵۷ ، ۲۵۸

آخرت کی سزا جو اس سے بھی زیادہ ہے (۱)

اس کے بعد آپ پر ہر جانب سے شدت کے ساتھ حملے ہونے۔ آخر زخموں سے چور ہو کر آپ زمین پر گر گئے اور کھڑے ہونے کی قوت باقی نہ رہی۔

(۱۷) عبداللہ بن الحسن

آپ حسنؑ بن علیؑ کے فرزند تھے۔ آپ کا سن اپنے بھائی قاسم سے بھی (کم) تھا اور آپ کی والدہ ام الرباب بنت امرأ القیس رباب مادر سکینہ و علی اصغر کی بہن تھیں۔

جب امام حسینؑ زخموں سے چور چور ہو کر زمین پر تشریف لا چکے تھے اُس وقت آپ خیمہ سے برآمد ہوئے اور امام کی طرف چلے۔ جناب زینب بنت علیؑ نے آپ کو روکنا چاہا مگر آپ کسی طرح نہ رکے اور دوڑتے ہوئے امام کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت بحر بن کعب بن عبید اللہ تیمی حضرت پر تلوار کا وار کرنا چاہتا تھا۔ آپ نے اُس سے کہا "زن خبیثہ کے بیٹے کیا تو میرے چچا کو قتل کریگا؟" مگر اس پر بھی جب اُس نے تلوار کا وار کر ہی دیا تو آپ نے اُسے اپنے ہاتھ پر روکا۔ ہاتھ جلد کے آخری حصّہ تک کٹ کر لٹکنے لگا اور آپ کے منھ سے بے ساختہ نکل گیا یا اماہ، امام حسینؑ نے آپ کو اپنے سینہ سے لگا لیا اور فرمایا کہ بیٹے صبر کرو اس مصیبت پر اور اس کے اجر و ثواب کے منتظر رہو، تم بھی اپنے بزرگوں یعنی رسول اللہؐ، علیؑ بن ابی طالبؑ، حمزہؓ، جعفرؓ اور حسنؑ کی خدمت میں پہنچا چاہتے ہو (۲) ابھی آپ یہ فرما ہی رہے تھے کہ حرملہ نے چلہ کمان میں تیر جوڑ

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۶۰ (۲) ارشاد

کو مارا جس سے عبداللہ کی شہادت واقع ہوئی۔

(۱۱) امام کی شہادت

دیر تک حضرت امام حسینؑ خستہ و مجروح بر سر خاک باقی رہے۔ جب کہ آپ کو شہید کر دینے سے بظاہر کوئی امر مانع نہ تھا مگر ہر شخص اس جرم عظیم کے ارتکاب سے بچنا چاہتا تھا (۱) شمر للکارا کہ آخر اب کیا انتظار ہے۔ آخر مالک بن نسیر بدی آگے بڑھا۔ اس نے آپ کے سر پر تلوار لگائی جو کاسہ سر تک پہنچ گئی (۲) بالآخر ذرعہ بن شریک کی تلوار (۳) سنان بن انس کا نیزہ (۴) اور پھر شمر بن ذی الجوشن کا خنجر وہ تھا جس نے اُس مجسمۂ حق کی شمع حیات گل کر دی، سچائی کی گردن قلم ہوئی اور "شہید حق"، شہید انسانیت، شہید راہ خدا کا سر نیزہ پر بلند کر دیا گیا۔

۱۰ محرم سنہ ۶۱ھ کی وہ یادگار تاریخ جمعہ کا دن ہے کہ انسانی تاریخ کا یہ سب سے اہم واقعہ رونما ہوا۔

---

(۶) الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۵۔ ارشاد صفحہ ۲۵۵ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۰ نے مالک بن بشیر کندی لکھا ہے۔ الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۵ (۳) الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۵ (۴) طبری ج ۶ صفحہ ۲۶۰ الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۶

تیسواں باب

شہادت کے بعد

حضرت امام حسینؑ اور آپ کے اقربا و انصار کے شہید کیے جانے پر مظالم کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ آپؑ جو لباس پہنے تھے وہ بھی اتار لیا گیا۔

اسحٰق بن حیوہ حضرمی نے قمیص لی۔ بحر بن کعب نے زیر جامہ (۱) اخنس بن مرثد نے عمامہ، بنی اودارم کے ایک شخص نے تلوار (۲) اور قیس بن اشعث نے قطیفہ (چادر یمانی) جو خز کی تھی لے لی اسی لیے کوفہ میں وہ "قیس قطیفہ" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا (۳)

اس کے بعد یزیدی فوج نے خیام اہل بیت نبوی پر چھاپہ مارا اور ان میں کا تمام اسباب و سامان لوٹ لیا (۴) حتیٰ کہ مخدرات عصمت کے سروں سے چادریں تک اُتار لیں (۵) اس کے بعد خیموں میں آگ لگا دی گئی ——

اور عمر سعد نے اپنی فوج میں آواز دی کہ کون کون ایسے ہیں جو لاشِ حسینؑ

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۵۹ (۲) ارشاد ص ۲۵۰ (۳) طبری ج ۶ ص ۲۶۰ ایک روایت میں اس شخص کا نام عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث ہے اور لکھا ہے کہ وہ "عبدالرحمٰن قطیفہ" کے نام سے مشہور ہوا (کتاب البلدان ص ۱۰۲) (۴) الاخبار الطوال ص ۲۵۶ (۵) طبری ۶ ص ۲۶۰

کو گھوڑوں سے پامال کرنے کے لیے تیار ہوں اس پر دس آدمی آمادہ ہوئے جنھوں نے لاشِ مطہر کے ساتھ اس ظلم کو بھی انجام تک پہنچایا (۱)

سرِ امام حسینؑ جو تن سے جدا کیا جا چکا تھا خولی بن یزید اصبحی کے ہاتھ ابن زیاد کے پاس پہلے روانہ کیا گیا (۲) پھر کچھ شہداء کے سر قطع کرکے اس کے بعد شمر بن ذی الجوشن، قیس بن اشعث، عمرو بن الحجاج اور عزرہ بن قیس کے ساتھ روانہ کیے گئے (۳)

امام حسینؑ کے پسماندگان میں صرف ایک بیمار فرزند علی بن الحسینؑ پردہ نشین خواتین اور کچھ چھوٹے بچے رہ گئے تھے جو رات بھر خیموں کے جلنے کے بعد اُسی کھلے ہوئے صحرا میں مقیم رہے۔

۱۱ محرم کو عمر بن سعد نے اپنی فوج کے کشتوں کو جمع کیا اور اُن پر نماز جنازہ پڑھ کر دفن کیا (۴) مگر شہدائے راہِ خدا کی لاشیں اسی طرح بے دفن چھوڑ دیں اور شام ہوتے ہوتے اہلبیت رسولؐ کو بطور قیدیوں کے ساتھ لے کر ابن سعد کوفہ کی جانب روانہ ہو گیا اور بقیہ شہداء کے سروں کو جو تعداد میں بہتر تھے نیزوں پر بلند کرکے ساتھ لے گئے (۵)

لاشہائے بے سر لشکر یزید کے کربلا سے چلے جانے کے بعد قبیلۂ بنی اسد نے جو کربلا سے تھوڑی دور پر غاضریہ میں رہتا تھا آکر دفن کیا (۶)

حضرت امام حسینؑ کو اُسی مقام پر جہاں کہ اس وقت ضریح موجود ہے اور آپ کے پائینِ پا علی اکبر کو دفن، جناب عباس کو غاضریہ کے راستہ پر نہر فرات

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۶۱ - ۲۶۲، ارشاد ص ۲۶۱ (۲) اخبار الطوال ص ۲۶۱ (۳) ارشاد ص ۲۵۱ (۴) طبری ج ۶ ص — (۵) اخبار الطوال ص ۲۵۶ (۶) طبری ج ۶ ص ۲۶۱، ارشاد ص ۲۶۵ (۷) اخبار الطوال

(۷) ارشاد ص ۲۵۱

کے قریب جہاں کہ آپ شہید ہوئے تھے اور دوسرے اعزاء اور اصحاب کو ایک گڑھا کھود کر یکجا دفن کر دیا گیا جن کے قبور کا وثوق کے ساتھ معین کرنا موجودہ ماخذوں کے لحاظ سے غیر ممکن ہے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ امام حسینؑ کے گرد و پیش ہی دفن ہیں اور حائر کا احاطہ اُن سب کو گھیرے ہوئے ہے (۱)

شہداء کے سر جب کوفہ پہنچ گئے تو شمر نے ان سروں کو ابن زیاد کے سامنے پیش کیا (۲)

اس موقع پر ابن زیاد نے سر امام حسینؑ کے ساتھ بے ادبی کی جسارت کی اور وہ ایک چھڑی سے آپ کے لب و دنداں پر ضرب لگانے لگا۔ یہ گستاخی دیکھ کر زید بن ارقم صحابی رسول کو تاب نہ رہی۔ انھوں نے کہا ارے یہ لب وہ ہیں جن پر میں نے خود رسول اللہؐ کے لبوں کو بوسہ لیتے ہوئے دیکھا ہے اور یہ کہہ کر رونے لگے ابن زیاد نے کہا اگر تم بڈھے نہ ہوتے اور عقل نہ جا چکی ہوتی تو میں ابھی تمھاری گردن مارنے کا حکم دے دیتا۔ زید بن ارقم اٹھ کر ابن زیاد کو برا کہتے اور مسلمانوں کو اس کی حکومت تسلیم کرنے پر لعنت ملامت کرتے چلے گئے۔ (۳)

ادھر اہل بیت نبوت کا لٹا ہوا قافلہ قیدیوں کی شکل سے اسی شہر کوفہ میں کہ جہاں حضرت علی بن ابی طالبؑ کے دور حکومت میں زینبؑ و ام کلثومؑ شاہزادی کی حیثیت سے رہ چکی تھیں۔ لایا جا رہا تھا مگر قبل اس کے کہ وہ حدود شہر میں داخل ہوں۔ حاکم کی طرف سے یہ منادی کر دی گئی تھی کہ اس موقع پر کوفہ میں کوئی شخص سلاح جنگ کے ساتھ گھر سے باہر نہ نکلے۔ نہ کوئی شخص ہتھیار لگائے ہوئے کوفہ کی سڑکوں پر دکھلائی دے اس کے علاوہ جگہ جگہ کسی خاص دہشت کے سبب سے سوار اور پیادوں کے بڑی تعداد میں پہرے بٹھلا دیئے گئے تھے۔ تماشائیوں کی خلقت

---

(۱) ارشاد ص ۲۶۵ (۲) الاخبار الطوال ص ۲۵۷ (۳) الاخبار الطوال ص ۲۵۷ طبری ج ۶ ص ۲۶۲

میں سے بعضوں کو اصلی واقعہ کی خبر تھی اور بعض بے خبر حکومت کے بیان پر اعتبار کرتے ہوئے یہی سمجھتے تھے کہ مخالفین اسلام کی جماعت پسپا ہوئی ہے اور ان کے اہل و عیال گرفتار ہو کر آرہے ہیں۔ سہل شہرزوری حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر عین اسی وقت کوفہ میں پہونچے۔ دیکھا کہ بازار سجا ہوا ہے تماشائیوں میں سے اکثر کے چہروں پر مسرت کے آثار نمایاں ہیں مگر انہی میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن کے چہرے اداس ہیں۔ انھوں نے بڑھ کر ایک بڈھے سے حال دریافت کیا۔ وہ ان کو ایک گوشہ میں لے گیا اور بچشم گریاں خاندان رسالت کی تباہی پر مندرجہ ذیل اشعار پر مشتمل مرثیہ پڑھ کر ان کو حقیقت حال سے مطلع کیا۔

الم تران الشمس اضحت مریضۃ ۔۔۔ لقتل الحسین والبلاد اقشعرت
وکانوا غیاثاً ثم اضحوا رزیۃ ۔۔۔ لقد عظمت تلک الرزایا وجلت
وان قتیل الطف من ال ھاشم ۔۔۔ اذل رقاب المسلمین فذلت

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ قتل حسینؑ سے سورج کو گہن لگ گیا اور تمام آبادیاں مغموم ہو گئیں۔ ہائے افسوس خاندان رسالت تو لوگوں کے لئے فریادرس تھا لیکن آج وہ خود مبتلائے مصیبت ہو گیا۔ اور سچ تو یوں ہے کہ یہ مصیبتیں بڑی عظیم اور سخت تھیں۔ بہ تحقیق کہ شہید کربلا کی شہادت سے مسلمانوں کی گردنوں میں رسوائی اور ذلت کا طوق پڑ گیا۔ اور دراصل وہ ذلیل ہو گئے۔"

ابھی یہ مرثیہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ شادیانوں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ اہل بیت رسولؐ کا تباہ حال قافلہ شہر میں داخل ہو گیا۔ آگے آگے نیزوں پر شہداء کے سر تھے۔ اور ان کے پیچھے اسرائے آل محمدؐ تھے۔ ایک عورت جو اس منظر کو دیکھنے کے لئے اپنے کوٹھے پر بیٹھی ہوئی تھی قیدیوں سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگی کہ "تم کس قوم و قبیلہ سے ہو؟" جواب دیا گیا کہ ہم اسرائے آل محمدؐ ہیں۔ یہ سننا تھا کہ ایک

کہرام برپا ہو گیا۔ گریہ و زاری کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

سطحی نظر سے دیکھنے والے اس منظر کو اہل بیت نبوت کے لئے سخت توہین و ذلت کا باعث سمجھ رہے ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ذلت حسینؑ کی تبلیغ منتہائے شباب پر پہونچ گئی اور دعوت حق کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔

اگر چشم حقیقت بیں سے دیکھا جائے تو ایک طرف نیزہ پر سر حسینؑ جس کی پیشانی پر سجدۂ خالق کا نشان پڑا ہو اور چہرے سے نور ساطع اور دوسری طرف مخدرات عصمت جو نامحرموں کے مجمع میں چادر و مقنع سے محروم کردئیے جانے کے بعد بھی غیرت و حیا کا مجسمہ، اخلاق محمدیہ کی تصویر بنی ہوئی جاہ و جلال کی چادروں میں پنہاں، طہارت و عفت کے لباس میں ملبوس تھیں دونوں نے سچائی کے پیکر میں روح پھونک دی۔ اور دنیا کی آنکھوں کے سامنے سے جہالت و ضلالت کے پردوں کو چاک کر کے پھینک دیا۔

اس موقع پر جب کہ آل رسولؐ کا لٹا ہوا قافلہ کوفہ سے اس بے کسی کے عالم میں گزر رہا تھا کہ اس کو دیکھ کر پتھر کا دل بھی پگھل جاتا۔ زنان کوفہ نے فطرۃً بیچین ہو کر رونا شروع کیا تو علی بن الحسینؑ (سید سجادؑ) نے ضعف و ناتوانی کے باعث بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ "تم ہی نے تو ہمارا خون بہایا۔ اب تمہاری عورتیں ہمارے حال پر رو رہی ہیں؟ ہمارا اور تمہارا فیصلہ خدا کے سپرد ہے" پھر ذرا غم و الم کی تاثیر میں اضافہ ہوا۔ اور مرد و زن سب مل کر رونے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ "تم لوگ ہماری مصیبت پر نالہ و شیون کر رہے ہو۔ پھر آخر ہم کو تباہ و برباد کس نے کیا ہے؟" بشیر بن حذیم اسدی ناقل ہے کہ اس وقت زینبؑ بنت علیؑ نے مجمع کی طرف رخ کیا اور موعظہ فرمانا شروع کیا۔ میں نے کبھی ایک پردہ نشین خاتون کو آپ کی طرح پرزور تقریر کرتے نہ سنا تھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کی زبان سے

آپ کے پدر بزرگوار علی ابن ابی طالبؑ بول رہے ہیں۔
آپ نے لوگوں کی طرف سکوت اختیار کرنے کا اشارہ کیا جس سے ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ آپ نے فرمایا کہ "حمد کا سزاوار اللہ ہے اور صلوٰۃ و سلام میرے پدر بزرگوار محمد مصطفیٰؐ اور ان کی عترت سے مخصوص ہے۔ اے اہل کوفہ اے اہل مکر و دغا تم روتے ہو، خدا کرے تمہارے آنسوؤں کو تھمنا نصیب نہ ہو اور تمہاری نوحہ و فریاد کی آوازوں میں سکون پیدا ہونے نہ پائے۔" پھر آپ کی تقریر کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ آپ نے فرمایا۔
"کیا تم لوگ سچ مچ آنسو بہا رہے ہو اور چیخیں مار مار کر رو رہے ہو؟ حقیقۃً تمہارے لئے ہے بھی یہی بہتر کہ زیادہ روؤ اور کم ہنسو۔ تم نے سمجھنے کی کوشش بھی کی کہ کس طرح تم نے رسول خداؐ کے جگر کو چاک کیا؟ ان کے محترم اہل حرم کو بے پردہ کیا۔ اور ان کی ہتک حرمت کی؟ کیا تم کو اس پر تعجب ہے کہ آسمان نے خون برسایا؟ یہ تو کچھ نہیں، آخرت کا عذاب بہت سخت ہو گا۔ اور اس وقت تمہارا کوئی مددگار نہ ہو گا۔ اس چند روزہ مہلت سے خوش نہ ہونا۔ خدا کو جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ اُس کو موقع کے ہاتھ سے جانے کا اندیشہ نہیں بلا شبہ وہ تمہیں ایک وقت تک تمہارے حال پر چھوڑے رہے گا۔" راوی ناقل ہے کہ آپ کی اس دل ہلا دینے والی تقریر کے دوران میں میرے گرد و پیش تمام سامعین حالت اضطراب میں دانتوں میں انگلیاں دبائے ہوئے رو رہے تھے۔ اور ایک بڈھے کو میں نے دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ "میرے ماں باپ تم پر نثار، تمہارے بوڑھے تمام دنیا کے بوڑھوں سے، تمہارے جوان تمام جوانوں سے، تمہاری عورتیں تمام عورتوں سے اور تمہاری تمام نسلوں سے افضل و بہتر ہے۔ نہ وہ کبھی ذلیل کی جا سکتی ہے نہ رسوا۔"
آپ کے بعد فاطمہ بنت الحسینؑ، ام کلثوم بنت علیؑ اور زین العابدینؑ

(علی بن الحسینؑ) نے متعدد خطبے ارشاد فرمائے جن سے اہل کوفہ کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ گئے اور حکومت نے بے خبری اور عوام فریبی کا جو طلسم قائم کیا تھا وہ ٹوٹ گیا۔

حسینی شخصیت کا اثر اتنا زبردست پڑ رہا تھا کہ خود حسینؑ کے قاتلوں میں سے ایک جب سرِ حسینؑ لئے ہوئے دربار ابن زیاد میں پہونچا تو اس کی زبان پر حسینؑ بن علیؑ اور آپ کے شخصی اور خاندانی خصوصیات کے تذکرہ میں مندرجہ ذیل اشعار جاری ہو گئے۔

املاء رکابی فضۃ و ذھبا فقد قتلت الملک المحجبا

ومن یصلی القبلتین فی الصبا وخیرھم اذ یذکرون النسبا

قتلت خیر الناس اما و ابا

(یعنی) "میرے پالان شتر کو طلاؤ نقرہ سے بھر دینا چاہئے کیونکہ میں نے (آپ کی خاطر سے) ایک بڑے ذی عزت بادشاہ کو قتل کیا ہے۔ اسے جو بچپنے میں دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھ چکا تھا اور حسب و نسب میں دنیا بھر سے بہتر تھا۔ میں نے اسے قتل کیا ہے جس کے ماں باپ دنیا میں سب سے بہتر تھے۔" اس کے ضمیر کی آواز اضطراری طور پر اس کے منھ سے باہر نکل رہی تھی۔ درآنحالانکہ اس نے محسوس نہ کیا کہ اس کے یہ الفاظ سیاست بنی اُمیّہ کے لئے کس درجہ مضر ثابت ہو سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابن زیاد نے غضبناک ہو کر اس سے کہا کہ "اگر تو انھیں ایسا ہی سمجھتا تھا تو پھر ان کے قتل میں شریک کیوں ہوا ہے تجھے مجھ سے کسی اچھے سلوک کی توقع نہ رکھنا چاہئے۔ بلکہ میں خود تجھے بھی ان ہی کے پاس بھیجدوں گا۔" چنانچہ وہ شخص اسی وقت قتل کر دیا گیا۔

ابن زیاد نے دربار میں پسماندگان حسینؑ کی حاضری کا حکم دیا۔ چنانچہ

خاندان رسالت کو قیدیوں کی حیثیت سے لاکر ابن زیادؓ کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ اپنے اندر کا دل دکھانے کے لئے امام حسینؓ کے دندان مبارک کو چھڑی سے ضرب لگانا شروع کیا۔ یہ بے ادبی دیکھ کر زید بن ارقم صحابی رسولؐ نے کہا کہ یہ وہ لب و دندان ہیں جن کے رسولؐ بوسے لیا کرتے تھے۔

ایک روایت کے مطابق انس بن مالک دربار میں موجود تھے۔ وہ روئے اور کہنے لگے کہ حسینؑ سب سے زیادہ رسولؐ سے مشابہ تھے۔ (۱)

اس موقع پر حضرت علی بن ابی طالبؑ کی بڑی بیٹی جناب زینبؑ نے لباس میں تبدیلی کر لی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ بہت پست اور معمولی درجہ کے کپڑے پہن لئے تھے اور کنیزوں نے آپ کے گرد حلقہ باندھ لیا تھا۔ (۲) مگر خلقی عظمت و جلال چھپانے سے نہیں چھپتے۔ چنانچہ ابن زیاد نے زینب کبریٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ وہ کون عورت ہے؟ تین دفعہ اس نے یہی کہا مگر کچھ جواب نہ ملا۔ آخر ایک کنیز نے کہہ دیا۔ ارے یہ زینبؑ بنت فاطمہؑ ہیں۔ یہ سن کر ابن زیادؓ نے جو فتح و ظفر کے نشہ میں چور تھا۔ آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "خدا کا شکر کہ اس نے تم لوگوں کو رسوا کیا۔ تمھیں قتل کیا۔ اور تمھارا جھوٹ ظاہر کر دیا۔" (۳)

"تم لوگوں" کے خطاب کے ساتھ اس فقرہ میں کہ "تمھارا جھوٹ ظاہر کر دیا" بڑی وسعت تھی۔ اس میں قرآن، حدیث، رسالت اور وحی سب کا انکار مضمر تھا۔ اب اسلامی اصول پر حملہ ہو رہا تھا جس پر حضرت زینبؑ نے خاموش رہنا اپنے لئے روا نہ جانا۔ فرمایا:۔

---

(۱) صحیح بخاری ج ۲ صفحہ ۱۸۵ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۲۶۲ ارشاد صفحہ ۲۵۹
(۳) طبری ج ۶ صفحہ ۲۶۲

"حمد ہے اس خدا کے لئے جس نے ہم کو عزت دی محمد مصطفےٰؐ کے ساتھ اور ہمیں پاک و پاکیزہ قرار دیا۔ اس طرح جو حق ہے پاکیزہ قرار دینے کا۔ نہ وہ کہ جو تو کہتا ہے۔ رسوا وہ ہوتا ہے جو فاسق و فاجر ہو اور جھوٹ اس کا کھلتا ہے جس کے مدنظر ہمیشہ سچائی نہ رہے اور وہ ہم نہیں ہیں، ہمارا غیر ہے۔"

اگر غیرت ہوتی تو ابن زیادؔ کو منفعل ہونا چاہیئے تھا۔ مگر وہاں تو اقتدار کا نشہ اور سلطنت کا غرور تھا۔ اسے خواہ مخواہ جناب زینبؑ کا دل دکھانے کا خیال پیدا ہوا۔ اور یہ کہنے لگا: "دیکھا تم نے اللہ نے تمھارے بھائی اور دیگر عزیزوں کے ساتھ کیا کیا ہے؟"

یہ طنزیہ فقرہ ایک عورت کے دل پر جو اثر کر سکتا ہے وہ ظاہر ہے مگر جناب زینبؑ نے متانت کے ساتھ جواب دیا: "میں نے تو اچھا ہی اچھا دیکھا۔ وہ خاصان خدا وہ تھے جن کے لئے شہادت کا درجہ خط تقدیر میں لکھ دیا گیا تھا اور وہ اپنے بستروں سے چل کر قربان گاہ کی طرف گئے۔ اور وہ دن بھی دور نہیں کہ جب پیش خدا تیرا اور ان کا مقابلہ ہوگا۔ اور تجھ کو اپنے کرتوت پر جوابدہی کرنا ہوگی۔" (۲)

اس پر ابن زیادؔ کو غصہ آ گیا اور اس نے آپ کو نا زیبا ایذا رسانی کا ارادہ کیا۔ مگر عمرو بن حریث وغیرہ کے سمجھانے سے باز رہا۔ پھر بھی اس نے آپ کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ "خدا نے میرے دل کی مراد پوری کر دی تمھارے سرکش بھائی اور گھرانے کے دوسرے نافرمان اور باغی اشخاص کو قتل کر کے۔" اس کے اس طرز کلام سے زینب کبریٰؑ کے دل پر چوٹ لگی۔ اور آپ کی آنکھوں

---

(۱) طبری ج ۶ صہ ۲۶۳

سے آنسو نکل آئے۔ مگر آپ نے صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے اُس کے جواب میں کہا کہ "ہاں بے شک تو نے میرے عزیزوں کو قتل کیا ہے، میری شاخوں کو کاٹ ڈالا ہے اور میری جڑ کو اکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔ اگر تیری مراد اس سے بر آ گئی ہے تو خوش ہو لے۔"

اس نے کہا "یہ بڑی قافیہ باز عورت ہے اور اس کے باپ بھی تو شاعر اور قافیہ باز تھے۔"

جناب زینبؑ نے پھر سکوت مناسب نہ سمجھتے ہوئے فرمایا "بھلا ایک عورت کو قافیہ بندی اور شاعری سے کیا تعلق، اور میں تو اس عالم میں ہوں کہ مجھے قافیہ بندی کا ہوش کہاں! لیکن دل کی آواز تھی جو میرے دہن سے نکل گئی۔" (۱)

اس کے بعد وہ حسینؑ کے بیمار فرزند کی طرف مخاطب ہوا۔ اور آپ کا نام دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا "علیؑ بن الحسینؑ"، وہ کہنے لگا "کیا اللہ نے علیؑ بن الحسینؑ کو قتل نہیں کیا؟" آپ نے سکوت کیا۔ ابن زیاد نے کہا "کیوں کچھ بولتے کیوں نہیں۔" آپ نے فرمایا کہ "میرے ایک اور بھائی کا نام بھی علی تھا۔ جن کو لوگوں نے قتل کر دیا۔" اُس نے کہا "نہیں بلکہ اللہ نے قتل کیا۔" آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی کہ "اللہ یتوفی الانفس حین موتھا"، یعنی "اللہ ہی موت کے وقت قبض روح کرتا ہے" یہ اور بات ہے۔ وہ بولا کہ "یہ بچہ نہیں ہے۔ سمجھ دار ہے۔ لیجاؤ اس کو بھی قتل کر دو۔" یہ سننا تھا کہ جناب زینب کبریٰ دوڑ کر اپنے بھتیجے سے لپٹ گئیں اور کہا مجھے بھی ان ہی کے ساتھ قتل کیا جائے۔ جناب زینبؑ کی اس بے تابی سے وہ ظالم بھی متاثر ہو گیا اور کہا "رہنے دو!

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۶۳ ارشاد ص ۲۵۹ (۲) طبری ج ۶ ص ۲۶۳

ان عورتوں کو لے کر یہی جائے گا۔" (۱)

لیکن موت پر فتح پانے والے بیمار نے نہایت جرأت و استقلال کے ساتھ فرمایا کہ:۔

"ابن زیاد تو مجھے موت سے ڈراتا ہے؟! کیا تو نہیں جانتا کہ قتل ہونا ہماری عادت ہے اور شہادت ہماری فضیلت۔" یہ وہ پر شکوہ آواز تھی جو دربار ابن زیادؑ میں گونجی اور ہر شخص نے سہم کر اس کو سنا۔ ابن زیاد عرق انفعال میں ڈوب گیا۔

اس نے دربار برخاست کر دیا۔ لیکن قیدیوں کو اس وقت تک کے لئے قید خانے میں رکھے جانے کا حکم دیا۔ جب تک کہ دمشق سے ابن زیادؑ کا قاصد اُس کے تہنیت نامہ کا جواب لے کر واپس نہ آجائے۔

اس کے بعد ابن زیادؑ نے تمام اہل کوفہ کو مسجد جامع میں جمع ہونے کا حکم دیا۔

جب لوگ جمع ہوگئے تو عبیداللہ بن زیاد نے منبر پر جاکر بطریق اعلان عام یہ ناروا کلمات اپنی زبان پر جاری کئے کہ "الحمد للہ الذی ظھر الحق واھلہ ونصر امیرالمومنین یزید بن معاویۃ وحزبہ وقتل .... الحسینؑ بن علی وشیعۃ" ان الفاظ میں اپنی فتح کا اعلان کرتے ہوئے جناب امیرؑ اور حضرت امام حسینؑ کے لئے انتہائی نازیبا الفاظ استعمال کئے تھے۔ جن کے سنتے ہی عبداللہ بن عفیف ازدی کھڑے ہوگئے۔ یہ شیعیان علیؑ میں سے ایک تھے جن کی بائیں آنکھ جنگ جمل میں جناب امیرؑ کی نصرت میں کام آئی تھی۔ اور پھر صفین میں سر پر

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۶۳

ایک تلوار پڑی اور دوسری ضرب ابرو پہ پڑی جس سے داہنی آنکھ بھی جاتی رہی۔ اب ان کا دستور یہ ہو گیا کہ یہ صبح کو مسجد جامع میں آجاتے تھے اور رات تک نمازوں میں مصروف رہتے تھے۔ پھر واپس جاتے تھے۔ انھوں نے ابن زیاد کے ان الفاظ کی رد کرتے ہوئے کہا۔ "او پسر مرجانہ! تو جھوٹا اور تیرا باپ جھوٹا۔ اور وہ جھوٹا جس نے تجھ کو حاکم بنایا اور اس کا باپ۔ او مرجانہ کے لڑکے! پیغمبر کی اولاد کو قتل کرنے کے بعد راستبازوں کی طرح کلام کرنا چاہتا ہے؟ ——" ابن زیاد نے غضبناک ہو کر سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ ان کو گرفتار کر لیں مگر عبداللہ نے اپنی قوم ازد کو آواز دی جس کے سات سو جنگی جوان کوفہ میں موجود تھے۔ چنانچہ کچھ بہادر ازدی ان کی امداد کے لئے آگئے اور سپاہیوں کے ہاتھ سے ان کو چھڑا کر نکال لے گئے اور ان کے مکان پر پہونچا دیا مگر رات کو مخفی طور سے ابن زیاد نے پھر ان کے گھر سے انھیں گرفتار کرایا اور بے رحمی کے ساتھ ان کو قتل کرا دیا اور ان کی لاش کو دوسروں کی عبرت کے لئے دار پر کھینچا (۱)

دوسرے دن ابن زیاد کے حکم سے سر امام حسینؑ کو کوفہ کے کوچہ و بازار اور تمام قبائل میں گردش دی گئی۔ اور پھر دروازۂ قصر پر آویزاں کرا دیا گیا۔ (۲)

جس زمانہ میں اہل بیت اطہار کوفہ میں اسیر تھے عام خیال یہ تھا کہ یزید تمام قیدیوں کے قتل کر دیئے جانے کا حکم دے گا۔ اسی دوران میں کہ جب اسرائے آل محمدؐ کوفہ میں قید تھے ایک دن کسی نے قیدخانے میں ایک پتھر

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۶۳۔ ۲۶۴ ارشاد صفحہ ۲۴۱ (۲) ارشاد صفحہ ۲۴۰

پھینکا جس میں اس مضمون کی ایک تحریر بندھی ہوئی تھی کہ آپ کے معاملات کے لئے ایک خط یزیدؔ کے پاس بھیجا گیا ہے۔ قاصد اس تاریخ کو جا رہا ہے اور اس تاریخ تک پلٹے گا۔ اگر تا وقت تکبیر کی آواز سنائی دے تو اپنے متعلق حکم قتل کا یقین کر لیجئے گا۔ اور اگر تکبیر نہ سنائی دے تو سمجھ لیجئے گا کہ انشاء اللہ امان ہے۔ لیکن قاصد کے آنے پر تکبیر کی آواز بلند نہیں کی گئی۔ کیونکہ یزیدؔ نے حکم دیا تھا کہ قیدیوں کو دمشق روانہ کر دو۔ (۱)

ابن زیاد نے حکم دیا کہ امام حسینؑ کے سر کو نوک نیزہ پر بلند کر کے تمام شہر میں گردش دی جائے پھر تمام شہداء کے سروں کو زحر بن قیس وغیرہ چند آدمیوں کے سپرد کیا اور انھیں دمشق کی طرف روانہ کیا اور ان کے عقب میں بیمار و ناتوان علی بن الحسینؑ کی گردن میں طوق ڈال کر اور اہل حرم کو اونٹوں پر سوار کر کے محضر بن ثعلبہ عائذی اور شمر بن ذی الجوشن کی نگرانی میں روانہ کیا۔ (۲)

خاندان رسول کی تاراجی اور اپنی کامیابی کو نمایاں کرنے کے لئے عراق سے دمشق جانے کا وہ راستہ اختیار کیا گیا جس میں آبادیاں زیادہ پڑتی تھیں۔ راستے بھر امام زین العابدینؑ کا عالم یہ تھا کہ کسی سے کلام نہیں کرتے تھے۔ بالکل خاموش چلے جاتے تھے۔ (۳) لیکن پسماندگان حسینؑ کے اس طرح تشہیر کئے جانے سے عام طور پر اموی حکومت کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا جانے لگا۔ اور بہت سے مقامات پر بے چینی اور برہمی کے آثار نمودار ہوئے۔ بہرحال طرح طرح کے اندوہ و مصائب کو برداشت کرنے کے بعد یہ پسماندگان دمشق میں داخل ہوئے۔ اس دن وہاں کے بازار خاص اہتمام سے سجائے گئے تھے۔

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۶۶ (۲) الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۹ طبری ج ۶ صفحہ ۲۶۶ ارشاد صفحہ ۲۶۰

(۳) طبری ج ۶ صفحہ ۲۶۴

اور مجمع کی یہ کثرت تھی کہ آفتاب نکلنے کے ساتھ ہی داخل ہونے کے باوجود کہیں زوال کے وقت دربار یزید میں پہنچ سکے تھے۔ جب خاندان رسالت کا یہ لٹا ہوا قافلہ بازار سے گزر رہا تھا تو ابراہیم بن طلحہ بن عبداللہ نے علی بن الحسینؑ سے طنزاً پوچھا کہ "اے فرزند حسینؑ فتح کس کی ہوئی؟" آپ نے جواب میں فرمایا "تم کو اگر معلوم کرنا ہے کہ فتح کس کی ہوئی تو نماز کے وقت جب اذان و اقامت کہنا اس وقت معلوم کر لینا کہ کس کو فتح ہوئی اور کس کو شکست"۔

جب اہل بیت نبوت حالت اسیری میں دروازہ مسجد دمشق پر پہونچے تو ایک بوڑھا سامنے آیا اور اُس نے اُن کو دیکھ کر کہا۔ "حمد ہے اُس خدا کی جس نے تم کو قتل اور ہلاک کیا۔ اور ملکوں اور شہروں کو تمھارے مردوں سے خالی اور پرامن بنایا۔ اور امیر المومنین یزید کو تم پر غلبہ عطا فرمایا"۔ اس بوڑھے سے یہ کلمات سُن کر بیمار کربلا علیؑ بن الحسینؑ نے فرمایا "اے شیخ کیا تو نے قرآن میں یہ آیت پڑھی ہے "قل لا اسئالکم علیه اجراً الا المودۃ فی القربیٰ" (یعنی) کہدو (اے ہمارے حبیب) کہ میں سوائے اپنے ذوی القربیٰ (اہلبیت) کی مودت و محبت کے تم سے اور کوئی اجر و معاوضہ اس تبلیغ رسالت پر نہیں مانگتا۔ بوڑھے نے کہا کہ "ہاں یہ آیت میں نے پڑھی ہے"۔ آپ نے فرمایا وہ ہم ہی ہیں جن کی محبت تم پر فرض کی گئی ہے۔ پھر فرمایا۔ کیا یہ آیت بھی پڑھی ہے۔ واعلموا انما غنمتم من شئی فان للہ خمسه وللرسول ولذی القربیٰ (یعنی) "یاد رکھو کہ جو تم کچھ منفعت حاصل کرو اور جو مال بغیر مشقت پاؤ اس میں سے پانچواں حصہ اللہ، رسولؐ اور ان کے ذوی القربیٰ کا حق نکال دو۔ اس نے عرض کیا کہ ہاں یہ آیت بھی پڑھی ہے۔ آپ نے فرمایا وہ ذوی القربیٰ ہم ہی ہیں جن کا یہ حق خمس میں نکالنا واجب ہے اور کیا یہ بھی پڑھا ہے کہ (انما یرید اللہ لیذهب

عنکم الرجس اہل البیت و یطھرکم تطھیرا"۔ اُس نے عرض کیا کہ بے شک پڑھا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ اہل بیت نبوت ہم ہی ہیں جن کو خدا نے برائی سے پاک رکھا اور معصوم بنایا ہے۔ بوڑھا یہ سن کر حیران ہو گیا۔ اس نے تصدیق کے طور پر دریافت کیا کہ "خدا کی قسم سچ سچ تم وہی ہو؟" آپ نے زور دے کر فرمایا کہ ہاں قسم بخدا ہم وہی آل رسول اہل بیت نبوت ذوی القربائے رسالت ہیں۔ بلا شک و شبہہ اور اپنے جد رسول اللہؐ ہی کی قسم کہ ہم وہی ہیں۔ یہ سننا تھا کہ بوڑھے نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا۔ عمامہ سر سے پھینک دیا۔ سر آسمان کی طرف بلند کیا اور کہا کہ "خداوندا گواہ رہنا کہ میں ہر دشمن آل محمدؐ سے چاہے وہ جن ہو یا انس بیزار ہوں اور اُن سے دوری چاہتا ہوں"۔ پھر بیمار کربلا کی طرف مخاطب ہو کر پوچھنے لگا کہ "کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟" آپ نے فرمایا، ہاں اگر تم توبہ کرو تو قبول ہو گی اور تم ہمارے اصحاب میں شمار ہو گے۔ اُس نے عرض کیا "میں توبہ کرتا ہوں اس گستاخی سے جو میں نے عدم معرفت کی بنا پر آپ کی شان میں کی تھی"۔

اس واقعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ بنی امیہ کے پچاس برس کے پروپگنڈے کے نتیجہ میں عام مسلمان خصوصاً اہل شام کس حد تک آل محمدؐ سے ناآشنا ہو چکے تھے۔

ابن القفطی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ جس وقت اسرائے آل محمدؐ اور سرہائے شہدا دمشق میں داخل ہو رہے تھے اُس وقت یزید اپنے محل کے بالاخانہ پر جو مقام جیرون میں تھا اس منظر کا مشاہدہ کرنے کے لئے موجود تھا اور جونہی سرہائے شہدا نیزوں پر دور سے نظر آئے اس نے یہ اشعار پڑھے :۔

لما بدت تلک الحمول و اشرفت تلک الرؤس علی ربی جیرون نعب الغراب فقلت قل او لا تقل فلقد قضیت من الرسول دیونی"

"جب وہ سواریاں نظر آئیں اور اُن سروں کا سایہ جیرون کے ٹیلوں پر پڑا تو کوا کائیں کائیں کرنے لگا۔ (جو کہ نحوست کی نشانی سمجھی جاتی تھی) میں نے کہا تو بول یا نہ بول میں نے بہر حال پیغمبر سے اپنے قرضے وصول کر لئے ہیں:"

ان دو شعروں سے ہی یزیدؒ کی غلط ذہنیت کا انکشاف صاف طور پر ہو جاتا ہے۔ یعنی امام حسینؑ آپ کے انصار اور اہل حرم کے خلاف جو جو مظالم … گئے … تھے ان کو وہ حضرت محمد مصطفیٰؐ سے قرضہ وصول ہونے کے برابر سمجھتا تھا۔

شہر دمشق میں داخل ہونے کے بعد یہ قافلہ اس دروازے کے پاس جو دربار شاہی سے قریب تھا روک دیا گیا۔ اور وہاں کافی دیر تک ٹھہرائے رکھے جانے کے بعد اُس کو اذن حضوری ملا۔ اور اُس دربار میں جو خصوصیت کے ساتھ آراستہ کیا گیا تھا۔ خاندان رسالت مثلی غلامان حبش و کنیزان ترک و دیلم اور طشت طلا میں حسینؑ مظلوم کا سر مبارک یزیدؒ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔

زحر بن قیس نے غلط طور سے بڑھا چڑھا کر اپنی جماعت کی بہادری اور اصحاب حسینؑ کی بے بسی کا نقشہ کھینچتے ہوئے روئداد جنگ یزیدؒ کو سنائی جس کا مضمون یہ تھا کہ سرکار والا حسینؑ ابن علیؑ عراق کی طرف … اٹھارہ آدمیوں کو لئے ہوئے اپنے اہل بیت میں سے اور ساٹھ آدمیوں کے ساتھ اپنے شیعوں میں سے تو ہم ان کے مقابلہ کے لئے گئے اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ غیر مشروط طریقہ پر اپنے کو امیر عبیداللہ بن زیاد کے سپرد کر دیں یا جدال و قتال پر آمادہ ہو جائیں انھوں نے جنگ کو سپردگی کے مقابلہ میں ترجیح دی۔ تو سورج نکلنے کے بعد ہی ہم نے ان کو چاروں طرف سے گھیر کر اس طرح حملہ کر دیا جس

طرح کبوتروں پر شکرے حملہ کرتے ہیں۔ جس سے اُن کو کسی طرف پناہ نہ ملتی تھی۔ چنانچہ زیادہ دیر گزرنے نہ پائی کہ ان کا پورے طور پر خاتمہ کر دیا گیا۔ اور اُن کے جسم بے لباس خاک و خون میں آلودہ چھوڑ دیئے گئے۔ (۱)

اس موقع پر یزید اپنے بدمار کے ساتھ بیٹھا ہوا شطرنج کھیل رہا تھا۔ اور شراب کے نشہ میں یہ شعر گا رہا تھا۔

الا یا ایھا الساقی ادر کاسا وناولھا

پھر کیف سرور کے ساتھ ساتھ بے دینی کا پارہ اور اونچا ہوا اور وہ یہ اشعار پڑھنے لگا۔

لیت اشیاخی ببدر شھدوا جزع الخزرج من وقع الاسل
لاھلوا واستھلوا فرحا ولقالوا یا یزید لا تشل!
لعبت ھاشم بالملک فلا خبر جاء ولا وحی نزل

یعنی آج اگر جنگ بدر والے بزرگ زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ دین محمدی کے انصار کس طرح نیزوں کے پڑنے سے گھبرا گئے ہیں۔ تو وہ اس صورت میں خوش ہو کر مجھے دعائیں دینے لگتے۔ بنی ہاشم نے حصول سلطنت کا ایک کھیل کھیلا تھا۔ حقیقت میں نہ کوئی خبر آئی تھی اور نہ کوئی وحی نازل ہوئی تھی۔

یہ سننا تھا کہ جناب زینب کبریٰ کھڑی ہو گئیں اور آپ نے معرکۃ الآرا تقریر شروع کی جس نے یزید کے جاہ و جلال کی تمام بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ "کتنا سچا ہے میرے پروردگار کا ارشاد کہ" آخر میں اُن لوگوں

---

(۱) طبری ج ۷ صفحہ ۳۷۶۔ ارشاد صفحہ ۲۶۱ دینوری نے اس تقریر کو شمر کی طرف منسوب کر کے درج کیا ہے (الاخبار الطوال صفحہ ۲۵۷-۲۵۸)

کی جو برے اعمال کرتے ہیں یہ نوبت پہونچی کہ وہ آیات خداوندی کی تکذیب کرتے اور ان کی ہنسی اڑانے لگے" تو نے اے یزید! کیا یہ گمان کیا ہے کہ چونکہ تو نے ہم پر زمین و آسمان کے تمام راستوں کو بند کرتے ہوئے ہم کو اس حالت پر پہنچا دیا ہے کہ آج ہم تیرے سامنے قیدیوں کی طرح لائے جا رہے ہیں تو اس سے خدا کے نزدیک بھی ہم حقیر اور تو با عزت قرار پا گیا۔ یا یہ کہ تجھے یہ ظاہری کامیابی تیرے مقرب بارگاہ الٰہی ہونے کی جہت سے حاصل ہوئی ہے۔ اسی خیال کے ماتحت تو خوش ہو ہو کر اپنے شانوں پر نظر ڈال رہا ہے۔ اس لیۓ کہ اس وقت تجھ کو یہی دکھائی دے رہا ہے کہ دنیا تیرے حکم کی پابند اور امور مملکت منظم و مرتب ہیں۔ اور سلطنت و حکومت تیرے لئے تمام خطرات سے پاک و صاف ہو گئی ہے۔ کیا تو بھول گیا خدا کے قول کو کہ نہ خیال کریں وہ لوگ جنھوں نے کفر اختیار کر رکھا ہے کہ ہم جو ان کو مہلت دیتے ہیں وہ ان کے لئے کسی بہتری کا باعث ہو گی۔ ہم ان کو صرف اس لئے مہلت دیتے ہیں کہ وہ خوب دل کھول کر گناہ کر لیں بالآخر تو ان کے لئے حقارت آمیز سزا مقرر ہی ہے۔ کیا اسلامی غیرت و حمیت اسی کی متقاضی ہے کہ تو اپنی عورتوں بلکہ کنیزوں تک کے لئے پردہ کا اہتمام کرے اور رسول ؐ کی نواسیوں کو قید کر کے در بدر پھرائے اور پھر اس پر یہ کہنے کی جرأت کرے کہ "لاھلوا واستھلوا فرحا" گویا تو اپنے مشرک بزرگوں سے داد کا طالب ہے۔ گھبرا نہیں تھوڑے ہی دنوں میں تو بھی اسی گھاٹ اتارا جائے گا اور اس وقت تو آرزو کرے گا کہ کاش تیرے ہاتھ شل اور زبان گنگ ہوتی اور تو نے جو کچھ کہا اور کیا وہ نہ کہا اور نہ کیا ہوتا۔ تیرے لئے اس سے بدتر کیا ہو سکتا ہے کہ روز حشر خدا تیرا فیصلہ کرنے والا، محمد مصطفےٰ ؐ تیرے مقابل میں مدعی اور جبرئیل ان کی طرف سے دعویٰ کے گواہ ہوں گے۔ اس وقت ان لوگوں کو بھی جنھوں نے

تیرے افعال کی تائید کی ہے اور تیرا ساتھ دے کر تجھے مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط رکھا ہے۔ معلوم ہو جائے گا۔ کہ ظالموں کو کیسا برا بدلا دیا جاتا ہے۔ اگرچہ انقلاب زمانہ نے یہ نوبت پہونچا دی ہے کہ میں تجھ سے بات کر رہی ہوں۔ میری نظروں میں تیری کوئی وقعت نہیں حتیٰ کہ تیری توبیخ و سرزنش کو بھی میں اپنے لئے ایک بڑی مصیبت خیال کرتی ہوں۔ لیکن کروں کیا کہ دل بھرا ہوا ہے اور کلیجے میں آگ لگی ہے۔ خدا کی شان کہ خدا پرست افراد شیطانی لشکر کے ہاتھوں قتل ہوں ــــــــــ

اچھا (اے یزید تجھ کو قسم ہے) تو کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھ۔ اور اپنی پوری کوشش صرف اپنی تمام جد و جہد ختم کر دے، لیکن خدا کی قسم تو ہمارے ذکر کو اور ہماری زندگی کو فنا نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہمارے اصلی مقصد کو تو پہونچ سکتا ہے۔ اس خون ناحق کا دھبا تیرے دامن پر قیامت تک باقی رہے گا۔ اور تو کبھی اس کو دھو نہیں سکتا۔

تیری رائے یقیناً غلط۔ تیری زندگی بہت محدود، اور تیرے ارد گرد کا مجمع بہت جلد تتر بتر ہونے والا ہے۔ وہ دن بہت نزدیک ہے جب منادی ندا کرے گا کہ "ظالموں پر خدا کی لعنت ہے"۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمارے پہلے بزرگوں کا انجام سعادت کے ساتھ اور ہمارے آخری بزرگ کا انجام شہادت و رحمت کے ساتھ مقرر کیا۔ اور وہی ہمارے لئے کافی اور بہترین ناصر و معین ہے"۔

اب یزید نے امام زین العابدین ؑ کی دل آزاری کرنا چاہی اور آپ کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن کی یہ آیت پڑھی، وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم "جو مصیبت تم پر آئی وہ تمہارے ہاتھوں آئی"۔ امام نے دوسری قرآنی آیت پڑھتے ہوئے بتایا کہ ہم پہلی آیت کے مصداق نہیں ہیں بلکہ اس آیت کے مصداق ہیں:- ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب مبین من قبل ان نبرأھا ان ذلک[1]

---

[1] کافی ج ۱ ص ۵۰۳

مطلب یہ ہوا کہ ہماری مصیبت ایک عہد و پیمان کے مطابق ہے جو ازل سے قلم بند ہو چکا تھا اور جس کی تکمیل ضروری تھی۔

پیہم حق کے اعلانات نے حاضرین کی نگاہوں سے باطل کے پردے بھی ہٹائے اور جرأت اظہار بھی پیدا کی۔ چنانچہ جب یزید نے بھی لب و دندان حسینؑ کے ساتھ اس بے ادبی کا اعادہ کیا جو کوفہ میں ابن زیاد کر چکا تھا، غالباً اس خیال کے ماتحت کہ کوفہ شیعیان علیؑ کا مرکز رہ چکا تھا۔ لہذا زید بن ارقم ابن زیاد کو بر سر دربار ٹوک دینے کی ہمت کر سکے، بھلا دمشق میں کس کی مجال ہو گی کہ مجھ پر معترض ہو سکے۔ مگر ہوا یہاں بھی وہی۔

ابو برزۂ اسلمی کھڑے ہو گئے اور کہا ارے، تو اپنی چھڑی اس لب و دندان پر لگاتا ہے جسے میں نے اکثر دیکھا کہ اس پر رسول اللہ ؐ اپنا منھ رکھتے تھے۔ یاد رکھ کہ اب قیامت کے دن بس تیری شفاعت ابن زیاد ہی کرے گا (۱)

باوجود اس سب کے یزید لعین کی ان جسارتوں اور گستاخیوں کو دیکھ کر اہل دربار کی ہمتیں بڑھ گئی تھیں، چنانچہ ایک سرخ رنگ شامی کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اے امیر المومنین! یہ لڑکی مجھے دے دیجئے اور اشارہ کیا اُس نے فاطمہ بنت الحسینؑ کی طرف۔ یہ سننا تھا کہ آپ کانپنے لگیں اور اپنی پھوپھی جناب زینب کبریٰؑ سے لپٹ گئیں۔ جناب زینبؑ نے بچی کو تسلی دی اور بلند آواز سے اس شامی سے کہا کہ کیا بکتا ہے۔ بخدا تو مر بھی جائے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ نہ یزید ایسا کر سکتا ہے۔ آپ کے آخری فقرہ پر یزید کو طیش آ گیا اور وہ کہنے لگا "تم غلط کہتی ہو مجھے اس کا اختیار حاصل ہے اور اگر میں چاہوں تو ایسا یقیناً کر سکتا ہوں"۔ جناب زینبؑ

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۶۷

نے فرمایا " جب تک اسلام کا دعویٰ رکھتا ہے تو ہرگز ایسا نہیں کر سکتا، یہ اور بات ہے کہ علی الاعلان تو ہمارے مذہب سے خارج ہو کر کوئی دوسرا دین اختیار کر لے " اس پر یزید کا غصہ اور بڑھا اور وہ کہنے لگا " مجھ سے تم ایسی باتیں کرتی ہو۔ دین سے خارج تو تمھارے باپ اور بھائی تھے " جناب زینبؑ نے جواب دیا کہ میرے باپ اور بھائی کے دین ہی کو بظاہر اختیار کر کے تو اور تیرا باپ اور دادا مسلمان کہلائے " یزید اس کے بعد اور زیادہ سخت کلامی پر اتر آیا۔ ناچار زینب کبریٰ کو یہ کہنا پڑا کہ " یزید تو ایک ظالم حاکم ہے اور اپنے جبر و تشدد سے ہم کو دبانا چاہتا ہے " آپ کے اس جواب سے یزید کو کچھ شرم دامن گیر ہوئی اور وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد جب شامی نے پھر اپنی درخواست کو دہرایا تو یزید نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا اور کہا کہ " دور ہو خدا تجھے غارت کرے "(۱)

ایک دفعہ دربار میں یزید نے حضرت امام زین العابدین سے مخاطب ہو کر کہا " اے علی ابن الحسینؑ تمھارے باپ نے میری قرابت داری کا خیال نہ کیا میرے حقوق کو نظر انداز کیا اور میری سلطنت میں منازعت کی تو اللہ نے اُن کے ساتھ وہی کیا جو تم دیکھ رہے ہو ۔۔۔۔ " امام نے اس کے جواب میں وہی آیت پڑھی کہ ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا مطلب یہ تھا کہ یہ تو عالم امکان میں لیل و نہار رہتا ہی ہے کسی کی فتح اور کسی کی شکست۔ اس کو دلیل حقانیت نہیں سمجھنا چاہیے۔

اب یزید کو فتح کی ترنگ اور بڑھی۔ یہ اس کی نفسیاتی خلش کا اثر تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ خود میرے دربار میں ہر شخص مجھے مجرم سمجھ رہا ہے۔ وہ صفائی کی

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۶۵ ارشاد صفحہ ۲۶۳۔

کوشش کرنے لگا۔ جو مزید اس کے خبث نفس کا ثبوت بن گئی۔ وہ اپنے خاندان کی مدت دراز کی اس سیاست کو کہ آل رسولؐ سے عوام کو ناواقف رکھا جائے فتح کے نشہ میں خود شکستہ کر رہا تھا۔ اس نے کہا "تم لوگ جانتے ہو ان پر یہ مصیبت کیوں آئی! صرف اس لئے کہ یہ اپنی جگہ سمجھتے تھے کہ میرے باپ علیؑ اس (یزید) کے باپ سے بہتر اور میری ماں اس کی ماں سے بہتر اور میرے نانا اس کے نانا سے بہتر تھے اور میں خود اس سے بہتر اور خلافت کا اس سے زیادہ مستحق ہوں۔ حالانکہ ان کا یہ خیال کہ ان کے باپ میرے باپ سے بہتر تھے اس کا تصفیہ یوں ہو جاتا ہے کہ میرے باپ اور ان کے باپ کے درمیان جھگڑا ہوا تو دنیا کو معلوم ہے کہ اس کا فیصلہ کس کے موافق ہوا۔ بے شک ان کا یہ کہنا کہ ان کی ماں میری ماں سے بہتر تھیں اور یہ بھی کہ ان کے نانا میرے نانا سے بہتر تھے۔ یقیناً درست ہے اس لئے کہ کوئی مسلمان رسولؐ کا مدِ مقابل دوسرے کو نہیں سمجھ سکتا۔ مگر قرآن کی یہ آیت ان کے پیش نظر نہ تھی کہ سلطنت کا مالک اللہ ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلب کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ وہ ہر شئے پر قادر ہے۔"

اس تقریر سے ظاہر ہے کہ اوصاف امتیازی کے مقابلہ میں یزیدؔ نے اپنی شکست کا اقرار کر لیا۔ مگر آخر میں دلیل وہی قہر و غلبہ کی پیش کر دی۔ جس کی بنا پر نمرود، فرعون اور شداد تک بے جرم و خطا ثابت کئے جا سکتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ معیار حقانیت نہیں ہے نہ قرآن کی آیت کا یہ مطلب ہے۔

خاندان بنی امیہ کا ایک شخص یحییٰ بن الحکم ان حالات سے اتنا متاثر

والد کا اور میرا سامنا ہو جاتا تو جو کچھ وہ فرماتے میں منظور کر لیتا اور کبھی ان کو نقل کرنا گوارا نہ کرتا۔ بہر طور خدا کو جو منظور تھا وہ ہوا۔ اب آپ مدینہ تشریف لے جائیے اور وہاں سے مجھے خط لکھتے رہیے گا اور جو کبھی ضرورت ہو اس سے مجھے مطلع کیجئے گا (۱)

اس کے بعد تیس آدمی نعمان بن بشیر کے ساتھ کیے گئے اور نعمان نے حسب ہدایت اہل بیت رسالت کے ساتھ راستے بھر پورے احترام کا برتاؤ رکھا اور ان کو مدینہ تک پہونچا دیا۔ (۲)

اس لٹے ہوئے قافلہ کے پہنچنے سے مدینہ میں ایک کہرام برپا تھا۔ پردہ نشین خواتین تک بے تابانہ گھروں سے نکل آئی تھیں چنانچہ خاندان عبد المطلب کی ایک خاتون کا یہ عالم تھا کہ وہ بال بکھرائے ہوئے درد انگیز نوحہ پڑھ رہی تھیں جس کا مضمون یہ تھا کہ روز قیامت رسول خدا کو کیا جواب دو گے جب وہ پوچھیں گے کہ تم نے میرے بعد میرے اہل بیت سے کیا سلوک کیا۔ جن کا عالم یہ ہے کہ کچھ ان میں سے قیدی بنائے گئے ہیں اور کچھ خاک و خون میں آغشتہ ہوئے۔ کیا میرے خدمات کا یہی صلہ تھا کہ تم میری اولاد کے ساتھ میرے بعد یہ سلوک کرو (۳)

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۶۶ - ارشاد ص ۲۶۳ (۲) الاخبار الطوال ص ۲۵۸

(۳) طبری ج ۶ ص ۲۲۱

اکتیسواں باب

اسیریِ اہلِ حرم کے واقعات پر ایک جامع تبصرہ

گزشتہ واقعات کی روشنی میں پورے طور پر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یزید کو انکارِ بیعت کے بہانے صرف قتلِ حسینؓ ہی مقصود نہ تھا بلکہ حقیقتہً وہ اُس روحانی مرکز کو فنا کرنا اور عوام کی نظروں سے گرانا چاہتا تھا جو تعلیماتِ اسلامی کا محافظ ہوتے ہوئے ناجائز اقتدار کے تصرفات میں کسی بھی جماعت کے ساتھ تعاون نہ کر سکتا تھا اور اس کی تمام ذمہ داری دمشق کی مرکزی حکومت پر تھی جس نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے مدینہ فرمان بھیجا، حاکم مدینہ کو بدلا، مکہ میں حاجیوں کے لباس میں فوج کے سپاہی بھیجے۔ ابنِ زیاد کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا اور اسے اس مہم کو سر کرنے کا پورا اختیار دیا۔ اگر یہ سب باتیں حکمِ یزید سے نہ ہوئی ہوتیں تو ابنِ زیاد اہلِ بیت کو دمشق نہ بھیجتا، کوفہ ہی میں قید رکھتا پھر اس کے اطلاع دینے کے بعد اگر یزید کو اہلِ بیتِ رسالت کی تذلیل و توہین مدِنظر نہ ہوتی تو قید کر کے شام بلانے کی کوئی وجہ نہ تھی بلکہ کربلا یا کوفہ ہی سے وہ مدینہ روانہ کر دیئے جاتے شہادتِ امام حسینؓ تک تو بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے کہ یزید کو اطلاع نہ تھی اور وہ ابنِ زیاد کا ذاتی فعل تھا مگر شہادتِ حسینؓ کے بعد تو ابنِ زیاد نے پسماندگانِ حسینؓ

کراہی غرض سے کوفہ میں ٹھہرائے رکھا کہ ان کے متعلق یزید سے ہدایات حاصل کیے
جائیں۔ چنانچہ اس کے بعد سے جو کچھ عملدرآمد ہوا وہ قطعاً یزید کے احکام سے
ہوا۔ پھر بھی کیا اس خیال کی گنجائش باقی رہ سکتی ہے کہ سرہائے شہداء اور
اہل حرم کو قید کر کے دمشق بھیجنا بھی ابن زیاد کا ذاتی فعل تھا۔

پھر اگر یزید کو خواہ مخواہ ان حضرات کی توہین منظور نہ تھی تو کوئی مکان
پہلے سے مہیا کیا جاتا اور اسی میں اہل بیت رسالت کو اتارا جاتا۔ اور یزید نے پہلی
ہی بار عزت و احترام کے ساتھ سید سجاد علی ابن الحسینؑ سے ملاقات کی ہوتی مگر
تاریخیں متفق ہیں کہ اہل حرم شام پہنچے تو یزید نے دربار عام اور نامحرموں کے
مجمع میں اسیران آل محمدؐ کو طلب کیا۔ اور کچھ نہ ہوا ہوتا تو اہل بیت کی یہی کیا کم
بے حرمتی تھی جو بلا واسطہ یزید کی منشا سے بالخصوص عمل میں آئی تھی نہ کہ مزید برآں چوب
خیزران اور سر حسینؑ کے ساتھ بے ادبی اور وہ قیامت خیز منظر تھا کہ جس پر مسلمان
تو مسلمان عیسائی بھی احتجاج کرنے پر مجبور ہو گئے۔

خیال کیا جا سکتا ہے کہ ان تمام مظالم کا موقع خود امام حسینؑ نے دیا۔ اہل
حرم کو اپنے ساتھ رکھ کر اسی لیے یہ امامؑ کے عمل کا نازک ترین پہلو سمجھا گیا ہے
جس سے مشورہ دینے والے منع کر رہے تھے مگر حسینؑ نے ان کا اپنے ساتھ رکھنا
ضروری سمجھا تھا۔

حالانکہ عام طور پر میدان جنگ میں عورتوں اور بچوں کا کسی فریق کے
ساتھ موجود ہونا ان کی حفاظت اور دفاعی مشکلات بہت بڑھا دیتا ہے اور فریق
مخالف کے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔

المنعمین بنتی بنی سعد حین اجلبت　　　　علینا الوکلایا والرعد والمباسل

(یعنی) افسوس ہے کہ اس جنگ کے میدان میں ہمارے خلاف فوج کشی کی ہمارے

ساتھ کی عورتوں اور کمسن بچوں نے مل کر۔ اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا
ہے کہ امام حسینؑ اپنے ساتھ اہل و عیال کیوں لے گئے۔ جب ان کو ہر قسم کا خطرہ تھا
حقیقت یہ ہے کہ امام حسینؑ نے بھی مشورہ دینے والوں کے ان خیالات کو رد نہیں کیا جو
آئندہ کے خطرات کے متعلق وہ پیش کر رہے تھے۔ بلکہ جس وقت آپ نے ان کا جواب
دیا تو جانا ناگزیر بتایا۔ کبھی یہ کہہ کر کہ خدا کی یہی مشیت ہے کہ یہ قیدی ہوں۔ اور کبھی یہ کہہ
کر کہ جو مقدر میں ہے وہ ہو کر رہے گا۔ ان باتوں سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ
امام حسینؑ تمام خطرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اہل حرم کا اپنے ساتھ رہنا ضروری
سمجھتے تھے اور اس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے ساتھ رکھنے کو آپ کے
مقصد کی تکمیل میں بڑا دخل تھا۔ اور وہ یہ کہ براہ راست حضرت امام حسینؑ کو اپنا
ذاتی اختیار رکھتے ہوئے کسی سلطنت سے مقابلہ ہرگز مقصود نہ تھا۔ آپ کا نقطۂ نظر یہ نہ تھا
کہ خود تخت حکومت پر بیٹھ کر مال و منال اور لذت حیات دنیا سے متمتع ہوں بلکہ آپ محض حقانیت
کے تحفظ میں حمایت باطل سمجھتے ہوئے یزید کی بیعت سے انکار فرماتے تھے اور یہ انکار اپنی
آخری سانس تک قائم رہنے کا تہیہ کر چکے تھے تاکہ آپ کا یہ انکار دنیا کی آنکھوں کے سامنے حقیقت
کے واضح ہونے کا ایک ذریعہ بنے اور وہ یزید کے افعال و اعمال کو آئین اور کبھی شریعت
اسلام کا جزو نہ سمجھ لے۔ اس کے لیے بڑی ضرورت اس بات کی تھی کہ آپ کی
مقاومت کے کسی عنصر کے متعلق غلط توجیہوں کی اشاعت کرنا فریق مخالف کے
لیے ناممکن ہو جائے اور آپ کی شہادت عظمیٰ کو کسی "پراسرار حادثہ" کی شکل نہ دی
جا سکے۔ اس لیے کہ اس صورت میں حقانیت کے دوامی تحفظ میں رخنہ پڑنے
کا پورا پورا امکان باقی رہ جاتا۔ یہ مقصد امام حسینؑ کا اہل حرم کے ذریعہ
سے انتہائی کامیابی کے ساتھ پورا ہوا اور آپ کی حقانیت و
مظلومیت اتنی نمایاں ہو گئی کہ بنی امیہ کی ہر ایک تاویل۔ کوئی ملمع کاری۔ اور

سیاسی شعبدہ بازی اس کو مشتبہ نہ بنا سکی۔

تاریخ کی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ بنی امیہ نے ایک زبردست چال بنی ہاشم
کے مقابلہ میں یہ چلی تھی کہ عثمان کو بحیثیت مظلوم پیش کیا اور اس خون کی ذمہ
داری غلط طور پر بنی ہاشم اور بالخصوص حضرت علی بن ابی طالب پر عائد کر دی
اس کے لیے عثمان کا خون بھرا کرتا اور ان کی زوجہ نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں
مدت تک مسجد جامع دمشق میں مجمع کے سامنے پیش کی جاتی رہیں اور مجمع ان کو
دیکھ کر آہ وزاری کرتا اور سر و سینہ پیٹتا رہتا۔ اس طرح ایک بہت بڑی جماعت
کے دلوں کو اہل بیت رسولؐ سے منحرف کیا گیا اور ابن سفیان نے مقتول کے
ورثہ بن کر لوگوں کی ہمدردی حاصل کی۔ یہ پروپیگنڈا اس وقت تک ختم نہیں
ہو سکتا تھا جب تک آل بنی ہاشم میں اولاد سفیان کے ہاتھوں ایک ایسا غم
انگیز حادثہ نہ ہو جائے جو ہمدردی کے اثرات کو منعکس کر دے۔ حقیقتاً امام
حسینؑ کو شہید کر کے دشمن خود بتدریجی طور پر اس کام کے انجام پانے کا ذریعہ
بن گیا جس کا بنی امیہ نے جوش ظفریابی میں ابتداً اندازہ بھی نہ کر سکے۔ وہ روز
عاشور تک اپنے اقدامات کے جواز میں قتل عثمان کے واقعہ کا حوالہ
دیتے تھے مثلاً حسینؑ اور آپ کے ساتھیوں پر پانی بند کرنے کی سند جواز
اسی کو قرار دیا کہ اس کے پہلے عثمان پر پانی بند کیا جا چکا ہے اور یہ
اس کا بدلہ ہے حالانکہ عثمان پر پانی بند کرنے میں بنی ہاشم کا کوئی ہاتھ نہ تھا مگر
پروپیگنڈا یہی کیا گیا تھا لیکن پہلے تو خود کربلا میں جوانوں، نوجوانوں اور
سب سے آخر میں شش ماہہ بچہ کی شہادت میں ظالم کا درجہ اتنا اونچا ہو گیا کہ اب
عثمان کا نام لینا بھی انسانی انصاف کی نگاہ میں غیر متوازن بات ہو گئی اور پھر اہل بیت
طاہرہ کی اسیری نے تو آل رسولؐ کی مظلومیت کو اس نقطہ معراج تک پہنچا دیا۔

جس کے بعد ہی ہوا خواہان بنی امیہ کی زبانیں بند ہو گئیں اور انھیں پھر عثمان کے وقتیہ
قتل کا نام لیتے ہوئے بھی شرم دامن گیر ہونے لگی۔ مطلب یہ ہے کہ عثمان کے
قمیص خون آلود اور ان کی زوجہ مکرمہ کی کٹی ہوئی انگلیوں کی نمائش تو خود مقتول
والی جماعت کے ہاتھوں سے ہوتی تھی۔ جس کے ساتھ اس کا کوئی ثبوت نہ تھا کہ
اس کا مرتکب کون ہوا ہے لیکن حسینؑ کے سر بریدہ اور ان کے اہل بیت اطہار
کی اسیری کی نمائش خود ان ہی ظالموں کے ہاتھ سے ہو رہی تھی جو اس ظلم کے
مرتکب تھے اس لیے اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو کہیں اور ڈھونڈنے کی
ضرورت نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس دنیا کی بھی جو اس سے پہلے جناب عثمان
سے ہمدردی کی وجہ سے آل سفیان کے ساتھ اور بنی ہاشم سے منحرف تھی
ہمدردیاں منتقل ہو گئیں۔ وہ اب بنی ہاشم کی غم خوار بن کر آل سفیان سے منحرف
ہو گئیں۔ اگر امام حسینؑ اہل حرم کو ساتھ نہ لاتے تو در حقیقت واقعہ اور اموی ذہنیت
کا اس درجہ انکشاف غیر ممکن تھا۔

تاریخ اسلام میں یہ مثال موجود ہے کہ اس کے پہلے حسنؑ بن علیؑ زہر سے
شہید کر دیے گئے مگر اس وقت تک حکومت بنی امیہ کے زور حکومت سے
مرعوب یا سیاسی چالوں سے فریب خوردہ تاریخوں میں یہ مسئلہ مشتبہ بنا رکھا
گیا ہے کہ اس سازش کی پوری ذمہ داری کس پر ہے۔ اسی طرح اگر کربلا کے بے آب
و گیاہ میدان میں بہتر یا سوا سو آدمی جنھیں چاروں طرف سے فوجی آہنی حصار
میں اس طرح محصور کر لیا گیا تھا کہ کسی آدمی کا آنا جانا بلکہ خبروں تک کی آمد و رفت
ناممکن تھی۔ جب قتل ہو جاتے تو کسی کو کیا خبر ہوتی۔ بس ادھر تلواروں کی زبانیں
ہوتیں اور اپنی بے جرمی کی داستانیں اور ادھر سے کوئی جواب دینے والا نہ ہوتا۔
اسی طرح حسینی مسئلہ مشتبہ بنا دیا جاتا اور نوعیت شہادت بالکل ہی

بدل دی جاتی۔

اس صورت میں حسینؑ اپنے جانی و مالی اور اولاد سب کو حقانیت کے احیاء
میں صرف نہ کرتے تو پھر نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ تاریخ کے اوراق اور کتب میں یہ
منقول ہوتا کہ یزید کے مقابلے میں شکست کھا گئے۔ آج تاریخ میں جو رنگ بھرا ہوا ہے
حسب استعمال کیا گیا ہوتا اور یہ حقیقت ہے کہ حسینؑ بن علیؑ کے بعد ہی معاذ اللہ بعض
اور باطل نے یہ غلط الفاظ صرف کیے گئے ہوتے۔ اگر حضرت امام حسینؑ
یکا و تنہا جنگ آپ کے ساتھ حقانیت و صداقت بھی قتل ہو جاتے جس میں بڑھ کر
جس کی کوئی شکست نہ ہو سکتی تھی۔

امام حسینؑ کے نزدیک آپ کی شہادت کے بعد آپ کے فلسفۂ شہادت
اور حقانیت و صداقت کی تبلیغ کا قائل؛ غیر ان کوئی ذریعہ ہوتی نہیں، مقتضا ہوا
ان کے بعد والی دو وارث مخدرات عصمت کے جو قیدی بنا کر شہر بشہر پھرائی جا رہی
تھیں ان کے دلوں میں غم و غصہ کی آگ بھڑک رہی تھی۔ جن کی رگوں میں علوی
ہاشمی خون جوش کھا رہا تھا جن کی زبانوں پر اظہار حق کی خاطر نبوی بلاغت اور علوی
فصاحت الفاظ کی صورت میں موجزن تھی۔ یا سید علی ابن الحسینؑ جن کو مشیت
باری نے شدت مرض کی بنا پر نصرت حسینؑ سے روز عاشور میدان جہاد میں
حصہ لے سکنے سے شاید اسی غرض سے باز رکھا تھا۔

امام حسینؑ خوب واقف تھے کہ بنی امیہ تمرد و انسانیت سے کتنا ہی گزر
جائیں پھر بھی وہ بے والی و وارث خواتین کو قتل کرنے کی ہمت نہ کر سکیں گے
جن کا قصور زیادہ سے زیادہ یہ بتایا جا سکتا ہو کہ انھوں نے انتہائی اضطراب اور
پریشانی کے عالم میں حکومت کے مظالم پر صدائے فریاد بلند کی۔

یہ صحیح ہے کہ روز عاشورا دشمنوں کے ہاتھ سے بعض عورتیں اور بچے بھی شہید

ہوئے تھے جو معرکۂ جنگ کے خصوصیات نہ سمجھے جا سکتے بطور مسند پیش
نہیں کیے جا سکتے بلکہ یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ یزید و ابن زیاد بے زمام قلم
و جور و بے ضابطگی اور بے دینی تھے کہ باوجود اس پر قادر نہ تھے کہ وہ معرکۂ
کربلا کے بعد اہل حرم حسینؑ سے کسی ایک فرد کو بھی قتل کرا دیتے۔ مگر ان میں
اتنی جرأت و ہمت باقی نہ تھی۔ اور نہ ان کے گرد و پیش کی فضا اس کی متحمل
ہو سکتی تھی۔ چنانچہ کوفہ میں جب جناب زینب کبریٰ نے اپنی باطل شکن تقریر
سے اموی حکومت کے فسق و فجور اور خبث و قساوت کو طشت از بام کر دیا تھا
تو ابن زیاد نے چاہا بھی تھا کہ آپ کو تازیانہ سے اذیت دے مگر اس کے دربار
والوں میں سے عمرو بن حریث سامنے آ گیا تھا اور جرأت کم ہو گیا تھا۔
بعد کو یزید کا قتل حسینؑ کی ذمہ داری ابن زیاد پر عائد کرنا خود احساس
شکست کی بنا پر تھا۔ مگر یہ نکلا اہل حرم حسینؑ کے ساتھ بھی انتہائی بدسلوکیاں
کی جا چکی تھیں۔ لہٰذا اس کے افعال کی بابت کسی تاویل کی گنجائش باقی نہ
رہ گئی تھی۔ جس کی بنا پر مورخین کو یہ سمجھنا پڑا کہ اگر اس کے دل میں قتل پر ملال
ہے کیے اور بعد کی عداوتیں نہ ہوتیں تو وہ سر امام حسینؑ کا احترام کرتا۔ اس
کے قاتلوں کو قتل کا حکم دیتا اور اہل بیت رسالت کے ساتھ حسن سلوک
سے پیش آتا۔

~~~
~~~

بتیسواں باب

اسرائے اہل بیتؑ کے مختصر حالات

اب جبکہ اسیری کے حالات بھی بیان ہو چکے اس کے نتائج پر بھی تبصرہ ہو گیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس کے قبل کے باب میں شہدائے کربلا میں سے ہر ہر فرد کے حالات پیش کیے جا چکے ہیں۔ اسی طرح یہاں اسیرانِ کربلا میں سے نمایاں افراد کے حالات بھی علیحدہ علیحدہ درج کر دیے جائیں۔

---

(۱)

علی ابن الحسینؑ

زین العابدینؑ اور سید سجادؑ آپ کے مشہور القاب تھے۔ آپ امام حسینؑ کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ آپ کے ذریعہ سے قدرت کو عرب اور عجم کے کمالات کو ایک مرکز پر مجتمع کرنا تھا۔ اس لیے کہ شہر بانو یعنی آپ کی والدہ گرامی یزدجرد آخری بادشاہ ایران کی بیٹی تھیں۔ ۳۸ھ میں آپ کی ولادت ہوئی[1] جب کہ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کوفہ میں مسند خلافت پر متمکن تھے اور

---

[1] کافی ج۱ ص ۲۹۶ ارشاد ص ۲۰۰

ابھی آپ کا سن پورے تین سال کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ۲۱ رمضان سنہ ۴۰ھ کو علی ابن ابی طالبؑ کی شہادت واقع ہوئی۔ پھر آپ پورے بارہ سال کے نہ ہونے پائے تھے کہ ۲۸ صفر سنہ ۵۰ھ کو آپ کے چچا حسن مجتبیٰؑ زہر دغا سے شہید کر دیے گئے۔

سنہ ۶۰ھ میں آپ کی عمر ۲۲ سال سے کچھ زائد تھی جب ۲۸ رجب کو اپنے والد بزرگوار امام حسینؑ کے ساتھ عراق کے لیے روانہ ہوئے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ راستے میں یا کربلا پہنچنے کے بعد کہاں آپ بیمار ہو گئے۔ بہرصورت ۱۰ محرم سنہ ۶۱ھ کو امام حسینؑ کی شہادت کے موقع پر آپ اس قدر بیمار تھے کہ نشست و برخاست کی طاقت نہ تھی اور پھر تیسری محرم کو پانی بند ہونے کے بعد پھر آپ کو تشنگی کی مصیبت اٹھانی پڑی جس سے ضعف و اضمحلال میں اضافہ ہوتا جانا ہی تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ آپ نصرت حسینؑ میں اس طرح شرکت نہ کر سکے جس طرح آپ کے دوسرے بھائیوں نے کی مگر قدرت کو آپ کا امتحان دوسری طرح لینا منظور تھا۔ عاشور کے بعد آپ دشمنوں کے ہاتھوں اپنی بہنوں، پھوپھیوں اور دیگر عزیز خواتین کے ساتھ پابہ زنجیر ہو کر کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام لے جائے گئے۔ دربار ابن زیاد میں آپ کی گفتگو اور دربار یزید کے اندر آپ کے پرزور اتمام حجت کا تذکرہ اس سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ شام سے رہائی کے بعد آپ مدینہ میں گوشہ نشین ہو کر اپنی باقی زندگی عبادت خدا میں گزار دی۔ آپ کی عبادت کی کیفیت یہ تھی کہ جب آپ نماز کے لیے وضو کرتے تھے تو چہرے کا رنگ زرد ہو جاتا تھا اور کوئی اس کا سبب دریافت کرتا تو آپ فرماتے تھے کہ تم کو معلوم ہے کہ کس کی بارگاہ میں حاضری دینے جا رہا ہوں۔[1]

---

[1] ارشاد ص ۲۶۲

سے نظر آتا ہے چنانچہ قیام کربلا کے بعد ایک موقع وہ ہے جب بہن نے بھائی کی زبانی وہ حسرت آمیز اشعار سنے جن کا مطلب یہ تھا کہ زمانہ کا انداز صبح و شام یہی ہے کہ کوئی نہ کوئی لقمۂ اجل ہوتا ہے اور ہر ذی روح کو اسی راستے پر جانا ہے۔ ان اشعار سے زینب کبریٰؑ نے محسوس کیا کہ بھائی خود اپنی سناؤنی سنا رہے ہیں تو بے تابانہ بھائی کے پاس آئیں اور کہا ہائے کاش میں دنیا سے گزر گئی ہوتی۔ مجھے آج محسوس ہو رہا ہے کہ میری ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا، میرے باپ اور میرے بھائی حسنؑ آج ہی مجھ سے چھوٹ رہے ہیں، آپ ہی تو اب ان سب کے جانشین ہیں۔ امام حسینؑ نے بہن کو تلقین صبر فرمائی۔ زینبؑ نے کہا کیوں بھائی کیا بالکل آپ مرنے پر تیار ہو گئے ہیں۔ حضرت نے ایک عربی کی مثل زبان پر جاری فرمائی کہ لو ترک القطا لیلا لنام مطلب یہ تھا کہ اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ یہ سنکر جناب زینبؑ کی بے چینی اور بڑھ گئی اور کہا "ہائے غضب!

اس کا مطلب ہے کہ آپ کو زبردستی ہم سے چھین لیا جائے گا" —— یہ کہہ کر اپنے منہ پر طمانچے مارے، گریبان چاک کیا اور غش کھا کر گر پڑیں۔ امام کسی طرح بہن کو ہوش میں لائے اور بصیرت افروز الفاظ میں بہن کو صبر کی ہدایت فرما کر قسم دی کہ میرے بعد گریبان نہ پھاڑنا منہ نہ نوچنا اور واویلا کہہ کر نوحہ نہ کرنا۔ پھر بہن کو لے جا کر اس جگہ بٹھا دیا جہاں زین العابدینؑ بیماری کے عالم میں لیٹے ہوئے تھے (۱)، تاکہ پھوپھی بھتیجے کی تیمارداری میں مصروف ہو جائیں اور ان کی توجہ اسی طرف مرکوز رہے۔

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۹ - ۲۴۰

زینب کبریٰؑ نے اپنے بھائی کی اس وقت کی ہدایتوں کو سخت سے سخت مواقع پر بھی پیش نظر رکھا اور مصائب کی انتہائی شدت کے باوجود ایسی بیتابی کا مظاہرہ نہیں کیا کہ دشمنوں کو شماتت کا موقع ملے۔

ہجرنویں محرم کی عصر کو جب فوج دشمن نے حملہ کیا تو جناب زینبؑ ہی تھیں جنہوں نے پاس آکر امام حسینؑ کو اس صورت حال کی طرف متوجہ کیا۔

روز عاشور جب امام رخصت کے لیے تشریف لائے تو آپ نے جناب زینبؑ ہی سے وہ پیراہن لے کر پہنا جسے اور جا بجا سے چاک کر لیا تاکہ دشمن لوٹنے کے وقت بوسیدہ ہونے کی وجہ سے شاید اس پیراہن کو نہ لیں اور لاش آپ کی برہنہ نہ ہو۔

اس کے بعد زینب کبریٰؑ کی آنکھوں کے سامنے وہ مناظر پیش آئے جن کا تصور بھی لرزہ بر اندام کرنے کے لیے کافی تھا۔ بھائی کی شہادت خیموں کی لوٹ اور پھر آتشزدگی اور اس کے بعد اسیری۔ ان تمام مراحل کو جناب زینبؑ نے ضبط و صبر کے ساتھ طے کیا۔

۱۱ محرم کی صبح کو جب پس ماندگان حسینؑ قیدی بنائے جا چکے اور لٹا ہوا قافلہ کوفہ کی طرف روانہ کیا گیا تو قتل گاہ سے ہو کر گزرا کہ جہاں افواج یزید کے مقتولین کو دفن کیے جانے کے بعد شہدائے کربلا کی لاشیں بے غسل و کفن خاک و خون میں آلودہ چھوڑ دی گئی تھیں۔

اس جگر خراش منظر سے بیمار و ناتواں علیؑ بن الحسینؑ کا وہ عالم ہوا کہ جسے دیکھ کر جناب زینبؑ بے تاب ہو گئیں اور جب مصیبت زدوں کا قافلہ مقتل شہداء میں پہنچا تو ان سے ان کی پھوپھی نے بے تاب ہو کر دریافت کیا کہ اے یادگار رفتگان، یہ تمہاری کیا حالت ہے کہ دم تمہارے جسم سے پرواز کیا چاہتی

کا کام تھا۔ بھائی کے بعد ظالم کے دار السلطنت میں مظلوم کا ماتم برپا کرنا بھی آپ ہی کا کارنامہ تھا۔ اور یہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد پہلی مجلس عزا تھی جو اسی سوگوار بہن نے برپا کی تھی۔

(۳) ام کلثوم بنت علیؑ

زینب صغریٰ نام اور ام کلثوم کنیت تھی (۱) حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ اور جناب فاطمہ زہراؑ بنت محمد مصطفےٰ کی چھوٹی بیٹی۔ رسول اللہؐ کے زمانہ کے آخر میں متولد ہوئی تھیں اور تقریباً دو سال کی عمر میں اپنے نانا رسول خداؐ اور اس کے چند ہی مہینے کے بعد اپنی والدۂ گرامی کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئیں اپنے چچا زاد بھائی محمد بن جعفر بن ابی طالب کے ساتھ آپ کا عقد ہوا تھا۔

بیوہ ہونے کے بعد سے آپ اپنے بھائیوں کے ساتھ رہیں اور اسی دوران میں اپنے شفیق باپ کی شہادت سے انتہائی درجہ دل شکستہ ہوئیں۔ آخری رات جس کی صبح کو حضرت علیؑ کے سر پہ ابن ملجم نے تلوار لگائی حضرت اپنی اسی بیٹی کے مہمان تھے اور اس رات کے تمام حالات جناب ام کلثومؑ ہی کی زبانی وارد ہوئے ہیں، جب علیؑ بن ابی طالبؑ کے سر مبارک پہ ضربت لگ چکی ہے۔ اور آپ بیت الشرف میں لائے گئے ہیں اور اس کے بعد زہر کی تاثیر بڑھی ہے تو خصوصیت کے ساتھ ام کلثوم شدت سے گریہ کر رہی تھیں (۲)

دینوری نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ جب حضرت امام حسینؑ مدینہ کی سکونت ترک فرما کر مکہ تشریف لے گئے تھے۔ تو آپ کی دونوں بہنیں

---

(۱) ارشاد صفحہ ۱۸۹ (۲) ارشاد صفحہ ۹

زینبؑ اور ام کلثومؑ آپ کے ساتھ تھیں۔ (۱)

بازار کوفہ میں زینب کبریٰ کے خطبہ کے بعد آپ نے بھی بصیرت افروز تقریر فرمائی تھی۔

(۴) رقیہ بنت علی بن ابی طالب

آپ عمر بن علیؑ کی حقیقی بہن بلکہ انھیں کے ساتھ توام پیدا ہوئیں۔ آپ کی والدہ ام حبیب بنت ربیعہ تھیں۔ (۲)

آپ کا عقد مسلم بن عقیل کے ساتھ ہوا تھا۔ مدینہ سے اپنے شوہر کی معیت میں حضرت امام حسینؑ کے ساتھ چلی تھیں۔ جب مسلمؑ مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ کر دئے گئے تھے تو آپ اپنے بھائی امام حسینؑ کے ساتھ گئیں۔ مکہ سے روانگی کے بعد راستے میں آپ کو اپنے شوہر کی شہادت کی اطلاع ہوئی تھی اور کربلا پہنچ کر روز عاشورہ آپ نے اپنے صاحبزادے عبداللہ بن مسلم بن عقیل کو امام پر نثار کر دیا تھا۔ پھر اسیری میں اپنی دونوں بہنوں زینبؑ و ام کلثومؑ کے ساتھ روح فرسا مصائب و آلام کا مقابلہ کرتی رہیں اور رہائی کے بعد انہی کے ساتھ مدینہ واپس گئیں۔

(۵) لیلیٰ ثقفیہ

آپ علی اکبرؑ (بن الحسینؑ) کی والدہ محترمہ تھیں۔ آپ کے نام و نسب اور خاندانی خصوصیات کا تذکرہ علی اکبرؑ کے حالات میں ہو چکا ہے۔ آپ معرکہ کربلا

---

(۱) الاخبار الطوال صفحہ ۲۲۰ (۲) ارشاد صفحہ ۱۸۹

میں موجود تھیں اور اسیری میں دختران علیؑ و فاطمہؑ کے ساتھ تھیں مگر اس کے بعد سے آپ کے حالات زندگی کا تاریخ میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

(۶) رباب بنت امرالقیس کلبی

آپ علی اصغرؑ اور سکینہؑ بنت الحسینؑ کی والدۂ گرامی تھیں۔ آپ میدان کربلا میں موجود تھیں اور اسیری میں بھی شریک لیکن رہائی کے بعد آپ نے مدینہ جانے سے انکار کر دیا اور ایک سال تک قبر حسینؑ پر خیمہ لگا کر مجاور کی حیثیت سے مقیم رہیں۔ جس میں شب و روز مجلس گریہ و بکا اور نوحہ و ماتم میں مصروف رہتی تھیں (۱)

ایک سال کے بعد مدینہ واپس ہوئیں۔ یہاں بھی آپ نے امام حسین کا ماتم برپا کیا۔ اور عرصۂ دراز تک وہ ان کی کنیزیں اور ان سے وابستگی رکھنے والی خواتین نوحہ وزاری میں مصروف رہیں۔ (۲)

(۷) فاطمہ بنت الحسین

آپ کی والدہ ام اسحٰق بنت طلحہ بن عبداللہ تیمیہ تھیں۔ (۳)

شیخ مفیدؒ نے لکھا ہے کہ امام حسنؑ کے فرزند حسن (مثنیٰ) نے اپنے چچا حضرت امام حسینؑ سے آپ کی دو صاحبزادیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ عقد کی خواستگاری کی۔ حضرت نے فرمایا کہ ان دونوں میں سے جس کے ساتھ تم کہو تمہارا عقد کیا جائے۔ حسن نے شرم سے سر جھکا لیا اور کچھ جواب

---

(۱) اصابہ مصر ج ۱ ص ۱۱۳ (۲) کافی ج ۱ ص ۲۹۶ (۳) ارشاد ص ۲۶۹

نہ دیا۔ حضرت نے فرمایا اچھا میں خود تمہارے لیے اپنی لڑکی فاطمہ کو منتخب کرتا ہوں۔ کیونکہ وہ میری مادر گرامی فاطمہؑ بنت رسولؐ سے زیادہ مشابہ ہے۔ (۱)

حضرت امام حسینؑ کو اپنی اس صاحبزادی پر اتنا اعتماد تھا کہ جب آپ میدان کربلا میں بعزم جہاد تشریف لے جا رہے تھے تو چونکہ آپ کے فرزند امام زین العابدینؑ شدت بیماری سے غش میں تھے۔ آپ نے مخصوص تحریری امانتیں ایک سربند لفافہ میں اور وصیت نامہ، دونوں کو فاطمہ کے سپرد فرمایا۔ بعد میں فاطمہ نے یہ چیزیں اپنے بھائی کو سپرد کیں۔ (۲)

آپ واقعۂ کربلا کے بعد عرصہ تک زندہ رہی تھیں۔ اور راویانِ احادیث میں آپ کا شمار ہے۔ آپ کے صاحبزادے عبداللہ المحض آپ کے واسطے سے نقل حدیث کرتے تھے (۳)

آپ اپنے بھائی حضرت امام زین العابدینؑ کے ساتھ خلوص و محبت رکھتی تھیں اور اپنی اولاد کو حضرت کے پاس بیٹھنے اور استفادہ کرنے کی ہدایت کرتی تھیں۔ (۴)

آخر میں آپ کو اپنے شوہر حسن بن حسنؑ کی وفات کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ آپ نے ایک سال تک اُن کی قبر پر اپنا خیمہ برپا رکھا (۵) اور برابر دن کو روزہ رکھتی تھیں اور رات بھر نماز پڑھتی تھیں۔ جب ایک سال کامل ہو چکا تو خیمہ ہٹا یا گیا اور آپ مدینہ واپس گئیں۔ (۶)

---

(۱) ارشاد ص ۲۰۱ (۲) بصائر ج ۱ ص ۱۶۹ و ۱۸۸ (۳) کافی ج ۱ ص ۲۹۴ و ابن ہشام ج ۱ ص ۱۵۳ (۴) ارشاد ص ۲۰۲ (۵) بخاری ج ۱ ص ۱۴۷ (۶) ارشاد ص ۲۰۳

(۸) سکینہ بنت الحسین

آپ رباب مادر علی اصغرؑ کے بطن سے تھیں۔ واقعہ کربلا میں آپ بہت کم سن تھیں۔ واقعۂ کربلا کے بعد آپ کی زندگی کے جو حالات ملتے ہیں وہ معتبر و مستند طریقہ سے ثابت نہیں ہیں۔

*

جب کہ خواتین اہل بیت رسالتؐ کا تذکرہ ہو رہا ہے تو بعض ایسی خواتین کا بھی یہاں ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو میدان کربلا میں خود تو موجود نہ تھیں مگر کربلا کے واقعات سے اہم تعلق رکھتی تھیں۔

*

(۱) ام المومنین ام سلمہؓ زوجۂ خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰؐ

آپ ازواج رسالتمآبؐ میں انتہائی نیک نہاد اور مقدس و محترم بی بی تھیں۔ آنحضرتؐ نے ہجرت کے دوسرے سال جنگ بدر کے بعد آپ سے عقد کیا تھا۔ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد بھی ام سلمہؓ کو حضرتؐ کے اہلبیتؑ یعنی علی بن ابی طالبؑ اور حسنؑ و حسینؑ کے ساتھ خاص الفت و محبت رہی۔ چنانچہ جنگ جمل کے موقع پر جب ام المومنین عائشہ نے حضرت علی بن ابی طالبؑ کے خلاف صف آرائی کی تھی اور اس کی خبر مدینہ پہونچی تھی تو ام المومنین ام سلمہؓ نے حضرت علی بن ابی طالبؑ سے کہا کہ اگر میرے لئے گھر سے نکلنا شرعاً ممنوع نہ ہوتا اور مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ آپ اسے کبھی گوارا نہ کریں گے تو میں خود آپ کے ساتھ جنگ میں چلتی مگر

کیا کروں مجبور ہوں کہ نکل نہیں سکتی۔

بہرحال اپنے فرزند عمر کو جسے میں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں۔ میں آپ کے ساتھ بھیجتی ہوں۔ وہ آپ کی نصرت میں جنگ کرے گا۔ چنانچہ یہ برابر حضرت علی بن ابی طالبؑ کے ہمراہ رکاب رہے یہاں تک کہ آپ نے حکومت بحرین اُن کو تفویض فرمائی۔ جس پر وہ ایک عرصہ تک قائم رہے (۱)

ترمذی کی روایت ہے کہ ام سلمہ نے روز عاشور رسول اللہؐ کو خواب میں اس حالت سے دیکھا کہ آپ رو رہے تھے اور آپ کے سر و ریش مبارک پر خاک پڑی ہوئی تھی۔ ام سلمہ نے سبب دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی ابھی میرا حسینؑ قتل کر دیا گیا ہے۔

بصحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق ام سلمہؓ کا وجود ۶۳ھ تک معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ نے اسی روز یعنی ۶۱ھ عاشور محرم کو انتقال فرمایا۔

۲) ام البنین زوجہ امیر المومنین علی بن ابی طالب

آپ کے نام و نسب اور خاندانی خصوصیات کا تذکرہ ابو الفضل العباسؑ اور اُن کے بھائیوں کے حالات کے ذیل میں ہو چکا ہے۔

جس ماں کے ایسے چار بیٹے ہوں اور وہ سب کے سب ایک ساتھ قتل ہو جائیں اس کے تاثرات زبان قلم سے کہاں ادا ہو سکتے ہیں۔ شرح کامل میں ابو الحسن اخفش عرب کے ایک بڑے ادیب کی زبانی یہ روایت درج

---

(۱) طبری ج ۵ ص ۱۶۷

ہے کہ واقعات کربلا سے مطلع ہونے کے بعد ام البنینؑ روزانہ بقیع کی طرف عباس کے کم سن فرزند عبید اللہ کو ساتھ لے کر چلی جاتی تھیں اور وہاں عباس کا مرثیہ پڑھتی تھیں جو اتنا دردناک ہوتا تھا کہ مدینہ کے لوگ وہاں جمع ہو جاتے تھے۔ حتیٰ کہ مروان بن الحکم کا سا خاندان نبوت کا دشمن بھی اکثر اس مجمع میں دکھائی دیتا تھا اور آپ کے پردرد اشعار کو سُن کر لوگوں کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو جاتے تھے۔

آپ کے یہ اشعار پردرد ہی نہیں بلکہ اُس قوت نفس کے بھی حامل ہوتے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ آپ عباس ایسے مجاہد راہ خدا کی ماں ہیں۔

چنانچہ آپ کے اشعار میں سے بعض تاریخ کے اوراق تک پہنچ کر ہماری نظر سے بھی گزرے ہیں جن کا مفہوم درج ذیل ہے:-

کہاں ہیں اُس منظر کے دیکھنے والے کہ جب میرا شیر دل عباس حملہ آور ہو رہا تھا بھیڑوں کے گلے پر اور اس کے پیچھے تھے حیدر صفدر (علی بن ابی طالبؑ) کی اولاد میں سے کئی باہمت شیر۔ ہائے افسوس کہ میرے فرزند کا سر گرز گراں سے شگافتہ کیا گیا۔ اُس وقت کہ جب اس کے دونوں ہاتھ کٹ چکے تھے۔ اے عباس مجھے یقین ہے کہ اگر تلوار تیرے ہاتھ میں رہتی تو کسی کی ہمت نہ تھی کہ تیرے قریب آسکتا۔

"اے لوگو اب مجھے "ام البنین" (فرزندوں کی ماں) نہ کہو اس لیے کہ اس سے مجھے میرے شیر یاد آجاتے ہیں۔ تھے میرے کبھی کئی بیٹے جن کی طرف نسبت دیکر میں پکاری جاتی تھی۔ اب تو میرے بیٹے ہی نہیں رہ گئے۔ وہ چاروں جوشیلے بازہائے شکاری کے تھے موت کے گلے میں باہیں ڈال چکے۔ نیزوں نے ان کے ٹکڑے کر دیے اور وہ سب زمین پر بے جان ہو کر گر گئے۔ کیا صحیح ہے جیسا کہ لوگ کہتے

ہوا کہ عباس کے ہاتھ بھی قطع کر دئے گئے تھے۔!!"

جبکہ خواتین متعلقہ کربلا کا تذکرہ ہو رہا ہے تو اصحاب حسینی سے نسبت رکھنے والی ان خواتین کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جن کا واقعات کربلا میں کوئی کارنامہ تاریخ کے صفحات پہ ثبت ہے تاکہ واقعۂ کربلا کی ہمہ گیری کے سلسلہ میں اس کا پورا اندازہ ہو سکے کہ طبقۂ خواتین کا اس معرکہ میں کتنا حصہ ہے۔

---

(۱۱) دلہم بنت عمرو

یہ زہیر بن القین کی زوجہ تھیں۔ ان کا ذکر حضرت امام حسینؑ کے سفر عراق کے سلسلہ میں منزل زرود کے حالات میں آچکا ہے۔

یہ محترم خاتون اپنے شوہر کے ساتھ ٦٠ھ میں حج کو گئی ہوئی تھیں۔ ان کے شوہر زہیر اب تک خاندان رسولؐ سے کوئی خاص ربط ضبط نہ رکھتے تھے۔ بلکہ عام طور سے عثمانی جماعت میں سمجھے جاتے تھے مگر واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خاتون کے دل میں مخفی طور پہ سہی اہل بیت رسولؐ کے ساتھ عقیدت موجود تھی اسی بنا پہ جب منزل زرود میں حضرت امام حسینؑ نے زہیر کے بلانے کو آدمی بھیجا اور زہیر کو جانے میں تامل ہوا تو اس خاتون نے کہا کہ سبحان اللہ! فرزند رسولؐ تمہارے بلانے کو آدمی بھیجیں اور تم نہ جاؤ۔ بڑے غضب کی بات ہے۔ ذرا جا کر سنو تو کہ حضرت کیا فرماتے ہیں۔ اسی بصیرت افروز فقرہ کا اثر تھا کہ زہیر گئے اور واپس آئے تو جان و دل سے امام کی نصرت پر آمادہ

ہو کر۔ بے شک اس خاتون کو خود واقعہ کربلا میں شرکت کا موقع نہیں ملا۔ اس لیے کہ زہیر نے اسے اپنے ساتھ لے جانا پسند نہیں کیا بلکہ اُسی منزل پر اُسے طلاق دے کر اُس کے میکے بھجوا دیا اور خود امام حسینؑ کے ساتھیوں میں شامل ہو گئے۔ مگر اس کی محرک یہی خاتون تھی اس لیے اسے واقعہ کربلا کے تذکرہ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۲) ام وہب بنت معبد

قبیلۂ نمر بن قاسط میں سے عبد اللہ بن عمیر کلبی کی زوجہ تھیں۔ کوفہ میں قبیلۂ ہمدان کے مقام بئرالجعد کے پاس ان کا مکان تھا جو کوفہ کی گنجان آبادی سے باہر نخیلہ کے حدود میں باغاتِ خرما کے قریب تھا۔ جب امام حسینؑ کے کربلا پہونچنے کی اطلاع ابن زیاد کو پہونچی اور اس نے اپنا لشکر گاہ نخیلہ میں قرار دیا اور عبد اللہ نے اس فوج کشی کا سبب معلوم ہونے پر یہ ارادہ کیا کہ وہ حضرت امام حسینؑ کی مدد کو جائیں گے تو انھوں نے اپنے اس مبارک ارادہ کا ذکر اپنی اسی قابلِ اعتماد اور وفادار بیوی ام وہب سے کیا۔ اس نے بغیر کسی تردد اور ہراس کے اپنے شوہر کی ہمت افزائی کی اور کہا "تم نے بالکل ٹھیک ارادہ کیا ہے۔ خدا تمھارے ارادہ میں برکت عطا کرے ضرور ایسا ہی کرو اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو"۔ چنانچہ رات کے وقت دونوں روانہ ہوئے اور انصار حسینؑ کے ساتھ کربلا میں جا کر ملحق ہو گئے۔

اس کا تفصیلی تذکرہ عبد اللہ بن عمیر کلبی کے حالات میں ہو چکا ہے (ص ۳۱)۔

یہی وہ تنہا خاتون ہے جس کے بے گناہ خون نے شہدائے کربلا کے ساتھ کربلا میں جلتی ریت پر بہہ کر اس مرقع کی دل دوزی اور درد انگیزی میں ایک موثر اضافہ کیا۔

سلام ہو اُس خاتون پر جس نے مظلوم کی نصرت میں اپنے گھر بار اپنے سہاگ اور پھر اپنی جان کو بھی نثار کر دیا۔

(۱۳) زوجۂ مسلم بن عوسجہ

فاضل سماوی نے لکھا ہے کہ بنی ہاشم کے علاوہ جتنے انصار امام حسینؑ تھے وہ کربلا میں اپنے اہل وعیال کو ساتھ نہ لائے تھے اس لئے کہ جو افراد مدینہ سے ساتھ آئے تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ حضرت بیعت یزید سے بچنے کے لئے کیسے غیر اطمینانی طریقہ پر تشریف لیے جا رہے ہیں۔ تو وہ اپنے ساتھ متعلقین کیوں لاتے اور جو لوگ راستے میں پہونچے یا کربلا میں آکر شریک ہوئے وہ دشمنوں کی ناکہ بندی سے بچتے ہوئے خود ہی کتنی مشکلوں سے جان بچا کر آئے تھے۔ پھر وہ اپنے ساتھ اپنے اہل و عیال کو کیونکر لا سکتے تھے۔

بس صرف تین آدمی تھے جو کربلا میں اپنے متعلقین کے ساتھ آئے تھے۔ ایک عبداللہ بن عمیر کلبی (جن کا ذکر ابھی ہو چکا۔)

دوسرے جنادہ بن حارث سلمانی (ان کا ذکر ابھی آئے گا)

تیسرے مسلم بن عوسجہ یہ کربلا میں اپنے متعلقین کے ساتھ آئے۔ خود اصحاب حسینؑ کے خیام کے ساتھ اپنا خیمہ لگا لیا اور عورتوں کو خیام حسینؑ میں اہل حرم کے پاس بھیج دیا۔ چنانچہ جنگ مغلوبہ میں قبل ظہر جب مسلم بن عوسجہ شہید ہوئے تو اُن کی ایک کنیز نے بلند آواز سے روتے ہوئے کہا وا سیداہ واہ ابن عوسجہ ”ہائے میرے آقا۔ ہائے مسلم بن عوسجہ“ اسی آواز سے فوج شام کو یہ علم ہو سکا کہ مسلم شہید ہو گئے ہیں۔ (۱)

---

(۱) ابصار العین ص ۱۲۸

(۱۴) بحریہ بنت مسعود

یہ جنادہ بن کعب انصاری کی زوجہ تھیں۔ اپنے شوہر اور بچہ کے ساتھ مکہ معظمہ سے حضرت امام حسینؑ کے قافلہ میں آئی تھیں۔ جب جنادہ بن کعب شہید ہو گئے تو انھوں نے اپنے نوعمر فرزند عمرو بن جنادہ کو نصرت حسینؑ کے لیے بھیج دیا۔ چنانچہ جب امام نے اجازت دینے میں تامل فرمایا اس بنا پر کہ ابھی تو اس کا باپ کام آیا ہے۔ اب اس کی بیوہ ماں کے دل پر کیا گذرے گی تو بچہ نے کہا کہ مجھے میری ماں ہی نے تو بھیجا ہے اور انھوں نے ہی مجھے یہ جنگ کا لباس پہنایا ہے۔

جب یہ بچہ میدان میں جا کر اپنی قربانی پیش کر رہا تھا تو یہ مقدس خاتون اپنے خیمہ کے دروازے پر کھڑی اس منظر کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ بے رحم دشمنوں نے بچہ کا سر کاٹ کر فوج حسینی کی طرف پھینک دیا۔ تو ماں نے اس سر کو اٹھا لیا اور کہا شاباش بیٹا! شاباش! تو نے میرا دل خوش کر دیا اور میری آنکھوں میں ٹھنڈک ڈال دی۔"

پھر اس نے سر کو اٹھا کر فوج دشمن کی طرف پھینک دیا اور خود بھی ایک گرز آہنیں لے کر حملہ کر دیا۔ امام نے حکم اسلامی یاد دلایا کہ عورتوں کو تلوار لے کر جہاد نہیں کرنا چاہیے تو وہ فرض شناس خاتون واپس چلی آئیں اور اہل حرم کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

قیاس کہتا ہے کہ مسلم بن عوسجہ اور جنادہ بن کعب دونوں کی متعلقہ خواتین اہل حرم حسینؑ کے ساتھ اسیری میں شریک ہوں گی مگر فاضل سماوی کی تحقیق یہ ہے کہ وہ کوفہ تک ساتھ رہیں اور کوفہ میں ان کے عزیز و اقارب

ابن زیاد سے کہہ سن کر ان خواتین کو رہا کرا لے گئے۔ کوفہ سے شام تک جو لے جائی گئیں وہ صرف خاندان رسالت کی مقدس خواتین یا اُن کے ساتھ ہمیشہ وابستگی رکھنے والی کنیزیں تھیں۔ (۱)

---

(۱) ابصار العین صـ۱۲۳

تینتیسواں باب

گزشتہ واقعات کی روشنی میں حسینی شخصیت اور کارنامۂ حسینی پر تبصرہ

راہِ حق میں واقعہ کربلا کے پہلے بھی بہت قربانیاں ہوئی ہیں مگر وہ انفرادی حیثیت رکھتی تھیں جیسے سقراط کا جام زہر پینا۔ جناب زکریا اور یحییٰ کا شہید کیا جانا۔ (بقول نصاریٰ) حضرت عیسیٰ کا صلیب پر چڑھایا جانا اور بہت سے دوسرے انبیا و مرسلین کا قتل کر دیا جانا مگر واقعۂ کربلا کی حیثیت اجتماعی تھی، جہاں حسینؑ کی قیادت و رہنمائی میں ایک جماعت مصروف کار تھی جس میں بچے بوڑھے اور جوان، آزاد اور غلام۔ عربی اور غیر عربی قریشی غیر قریشی ہر سن اور ہر طبقہ کے افراد موجود تھے۔ جن میں مشترک نقطہ سوائے ایک اتحاد مقصد کے کچھ نہ تھا۔

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اتنے ہم دل اور ہم زبان، ہم خیال اور ہم آہنگ افراد دنیا میں نہ واقعہ کربلا کے پہلے ایک نقطہ پر مجتمع ہوئے اور نہ اس کے بعد۔

حالانکہ جذبات انسانی میں ماحول اور سن و سال کے اختلاف سے کسقدر فرق ہوا کرتا ہے۔ مثلاً جوان زیادہ تر اقدام پسند ہوتے ہیں اور جلد ہی میدانِ عمل میں کود پڑنا چاہتے ہیں۔ بوڑھے نسبتہً بردبار ہوتے ہیں اور ہر معاملہ میں بہت سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں۔ اور عورتیں زیادہ تر دل کی کمزور

ہوتی ہیں۔ اس لئے ہولناک موقع پہ شدت سے متاثر ہو کر مردوں کے عزم و ارادہ کے بھی پست کر دینے کی باعث قرار پاتی ہیں اور بچے تو ناموافق حالات میں رونے یا مچلنے ہی لگتے ہیں چنانچہ اگر کسی سخت موقع پہ ایک مرد، ایک عورت ایک بچہ اور ایک بوڑھا یکجا ہوں تو اقتضاء طبع کے لحاظ سے اُن کے رجحانات میں اتنا اختلاف ہوگا کہ اُن میں کی ذمہ دار فرد کو کسی ایک راہ عمل کے معین کرنے اور سب کو اُس پہ چلانے میں کافی وقت محسوس ہوگی۔ چہ جائیکہ سو ڈیڑھ سو آدمیوں کی وہ جماعت جس میں ایک نہیں، متعدد بوڑھے، متعدد جوان، متعدد بچے، اور پھر ان کے علاوہ متعدد عورتیں موجود ہوں، اور پھر یہ تمام افراد بغیر کسی باہمی اختلاف یا کشمکش کے سخت سے سخت حالات میں بھی برابر سے شریک کار اور مصروف عمل ہوں تو اس کے متعلق بس یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کے قائد کی قیادت عجیب تاثیر رکھتی تھی کہ اُس نے جوانوں کے خون کی گرمی کو گھٹا کر اس میں بوڑھوں کے ساتھ ٹھہرنے کی صلاحیت پیدا کی اور بوڑھوں کی طبیعت میں حرارت پیدا کر کے ان کو جوانوں کے ساتھ ساتھ چلنے کے قابل بنایا۔ عورتوں کے دلوں میں اتنی قوت بھر دی کہ وہ شدید سے شدید ظلم و تشدد کے ہنگام میں پریشان و مضطرب نہ ہوں اور بچوں کی طبیعتوں میں وہ پختگی راسخ کر دی کہ ہولناک موقعوں پر بھی وہ رونے کے بجائے ہنستے نظر آئیں۔

امام حسینؑ کا یہ طریقۂ قیادت حقیقتاً ایک راز سربستہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ دشمنوں کے مقابلہ میں تو آپ نے بغرض اتمام حجت تقریریں کیں۔ لیکن اپنے احباب و اعزا میں جوش عمل پیدا کرنے کے لیے کوئی تقریر بھی نہیں کی بلکہ اس کے برخلاف آپ برابر اُن کو اپنا ساتھ چھوڑ کر چلے جانے کی ترغیب دیتے رہے اور وہ سختی کے ساتھ آپ کی نصرت کا دم بھرتے رہے۔

اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بس امام حسینؑ کی مخصوص ذہنی تربیت تھی کہ حقانیت کی صحیح قدر و قیمت کا احساس اس طرح اُن کے دل میں آتا رہا تھا کہ وہ خود اپنے ضمیر کی تحریک سے قدم آگے بڑھانے پر گویا کہ اپنے کو مجبور پا رہے تھے۔ وہاں کسی خاطر داری اور مروت یا دباؤ کا سوال نہ تھا بلکہ ان کی وہ جماعت تھی جو حق کو حق سمجھتے ہوئے راہ حق پر گامزن تھی۔ اور حقیقتہً ایسے ہی ساتھیوں کی حسینؑ کو ضرورت بھی تھی۔ اسی لیے آپ نے مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت سے لے کر شب عاشور تک ہر ہر موقع پر اپنی دشوار گزار مقاومت کے بظاہر ہولناک انجام سے اُن کو بار بار متنبہ کرتے رہنے کو اپنا مستقل شعار بنا لیا تھا اور یہی آپ کا طریقۂ کار تھا جس نے آپ کی مقاومت کو اعجاز کی حد تک کامیاب ثابت کر دکھایا۔

ایسا آج بھی ممکن ہے کہ دوران جنگ میں کسی فریق کی گولہ باری سے کوئی بستی بالکل تہس نہس اور ویران ہو جائے اور اس میں کوئی ایک متنفس بھی زندہ باقی نہ رہے مگر ان لوگوں میں سے کہ جن کی جانیں اس گولہ باری کے ذیل میں ضایع ہو رہی ہوں گی، نا ممکن ہے کہ ہر ایک اس مصیبت کے برداشت کرنے کا حقیقتہً آرزومند ہو اور خود اختیاری طور پر اس کو گوارا کر رہا ہوں۔ اُن میں سے بیشتر کا اگر بس چل سکے تو جس قیمت پر بھی ہو اپنے کو اس مصیبت سے بچا لیں۔ مگر کربلا میں انصار حسینؑ میں سے ہر ایک خود ذاتی حیثیت سے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسلک کی حقانیت پر یقین کامل رکھتے ہوئے برضا و رغبت تمام آگے بڑھ رہا تھا۔ اس طرح کہ اُن میں سے کسی ایک کے دامن عمل پر بھی کمزوری کا دھبا نہ آسکا۔

غداری اور مخالفانہ سرگرمی سے قطع نظر کرتے ہوئے کسی جماعت میں

منسلک شدہ افراد کا باہم نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ اختلاف رائے رکھنا عموماً قابل اعتراض امر نہیں ہوتا لیکن چونکہ عمل میں ہم آہنگی اور یک جہتی باقی نہیں رہتی لہٰذا مقصد اور نتیجہ تحریک کے استحکام پر اس کا بھی اثر برا پڑتا ہے مگر جماعت حسینی کے افراد میں باہم اختلاف رائے کا نام و نشان بھی نہ تھا بلکہ وہاں پوری جماعت نے اختیاری طور پر اور پورے شعور و ارادہ کے ساتھ اپنے تصور خیال، ارادہ، عزم اور اقدام کو مستغرق کر دیا تھا۔ ایک انسان کے خیال، ارادہ اور اقدام کے اندر —— اسی لیے یہ کہنا درست ہے کہ ایسے قائد اور ایسی جماعت کی مثال دنیا کے پردہ پر نظر نہیں آتی۔

جماعت میں سے ہر ایک رہنما کی ہستی اور اس کے مسلک پر جیسے خود بھی اپنے دماغ و عقل سے صحیح سمجھ چکا تھا، اپنے کو قربان کر رہا تھا۔ اور رہنما انہیں ہر ایک کی مصیبت کو برداشت کرنے کے بعد اپنے کو سخت ترین موقع کی آزمائش کے لیے تیار پا رہا تھا۔ وہ سخت موقع وہ تھا جب آس پاس کوئی نہ رہا تھا اور صرف ایک اکیلے حسینؑ کی ذات تھی مگر اب بھی اس ایک اکیلے انسان کے عزم و ارادہ میں وہی جاہ و جلال اور استحکام تھا جو مددگاروں کے موجود ہونے کے عالم میں موجود تھا۔ چراغ بجھ گیا مگر اپنی روشنی چھوڑ گیا وہ روشنی جو ہزاروں تاریکیوں کے پردہ میں اب تک جگمگا رہی ہے کوئی شبہ نہیں کہ ظلم اور تشدد کی آگ نے ابتدائے آفرینش سے آج تک لاکھوں بستیاں خاکستر کر دیں مگر مظلومیت میں کبھی شعور، اقتدار و اختیار اور فرائض کی بجاآوری میں اطمینان و سکون و وقار کا یہ مظاہرہ نظر نہیں آیا جو کربلا کے میدان میں نظر آ رہا تھا۔

سب سے پہلے جبروت و تشدد کے مقابلہ میں ظاہری حیثیت سے بے سروسامانی اور بے بسی کی جنگ کا نمونہ کربلا میں پیش کیا گیا اس لیے کہ

اس کے پہلے طاقت کا مقابلہ طاقت سے ہمیشہ ہوتا رہا تھا مگر طاقت کا مقابلہ کردار کی قوت سے کبھی نہیں کیا گیا تھا۔

اسی طریقۂ مقابلہ کو بہت ہی ناقص درجہ پر ہندوستان کی نجات کے لیے اختیار کیا گیا۔ مگر باوجودیکہ یہاں مقابل کے ظلم و تشدد کا درجہ اتنا سنگین نہ تھا جو بالعموم انسانوں کی بیش قیمت جانوں تک پہونچتا پھر بھی افراد میں وہ ہم رنگی و ہم آہنگی نظر نہ آسکی جو اس قسم کے مقابلہ کی کامیابی کا اصلی راز ہے۔

اس کے ساتھ واقعۂ کربلا میں یہ خاص خصوصیت تھی کہ وہاں طاقت کے مقابلہ میں بیکسی اور بے بسی کے باوجود بھی وہ "سپردگی" نہ تھی جو ظالم کی ہمت افزائی کی باعث ہوسکے بلکہ وہاں حفاظت خود اختیاری کے اُس فطری آئین پر پورا عمل کیا جا رہا تھا جو اسلام کا بنیادی قانون ہے اس طرح واقعۂ کربلا میں ایک ایسی نوعیت پیدا ہوگئی تھی جسے دنیا آج تک نہ دہرا سکی ہے۔ نہ آئندہ کبھی دہرا سکے گی۔

اس مقابلہ کی عدیم المثال نوعیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کربلا کے میدان میں امام حسینؑ مخدرات عصمت اور اطفال خورد سال کو بھی اپنے ساتھ لائے جنھوں نے اپنے اپنے حدود کے اندر اس مجاہدۂ عظمیٰ میں نمایاں اور منظم حصہ لیا جس نے واقعۂ کربلا کے منفرد خصوصیات میں ایک بڑا اضافہ کر دیا جس کے متعلق گزشتہ ابواب میں سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ واقعۂ کربلا میں بوڑھے، جوان، بچے اور عورتیں سب ہی حقانیت کے تحفظ میں اپنے اپنے محل پر اپنا کام فرض کے کامل احساس

کے ساتھ انجام دے رہے تھے جن کے لحاظ سے واقعۂ کربلا صرف دردانگیز اور جان گسل واقعہ نہیں رہا بلکہ وہ مذہبی و اخلاقی تعلیمات کا ایک بے مثال مرقع بن گیا جو اطمینان و سکون کے لمحات میں بھی اگر مرتب ہوتا تب بھی انتہائی کے قابل ہوتا چہ جائیکہ وہ ایسے پر اضطرات عالم میں مرتب ہوا تھا جبکہ انسان کے ہوش بھی بجا رہنا مشکل ہیں۔

حسینی شخصیت کی بے نظیر رفعت

حسینؑ اپنے کردار کی بلندی میں منفرد ہوتے اُس وقت بھی کہ جب یزید کی خلافت کے تمام عالم اسلامی میں تسلیم شدہ ہونیکے بعد تنہا انکار کی آواز ہی آپ نے بلند کی ہوتی، لیکن اُس وقت حسینؑ اور بھی بلند نظر آئے کہ جب آپ نے ہزاروں تلواروں نیزوں اور تیروں کے مقابلہ میں بھی اُس انکار کو قائم رکھا۔ حسینؑ اُس وقت بھی حسینؑ ہوتے جب آپ اکیلے قربان گاہ شہادت میں تنہا اپنی جان کا ہدیہ پیش کر دیتے۔ لیکن حسینؑ اور بھی بلند ہو گئے جب آپ نے اپنے ساتھ کم از کم بہتر ۷۲ قربانیاں اور بھی پیش کر دیں۔

حسینؑ بے شک حسینؑ ہی رہتے اگر آپ کسی جماعت کو پرجوش تقریروں کے ذریعہ سے ترغیب و تحریص سے کام لیتے ہوئے اپنے ساتھ رکھنے میں کامیاب ہوئے ہوتے لیکن حسینؑ اور بھی بلند منزل پر نظر آئے کہ جب آپ نے اپنے ساتھ والوں کو اس قسم کی کسی صورت سے اپنے ساتھ رکھنے میں کامیابی حاصل نہیں کی بلکہ آپ نے اپنی حقانیت کو اس

طرح پر ان کے ذہن نشین کیا کہ ان میں سے ہر ایک حسینی عزم اور استقامت کا حامل ہو گیا۔ یعنی عام طور پر تو ایک انسان کا اپنے دل و دماغ کو قابو میں رکھنا اور اپنے قدم کا مستقل رکھنا ہی ایک بڑا کارنامہ ہوتا ہے لیکن حسینؑ نے بہتر آدمیوں کے دل و دماغ کو ایک مرکز جمع کر کے گویا ہر ایک سینہ میں اپنا دل اور ہر دل میں اپنا استقلال ودیعت کر دیا تھا ——— جیسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ:-

حسینؑ ایک اکیلے میدان جہاد میں حسین ہو کر نہیں آئے تھے بلکہ وہ بو نمت واحد بہتر حسین میدان قربانی میں پیش کر رہے تھے یعنی ایسے افراد جن میں ہر ایک قوم، قبیلہ اور سن و سال کے باہمی اختلاف کے باوجود اس ایک روح کا حامل تھا جس روح کو ہم سوائے "لفظ حسین" کے کسی دوسرے نام سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد حسینؑ اس وقت بھی حسینؑ ہی رہتے جب آپ اپنے اعزا و احباب کے داغ اٹھانے کے قبل جام شہادت نوش فرما لیتے لیکن حسینؑ اس وقت اور بلند سطح پر نظر آئے کہ جب آپ نے ان میں کی ہر فرد کو اپنے سامنے راہ حق میں نثار کر دیا۔

پھر اس صورت میں بھی حسینؑ یقینی ایک مخصوص منزل پر ہوتے اگر اس کے بعد آپ بغیر مقابلہ کیے ہوئے اپنے کو نیزہ و شمشیر کے سپرد کر دیتے مگر حسینؑ اس وقت اس سے بھی بلند نظر آئے جب کہ ان ہی ہاتھوں سے جن پر ابھی ابھی طفل شیر خوار کا لاشہ اٹھا چکے تھے۔ تلوار کے قبضہ کو مضبوط پکڑا اور مردانہ وار مقابلہ شروع کر دیا۔ اور اس تنہائی کے عالم میں اور ہزاروں کے نرغے میں بھی آپ نے حمزہؑ و جعفرؑ اور حیدر صفدرؑ کے روایات کو زندہ کر دکھایا۔

حسینؑ اور بھی بلند منزل پر اُس وقت نظر آتے ہیں جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ آپ نے شدید سے شدید مصائب والام میں مبتلا ہونے کے باوجود شریعت اسلام کے عام فرائض وتعلیمات کو ایک لمحہ کے لئے نظر انداز نہیں فرمایا چنانچہ اصحاب واعزا کے لاشے اٹھانے کے ساتھ ساتھ غلاموں کے لئے بھی مساوات اسلامی کو برت رہے تھے جیسا کہ جون غلام ابوذر غفاری اور غلام ترکی کے حالات میں درج کیا جاچکا ہے۔ اور اس موقع پر بھی کہ جب آپ کے اصحاب ایک ایک کر کے شہید ہوتے جارہے تھے اور جدال وقتال جاری تھا۔ آپ نے نماز ظہر بجماعت ادا فرما کر احساس فرض کی بے نظیر مثال پیش کی۔ دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ بوقت واحد آپ جہاد بھی کرتے جاتے تھے اور مقاصد جہاد کا عملی اعلان بھی۔

حسینؑ اس وقت بھی حسینؑ ہی رہتے کہ جب آپ صرف اپنے تمام اصحاب واعزا کے ساتھ شہید ہو جاتے اور اپنے جہاد کو اپنی زندگی کے خاتمہ ہی پر ختم کر تے۔ مگر اس وقت حسینؑ میدان جہاد میں اور بھی بلند نظر آتے جب آپ نے اپنی شہادت کے بعد کے لئے اس شہادت کے مقاصد کی اشاعت کا انتظام کیا اپنے اہل حرم اور چھوٹے بچوں کو ساتھ لا کر جن میں سے ہر ایک میں فرض شناسی اور حقیقت پروری اس طرح سرایت کئے ہوئے تھی کہ ابن زیادؔ کے دربار اور یزیدؔ کے قصر حکومت میں بھی ان پسماندگان میں سے کسی ایک متنفس نے اموی حکومت کے سامنے سرتسلیم خم نہیں کیا۔ یعنی وہ بیعت کا انکار جس پر حسینؑ کا سر نیزہ پر پہونچ گیا اب بھی قائم تھا۔ اور اب اس کے علمبردار سید سجادؑ، زینبؑ خاتون، ام کلثومؑ ہی نہیں بلکہ کمسن بچے فاطمہؑ اور سکینہؑ اور محمد باقرؑ بھی تھے۔

کردار حسینی کی لامتناہی رفعت کے مذکورہ بالا منازل میں سے ہر منزل وہ ہے جہاں انسانیت سر تسلیم خم کر دیتی ہے اور اسی کو انتہائے امکان سمجھ لینے پر اکتفا کر لیتی ہے مگر حسینی عمل اس کے بعد بھی آگے بڑھتا ہی نظر آتا ہے اور آخر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ کی ذات تاریخ عالم میں ایک نئے انسانی تصور کا اضافہ کرتی ہے۔ وہ تصور جس کے خط و خال سمجھنے میں تیرہ سو برس سے اب تک دنیا مصروف ہے اور ابھی بہت کچھ سمجھنا اور سمجھ کر لفظوں میں بیان کر سکنا باقی ہے۔

*

چونتیسواں باب

فتح کس کی ہوئی

مادی نقطۂ نظر سے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ معرکۂ کربلا کے نتیجہ میں یزید کو فتح ہوئی اور امام حسینؑ کو مکمل طور سے شکست ہو گئی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی زبان و لغت میں بھی فتح پانے کے معنی "قتل کر دینا" اور شکست کھانے کے معنی قتل کر دیا جانا نہیں قرار پا سکتے۔ بلکہ فتح نام ہے کامیابی یعنی مقصد کے حصول کا اور شکست ناکامی یعنی مقصد کے ہاتھ نہ آنے کا۔ لہٰذا معرکۂ کربلا کے نتیجہ کے متعلق کسی فیصلہ تک پہنچنے کے لئے طرفین کے مقاصد کو سمجھنا بہرحال ضروری ہے۔ جیسا کہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے۔ یزید سے امام حسینؑ کو ذاتی اور شخصی اغراض کی بناء پر مخالفت نہ تھی۔ اگر بحیثیت ایک متنفس کے حسینؑ بس زندگانی دنیا ہی کے خواہاں ہوتے اور یزید آپ کی دنیاوی سیاست سے علیحدگی کو اپنے اقتدار سلطنت کے قائم رہنے کے لئے کافی سمجھتا تو عملی حیثیت سے کسی تصادم کا امکان ہی نہ ہوتا۔

مگر وہاں صورت حال یہ تھی کہ یزید مسلمانوں کے سروں پر بحیثیت ایک خود سر اور مطلق العنان فرمانروا کے مسلط ہونے کے ساتھ ساتھ بحیثیت پیغمبرِ اسلام کی نیابت کا دعویدار تھا اور حسینؑ کے خاموشی کے ساتھ

بیعت سے علیحدہ رہنے کو بھی وہ اپنے مقصد میں مزاحم سمجھتا تھا۔ وہ قبل اسلام کی مادہ پرستی کو لٹانے کے لئے عملی طور سے کوشاں اور حسینؑ روحانیت اور خدا پرستی کو قائم رکھنے کے ذمہ دار، وہ جبر و ظلم اور استبداد کا سکہ چلانے کے درپے اور حسینؑ حق و راستی کا علم بلند کرنے پر مامور، وہ اسلامی حدود و امتیازات مٹانے پر تلا ہوا، اور حسینؑ اسلامی خصوصیات کو باقی رکھنے کے فریضہ پر متعین تھے چنانچہ یزید نے معرکہ کربلا کے مقاصد کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے فی ما فی نقطۂ نظر کو بے نقاب کر دیا یہ کہہ کر کہ حسینؑ نے (عوام کو ان کے حقوق سے آگاہ کر کے) ہماری بلند عمارتوں اور آرائش و آسائش کے سامان کو خطرہ میں ڈال دیا تھا اس لئے ہمیں اپنے اقتدار اور دولت کو قائم رکھنے کے لئے جنگ کرنا پڑی۔" اور حسینؑ نے اپنی مقاومت کی نوعیت کو مندرجہ ذیل اشعار میں واضح فرمایا ہے۔ جو ابن خشاب نے نقل کئے ہیں۔

اللہ یعلم ان ما ∴ بیدی یزید لغیرہ ∴ وبانہ لم یکسبہ ∴ بخیرہ و بمیرہ

لو انصف النفس الخؤ ∴ ن لقصرت من سیرہ ∴ ولکان ذالک منہ اد ∴ نی شرہ من خیرہ

یعنی اللہ جانتا ہے کہ جو کچھ یزیدؔ کے پاس ہے وہ سب کا سب دوسروں کا ہے۔ خود اُس کو کوئی استحقاق اس پر تصرف کا حاصل نہیں ہے۔ اگر وہ خیانت کرنے والا انصاف سے کام لیتا تو اپنی رفتار بدل دیتا اور شرارت میں کمی کرتا۔

حسینؑ کا یہی نظریہ وہ تھا جس کا پھیلنا اور دوسروں کے دماغوں اور پھر زبانوں تک پہونچنا یزیدؔ کی تباہی کا باعث ہو سکتا۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ استبدادی طاقت اس امر کی مقتضی ہوتی

ہے کہ افراد قوم کی قوت احساس اور جراُت اظہار ختم کی جائے۔

چنانچہ حکومت دمشق کی طرف سے ایسی ہی تدبیریں کی گئیں کہ عوام نے یہ سوچنا چھوڑ دیا تھا کہ حکومت جائز ہے یا ناجائز۔ اور اگر کوئی سوچتا اور سمجھ بھی لیتا تو اس میں اتنی ہمت نہ ہوتی کہ وہ اپنے خیالات کا آزادی کے ساتھ اظہار کر سکتا۔ اس کے بالکل برخلاف امام حسینؑ کا مقصد یہ تھا کہ جمہور مسلمین میں قوت احساس اور جراُت اظہار کی صفتیں جو مفقود ہو گئی تھیں پھر سے پیدا ہو جائیں۔

حسینؑ اپنے بلند کردار سے ایک عام بیداری پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جس کے ماتحت صرف طاقت و اقتدار کو حق نہ سمجھا جائے۔ بلکہ اصل حق کو حق سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی طاقت پیدا ہو، ظاہر ہے کہ عام خیالات جب سطح پر قائم ہو جاتے ہیں۔ اس سے اس وقت تک نہیں ہٹتے جب تک کہ فضائے دماغی میں ہلچل ڈالنے والا کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آتا۔

چنانچہ ۶۰ھ میں حکومت شام کے قبیح و مذموم افعال عام طور پر مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے پھر بھی ان پر ایک عام بے حسی چھائی ہوئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ امام حسینؑ کا ساتھ دینے والے بھی تعداد میں بہت کم تھے۔

لہٰذا فطری حیثیت سے ضرورت تھی کسی ایسے اچانک حادثہ کی، بلکہ غیر معمولی واقعہ کی جو عام خلقت انسانی کی قوت احساس کو بیدار کر دے۔ چنانچہ امام حسینؑ کی شہادت نے اسی مقصد کو حاصل کیا۔

اسی کے ساتھ آپ کی عملی حیثیت سے نہایت شاندار مقاومت کی مثال نے ان میں پھر سے جراُت اظہار پیدا کر دی۔ بات یہ ہے کہ عام

طور پر جب تک انسان میدان عمل میں کوئی صریحی مثال نہیں دیکھ لیتا ہے اُس وقت تک ہچکچاتا رہتا ہے لیکن مثال سامنے آجانے پر وہ خود بھی سرگرم عمل ہونے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

میدان کربلا میں نہ صرف حسینؑ ہی کو بلکہ بوڑھوں جوانوں اور بچوں تک کو نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ اپنی اپنی جانوں کی قربانیاں پیش کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھنے یا کانوں سے سن لینے والوں کے نزدیک راہ حق میں موت کا مرحلہ پہلے سے بہت زیادہ آسان ہو گیا۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اکثر وہی اسباب جن کے ذریعہ سے خاص طرح کا نتیجہ پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے حد سے بڑھ جانے پر توقع کے بالکل خلاف نتیجہ برآمد کرتے ہیں۔ جیسا کہ عرب کا مقولہ ہے الشیئ اذا تجاوز عن حدہ رجع الی ضدہ (یعنی) کوئی شے جب اپنی حد سے تجاوز کرتی ہے تو اپنی ضد کی طرف مائل ہوتی ہے۔

چنانچہ ایک جابر و قاہر حکومت کی طرف سے عوام پر اس پابندی کا عاید کیا جانا کہ اُس کے طرز عمل کے خلاف آواز بلند نہ کی جائے۔ زیادہ تر جبر و تشدد کی بناء پر ہوتا ہے لیکن یہی ظلم و تشدد جب حد سے گزر جاتا ہے تو پھر اسی دبی اور پسی ہوئی خلقت سے ہی آواز ایک بے اختیارانہ چیخ کے طور پر بلند ہوتی ہے جو آگے چل کر کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

یزیدی حکومت جو حسینؑ پر ظلم و ستم ڈھا رہی تھی وہ اسی غرض سے کہ آپ کے بظاہر عبرتناک انجام کو دیکھ کر پھر کسی کو ذرا بھی مخالفت کی جرأت نہ ہو، اور امام حسینؑ اس کے تمام مظالم صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر رہے تھے۔

نتیجۃً حکومت اپنے ذوق ستم رانی کے سبب سے یہ تمیز نہ کر سکی کہ ظلم وجور کو کس حد تک جبر کے دباؤ سے خلقت برداشت کرنے پر تیار کی جاسکتی ہے۔ اور کس نقطہ تک پہنچ کر بظاہر وہ احساسات بھی بھر ہری لے کر جونک پڑتے ہیں اور شکنجۂ ظلم میں گرفتار اور بظاہر بے بس خلق خدا اس شدت سے پھڑپھڑاتی ہے کہ خود شکنجہ ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔

چنانچہ حضرت امام حسینؑ یہ اعتماد کامل رکھتے تھے کہ آپ حقانیت کے تحفظ میں مصائب کا وہ غیر معمولی مقابلہ کر سکیں گے کہ خود ظلم وتشدد کے دست وبازو آپ کی قوت برداشت کے مقابلہ میں معطل وعاجز نظر آنے لگیں گے۔

حکومت کی توقع تو یہ تھی اور مظالم ڈھائے اسی لیے جاتے ہیں کہ دوسرے عبرت حاصل کر کے اس کے بعد ایسی جرأت نہ کریں گے اور حکومت کے منشا کے خلاف طرز عمل اختیار کرنے کا یہ دردناک انجام دیکھ کر کسی کو لب کشائی کی ہمت نہ ہوگی۔ اسی خیال کے ماتحت پسماندگان حسینؑ کا لٹا ہوا قافلہ بحال تباہ شہر بشہر اور دیار بدیار تشہیر کیا گیا تھا۔ مگر اوراق تاریخ گواہ ہیں کہ نتیجہ بالکل یزید کی توقع کے خلاف ظاہر ہوا۔ جس کے آثار میں موقع جنگ ہی پر حر بن یزید ریاحی کے لشکر شام سے جدا ہو جاتے ہی سے نظر آنے لگے تھے۔ چنانچہ شہادت حسینؑ کے بعد تیسرے ہی دن جب دربار ابن زیاد میں سر حسینؑ کے ساتھ بے ادبی کی جارہی تھی تو بوڑھے صحابی زید بن ارقم نے سر دربار گھڑے ہو کر صدائے احتجاج بلند کی جس سے ظاہر ہو گیا کہ کربلا کے واقعہ سے حق گوئی کی جرأت کم نہیں ہوئی بلکہ زیادہ ہو گئی۔ پھر جب مسجد جامع میں لوگ جمع کیے گئے اعلان فتح سننے کے لیے

تو باوجودیکہ وفاداروں کا خالص جمادُ تھا، پھر بھی حسینؑ اور آپ کے والد بزرگوار علی بن ابی طالبؑ کا نام بے ادبی کے ساتھ آنا تھا کہ دفعتہً مسجد کی خاموش فضا میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی اور بوڑھے نابینا عبداللہ بن عفیف نے اس بے جگری کے ساتھ ابن زیاد کو ٹوکا جو تاریخ میں یادگار ہے۔

اسی طرح یزیدؔ نے اپنے دربار میں جب چوب خیزراں سے سر حسینؑ کے ساتھ بے ادبی کی تو ابو برزۂ اسلمی اور نیز سفیر بادشاہ روم نے جو عیسائی تھا اس کے منھ پر اس کو بہت کچھ سخت و سست کہا۔

یہ تھی حسینی فتح کہ باطل کے خلاف احتجاج ہونے لگا اور مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی اپنے میں جراٴت اظہار محسوس کرنے لگے تھے۔

معرکہ کربلا سے پہلے کس کی مجال تھی کہ یزیدؔ کے دربار میں امام حسینؑ کا نام عزت کے ساتھ لے سکے۔ لیکن پس ماندگان حسینؑ کے قیدیوں کی صورت میں اُس کے سامنے پیش کیے جانے کے بعد اس کے منھ پر حسینؑ کی تعریفیں ہوتی تھیں اور اُس کو خاموشی کے ساتھ سننا پڑتا تھا۔

اس سب کے بعد نتیجہ کے لحاظ سے یہ ماننا لازمی ہے کہ حسینؑ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے لہٰذا وہ فاتح تھے اور یزیدؔ اپنے مقصد میں ناکام ہوا لہٰذا وہ یقیناً مفتوح تھا۔

پینتیسواں باب

مجرموں کی پشیمانی

فتح اور شکست کی ایک خاص شناخت یہ ہے کہ فاتح اپنے کارنامہ پر نازاں ہوتا ہے اور مفتوح اپنے طرز عمل پر شرمندہ و پشیمان، چنانچہ ظاہر ہے کہ حسینؑ جس راستے پر چلے تھے اس پر قائم رہے اور آپ نے جو کچھ کیا اور جو اُس کا نتیجہ ہوا اس پر نہ آپ خود پشیمان ہوئے نہ آپ کے ساتھی، آپ کے پسماندگان اور آپ کے چھوٹے چھوٹے بچوں تک میں سے کوئی پشیمان ہوا نہ آپ کی اولاد یا آپ کے ماننے والوں میں سے کوئی آپ کے بعد پشیمان ہوا کہ حضرت امام حسینؑ نے ایسا کیوں کیا جس کا نتیجہ آپ کی بربادی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لیکن آپ کے قاتل اور مخالف ہی نہیں بلکہ وہ بھی جنھوں نے عملی حیثیت سے آپ کی نصرت کا فرض ادا نہ کیا تھا یا نہ کر سکے تھے بعد میں پشیمان ہوئے کہ ہم نے ایسا کیوں کیا۔

نفسیاتی حیثیت سے اظہار پشیمانی مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے کبھی تو اس کے ماتحت اپنے طرز عمل کے متعلق تاویلوں اور عذر تراشیوں سے کام نکالا جاتا ہے اور کبھی اپنے سر سے ذمہ داری ہٹا کر دوسروں کے سر عائد کی جاتی ہے اور کبھی ندامت و افسوس کا صاف صاف اظہار کر دیا جاتا ہے

چنانچہ حقیقی معنی میں برمحل اور قابل صد ستائش اظہار ندامت حُر بن یزید ریاحی کا تھا جس کے ذیل میں انھوں نے روز عاشور نصرت حسینؑ کے اہم فریضہ کی پوری بجا آوری کرتے ہوئے اپنے بہتے ہوئے خون سے اپنی فرد عمل کو دھو کر صاف بنا دیا اور سعادت شہادت حاصل کی، اس کے بعد جن جن لوگوں نے بھی اپنی اپنی پشیمانی کا اظہار مختلف طریقوں پر کیا وہ بعد از وقت تھا۔

ان میں سب سے خفیف درجہ کے مجرم وہ اہل کوفہ تھے جنھوں نے مسلم بن عقیل کے واسطہ سے نصرت حسینؑ کا عہد و پیمان کیا تھا۔ مگر وقت آنے پر ان اسباب سے جن کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں ہو چکا ہے کربلا نہ پہونچ سکے یا پہونچنے کی کوشش نہ کی۔ ان کی پشیمانی نہایت سچے دل سے معرکہ کربلا کے بعد بہت جلد ہی وقوع میں آ گئی جسے انھوں نے اپنی ان کوششوں سے جو خون حسینؑ کا انتقام لینے کے لیے کی گئیں ایک قابل احترام درجہ دے دیا۔ اور "توابین" لقب حاصل کیا۔

ایسے مجرموں میں جنھوں نے فریضۂ نصرت کے ادا کرنے میں کوتاہی کی تھی ایک عبداللہ بن الحرا الجعفی تھا جسے راہ کوفہ میں حضرت امام حسینؑ نے خود نصرت کی دعوت دی تھی مگر اُس نے حیلہ حوالہ سے اپنی جان بچائی اور اس سعادت سے محروم رہا (۱) اس پر اسے عمر بھر ندامت رہی جسے اس نے ان اشعار کی صورت میں ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

فیالک حسرة ما دمت حیا	تردد بین حلقی والتراقی
حسین حین یطلب بذل نصری	علی اهل العداوة والشقاق
فما انسیٰ غداة یقول حزنا	اتترکنی وتزمع لانطلاق
فلو فلق التلهف قلب حی	لهم القلب منی بانفلاق

(۱) ارشاد مفید

(یعنی) تمام زندگی مجھے یہ رنج و ملال رہے گا کہ حضرت امام حسینؓ نے مجھ سے مدد طلب کی اور میں نے اس سعادت کو حاصل نہ کیا (۱) پھر ۔۱۔ واقعہ کربلا کے بعد ابن زیاد نے اس سے شکایت کی کہ تم عرصہ سے کہاں غائب ہو تم نے حسینؓ کے مقابلہ کو جانے سے گریز کیا معلوم ہوتا ہے تم ہمارے دشمنوں سے ہمدردی رکھتے تھے تو یہ سن کر اُس کے جذبات میں اور زیادہ طوفان پیدا ہو گیا۔ اور اب اس نے جو اشعار کہے ان میں سے دو شعر حسب ذیل ہیں

یقول امیر غادر حق غادر — الا کنت قاتلت الشہید ابن فاطمہ
فیا ندمی الا اکون نصرتہ — الا کل نفس لا تسدد نادمہ

"وہ امیر جو خود انتہائی غدار ہے مجھ سے پوچھتا ہے کہ تم فرزند فاطمہ زہراؑ کے خلاف جنگ میں شریک کیوں نہ ہوئے؟ حالانکہ مجھے تو اسی کی ندامت ہے کہ میں نے ان کی نصرت کیوں نہ کی اور یقیناً جو شخص بھی صحیح راستہ نہ اختیار کرے اُسے نادم ہونا ہی چاہیئے" اس کے بعد وہ کوفہ سے نکل کر سرزمین جبل کی طرف چلا گیا۔ (۲)

ان سے زیادہ مجرم وہ خلقت تھی جو حضرت امام حسینؓ کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان کربلا میں صف بستہ کھڑی تھی۔ چنانچہ ان میں سے بعض کے اظہار پشیمانی پر مبنی اقوال جستہ جستہ تاریخ نے ہم تک پہونچائے ہیں۔ مثلاً قرہ بن قیس کہ جو عمر بن سعد کے نمائندہ کی حیثیت سے امام حسینؑ کی خدمت میں آیا تھا واقعہ کربلا کے بعد کہا کرتا تھا کہ اگر حر بن یزید نے مجھ کو مطلع کر دیا ہوتا کہ وہ جماعت حسینی کی طرف جا رہے ہیں تو میں بھی

---

(۱) الاخبار الطوال صـ۲۵۸ (۲) طبری ج ۶ صـ۲۰۰ (۳) الاخبار الطوال صـ۲۵۹

ان کے ساتھ ضرور ہو لیتا۔ (۱)

اسی طرح رضی بن منقذ عبدی کہ جس نے میدان کربلا میں بریر ہمدانی پر حملہ کیا تھا اور بالآخر زیر ہونے پر کعب بن جابر بن عمرو ازدی کو اپنی کمک پر بلایا تھا اور اس نے بریر کو نیزہ مار کر قتل کر دیا تھا۔ واقعہ کربلا کے بعد اپنی پشیمانی کا حسب ذیل اشعار میں اظہار کیا کرتا تھا۔

"مقدر میں اس طرح لکھا نہ ہوتا تو میں اس جنگ میں شریک ہی نہ ہوا ہوتا کہ ابن جابر کا احسان مجھ پر ہو سکتا۔ وہ دن میرے ہی لیے تمام عمر کے عار و ننگ کا باعث نہیں ہوا۔ بلکہ متعدد نسلوں کی ذلت و خواری کا سبب ہو گیا۔ کاش بریر کے قتل اور حسینؑ سے مقاتلہ کے دن سے پہلے ہی میں مر کر قبر میں پہنچ گیا ہوتا۔ (۲)

شبث بن ربعی کو جو فوج ابن سعد کے بڑے سرداروں میں سے تھا۔ یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ اللہ اس ملک والوں کو کوئی خیر نہیں پہنچا سکتا۔ کتنے غضب کی بات ہے کہ ہم نے پانچ برس تک علی بن ابی طالبؑ اور ان کے فرزند (حسن مجتبیٰؑ) کے ساتھ مل کر آل ابوسفیان سے جنگ کی پھر اس کے بعد ان ہی کے فرزند حسینؑ کے مقابلہ میں جو اپنے ذاتی صفات کے لحاظ سے بھی تمام روئے زمین کے لوگوں سے بہتر تھے ہم نے معاویہ اور زیاد کی اولاد کے ساتھ مل کر چڑھائی کر دی۔ یہ اتنی بڑی گمراہی تھی جس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتی۔ (۳)

ایوب بن مشرح خیوانی جس نے حر بن یزید ریاحی کے گھوڑے کو

---

(۱) ارشاد صفحہ ۲۴۹ طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۳ (۲) طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۸
(۳) طبری ج ۶ صفحہ ۲۵۰

کربلا میں تیر مار کر قتل کیا تھا، عرصہ کے بعد جب وہ یہ روداد بیان کر رہا تھا تو حاضرین میں سے بعض نے پوچھا کہ کیا تم نے حر کو قتل بھی کیا تھا، کہا نہیں بخدا میں نے انھیں قتل نہیں کیا۔ قتل کسی دوسرے نے کیا اور مجھے پسند بھی نہ تھا کہ میں انھیں قتل کروں۔ ابوالوداک (حاضرین میں سے ایک شخص) نے کہا کیوں؟ کہا عالم خیال یہ ہے کہ وہ بہت نیک اعمال لوگوں میں سے تھے اب اگر ان کے مقابلہ میں ہاتھ اٹھانا گناہ تھا تو میں صرف زخمی کرنے اور مقابلہ میں کھڑے ہونے ہی کی حد تک گناہ گار رہوا یہ بہتر تھا اس سے کہ میں اُن میں سے کسی کے قتل کا مرتکب ہوتا۔ یہ سن کر ابوالوداک کو غصہ آگیا۔ کہا میرے نزدیک تو تم سے اللہ اُن سب کے قتل کا مواخذہ کریگا۔ ارے کسی کو تیر لگایا۔ کسی کے گھوڑے کا خاتمہ کیا۔ کسی سے دست بدست مقابلہ کیا۔ کبھی خود حملہ کیا۔ اور کبھی دوسروں کو ترغیب دلائی اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنی موجودگی سے سواد لشکر میں اضافہ کیا اور جب حملہ ہوا تو میدان سے فرار کرنا گوارا نہ کیا اور تمہاری طرح دوسروں نے بھی یہی سب باتیں کیں تو تم سب ہی اُن تمام شہداء کے قاتل ٹھہرے اور سب ہی کو اس جرم کی سزا ملنا ہے۔ ایوب کے پاس اسکا کوئی سنجیدہ جواب نہ تھا۔ وہ جل کر کہنے لگا کہ اچھا اگر تمھارے ہاتھ روز قیامت کا حساب ہو تو تم مجھے کبھی نہ بخشنا (۱)

ان سے بھی بڑھ کر مجرم افواج یزید کا افسر عمر سعد تھا۔ اُس کے تاثرات کا بیان حمید بن مسلم نے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عمر بن سعد میرا دوست تھا۔ جب وہ میدان کربلا سے واپس ہوا تو میں نے جا کر اُس سے حالات دریافت کیے۔ اُس نے کہا کچھ نہ پوچھو کوئی مسافر اپنی منزل کی طرف ایسے برے انجام کے ساتھ

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۵۰

واپس نہیں ہوا ہوگا جیسے کہ ہیں۔ میں نے قریبی رشتہ داری کا پاس نہ کرتے ہوئے ایک جرم عظیم کا ارتکاب کیا (۱)

اس سے بڑا مجرم حاکم کوفہ عبیداللہ بن زیاد تھا کہ جس نے تمام افواج کو اپنی نگرانی میں میدان کربلا کی طرف بھیجا اور عمر بن سعد کو قتل حسینؑ پر مامور کیا۔ وہ اپنے اس عمل سے متعلق ذمہ داری یزید پر عائد کرتا تھا چنانچہ جب یزید کے مرنے پر عراق میں حکومت کے خلاف ہمہ گیر شورش برپا ہو گئی اور ابن زیاد کو بصرہ سے فرار اختیار کرنا پڑا تو اس نے قبیلہ بنی یشکر میں سے ایک شخص کو راستہ بتانے کے لیے اپنے ساتھ لیا۔ اثنائے راہ میں ایک مرتبہ جب دیر تک ابن زیاد ناقہ پر سر جھکائے بیٹھا رہا تو اس شخص نے یہ خیال کر کے کہ وہ سو گیا ہے اس کو آواز دی۔ ابن زیاد نے جواب میں کہا کہ میں سو نہیں رہا ہوں بلکہ ایک اہم مسئلہ کے متعلق غور و فکر کر رہا تھا۔ اس شخص نے کہا میں جانتا ہوں آپ کیا سوچ رہے تھے، پھر ابن زیاد کے دریافت کرنے پر اس نے بتلایا کہ "آپ حسینؑ بن علیؑ کے قتل کرا دینے پر خجالت و پشیمانی کا احساس کر رہے تھے اور بصرہ میں جو قصر ابیض تعمیر کرایا ہے اور اس میں رہنا نصیب نہ ہوا اس کے متعلق سوچ رہے تھے یا بصرہ کے خوارج کو جو محض بدگمانی اور توہم کی بنا پر آپ نے قتل کر دیا تھا اس پر پشیمان ہو رہے تھے"۔ ابن زیاد نے جواب دیا کہ تم نے کوئی بات ٹھیک نہیں کہی۔ چونکہ حسینؑ بن علیؑ نے بادشاہ وقت کی مخالفت کی تھی اور اس نے مجھ کو ان کے قتل کرنے کا حکم دیا تھا لہٰذا اس کی ذمہ داری یزید بن معاویہ پر ہے مجھ پر نہیں ہے (۲)

---

(۱) الاخبار الطوال ص ۲۵۰ (۲) طبری ج ۷ ص ۲۹

اسی پشیمانی کا نتیجہ تھا کہ جب یزید نے حجاز پر فوج کشی کرنا چاہی اور ابن زیاد کو لکھا کہ عبداللہ بن زبیر کے مقابلہ کے لیے جاؤ تو اُس نے انکار کر دیا اور کہا اس فاسق کے کہنے سے رسولؐ کے نواسے کو تو قتل کر چکا اب کعبہ پر بھی فوج کشی کروں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا (۱)

سب سے بڑا مجرم یزید بن معاویہ تھا جس کی تصدیق ابن زیاد کے بیان سے ہو چکی اور اُس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ اطلاع ملنے پر کہ حسینؑ کوفہ کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اُس نے ابن زیاد کو کوفہ کا حاکم اُسی لیے مقرر کیا تھا کہ وہ انتہائی سخت گیری سے کام لے سکیگا۔ پھر جب ابن زیاد کے حکم سے مسلم بن عقیلؑ شہید کر دیے گئے اور اُن کا سر کاٹ کر یزید کے پاس بھیجا گیا تو یزید نے اُس سے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ابن زیاد کے حسن خدمت کا اقرار کیا اور اُس کو مزید ہدایت بھیجی کہ اب حسینؑ کا مقابلہ بھی اسی عنوان سے کیا جائے۔

پھر شہادت حسینؑ کے بعد ابن زیاد نے پہلے سر ہائے شہداء اور پسماندگان حسینؑ کی بابت یزید کی مرضی معلوم کر لی، اُس وقت اُن کو کوفہ سے دمشق کی طرف روانہ کیا۔ اور تمام واقعات مظالم معلوم ہونے کے بعد یزید کی طرف سے ابن زیاد پر کوئی عتاب نہیں ہوا بلکہ وہ یزید کی زندگی کی آخری سانس تک کوفہ کے تخت حکومت پر باقی رہا اور یزید کی نوازشیں اُسی پر نہیں بلکہ آل زیاد میں سے دوسرے افراد پر بھی اور زیادہ ہو گئیں چنانچہ ابن زیاد کا ایک بھائی عبدالرحمان بن زیاد جو ۵۹ھ سے خراسان کا حاکم تھا، شہادت امام حسینؑ کو سننے کے بعد خراسان اپنی جگہ ایک دوسرے

(۱) طبری ج ۶، ص

شخص کو قائم مقام بنا کر دمشق گیا اور خراسان کے خزانہ میں جو دو کروڑ درہم اُس کے اقرار کے مطابق جمع تھے وہ اپنے نام معاف کرا لیے (۱) پھر عبدالرحمان کے بعد خراسان کی حکومت اسی کے دوسرے بھائی مُسلم بن زیاد کے سپرد کی گئی (۲)۔

ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ قتل حسینؓ یزید کے منشا کے مطابق اور اُسی کے حکم سے عمل میں لایا گیا تھا، اسی بنا پر شروع شروع اُس نے شہادت حسینؓ پر انتہائی شادمانی کا اظہار کیا لیکن اس کے بعد جب آثار انقلاب قوی سے قوی تر ہوتے گئے تو اُس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا اور وہ کفِ افسوس مل مل کر نہایت حسرت و یاس کے ساتھ کہنے لگا کہ "ہائے حسینؓ بن علیؓ کو قتل کر کے ابن زیاد نے مسلمانوں کی نظروں میں مجھ کو ذلیل و خوار اور قابل نفرت بنا دیا اور اُن کے دلوں میں میری طرف سے کینہ و عداوت کے بیج بو دیے۔ قتل حسینؓ کو نہایت ترین جرم سمجھتے ہوئے مسلمانوں میں نیک و بد سب ہی مجھ سے بیزار ہو گئے۔ ہائے ابن مرجانہ (ابن زیاد) نے یہ کیا کیا۔ خدا اُس پر لعنت کرے (۳)

انفعال و پشیمانی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی بات سے ہٹ جائے۔ امام حسینؓ اور یزید میں نباہ کی صورت نہیں تھی کہ یزید حسینؓ سے بیعت حاصل کرنے پر مصر تھا اور امام حسینؓ کو آخری

---

(۱) الوزراء والکتاب ص ۱۸ (۲) الوزراء والکتاب ص ۱۵ طبری ج ۶ ص ۱۷۲۰۱

(۳) طبری ج ۷ ص ۱۹

حد تک انکار تھا۔ اب یہ تو قطعی طور پر ثابت ہے کہ امام حسینؑ نے اپنے انکار بیعت کو اقرار سے تبدیل نہیں کیا اس لیے کہ اگر ایسا کر دیا ہوتا تو سر نوک نیزہ پر نظر نہ آتا مگر یہ دیکھنا ہے کہ یزید اپنے مطالبہ پر قائم رہا یا اُس سے ہٹ گیا؟ یہاں پر یہ یاد کر لینا ضروری ہو گا کہ یزید کا حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ شخصی حیثیت سے نہ تھا بلکہ پیغمبر اسلام کے روحانی وارث کی حیثیت سے جب ایسا تھا تو جو حیثیت اپنی زندگی میں حسینؑ کو حاصل تھی وہی آپ کے بعد آپ کے فرزند علی ابن الحسینؑ کو حاصل ہو گئی تھی۔ پھر حضرت امام حسینؑ تو بنفس نفیس یزید کی گرفت میں کبھی آ نہ سکے تھے اس لیے کہ یزید تھا دمشق میں اور حسینؑ تھے مدینہ، مکہ یا پھر کربلا میں، مگر آپ کے پسماندگان کے لیے ایسا وقت آیا کہ جب وہ سب کے سب قیدیوں کی حیثیت سے یزید کے سامنے پیش کیے گئے۔ اگر یزید اپنے مطالبہ بیعت پر قائم ہوتا تو اُس کو علی ابن الحسینؑ کے سامنے اس سوال کو پھر پیش کرنا چاہیے تھا لیکن پسماندگان حسینؑ میں سے کسی فرد کے سامنے بھی بیعت کا سوال پیش نہیں کیا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یزید اپنے مطالبہ بیعت سے ہٹ گیا تھا۔ حالانکہ مظالم ڈھائے اسی لیے جاتے ہیں کہ کمزور فریق مرعوب و خوف زدہ ہو جائے مگر ابن زیاد کے دربار میں ایسا موقع پیش آ چکا تھا کہ اُس کے علی ابن الحسینؑ کو قتل کی دھمکی دینے پر آپ نے تیور بدل کر نحیف مگر عزم مستقل کی پوری ترجمانی کرتی ہوئی آواز میں کہا تھا "اما علمت ان القتل لنا عادۃ وکرامتنا الشہادۃ" (یعنی) کیوں ابن زیاد! ابھی تک تو نہیں سمجھ سکا کہ قتل ہونا ہماری عادت ہے اور شہادت ہماری عزت ہے۔

اس سے ظاہر ہو گیا کہ ظلم اٹھانے والے ظلم کی سنگینی سے خوف زدہ

نہیں ہوئے مگر ظلم کرنے والے ان کے صبر و استقلال کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے چنانچہ یزید میں اپنے تمام جبروت کے مظاہروں کے باوجود اب اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ پس ماندگان حسین ؑ میں سے کسی کے سامنے سوال بیعت پیش کرتا۔ اس لیے کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے حسین ؑ کا سر بریدہ موجود تھا اور اُس کے کانوں میں کربلا کے حالات گونج رہے تھے اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اگر سوال بیعت کہیں پھر کر دیا گیا تو دمشق کا دربار صحرائے کربلا بن جائے گا۔ لہٰذا دوسری طرح کی دل آزاریاں پس ماندگان حسین ؑ کے خلاف اختیار کی گئیں مگر سوال بیعت اٹھایا نہیں جا سکا۔ کیا اس سے بڑھ کر حسین ؑ کی فتح اور یزید کی شکست کا دوسرا کوئی ثبوت درکار ہے؟
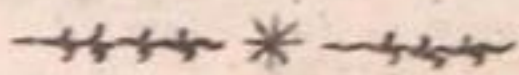
چھبیسواں باب

عالم اسلامی کے تاثرات

شہادت حسینؓ کے تفصیلات پر مطلع ہوتے ہی عالم اسلامی کی ہر فرد کے دل میں غم و غصہ کا طوفان برپا ہو گیا اور جو جو بھی اس کے ارتکاب کے ذمہ دار سمجھے گئے ان سے نفرت و بیزاری کا اظہار کیا جانے لگا۔ اور قتل حسینؓ ان کے لیے رسوائی کی ایک سند بن گیا۔

چونکہ بظاہر حالات اس شہادت عظمی سے اہل کوفہ کو قریب کا تعلق تھا لہذا ان کے دامن پر اس کا ایسا دھبہ لگا کہ صدیوں تک وہ دھویا نہ جا سکا یہاں تک کہ ابو العباس سفاح کے سامنے جب بصرہ اور کوفہ کی باہمی فضیلت کے بارے میں مناظرہ ہوا تو ابو بکر ہذلی نے کوفہ کی مذمت میں یہی چیز خاص طور سے پیش کی کہ یہاں کے لوگوں نے حسینؓ کو قتل کیا۔

ابو عثمان نہدی ایک صحابی رسولؐ کوفہ میں رہا کرتے تھے۔ جب حسینؓ میدان کربلا میں شہید کر دیے گئے تو کوفہ سے وہ بصرہ کی طرف منتقل ہو گئے یہ کہہ کر کہ میں اس شہر میں نہیں رہوں گا۔ جہاں رسول اللہؐ کا نواسہ شہید کر ڈالا گیا ہو۔

پھر چونکہ کوفہ اور کربلا سرزمین عراق پر واقع ہیں لہذا عراق کے لیے بھی قتل حسینؓ باعث ذلت شمار کیا جانے لگا۔ چنانچہ اہل عراق میں سے

ایک شخص نے عبداللہ بن عمر سے دریافت کیا کہ حالت احرام میں مچھر مارنا جائز ہے یا نہیں ؟ اس پر انھوں نے کہا کہ اہل عراق کو دیکھو تو یہ مچھر کے خون کے متعلق استفسار کرتے ہیں حالانکہ ان ہی لوگوں نے پیغمبر خدا کے نواسے کا خون بے دریغ بہا دیا ۔ باوجودیکہ پیغمبر خداؐ نے حسنؑ و حسینؑ کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ دونوں کائنات عالم میں میرے دو گلدستے ہیں ۔ (۱)

شخصیتوں کے لحاظ سے شہدائے کربلا کے قاتلوں سے تنفر خود ان کے گھر والوں تک کو ہو گیا چنانچہ بریر ہمدانی کا قاتل کعب بن جابر جب اپنے مکان پر واپس ہوا تو اس کی بیوی یا بہن نوار بنت جابر نے کہا کہ میں تجھ سے اب عمر بھر بات نہیں کروں گی ۔ تو نے فاطمہ زہراؑ کے فرزند کے خلاف جنگ میں شرکت کی اور سید القراء (بریر) کو قتل کیا ۔ (۲)

ابن زیاد جس نے براہ راست کربلا کی طرف فوجیں بھیجی تھیں اس کے متعلق قبل اس کے کہ یزید کی سیاست میں کوئی تبدیلی واقع ہو اور وہ خود ابن زیاد کو قتل حسینؑ کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت شروع کرے ۔ دوسرے لوگ اس کے درباریوں میں سے ابن زیاد کی ماں سمیہ سے حقارت آمیز تذکرہ کے ساتھ اسے برا کہتے تھے جسے یزید کو بہرحال خاموشی کے ساتھ سننا پڑتا تھا ۔ چنانچہ یحییٰ بن الحکم نے یزید کے پہلو میں بیٹھ کر حسب ذیل شعر پڑھ دیئے تھے ۔

لھام بجنب الطف ادنی قرابۃ — من ابن زیاد العبد ذی الحسب الوغل

سمیۃ امسی نسلھا عدد الحصی — وبنت رسول اللہ لیس لھا نسل

---

(۱) بخاری ج ۲ ص ۱۸۱ ج ۳ ص ۳ (۲) طبری ج ۶ ص ۲۴۷

(یعنی) وہ سر جو میدان کربلا میں تنوں سے جدا کر دیے گئے قرابت کے اعتبار سے ہم سے زیادہ نزدیک تھے بہ نسبت غلام زادہ ابن زیاد کے جو کمینہ خاندان سے ہے۔ افسوس سمیہ کی نسل تو سنگریزوں کی طرح پھیل گئی اور دختر رسولؐ کی نسل باقی نہ رہی۔" (۱)

کسی اور کا کیا ذکر اسی سمیہ نے جو ابن زیاد کی ماں تھی بیٹے کو اس کے اس فعل پر لعنت ملامت کی۔ (۲)

خود یزید کی رسوائی کے عالم کا پورا پورا اندازہ اسی کے اس قول سے ہو جاتا ہے کہ ابن زیاد نے مسلمانوں میں مجھ کو ذلیل وخوار اور قابل نفرت بنا دیا اور ان میں کے نیک و بد سب ہی مجھ سے بیزار ہو گئے۔

نہ صرف یہ کہ خود اس کے زمانہ میں لوگ اُسے برا کہتے اور سمجھتے تھے بلکہ اس کے بعد آنے والی نسلوں میں بھی اس کے خلاف غم و غصہ کا قوی جذبہ پایا جاتا تھا یہاں تک کہ خود بنی امیہ میں سے اس کے بعد ہونے والے سلاطین اس چیز کے روادار نہ تھے کہ کوئی بھی اس کا ذکر تعظیم واحترام کے ساتھ کرے بلکہ خود اس کے بیٹے معاویہ بن یزید نے برسر منبر اپنے باپ کی بداعمالیوں کا اقرار کرتے ہوئے اس کے خالی کیے ہوئے تخت حکومت پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔

دوسری صدی ہجری کے اوائل تک یہ جذبہ برقرار رہا چنانچہ عمر بن عبد العزیز کے دربار میں کسی شخص نے ایک مرتبہ یزید کے نام کے ساتھ لفظ "امیر المومنین" کہہ دیا تھا تو عمر بن عبدالعزیز نے غصہ سے کہا "تم اُسے

---

(۱) ارشاد صفحہ ۲۶۱ - ۲۶۲ (۲) طبری ج ۶، ص ۶

امیر المومنین کہتے ہو؟!" اور پھر حکم دیا کہ اسے بیس تازیانے لگائے جائیں۔ چنانچہ یہ سزا اس کو دی بھی گئی۔

اتنا ہی نہیں بلکہ قتل حسینؓ اور یزید کی حکومت امت اسلامیہ کے دامن پر ایک دھبا بن گئی جیسا کہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور فلسفی شاعر ابو العلاء معری نے مندرجہ ذیل دو شعروں میں اس کا اظہار کیا ہے:۔

اری الایام تفعل کل نکرٍ فما انا بالعجائب مستزید

الیس قریشکم قتلت حسیناً وکان علیٰ خلافتکم یزید

(یعنی) زمانہ کی نیرنگیاں میرے سامنے عجیب نقشے پیش کرتی رہتی ہیں یہاں تک کہ ان کو دیکھنے کی اب مجھے ہوس باقی نہیں رہی۔ کیوں؟ کیا تمھارے قریش نے حسینؓ کو قتل نہیں کیا اور کیا تمھاری خلافت کے تخت پر یزید ساخطا کار نہیں بیٹھا۔؟

ظاہر ہے کہ اس درجہ وسیع اور دیرپا جذبۂ نفرت جو قاتلان حسینؓ کے خلاف عام طور پر خلق خدا میں پیدا ہو چکا تھا وہ بے نتیجہ نہیں رہ سکتا تھا۔ لہذا ناممکن تھا کہ صورت حال میں انقلاب پیدا نہ ہوتا۔

سینتیسواں باب

آثار انقلاب

واقعہ حرّہ خلافت ابن زبیر اضطراب عراق و ایران اور دیگر جزئی واقعات

بڑے سے بڑے انقلاب کا رنگ بنیادی دو چیزیں ہیں کہ جو شہادت حسینؑ کے فطری نتیجہ کے ذیل میں عام طور پر مسلمانوں میں پیدا ہوچکی تھیں یعنی قوت احساس اور جرأت اظہار جب یہ دو چیزیں کسی خاص سلطنت کسی خاص نظام یا کسی خاص اقتدار کے خلاف بروئے کار آجائیں تو پھر انقلاب کا رونما ہونا لازمی اور ضروری ہے۔

چنانچہ حکومت یزید کے خلاف آثار انقلاب اسی وقت سے نمایاں ہونے لگے تھے کہ جب پس ماندگان حسینؑ قیدیوں کی صورت سے کوفہ کے بازار میں تشہیر کیے جارہے تھے۔ حالانکہ ان قیدیوں کو خود رونے کی اجازت نہ تھی اور حکومت کی طرف سے فتح کی خوشیاں منانے کا اہتمام تھا مگر بہرصورت پس ماندگان حسینؑ کی حالت زار کو دیکھ کر اور زینبؑ و کلثومؑ اور علیؑ بن الحسینؑ کے زوردار خطبوں کو سن کر کوچہ و بازار میں گریہ و زاری

کے شور سے ایک کہرام برپا ہو گیا تھا یہ رائے عامہ کا وہ بے ساختہ مظاہرہ تھا جسے کوئی طاقت دبا نہیں سکتی تھی۔

پھر جب پس ماندگان حسینؑ شام کی طرف روانہ کیے گئے تو یزیدیوں کے مقابلہ میں راستے میں بہت سی منزلوں پر شہروں کے دروازے بند کر لیے گئے۔ بہت سے مقامات پر لوگ مسلح ہو کر نکل آئے اور اکثر جگہ جنگ کی صورت بھی پیش آئی۔ چنانچہ یہ آغاز ہی وہ تھا جو بجائے خود کسی بڑے انقلاب کی اپنے انجام میں خبر دے رہا تھا۔

مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ یہ دونوں مسلمانوں کے خاص مرکز تھے۔ مدینہ بنی ہاشم کا شہر تھا جن میں سے ابو طالب کی اکثر اولاد حضرت امام حسینؑ کے ساتھ جا چکی تھی۔ مگر اس خاندان کے دوسرے افراد تو سب ہی مدینہ میں رہ گئے تھے۔ پھر اولاد ابو طالب میں سے بھی محمد بن حنفیہ اور عبد اللہ بن جعفر مدینہ ہی میں رہے تھے۔ خواتین میں سے بھی کئی باقی رہ گئی تھیں۔ اہل مدینہ کتنے ہی بے حس سہی مگر اتنے دردمندوں کے تاثرات انھیں کہاں تک متاثر نہ بناتے۔ اسی وقت جب ابن زیاد نے سر امام حسینؑ دمشق کی جانب روانہ کیا، یزید نے عبد الملک بن ابی الحدیث سلمی کو مدینہ روانہ کیا اور کہا کہ جا کر عمر بن سعید بن عاص (حاکم مدینہ) کو قتل حسینؑ کی خوش خبری پہونچا دو۔ عبد الملک جب مدینہ کے پاس جا پہونچا تو راستے ہی میں ایک شخص نے قریش میں سے اسے دیکھ کر پوچھا: کیوں کیا واقعہ ہے؟ اس نے کہا کہ واقعہ امیر کے پاس پہونچ کر معلوم ہوگا۔ یہ سننا تھا کہ اس نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بخدا حسینؑ قتل ہو گئے۔

عبد الملک نے عمر بن سعید کے پاس پہونچ کر شہادت حسینؑ کی اطلاع

دی۔ اس نے کہا کہ جاؤ اور مدینہ میں اس کا اعلان کر دو۔ عبدالملک نے مدینہ میں اعلان کیا تو ایک مرتبہ شہر مدینہ میں ٹیس پڑ گئی۔ خود عبدالملک کا بیان ہے کہ میں نے عمر بھر میں رونے کا یہ شور نہیں سنا جو حسینؑ بن علی کے قتل کا اعلان سننے کے بعد مدینہ میں بنی ہاشم کے گھروں سے بلند ہوا۔

عبدالملک اس اعلان کے بعد عمر بن سعید کے پاس واپس آیا تو وہ اس کو دیکھ کر مسکرایا اور مثال میں عمرو بن معدی کرب کا یہ شعر پڑھا۔

عجت نساء بنی زیاد عجۃ　　کعجیج نسوتنا غداۃ الارنب

اور کہا یہ آج کا ماتم بدلا ہے اس ماتم کا جو بنی امیہ کی عورتوں میں عثمان کے قتل پر برپا ہوا تھا۔ پھر اس نے مسجد میں جا کر تقریر کی اور لوگوں کو امام حسینؑ کی شہادت سے مطلع کیا۔ (۱)

محمد حنفیہ کو جس وقت اطلاع ملی وضو کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ اسی طشت میں گرنے لگے۔ (۲)

عبداللہ بن جعفر کو حضرت امام حسینؑ کے ساتھ ہی ساتھ ان کے دونوں بیٹوں کی شہادت کی اطلاع بھی دی گئی۔ انھوں نے کلمہ انا للہ وانا الیہ راجعون ؕ زبان پر جاری کیا۔ ان کا غلام ابو السلاسل جو حسینی عظمت سے ناواقف تھا اور اپنے آقا زادوں کے قتل سے متاثر تھا! کہنے لگا کہ یہ روز بد ہمیں حسینؑ کی بدولت دیکھنا پڑا۔ عبداللہ بن جعفر نے جو یہ سنا تو غضبناک ہو کر اپنی نعل سے اسے ضرب لگائی اور کہا "حرامزادے! تو حسینؑ کے بارے میں ایسا کہتا ہے۔ بخدا اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو اپنی

---

(۱) ارشاد ص ۲۶۳　(۲) طبری ج ۶ ص ۲۲۹

جان نثار کرتا۔ مجھے تو بس اس سے ایک طرح کا صبر آگیا کہ میرے دونوں بچے میرے بھائی کے ساتھ وفاداری کا حق ادا کرکے صبر و استقلال کے ساتھ جاں بحق تسلیم ہوئے۔"

پھر حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا "اللہ کا شکر ہے کہ اگر میں خود حسینؑ کی نصرت نہ کر سکا تو کم از کم میرے دونوں فرزندوں نے حق نصرت ادا کیا۔ (۱)

ایک طرف عقیل بن ابی طالب کی بیٹیاں، مسلم کی بہنیں، ام لقمان اور ام ہانی، اسماء، رملہ اور زینب اپنے بھائی مسلم پر تو توجہ نہیں کر رہی تھیں مگر حسینؑ کے غم میں عجیب پر تاثیر انداز سے کہہ رہی تھیں۔

"کیا کہو گے (اے مسلمانو!) جب رسولؐ تم سے پوچھیں گے کہ میرے بعد تم نے میری اولاد اور میرے اہل بیت کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ یہ کہ کچھ اُن میں سے قید ہیں اور کچھ مقتول خاک و خون میں آلودہ ہیں۔ میں نے تمہارے ساتھ جو خیر خواہی کی اور جو خدمتیں انجام دیں اُن کا یہی صلہ تھا کہ میرے بعد میرے گھرانے کے ساتھ ایسا سلوک کرو۔ (۲)

ممکن نہیں تھا کہ یہ تاثرات اثر پیدا نہ کرتے۔ ان تاثرات ہی کا نتیجہ تھا کہ مدینہ والوں نے آنکھیں کھولیں اور یزید کے افعال و اعمال کی جانچ کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ سنہ ۶۲ھ میں عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ وغیرہ شرفائے مدینہ کے وفد نے شام جا کر یزید کے حالات کا مطالعہ کیا۔ حالانکہ ان لوگوں کو بڑی بڑی رقمیں دی گئیں۔ مگر جب وہ واپس آئے تو انھوں نے یزید کی بے دینی کے حالات کو ظاہر کیا۔ اور کہا کہ "ہم ایسے شخص کے پاس سے آ رہے ہیں کہ جو کوئی مذہب نہیں رکھتا بلکہ شراب

---

(۱) ارشاد ص ۲۶۴ (۲) طبری ج ۷، ص ۲ تاریخ کامل ج ۴ ص ۵۲

پیتا ہے، طنبورہ بجاتا ہے، گانے والیوں سے گانا سنتا ہے اور کتّوں سے کھیلتا رہتا ہے۔ اور رندوں بدمستوں کے ساتھ، قصہ گوئی میں اوقات صرف کرتا ہے چنانچہ ہم سب اُس کی بیعت کا قلادہ اپنی اپنی گردن سے اتار ڈالتے ہیں (۱)

علامہ جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں کہ اس وفد کے ارکان نے بیان کیا کہ "ہم نے یزید کی مخالفت اُس وقت اختیار کی ہے کہ جب ہمیں اس کا اندیشہ پیدا ہو گیا کہ ہم پر عذاب الٰہی کے طور پر آسمان سے پتھر برسیں گے۔ اس لیے کہ وہ ایسا شخص ہے جو اپنے باپ کی تصرف کردہ کنیزوں (اپنی سوتیلی ماؤں) بیٹیوں اور بہنوں تک کو اپنے لیے حلال سمجھتا ہے شراب پیتا اور نماز کو ترک کرتا ہے"!

اگرچہ مدینہ سے جو وفد دمشق گیا تھا اُس کے ارکان کے رجحانات پر قابو رکھنے کے لئے تمام وہ تدابیر بروئے کار لائے گئے تھے جو اس کے بہت پہلے سے حکومت دمشق کے زیر تجربہ رہ کر کامیاب ثابت ہوتے رہے تھے مگر شہادت حسینؑ کا یہ اثر تھا کہ اس مرتبہ وہ تمام ذرائع ناکامیاب ثابت ہوئے بلکہ اس وفد کے ایک رکن منذر بن زبیر نے اپنی تقریر میں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ یزید نے مجھ کو ایک لاکھ درہم دیے ہیں مگر یہ چیز مجھے اس کے صحیح حالات آپ لوگوں کے سامنے بیان کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی چنانچہ میں صاف صاف بتلاتا ہوں کہ وہ شراب پیتا ہے اور اس نشہ میں ایسا سرشار ہوتا ہے کہ نماز ترک ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ تمام واقعات انھوں نے بھی بیان کیے جو ان کے دوسرے ساتھی بیان کر چکے تھے

---

(۱) طبری ج ۷ ، ص ۴ - تاریخ کامل ج ۴ صفحہ ۵۲

چنانچہ ۶۳ھ کے شروع ہوتے ہی اہل مدینہ نے متفق ہو کر یزید کے گورنر کو جو یزید کا ایک چچا زاد بھائی عثمان بن محمد بن ابو سفیان تھا مدینہ سے نکال دیا اور بنی امیہ کا باوجودیکہ وہ وہاں، تقریباً ایک ہزار کی تعداد میں تھے محاصرہ کر لیا (۱)

اب عمل اور رد عمل کے تحت میں یزید کی طرف سے تشدد اور مسلمانوں کی طرف سے مظاہرات نفرت کا ایک سلسلہ تھا جو جاری ہو گیا۔ قتل حسینؑ نے جو بیداری پیدا کی اس کے نتیجہ میں مدینہ والوں میں جو بے چینی پیدا ہوئی اور اب مدینہ والوں کی سرکوبی کے لیے مسلم بن عقبہ کی سرکردگی میں جو فوج بھیجی تو غیظ و غضب کی شدت میں اسے حکم دے دیا کہ فتح پانے کے بعد مدینہ کو تین (۳) دن کے لیے مباح سمجھ لینا یعنی بے محابا قتل و غارت کرنا اور جو مال یا ہتھیار یا قیدی ملیں وہ سب فوج کی ملکیت ہوں گے (۲)

دینوری کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "اگر اہل مدینہ پر فتح پا تو تین دن تک برابر مدینہ کو لوٹتے رہنا (۳)

چنانچہ روز چہار شنبہ ۲۸ ذی الحجہ ۶۳ھ کو مدینہ منورہ میں قتل و غارت کر کے پوری طرح اس حکم کی تعمیل کی گئی (۴) اور تین دن رات مسلسل اہل شام مدینے کو لوٹتے رہے (۵)

ظاہر ہے کہ مدینہ میں قیدی جو مل سکتے ہیں وہ یہود یا نصاریٰ وغیرہ نہیں ہونگے۔ وہ صحابۂ رسول اور تابعین کے گھرانوں کے عورتیں اور بچے تھے مگر یزید کی طرف سے ان کے لیے یہ حکم صریح موجود تھا کہ وہ فوج کے سپاہیوں پر تقسیم ہو جائینگے۔

---

(۱) طبری ج ۷ صـ ۲۰۳-۲۰۴ (۲) طبری ج ۷ صـ ۷ (۳) الاخبار الطوال صـ ۲۶۵

(۴) طبری ج ۷ صـ ۸ (۵) الاخبار الطوال صـ ۲۶۶

اس وقت باطل کا حوصلہ اتنا بلند تھا کہ باقی ماندہ اہل مدینہ سے جو یزید کی بیعت لی گئی وہ اس شرط کے ساتھ کہ وہ سب یزید کے غلام ہوں گے یزید ان کی جان و مال اور اہل و عیال کے بارے میں مکمل اختیارات کا مالک ہوگا۔ (۱) چنانچہ جناب ام سلمہ زوجۂ رسولؐ کے نواسے یزید بن عبد اللہ بن ربیعہ بن اسود نے ان الفاظ کے ساتھ بیعت کرنے سے انکار کیا تو انھیں فوراً قتل کر دیا گیا (۲) یزید نے یہ سب واقعات سنے تو ان پر بجائے تاسف کے خوشی کا اظہار کیا اور یہ اشعار پڑھے کہ

لیت اشیاخی ببدر شھدوا | جزع الخزرج من وقع الاسل
حین حکت بقباء برکھا | واستحر القتل فی عبد الاشل (۳)

اس کے معنی یہ ہیں کہ مدینہ پر یہ حملہ اور اہل مدینہ کے ساتھ یہ سلوک بھی پیغمبر اسلام سے بدلا لینے ہی کے سلسلہ میں تھا۔

اُدھر مکہ والے بھی کروٹ بدل چکے تھے چنانچہ عبد اللہ ابن زبیر نے کہ جو عرصہ سے خلافت کے متمنی تھے امام حسینؑ کی شہادت کی خبر (۳) کر اور یزید و بنی امیہ کے خلاف نفرت و بیزاری کا قومی جذبہ لوگوں میں پاکر موقع کو غنیمت سمجھا اور ایک پرزور تقریر میں کوفہ اور عراق کے لوگوں کی بے وفائی اور جفا شعاری کی پوری طرح مذمت کی اور حضرت امام حسینؑ کی صداقت اور حقانیت کا اظہار و اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ قسم ہے خدا کی حسینؑ نے شرافت و کرامت کے ساتھ جان دینے کو ذلت اور حقارت کے ساتھ زندہ رہنے پر ترجیح دی۔ قتل حسینؑ کے بعد ہم کبھی اس قوم کی طرف سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ بخدا ان لوگوں نے ایسے بزرگوار کو شہید کیا ہے کہ جو قلیل النوم اور کثیر الصوم تھا۔ راتوں کو عبادت الٰہی میں طولانی قیام کرنے

---

(۱) طبری ج ۷ صفحہ ۱۲ و ۱۳ (۲) الاخبار الطوال صفحہ ۲۶۱ (۳) الاخبار الطوال صفحہ ۲۶۳

والا، دنوں کو بکثرت روزہ رکھنے والا، شرف و بزرگی اور دین میں سب سے افضل اور امر خلافت کیلیے سب سے زیادہ مستحق اور موزوں تھا۔ قسم ہے خدا کی کہ اس نے کبھی قرآن کو غلط معنی نہیں پہنائے، خوف الٰہی سے وہ بیحد رونے والا تھا اور بجائے میخواری کے ہمیشہ روزے رکھتا تھا اور بجائے شکاری کتے پالنے کے الٰہی کے جلسے اس کے گھر میں برپا رہتے تھے۔ اسی تقریر کا اثر تھا کہ اہل مکہ کو یزید سے بیزاری پیدا ہوئی اور عبداللہ بن زبیر کی بیعت کے لیے تیار ہوئے۔ یزید یہاں کے حالات سے بہت فکرمند ہوا اور اس نے کوشش کی کہ مکۂ معظمہ کی کسی ممتاز شخصیت کو اپنے ساتھ وابستہ کر سکے مگر قتل امام حسینؑ کا وہ بڑا جرم اس کے نامۂ عمل میں تھا کہ جو عبداللہ بن زبیر کی اطاعت نہ کرنا چاہتے تھے وہ بھی یزید سے بہرحال نفرت کرتے تھے چنانچہ عبداللہ بن عباس ایسے ہی شخص تھے کہ انھوں نے ابن زبیر کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یزید کو یہ معلوم ہوا تو اس نے عبداللہ بن عباس کو لکھا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ اس لاندہب (ابن زبیر) نے آپ کو حرم الٰہی میں اپنی بیعت حاصل کرنے کے لیے بلایا تھا مگر آپ نے ہماری وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے اس کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا ہے بس اپنے ابنائے وطن کو اور ان لوگوں کو جو بیرونجات سے آپ کے پاس آمد و رفت رکھتے ہیں، ابن زبیر اور میری نسبت اپنے صحیح خیالات سے برابر آپ مطلع فرماتے رہیں اس لیے کہ ابن زبیر آپ کو اپنی بیعت اور اطاعت میں لینے کے بعد آپ سے باطل کی تمنا اور اپنے گناہوں میں آپ کو شریک کرنے کی آرزو رکھتا تھا مگر آپ نے ہماری بیعت و اطاعت میں داخل رہتے ہوئے وفائے عہد کے حق کو پورا کیا ہے لہٰذا خدا اس صلہ رحم کی آپ کو جزائے خیر دے اور بہر طور میں بھی آپ کے اس صلہ رحم اور نیک سلوک کو بھولنے والا نہیں ہوں اور جس صلہ و انعام کے آپ مستحق ہیں وہ بہت جلد آپ کے پاس پہنچاؤں گا۔ مگر یہ کہ آپ آنے جانے والوں کو ابن زبیر کی برائیوں اور اس

کی جہاں زبانی کے متعلق متنبہ کرتے رہیں کیونکہ عام طور پر لوگ اس کے متعلق آپ کی رائے کو زیادہ وقیع اور معتبر سمجھتے ہیں۔" عبداللہ بن عباس نے اس خط کا حسب ذیل جواب یزید کو روانہ کیا۔

"تمہارا خط پہونچا۔ تم نے جو یہ لکھا ہے کہ میں نے عبداللہ بن زبیر کی بیعت تمہاری وفاداری کے خیال سے نہیں کی۔ یہ غلط ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں کبھی بھی تمہارا مداح اور ہوا خواہ نہیں رہا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس بات کو بھول جاؤں گا کہ تم نے ہی حسینؓ کو قتل کیا ہے اور کیا بنی مطلب کے اُن نوجوانوں کی خاک و خون میں بھری لاشوں کا ہولناک تصور میرے دماغ سے محو ہو جائے گا۔ جن کے کپڑے تک لوٹ لیے گئے تھے اور بے گور و کفن گرم ریگ پر یونہی چھوڑ دی گئی تھیں۔ صرف ہوا کے جھونکوں نے خاک ڈال کر جن کی پردہ داری کا حق ادا کیا اور جانوران صحرائی نے ان کی حفاظت کے فرض کو پورا کیا۔ یہاں تک کہ اللہ نے ایک قوم کے ذریعہ سے ان کے دفن و کفن کا سر انجام کیا۔

ہاں ہاں اے یزید! میں نہیں بھول سکتا اور کبھی نہیں یہ کہ تم نے حسینؓ کو حرم خدا اور حرم رسولؐ سے نکلنے پر مجبور کیا اور ابن مرجانہ کو قتل حسینؓ پر مامور کیا۔ میں تو خدا کی ذات سے بہرحال امید رکھتا ہوں کہ وہ منتقم حقیقی بہت جلد تمہارے اعمال کے مطابق سزا دے گا۔ اور عذاب میں مبتلا فرمائے گا کیونکہ تم نے اُس کے نبی کی عترت کو قتل کیا اور اُن کے قتل پر راضی ہوئے ہو اور یہ جو تم نے لکھا ہے کہ تم میرے ساتھ صلۂ رحم برتو گے اور انعام و اکرام سے پیش آتے رہو گے۔ تو تم اپنی اس مہربانی اور صلۂ رحم کو بس اپنے ہی لئے اٹھا رکھو۔ ہم کو اس کی مطلق ضرورت نہیں ہے اور یہ جو تم نے لکھا ہے کہ میں لوگوں

کو تمہاری طرف مائل اور عبداللہ ابن زبیر سے منحرف اور برگشتہ کردوں تو اس کے متعلق میں بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے لیے کبھی خیر و برکت نہ ہو اس لئے کہ تم مجھ سے اپنی نصرت اور حمایت کی امید رکھتے ہو درانحالیکہ تم نے میرے ابن عم کو قتل اور رسول اللہ ص کے ان اہلبیت کو ذبح کیا ہے کہ جو رشد و ہدایت کے چراغ اور تاریک راتوں میں روشن ستارے تھے افسوس کہ اُن کو تمہاری فوجوں کی گھنگھور گھٹا نے پوشیدہ کر دیا۔ کیوں اے یزید! کیا تم نے اپنے لمک خواروں کو اس لیے حرم الٰہی میں نہیں بھیجا تھا کہ حسین ع کو اسی حرم مقدس میں قتل کر دیں اور کیا تم حسین ع کو برابر ڈراتے دھمکاتے نہیں رہے یہاں تک کہ وہ سفر عراق اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تم نے ہی یہ سب کچھ کیا اور اس لیے کیا کہ تمہارے دل میں مخالفت خدا و رسول ص اور آل رسول ص کی جن کی شان میں خدا نے آیۂ تطہیر نازل فرمائی جاگزیں ہے۔ اس آیۂ تطہیر کے مصداق آلِ رسول ہی تھے نہ کہ تمہارے باپ دادا جو جفاکار، طاغی و باغی اور دشمن خدا و رسول تھے۔ اب ان افعال و اعمال کے باوجود بھی کیا تم مجھ سے اپنی ہوا خواہی کی امید رکھ سکتے ہو؟ اے یزید! سب سے زیادہ عظیم جسارت تمہاری یہ تھی کہ تم نے رسول ص کی نواسیوں کو سر برہنہ کیا اور قیدی بنا کر عراق سے شام تک تشہیر کرایا تاکہ لوگوں کے دلوں پر اپنے غلبہ تسلط اور تمہاری کا یہ سکہ جیٹھاؤ کہ بظاہر کس طرح ذریت رسول کو مغلوب و مقہور کرنے میں تم کامیاب ہوئے ہو اور پھر اس پر تم نازاں ہو کر اس طرح تم نے آل رسول ص سے اپنے ان فاسق و فاجر اور کافر بزرگوں کے خون کا بدلہ لیا ہے کہ جو جنگ بدر میں قتل ہوئے تھے اور جس کا کینہ تمہارے دل میں دبی ہوئی چنگاری کی طرح چھپا ہوا تھا۔

علامہ سبط ابن جوزی لکھتے ہیں کہ جب یہ خط یزید نے پڑھا تو سخت

برافروختہ ہوا۔ بلکہ ابن عباس کے قتل کا ارادہ بھی اُس نے کیا مگر یہ کہ ابن زبیر کے خلاف جنگ میں مشغول ہو کر قتل ابن عباس کی تدبیر نہ کر سکا۔

علامہ ابن اثیر نے بھی اپنی تاریخ (مطبوعہ مصر ج ۴ صـ۶۲) میں اس خط و کتابت کو کچھ کمی اور بیشی کے ساتھ درج کیا ہے۔

مدینہ میں قتل و غارت کے بعد یزید کی ہدایت کے مطابق اُس کا فرستادہ افسر مسلم بن عقبہ مکہ معظمہ کی طرف متوجہ ہوا مگر محرم ۶۴ھ میں ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ پنجۂ موت میں گرفتار ہو گیا۔ (۱) تاہم مرنے سے پہلے ہی اُس نے اپنی جگہ یزید کے کہنے کے موافق حصین بن نمیر سکونی کو سردار لشکر بنا دیا۔ اور یہ ہدایت کر دی کہ دیکھو اہل مکہ کے ساتھ شام والے جو بھی کرنا چاہیں تم اُس میں کوئی مزاحمت نہ کرنا (۲) ــــــ حصین نے مکہ پر حملہ کیا اور خانۂ خدا کا محاصرہ کر لیا۔ کئی مہینے تک عبداللہ بن زبیر سے مقابلہ ہوتا رہا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ روز شنبہ ۳ ربیع الاول ۶۴ھ کو منجنیق نصب کر کے خانۂ کعبہ پر پتھر ہی نہیں برسائے گئے۔ بلکہ آتشباری کی گئی جس سے کعبہ میں آگ لگ گئی۔ (۳)

بس یہ آخری کارنامہ تھا جس کے بعد روز سہ شنبہ ۱۴ ربیع الاول ۶۴ھ کو یزید دنیا سے رخصت ہو گیا۔ (۴)

جس کے بعد حصین بن نمیر نے عبداللہ بن زبیر سے کہلا بھیجا کہ جس نے ہم کو تم سے جنگ کے لئے بھیجا تھا وہ تو ہلاک ہو گیا۔ لہذا اب ہماری

---

(۱) طبری ج ۷، صـ۱۴ (۲) الاخبار الطوال صـ۲۶۳

(۳) صحیح مسلم ج ۱ صـ۴۲۲۔ طبری ج ۷، صـ۱۴ (۴) طبری ج ۷، صـ۱۵

تمہاری جنگ بھی ختم ہو گئی۔ اب تم شہر کے دروازے ہمارے لیے کھول دو کہ ہم خانہ کعبہ کا طواف کر کے واپس جائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ فوج واپس گئی۔ (۱)

الفخری لکھتا ہے کہ "یزید کے عہد حکومت کی مجموعی مدت صحیح حساب کے رو سے کل تین سال اور چھ مہینے ہوتی ہے۔ ان میں سے پہلے سال میں اس نے حسینؓ بن علیؓ کو شہید کیا۔ دوسرے سال میں مدینہ منورہ پر چڑھائی کی اور اس کو تین روز تک تاراج کیا اور تیسرے سال میں مکہ معظمہ پر فوج کشی کی۔ ان ہر سہ مظالم میں سے کربلا کے حادثہ نے بالخصوص دنیائے اسلام میں ایسی خوفناک سنسنی پھیلا دی کہ جو شخص بھی اپنے دل میں قوت احساس رکھتے ہوئے اس نازیبا اقدام کے تفصیلات سے مطلع ہوتا تھا، ممکن ہی نہ تھا کہ اس کا دل متاثر ہو جو اسے نکہ یہ اقدام صرف شرعی گناہ اور قانونی جرم ہی نہ تھا بلکہ ایک بہت بڑی سیاسی غلطی تھی۔ جس کے ماتحت یزید اور اس کے نالائق اور کمینہ مشیران تدبیر مثلاً ابن زیاد و شمر وغیرہ نے اُن لوگوں کو بھی اپنی مخالفت پر آمادہ کر دیا کہ جو رسول خدا کی عظمت کے قائل ہونے اور دین اسلام سے وابستگی رکھنے کے باوجود اموی حکومت کے ساتھ عقیدت اور وفاداری تو نہیں، عدم تعرض اور رواداری کے مسلک پر آخر تک قائم رہنا ضرور چاہتے تھے۔

۶۴ھ میں یزید کی ہلاکت کے بعد عراق کے گھٹے ہوئے جذبات ابن زیاد کے خلاف اس طرح ابل پڑے کہ "بیک بینی و دو گوش" بصرہ سے فرار کرنا پڑا۔ (۲) اسے خلق خدا کی بیزاری کا اپنی ذات سے اندازہ ہو گیا راستے میں جب ایک شتربان کو سنا کہ وہ اپنے اونٹ کی حدی خوانی ان اشعار کے ساتھ

---

(۱) الاخبار الطوال ص۲۶۸ (۲) الاخبار الطوال ص۲۸۶، ۲۸۷ طبری ج ۷، ص۱۷

کر رہا تھا۔

یا رب رب الارض والعباد — العن زیاداً وبنی زیاد

کم قتلوا من مسلم عباد — جم الصلوۃ خاشع الفواد

یکابد اللیل من السہاد

یعنی پروردگار زیاد اور اولاد زیاد پر لعنت فرما کہ انہوں نے کتنے نماز گزار، شب بیدار متقی اور پرہیزگار مسلمانوں کو بے جرم وخطا قتل کیا ہے (۱)

اہل عراق کا اشتعال اس کے خلاف اتنا بڑھا ہوا تھا کہ جب تعاقب کرنے پر وہ خود نہ مل سکا تو دار الامارہ پر حملہ کر کے جو کچھ اس کا مال ومتاع تھا سب لوٹ لیا (۲)

کوفہ کا جو عالم تھا وہ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ جب کوفہ میں یزید کی ہلاکت کے بعد ابن زیاد کی حکومت تسلیم کیے جانے کی تحریک ہوئی تو یزید بن حارث بن رویم شیبانی نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ہم تو ابن سمیۃ سے نجات حاصل کرنے کے متمنی ہیں۔ ہم ہرگز اس کی حکومت کو نہیں مان سکتے (۳)

حالانکہ یہ یزید خود کربلا میں لشکر یزید کے اندر موجود تھا۔ مگر وہ بھی اب بنی امیہ کی حکومت سے نفرت ظاہر کر رہا تھا۔ اس سے عام فضا کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہمدان کی عورتیں حسینؑ کا ماتم کرتی ہوئیں اور ان کے مرد تلواریں لیے ہوئے یہ سب مسجد میں آ کر مظاہرہ کرنے لگے کہ ہم اب ایسے اشخاص کا اقتدار برداشت نہیں کر سکتے جنھوں نے فرزند رسولؐ کا کربلا میں خون بہایا ہے (۴)

---

(۱) الاخبار الطوال صفحہ ۲۸۸ (۲) طبری ج ۷، صفحہ ۲۵ (۳) طبری ج ۷، صفحہ ۳۰

(۴) صواعق محرقہ صفحہ ۱۳۴ طبری ج ۷، صفحہ ۳۰۔

بقول جناب نجم آفندی :-

شہید ظلم کلیجے ہلا دیے تو نے　　حسین درد کے دریا بہا دیے تو نے

ہر ایک ذرہ ہستی میں اک تڑپ بھر دی　　دماغ و منبع کے دل ہلا دیے تو نے

انتہا یہ تھی کہ خود یزید کے بیٹے اور جانشین معاویہ بن یزید نے سر منبر اپنے باپ کے اعمال و کردار سے نفرت و بیزاری کا اظہار کیا۔ اس طرح کہ جب یزید کے بعد اسے خلیفہ تسلیم کیا گیا تو اس نے منبر پر جا کر حسب ذیل تقریر کی :-

"ایہا الناس - یہ امر خلافت اللہ کی ایک مستحکم رسی تھی۔ مگر میرے دادا معاویہ بن ابی سفیان نے اس کے متعلق حقیقی معنی میں مستحق خلافت شخص علی بن ابی طالبؑ سے جھگڑا کیا اور وہ مذموم طریقہ اختیار کیا جس سے سب ہی واقف ہیں۔ بہر حال وہ اپنے گناہوں میں چاروں طرف سے گھر کر قبر میں پہونچ گئے تو یہ منصب میرے باپ یزید کو پہونچا اور وہ بھی کسی طرح اس کے مستحق نہ تھے۔ انھوں نے رسولؐ کے نواسے (حسین ابن علی) کو قتل کیا۔ بالآخر ان کی بھی عمر ختم ہو گئی۔ اور وہ بھی اپنے گناہوں میں گرفتار قبر میں جا پہنچے۔"

اس کے بعد وہ رو دیا اور کہنے لگا کہ سب سے بڑی مصیبت ہمارے لیے اس امر کا احساس ہے کہ ان کا انجام برا ہوا۔ کیونکہ انھوں نے اولاد رسولؐ کو قتل، شراب کو مباح اور حرمت خانہ کعبہ کو برباد کیا۔ پس اب میں جو اس وقت تک خلافت کی شیرینی سے نا آشنا ہوں تو اس کی تلخی کا مزہ کیوں چکھوں ـــــ تم جانو تمہارا کام۔ مجھے خلافت سے کوئی سروکار نہیں۔ بالغرض دنیا اگر کوئی اچھی نعمت ہے تو بھی ہم اس میں سے بہت کافی حصہ پا چکے اور حقیقۃً اگر وہ کوئی بری چیز ہے تو جتنا بھی اس وقت تک ہم کو اس میں سے ملتا رہا وہی بہت زیادہ ہے"۔ اس کے بعد وہ محل میں چلا گیا اور چالیس دن گزارنے

کے بعد اس دار فانی سے رحلت کر گیا۔ (۱) بعض مورخین کا خیال ہے کہ اسے زہر دے دیا گیا۔ (۲) معاویہ بن یزید کے بعد خراسان میں بھی حرکت پیدا ہو گئی۔ انھوں نے اپنے یہاں کے گورنروں کو نکال دیا۔ اور جنگ و جدال شروع کر دی (۳) اب خلافت اولاد ابی سفیان سے ہمیشہ کے لیے نکل گئی۔ شام میں بوڑھے مروان بن الحکم کی بیعت کی گئی اور خلافت پھر عرصہ تک اسی کی اولاد میں برقرار رہی۔

---

(۱) طبری ج ۷، صفحہ ۳۰ صواعق محرقہ صفحہ ۱۳۴ (۲) طبری ج ۷، صفحہ ۳۴ (۳) طبری ج ۷، صفحہ ۳۴

اڑتیسواں باب
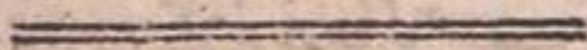
جماعت توابین

مورخ طبری کا بیان ہے کہ جب حسینؓ بن علیؓ قتل کر دئے گیے اور ابن زیاد اپنے لشکرگاہ سے جو نخیلہ میں قرار دیا گیا تھا واپس ہو کر پھر کوفہ میں داخل ہوا تو شیعیان علیؓ نے ایک دوسرے کو نفرین و ملامت اور اپنی کمزوری پر اظہار ندامت اور شرمساری کرنا شروع کیا اور اچھی طرح محسوس کرنے لگے کہ ہم سے ایک بڑے جرم کا ارتکاب ہوا کہ پہلے تو امام حسینؓ سے نصرت کے وعدہ پر کوفہ تشریف لانے کی خواہش کی۔ مگر جب آپ ہماری دعوت منظور فرما کر عراق تشریف لے آئے تو آپ کی مدد کو نہ گیے۔ یہاں تک کہ آپ ہمارے بالکل قریب ہی قتل کر ڈالے گیے۔ لہذا انھوں نے طے کر لیا کہ یہ عار و ننگ ہم سے دور نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم ان لوگوں کو جنھوں نے حسینؓ و انصار حسینؓ کے قتل میں شرکت کی تھی قتل نہ کر لیں یا اس کوشش کے ذیل میں خود بھی اپنی اپنی جانیں دے دیں۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلہ میں دوستان اہل بیت میں سے پانچ اہم شخصیتوں سے رابطہ قائم کیا۔ سلیمان بن صرد خزاعی جو اصحاب رسولؐ میں سے تھے۔ مسیب بن نجبہ فزاری جو اصحاب حضرت علیؓ میں سے ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ عبداللہ بن سعد بن نفیل ازدی

عبداللہ بن وال تیمی اور رفاعہ بن شداد بجلی چنانچہ یہ پانچوں آدمی اور دوسرے بہت سے ممتاز افراد سلیمان بن صرد خزاعی کے مکان پر جمع ہوئے اور مسیب بن نجبہ نے تقریر کی۔ (۱) جس میں کہا کہ ہم اپنی سچائی پر ناز اور اپنی جماعت پر فخر کیا کرتے تھے لیکن جب خدا نے ہمارا امتحان لیا معلوم ہوا کہ ہمارے دعوے سراسر غلط تھے۔ ہم نے امام حسینؑ کو دعوت دی اور ان کے پاس پیغام بھیجے کہ آئیے ہم آپ کی نصرت پر آمادہ ہیں لیکن جب آپ تشریف لے آئے تو ہم نے اپنی جان چرائی اور ہم نے اپنی جانوں اور اپنے اموال بلکہ اپنی زبانوں سے بھی اپنے فریضہ اور نصرت و حمایت کو پورا نہ کیا اور اپنے قبیلہ ہی کو اس کے لیے آمادہ کیا۔ اب ہم خدا اور رسولؐ کو کیا جواب دیں گے جب کہ ہمارا کوئی عذر قابل قبول قرار پا ہی نہیں سکتا۔ البتہ یہ ایک صورت ہو سکتی ہے کہ قتل حسینؑ میں کسی حیثیت سے بھی جن جن نے حصہ لیا ہے ان سب اشخاص کو قتل کریں یا اس سلسلہ میں خود اپنی جانوں سے گزر جائیں اب آپ لوگوں کو لازم ہے کہ کوئی اپنا سردار منتخب کریں جس کی زیر قیادت اس مہم کی تکمیل ہو۔

ان کی تقریر کے ختم ہوتے ہی رفاعہ بن شداد کھڑے ہوئے اور انھوں نے مناسب الفاظ میں ان کی تائید کی اور کہا کہ اگر آپ پسند کریں تو آپ ہی کو اس مہم کی قیادت سپرد کی جائے۔ اور نہیں آپ کی رائے ہو اور دوسرے حضرات بھی متفق ہوں تو ہم اس ذمہ داری کو اپنی جماعت کی سب سے معمر فرد سلیمان بن صرد کے سپرد کریں جو پیغمبر خداؐ کے صحابی ہیں اور جن کے

---

(۱) طبری ج ۷ ص ۴۷

کارنامے نصرت دین میں سب ہی کو معلوم ہیں، اور جن کی اصابت رائے اور بصیرت بھی قابل اعتماد ہے۔ عبداللہ بن دال اور عبداللہ بن سعد نے بھی اپنی تقریروں میں مزید تائید کے ساتھ مسیب بن نجبہ اور سلیمان بن صرد دونوں کی اہلیت کا اقرار کیا۔ آخر میں مسیب بن نجبہ کی اختتامی تقریر کے بعد بالاتفاق سلیمان بن صرد کا اس جماعت کی قیادت کے لیے انتخاب ہو گیا۔

اب سلیمان کھڑے ہوئے اور انھوں نے انتہائی پرزور ایک تقریر کی جسے وہ اس کے بعد ہر جمعہ میں دہرایا کرتے تھے (۱) اس کا مختصر اقتباس درج ذیل ہے:-

"ہم لوگ گردنیں اٹھا اٹھا کر اشتیاق کے ساتھ اہل بیت رسول کی تشریف آوری کی راہ دیکھا کرتے تھے لیکن جب وہ آئے تو ہم نے تغافل اور تساہل سے کام لیا۔ یہاں تک کہ ہمارے ملک میں اور ہمارے قریب فرزند رسول قتل کر دیے گئے جبکہ آپ آواز استغاثہ بلند کر رہے تھے لیکن کوئی لبیک کہنے والا نہ تھا۔ گروہ فاسقین نے اُن کو اپنے تیروں کا نشانہ اور نیزوں کا سرمشق بنائے رکھا یہاں تک کہ آپ شہید ہو گئے۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ اعدا نے بعد شہادت آپ کا لباس تک لوٹ لیا۔ پھر اب اٹھا ہے تو اٹھ کھڑے ہو۔ اللہ کا غضب حرکت میں آچکا ہے۔ بس اب طے کر لو کہ اپنے بیوی بچوں کے پاس اُس وقت تک واپس نہیں جاؤ گے جب تک اللہ کی خوشنودی کا سامان نہ کر لو گے۔ اور بخدا میرے خیال میں تو وہ اس وقت تک تم سے خوشنود نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان کے قاتلوں کو کیفر کردار تک نہ پہنچا دو۔ یا خود ہی

---

(۱) طبری ج ۷، ص ۴۹

راہ میں جان نہ دے دو۔ ہاں خبردار موت سے ڈرنا نہیں کیونکہ جو کوئی موت
سے ڈرتا ہے وہ ذلیل ہوتا ہے۔ دیکھو تو کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت
نے جب گوسالہ پرستی کے جرم کا ارتکاب کیا تو اُن کی توبہ کس طرح
قبول ہوئی؟ اُن سے کہا گیا کہ تم اپنے نفوس کے قتل کرنے پر تیار ہو جاؤ۔
اس پر اُس جماعت نے کیا کیا؟ وہ گردنیں بڑھا کر فیصلۂ قدرت کے اجراء
کے لیے تیار بیٹھ گئے اس لیے کہ انھیں اپنے جرم کا صحیح احساس تھا اور یہ معلوم
ہو گیا تھا کہ بغیر اس کے توبہ قبول نہیں ہو سکتی۔ اب تم بھی اگر اپنے کو مجرم سمجھ
رہے ہو تو ایسی ہی قربانی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تلواریں تیز کر لو۔ نیزوں کی
انیاں درست کر لو۔ اور پورے ساز و سامان سے تیار ہو کر منتظر ہو کر بیٹھ
جاؤ کہ جب تمھیں دعوت دی جائے تو فوراً نکل کھڑے ہو۔ دیر نہ ہونے پائے

یہ پرجوش تقریر تھی جسے سن کر مجمع کے جذبات میں طوفان برپا ہو گیا
متعدد مقررین نے کھڑے ہو ہو کر اپنے تاثرات اور عزم جہاد کا اظہار کیا
عبداللہ بن وال تیمی خزانچی مقرر ہوئے اور طے پایا کہ اُن کے پاس روپیہ جمع
کیا جائے اور عزم و ولولہ سے بھرا ہوا یہ مجمع منتشر ہوا۔

اب سلیمان نے مدائن میں سعد بن حذیفہ بن یمان اور دوسرے مقامات
پر کچھ دوسرے اشخاص کو خطوط بھی لکھے (۱) ان خطوط کے مضمون کا اہم
حصہ حسب ذیل تھا۔

"شیعیان اہل بیت نے اپنے اس موقف پر غور کیا ہے جو اُن سے رونما
ہوا۔ فرزند رسولؐ کے بارے میں جنھیں دعوت دی گئی تو وہ آ گئے اور آنحضر

---

(۱) طبری ج ۷، ص۹۴ (۲) طبری ج ۷، ص۹۶

نے جب دعوت نصرت دی تو اُس پر لبیک نہ کہی گئی۔ اور انھوں نے واپس جانا چاہا تو انھیں روکا گیا اور انھوں نے امان چاہی تو انکار کیا گیا اور انھوں نے چاہا کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیں مگر دشمنوں نے انھیں نہ چھوڑا اور ان پر چڑھائی کر کے انھیں شہید کر ڈالا پھر ان کا لباس لوٹ لیا اور لاش مطہر کو عریاں چھوڑ دیا۔ اب ہماری جماعت نے اس پیش آمد پر غور کیا ہے اور انھیں شدت کے ساتھ یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ ان سے اس معصوم کی مدد نہ کرنے میں بہت بڑی خطا سرزد ہوئی ہے جس کا کفارہ یہی ہے کہ اُن کے قاتلوں کو قتل کریں یا خود اپنی جان دے دیں۔ اب یہ سب بالکل تیار ہو گئے ہیں لہٰذا آپ لوگ بھی تیار ہو جائیں۔ ہم نے اس مہم جنگ کے آغاز کے لیے ایک تاریخ اور جگہ مقرر کر دی ہے جس میں سب کو مجتمع ہو جانا چاہیے! تاریخ یکم ربیع الثانی ۶۵ھ ہو گی اور جگہ مقام نخیلہ"

یہ خط سعد کو پہونچا اور انھوں نے مدائن کے شیعوں کو پڑھ کر سنایا اور اس کے ساتھ خود تقریر کی (۱) جس میں کہا کہ "واقعہ یہ ہے کہ آپ لوگ متفق طور پر حضرت امام حسینؑ کی نصرت کا عزم رکھتے تھے اور جونہی اُن کے تشریف لانے کی اطلاع ملے فوراً ہی ان کے پاس جانے کا ارادہ رکھتے تھے مگر آپ کو اچانک ان کی شہادت کی خبر ملی جس سے مجبور ہو گئے۔ بہرحال اللہ کے یہاں آپ کی نیتوں کا اجر ملے گا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ آپ کے برادران دینی اہل باطل سے مقابلہ کے لیے آپ کی مدد کے خواستگار ہیں۔ اب غور کرنا ہے کہ اس بارے میں کیا کرنا چاہیے"۔

سب نے کہا کہ ہم ضرور ان کی مدد کریں گے اور متفقہ طور پر دشمنان اہل بیت سے جہاد کریں گے۔ چنانچہ سعد بن حذیفہ نے سلیمان بن صرد کے

(۱) طبری ج ۷، ص۵۰

خط کا جواب اقرار نصرت پر مشتمل روانہ کر دیا۔ اسی طرح کے جواب دوسروں کے بھی آئے۔ یہ سب کاروائیاں بالکل خاموشی سے ہو رہی تھیں۔ یہاں تک کہ رازداری کے ساتھ کافی افراد اس تحریک سے متفق ہو گئے۔ تاہم ۶۱ھ سے لے کر ربیع الاول ۶۴ھ یعنی ہلاکت یزید تک حالات ایسے پیدا نہیں ہو سکے کہ اس سلسلہ میں کوئی عملی اقدام کیا جا سکتا (۱)۔ مگر یزید کی موت کے بعد اس تحریک میں زیادہ قوت پیدا ہوئی اور اب تقریباً علانیہ اُس کی اشاعت کی جانے لگی۔ یہاں تک کہ یہ تحریک مصر تک بھی پہنچ گئی اور عبید اللہ بن عبداللہ مُری کی مسلسل تقریروں نے جن میں شہادت امام حسینؑ کا تذکرہ نہایت موثر الفاظ میں کیا جاتا تھا۔ وہاں بھی جوش و خروش پیدا کر دیا۔ (۲)

یکم ربیع الثانی ۶۵ھ مقررہ تاریخ پر یہ لوگ نخیلہ میں جمع ہوئے تو یہ دیکھ کر کسی حد تک مایوسی ہوئی کہ جن لوگوں نے اقرار نصرت کیا تھا اور جن کے نام فہرست میں درج ہو چکے تھے وہ سولہ ہزار تھے مگر تاریخ معین پر جو تعداد جمع ہوئی وہ صرف چار ہزار کی تھی (۳) تاہم یہ لوگ عزم و ارادہ کے پکے تھے۔ اس لیے قلت تعداد کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انھوں نے اقدام کا تہیا کر لیا۔

بعض لوگوں کی رائے تھی کہ قاتلان حسینؑ کوفہ ہی میں موجود ہیں۔ ان سے پہلے سمجھ لینا چاہیے مگر سلیمان کی رائے یہ ہوئی کہ سب سے بڑا قاتل حق امام حسینؑ کا جو اس وقت موجود ہے، ابن زیاد ہے جس نے تمام خزائن مصالحت کو مسترد کیا اور یہ کہا کہ جب تک حسینؑ غیر مشروط طور پر اطاعت

---

(۱) طبری ج ۔ ص ۵۱ (۲) طبری ج ۷ ص ۵۲ (۳) طبری ج ۷ ص ۶۶

نہ کرلیں اُن کو امان نہیں مل سکتی، لہٰذا اسی کے مقابلہ کے لیے چلنا چاہیے۔ جب اُس کے مقابلہ میں کامیابی ہو جائے تو پھر ان چھوٹے آدمیوں کو سزا دینا کون مشکل ہے۔ چنانچہ سب نے اس رائے پر اتفاق کر لیا۔ (۱)

شب جمعہ ۵ ربیع الثانی ۶۵ھ کو اندھیرے منہ یہ لوگ شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ (۲)

سب سے پہلے ان لوگوں نے جاکر قبر حسینؑ کی زیارت کی۔ اس وقت اُن کے گریہ و شیون کا عجب عالم تھا اور ہر ایک اس آرزو سے بے تاب تھا کہ کاش وہ نصرت امام میں روز عاشور کام آیا ہوتا اور اس شہادت کے درجہ کو حاصل کرتا۔ ایک شب و روز انھوں نے اسی عالم میں نوحہ و ماتم کے ساتھ ساتھ نماز و مناجات اور توبہ و استغفار میں بسر کیا۔ اس کے بعد جذبات کے انتہائی تلاطم میں وہ پورا مجمع قبر امام حسینؑ سے رخصت ہوا جس کے ساتھ سلیمان بن صرد اور دوسرے سرداروں کی انتہائی موثر تقریروں نے (۳) ولولہ و جوش کے دریا کو شدت کے ساتھ طوفانی کر دیا۔

ان مجاہدین نے منزل بمنزل طے کر کے عین الوردہ میں جاکر اپنے صفوف مرتب کیے۔ پانچ دن کے بعد شام کی فوجیں ابن ذی الکلاع اور حصین بن نمیر کی سرکردگی میں ان کے مقابل پہنچ گئیں۔ اب سلیمان بن صرد نے آخری انتظامات کیے اور اعلان کیا کہ اگر میں کام آجاؤں تو سردار لشکر مسیب بن نجبہ ہوں گے اور وہ شہید ہو جائیں تو سردار عبداللہ

---

(۱) طبری ج ۷، ص ۶۸ (۲) طبری ج ۷، ص ۶۹

(۳) طبری، ج ۷، ص ۷۰

بن سعد بن نفیل ہوں گے اور اُن کے بعد عبداللہ بن وال اور پھر رفاعہ بن شداد۔ (۱)

روز چہار شنبہ ۸ر جمادی الاولیٰ کو پہلا مقابلہ ہوا۔ باوجودیکہ دشمن کی فوج بارہ ہزار تھی (۲) اور یہ کل چار ہزار پھر بھی یہ غالب آئے مگر دوسرے دن آٹھ ہزار فوج کی کمک ان کے مقابل میں آگئی جسے عبیداللہ بن زیاد نے روانہ کیا تھا۔ آج بڑی شدت کا مقابلہ رہا اور رات آنے تک جنگ جاری رہی اب زخمیوں کی تعداد مجاہدین میں بہت زیادہ تھی۔

تیسرے دن دشمنوں کی کثرت اور ان کی قلت سے حالت دیگرگوں ہوگئی۔ پھر بھی جان توڑ مقابلہ کرتے رہے مگر آخر میں بزدل دشمنوں نے تیرباراں کا سلسلہ جاری کر دیا۔ چنانچہ ایک تیر آکر سلیمان بن صرد خزاعی کے لگا جس سے وہ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ ان کے بعد علم لشکر مسیب بن نجبہ نے لیا اور بڑی بہادری سے کئی حملے کیے مگر آخر وہ بھی شہید ہوئے (۳)

ان کے بعد عبداللہ بن سعد بن نفیل نے علم سنبھالا اور قبیلۂ ازدی جماعت کو ساتھ لے کر مقابلہ شروع کیا۔ اس دوران میں مدائن کے تین سوار آئے جنھوں نے اطلاع دی کہ مدائن اور بصرہ سے کمک روانہ ہو چکی ہے مگر یہاں حالت اتنی نازک ہو چکی تھی کہ ان مجاہدین کی زندگی میں اس فوج کے پہونچنے کی امید نہ تھی آخر وہ نووارد تینوں مجاہدین بھی لڑ کر جاں بحق تسلیم ہوئے (۴) اور اس کے بعد عبداللہ بن سعد اور پھر عبداللہ بن وال بھی شہید ہو گئے۔ (۵)

---

(۱) طبری ج ۷، ص۶۶ (۲) طبری ج ۷، ص۶۵ (۳) طبری ج ۷، ص۷۰

(۴) طبری ج ۷، ص۷۲ (۵) طبری ج ۷، ص۷۳

اب شام ہوگئی تھی اس لیے جنگ موقوف ہوگئی نامزد سرداروں میں اب صرف رفاعہ بن شداد باقی تھے مگر اب حالت یہ تھی کہ ان کی تعداد چار ہزار سے گھٹ کر صرف چند سو باقی رہ گئی تھی اور ان میں سے بھی اکثر زخمی اور ناقابلِ جنگ تھے لہٰذا اُنھوں نے مقابلہ جاری رکھنے میں کامیابی کی صورت نہ دیکھتے ہوئے رات کے وقت اپنی قلیل فوج کے ساتھ مراجعت اختیار کی (۱)، اور اس طرح قاتلانِ حسینؑ سے بدلا لینے کی یہ پہلی کوشش منزل آخر تک پہنچی۔

---

(۱) طبری ج، صہ ۸
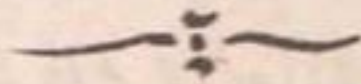
انتالیسواں باب

خون ناحق کا انتقام

سلیمان بن صرد خزاعی کی سرکردگی جماعت توابین نے بھی قاتلان حسینؑ ہی سے انتقام لینا چاہا تھا مگر چونکہ انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق براہ راست حکومت یزید کے خلاف محاذ قائم کیا تھا اور اس کو اپنی قلیل تعداد کی بنا پر وہ کوئی خاص مادی نقصان نہ پہونچا سکے لہٰذا انفرادی حیثیت میں قاتلان حسینؑ سے وہ کوئی انتقام نہ لے سکے۔ پھر بھی قدرت اس قتل ناحق کے ارتکاب کرنے والوں کو زیادہ عرصہ تک مہلت دینے کے لیے تیار نہ تھی، چنانچہ مشیت ایزدی نے اس کام کے لئے مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کو منتخب کیا۔

خاندانی اعتبار سے وہ رؤسائے عرب میں سے تھے۔ ان کے والد ابو عبیدہ اسلامی فتوحات کے سلسلہ میں تسخیر ایران سے متعلق اکثر نبرد آزمائیوں میں شریک ہو چکے تھے چنانچہ "جسر ابی عبید" کی جنگ انھی کے نام سے منسوب ہے اور خود مختار اہل بیت رسولؐ کے ہمدرد کی حیثیت سے خاص طور پر مشہور رہے۔ اگرچہ جو خطوط حضرت امام حسینؑ کو کوفہ سے بھیجے گئے تھے ان میں ان کے نام کی صراحت نظر نہیں آتی، تاہم جب مسلم بن عقیل کوفہ پہونچے تھے تو آپ نے مختار ہی کے گھر پہ قیام کیا تھا۔ (۱)

(۱) طبری ج ۷ ص ۹ ارشاد ص ۲۱۱

اس کے بعد جب ابن زیاد کا کوفہ پر تسلط ہوا اور فضا مکدر ہوئی تو اُس موقع پر مختار کوفہ میں موجود نہیں تھے بلکہ اپنی زمینداری میں کسی موضع پر گئے ہوئے تھے۔ لہذا مسلم ان کے گھر سے منتقل ہو کر ہانی کے مکان پر قیام پذیر ہوئے پھر ہانی کے گرفتار ہونے پر مسلم کو جہاد کے لئے نکلنا پڑا اور بالآخر مسلم و ہانی دونوں شہید ہوئے۔ اس کے بعد عمرو بن حریث نے رایت امان اس اعلان کے ساتھ بلند کیا کہ جو اس جھنڈے کے نیچے آجائے گا اُس کا جان و مال محفوظ رہے گا۔ اس وقت مختار کوفہ واپس پہونچے۔ (۱) اور عمرو بن حریث کے رایت امان کے نیچے آگئے لیکن ان کی طرف سے حکومت کوفہ اس درجہ بدظن تھی کہ انھیں اس جھنڈے کے نیچے پہونچ جانے پر بھی امان نہ مل سکی۔ ابن زیاد نے اپنے دربار میں بلا کر اپنی چھڑی سے ان کے چہرے پر (ایسی) ضربیں لگائیں کہ ان کی آنکھ کو صدمہ پہنچ گیا۔ اور پھر انھیں قیدخانہ بھجوا دیا۔ چنانچہ جب حضرت امام حسینؑ کی شہادت واقع ہوئی تو وہ کوفہ میں مقید تھے اور غالباً قتل بھی کر دیے جاتے مگر ان کی بہن عبداللہ بن عمر کی زوجہ تھیں ـــــ اور اگرچہ عبداللہ بن عمر بھی شروع میں یزید کی بیعت سے انکار کرتے تھے۔ مگر شہادت حسینؑ پر مطلع ہونے کے بعد ان کا حوصلہ پست ہو چکا تھا اور وہ حکومت یزید کی طرف جھکنے لگے تھے۔

ادھر یزید عام طور پر عالم اسلامی کی برہمی اور بیزاری سے متاثر ہو کر ہر ایسے شخص کی انتہائی دل جوئی اور مراعات کرنا چاہتا تھا کہ جو کم از کم اس کی حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے سے باز رکھا جا سکتا ہو۔ لہذا اس موقع پر عبداللہ بن عمر کی کسی بات کو رد کر کے ان کو اپنے سے برگشتہ خاطر کرنا کسی طرح مناسب نہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن

عمر نے مختار کی بہن کے انتہائی اصرار سے مجبور ہو کر یزید کو مختار کی رہائی کے لئے خط لکھا اور یزید نے فوراً عبید اللہ بن زیاد کو تاکیدی حکم بھیجا کہ مختار کو رہا کر دیا جائے۔

اس طرح ابن زیاد اُن کو رہا کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مگر شرط کر دی کہ تین دن کے اندر کوفہ چھوڑ دینا ورنہ تمہارا خون مباح ہو گا چنانچہ تین دن کے اندر مختار کوفہ سے حجاز کی طرف روانہ ہو گئے۔ (۱)

ایک سال سے زیادہ وہ حجاز میں مختلف مقامات پر گردش کرتے رہے اور اس دوران میں وہ برابر کہتے رہتے تھے کہ مجھے حضرت امام حسین کے خون کا انتقام لینا ہے۔ جو میں لے کر رہوں گا۔ (۲) جب دمشق کی فوجوں نے حصین بن نمیر کی سرکردگی میں عبد اللہ بن زبیر کے مقابلہ میں فوج کشی کی اور مکۂ معظمہ کا محاصرہ کیا تو مختار اُس وقت مکہ میں تھے اور ۳ ربیع الاول ۶۴ھ کو جس دن خانہ کعبہ میں آگ لگائی گئی اور شام کی فوجیں شہر مکہ میں داخل ہوئیں تو مختار نے اہل شام کے مقابلہ میں تقریباً تن تنہا جرأت و ہمت کے ساتھ شدید جنگ کی۔ (۳)

یہاں تک کہ اہل شام کو شکست ہوئی۔ اسی دوران میں ہلاکت یزید کی خبر آئی اور شام کی فوجیں واپس گئیں۔ مختار اس کے بعد بھی پانچ مہینہ سے کچھ زیادہ عبد اللہ بن زبیر کے پاس مکۂ معظمہ میں مقیم رہے۔

اتنے عرصہ میں کوفہ کی حکومت میں انقلاب ہو چکا تھا۔ اہل کوفہ ابن زیاد کے نائب حکومت عمرو بن حریث کو نکال چکے تھے

---

(۱) طبری ج ۷ صفحہ ۵۹ (۲) طبری ج ۷ صفحہ ۶۲ (۳) طبری ج ۷ صفحہ ۶۳

اور عارضی طور پر عامر بن مسعود کو حاکم بنا دیا تھا جس نے عبد اللہ بن زبیر کی اطاعت کر لی اور اہلِ کوفہ سے ابن زبیر کی خلافت تسلیم کرائی۔ مگر ابھی تک کوفہ میں نظم و نسق پورے طور پر قائم نہیں ہونے پایا تھا۔ مختار کو یہ وقت قاتلانِ امام حسین سے انتقام کے متعلق اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے بہت مناسب معلوم ہوا، وہ کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ (۱) اور وہاں پہنچ کر ممتاز افراد شیعہ سے اپنی مہم کے بارے میں تبادلۂ خیالات شروع کر دیا۔ اور بہت سے اشخاص اُن کے ساتھ متفق الرائے ہو گئے۔ (۲)

مگر جب سلیمان بن صرد خزاعی جماعت توابین کے ساتھ شامیوں کے مقابلہ کو نکلے، اس وقت کوفہ میں مختار کو بھی قید کر کے داخل زندان کر دیا گیا۔ (۳)

سلیمان کی شہادت کے بعد جب ان کی جماعت کے باقی ماندہ افراد رفاعہ بن شداد کے ساتھ کوفہ واپس ہوئے تو مختار قید خانہ میں تھے۔ (۴)

آخر کو عبد اللہ بن عمر نے پھر عبد اللہ بن زبیر اور ابراہیم بن محمد بن طلحہ کو جو اس وقت عبد اللہ بن زبیر کی طرف سے کوفہ کا حاکم تھا مختار کی رہائی کے لئے خط لکھا جس کے بعد وفاداری کی قسمیں لینے کے بعد مختار کو رہا کر دیا گیا۔

اس کے بعد عبد اللہ بن زبیر نے ان دونوں کو معزول کر دیا اور عبد اللہ بن مطیع کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ (۵) جو روز پنجشنبہ ۲۵ ماہ رمضان ۶۵ھ کو کوفہ میں وارد ہوئے۔ (۶)

اب مختار کے ساتھ بہت سے ممتاز صاحبانِ عزم و ہمت متفق الرائے

---

(۱) طبری ج ، ص۶۲ (۲) طبری ج ، ص۶۴ (۳) طبری ج ، ص۶۵

(۴) طبری ج ، ص۸۰ (۵) طبری ج ، ص۹۴ (۶) طبری ج ، ص۹۵

ہو چکے تھے مگر مالک اشتر کے فرزند ابراہیم کی ایک اہم شخصیت تھی جن کا متحد بنانا اس مہم کے لیے ضروری محسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ ابراہیم کو مقصد سے پورے طور پر آگاہ کر کے انھیں بھی متفق بنا لیا گیا جس سے مختار کی تحریک کو بڑی قوت حاصل ہوئی۔ (۱)

اب برابر مختار ابراہیم کے یہاں آمد و رفت رکھنے لگے روزانہ شام کے وقت ابراہیم اُن کے یہاں جاتے تھے اور رات گئے تک تبادلۂ خیالات کرتے رہتے تھے۔ بالآخر اس امر پر اتفاق ہوا کہ شب پنجشنبہ ۱۴ ربیع الاول ۶۶ھ کو عملی اقدامات کا آغاز کر لیا جائے۔ (۲)

ان لوگوں نے باہم یہ رائے قائم کی کہ ہم کو قاتلان حسینؑ سے انتقام لینے کے لیے دمشق جانے کی ضرورت نہیں بلکہ حقیقتاً قاتلان حسینؑ چونکہ یہیں کوفہ میں موجود ہیں لہٰذا ان سے ہم کو بدلا لینا چاہیے لیکن اس صورت میں ابن زبیر کی حکومت سے ان کا تصادم لازمی تھا۔ اس لیے کہ قاتلان امام حسینؑ کا براہ راست تعلق اگرچہ حکومت شام سے تھا۔ مگر وہ اس وقت کوفہ کے باشندہ تھے۔ ان سے انتقام لینے کے معنی تھے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا اور ظاہر ہے کہ حکومت وقت کو اس صورت میں اپنے نظام کے تحفظ کی خاطر ان افراد کی حفاظت کرنا تھی جو اُس شہر کے باشندہ تھے لہٰذا مختار اور ان کی جماعت کے لیے قاتلان حسینؑ سے اپنے حسب دلخواہ انتقام لینا ممکن ہی نہ ہو سکتا تھا۔ جب تک کہ وہ کوفہ کی موجودہ حکومت کو ختم کر کے ایک خود مختار حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس نظریہ کے ماتحت ان کا حکومت ابن زبیر سے تصادم ناگزیر ہوا۔

---

(۱) الاخبار الطوال ص ۲۸۳ - ۲۸۳ طبری ج ۷، ص ۹۸ - ۹۹ - (۲) طبری ج ۷، ص ۱۰۰

اور نتیجہ — عبد اللہ بن مطیع کے تاب مقابلہ نہ لاکر فرار اختیار کرنے پر کوفہ میں مختار کی حکومت قائم ہوگئی۔

اس طرح مختار دو حکومتوں کے غیظ و غضب کا مرکز بن گئے۔ ایک طرف حکومت شام جس سے براہ راست قاتلان امام حسینؑ کا تعلق تھا اور دوسری طرف ابن زبیر کی حکومت جو کوفہ میں اپنے تسلط کے لیے مختار سے جنگ کرنا ضروری سمجھتی تھی۔

اس صورت حال کے دیکھنے کے بعد ہی ہم ان الزامات کی حقیقت کے متعلق بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں، جو مختار کے متعلق عام تواریخ میں درج کر دیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ علم غیب کے مدعی تھے، وہ کہتے تھے کہ مجھ پر جبرئیل آتے ہیں۔ انھوں نے محمد حنفیہؒ کی مہدویت کا اعلان کر کے غلط طور پر اپنے کو ان کا نمائندہ بتایا اور ان کی طرف سے جعلی خط بنا کر ابراہیم بن مالک اشتر کو اپنا ہم خیال بنایا۔ — وغیرہ وغیرہ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب حکومتوں کی طرف سے ان کے خلاف پروپگنڈا تھا جس کی مثالیں برابر تاریخ میں ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ عبد اللہ بن زبیر کو یزید اور اس کے ہواخواہ مُلحِد کے نام سے یاد کرتے تھے۔ پھر اگر مختار کے خلاف اس قبیل کے الفاظ ملتے ہیں تو انھیں کیونکر حقیقت سمجھا جا سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک تو ان الزامات کا غلط ہونا ان افراد ہی پر نظر کرنے سے ثابت ہو جاتا ہے جو مختار کے ساتھ تھے اور برابر ساتھ رہے جیسے کہ ابو الطفیل عامر بن واثلہ بن اسقع کنانی کہ جو صحابی رسول تھے (۱)

---

(۱) سنہ ۱۰۰ھ میں وفات پائی۔ اصحاب رسولؐ میں سب کے آخر میں انھی کی وفات ہوئی ہے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۵۸)

اسی طرح ابو عثمان نہدی اور پھر رفاعہ بن شداد، یزید بن انس، عبدالرحمن بن سعید بن قیس، ورقاء بن عاذب اور احمر بن شمیط وغیرہ۔ یہ سب صاحبان بصیرت اور دین دار لوگ تھے۔

ابراہیم بن مالک اشتر کے متعلق یہ مان بھی لیا جائے کہ انھیں غلط تحریر دکھلا کر موافق بنا لیا گیا تھا تو بعد میں مختار کے ساتھ تقریباً ہر وقت رہنے کے باوجود انھیں مختار کے عقائد و اعمال پر اطلاع نہ ہوتی اور اطلاع ہونے کے بعد وہ منحرف نہ ہو جاتے؟ پھر اگر فرض کیا جایے کہ انھیں ہر وقت ساتھ رہنے کے باوجود ان باتوں کی اطلاع نہیں ہوئی تو آخر ان راویوں کو ان پر اطلاع کیونکر ہوسکی جو مختار کے ساتھ ویسے روابط بھی نہ رکھتے تھے۔

مختار کا خلوص تو اس سے ظاہر ہے کہ حکومت پانے کے بعد بھی مختار اور اُن کے ساتھیوں نے اپنے نصب العین کو فراموش نہیں کیا۔ اور چن چن کر انھوں نے قاتلان حسینؑ کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ جس طرح اُن کا امتیازی نعرہ تھا۔ "یالثارات الحسینؑ" (۱) اسی کے مطابق ان کا عمل ظاہر ہوا۔ اس کی تکمیل اس طرح ہو گئی کہ ایک طرف تو عبیداللہ بن زیاد شام کی فوج کو لے کر موصل پر حملہ آور ہوا۔ مختار نے اُس کے مقابلہ کے لئے تین ہزار کی جمیعت کے ساتھ یزید بن انس کو بھیجا (۲) اس فوج نے دشمن کے لشکر کو جنگ میں شکست بھی دے دی۔ (۳) مگر عین معرکہ جنگ میں یزید بن انس کی جو بیمار پہلے سے تھے وفات ہو گئی اور ورقاء بن عاذب نے فوج دشمن کی کثرت اور اپنی قلت تعداد کے سبب اپنے سردار کے انتقال کے بعد اس مہم کو کوفہ سے مزید کمک منگوانے تک ملتوی کر دینے کا فیصلہ کیا۔ (۴)

---

(۱) طبری ج، ص۱۰۲ (۲) طبری ج، ص۱۱۳ (۳) طبری ج، ص۱۱۱ (۴) طبری ج، ص۱۱۵

مختار کو یہ اطلاع ہوئی تو اُنھوں نے ابراہیم بن مالک اشتر کو، ہزار کی فوج کے ساتھ ورقاء کی مدد کے لیے موصل کی طرف روانہ کیا۔ کوفہ کے سرداروں نے جو تقریباً سب ہی وہ لوگ تھے جو حضرت امام حسینؑ کے مقابلہ میں جنگ میں شرکت کر چکے تھے اس موقع کو غنیمت جان کر کہ ابراہیم کوفہ سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اور مختار تقریباً اکیلے ہیں، متفق ہو کر بغاوت کر دی اور مختار سے جنگ شروع کر دی (۱) ان میں حسب ذیل افراد کے نام نمایاں طور پر ملتے ہیں! شبث بن ربعی۔ شمر بن ذی الجوشن۔ محمد بن الاشعث۔ زحر بن قیس۔ حجار بن ابجر۔ یزید بن حارث بن رویم شیبانی۔ عمرو بن حجاج زبیدی۔ (۲) ان میں سے کوئی بھی نام واقعات کربلا کا مطالعہ کر چکنے والوں کے لیے اجنبی نہیں ہے۔

مختار نے اپنے ساتھ والی جماعت کے ساتھ ان لوگوں کا معمولی طور سے مقابلہ جاری رکھا اور ایک قاصد کو ابراہیم بن اشتر کے پاس بھیج کر اطلاع دی کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ فوراً کوفہ کی طرف واپس آئیں، چنانچہ تیسرے دن وہ اپنے لشکر کے ساتھ کوفہ واپس آ گئے۔ (۳)

اب دشمنانِ آلِ رسول کی سرکوبی کا ہنگام آ گیا تھا۔ چنانچہ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

پہلا ہی پانچ سو آدمیوں کا جتھا جو گرفتار ہو کر مختار کے پاس پیش ہوا تو مختار نے کہا۔ ان میں سے جو جو قتل حسینؑ کے موقع پر کربلا میں موجود ہوں انھیں مجھے بتاتے جانا، ان کی میں جاں بخشی نہیں کروں گا۔ باقی سب کو چھوڑ دوں گا۔ چنانچہ جن جن کے بارے میں یہ الزام ثابت ہوا وہ قتل کر دیے گئے۔ باقی سب

---

(۱) طبری ج۷، صفحہ ۱۱۶ (۲) طبری ج۷، صفحہ ۱۱۶ و صفحہ ۱۱۷ (۳) طبری ج۷، صفحہ ۱۱۷

کو اقرار وفاداری لینے کے بعد رہا کر دیا۔ (۱)

اس کے بعد مختار کی جانب سے شہر میں ندا دی گئی کہ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے اُسے امان ہو گی سوا اس شخص کے جو آلِ رسولؐ کے خون میں شریک ہوا ہو۔ (۲) یہ روز چہار شنبہ ۲۴ر ذی الحجہ ۶۶ھ کا ذکر ہے۔ (۳)

ابو عمرہ کیسان پولیس کے افسر تھے۔ چونکہ قاتلان حسینؑ بھی اب گھروں میں چھپ گئے تھے اس لیے ابو عمرہ مامور ہوئے کہ ایک ہزار مزدور ساتھ لے کر جائیں اور جو جو مظالم کربلا میں شریک تھے ان کے گھروں کو مسمار کرائیں کیونکہ ابو عمرہ ان لوگوں سے خوب واقف تھے۔ چنانچہ انھوں نے بکثرت گھر منہدم کرائے اور اس ذیل میں بہت سے دشمنان اہل بیت قتل ہوئے۔ (۴)

اب بڑے بڑے نمایاں افراد جو قاتلان امام حسینؑ میں سے تھے تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ جیسے شمر بن ذی الجوشن (۵) عبداللہ بن اسد جہنی۔ مالک بن نسر بدی۔ حمل بن مالک محاربی (۶) زیاد بن مالک، عمران بن خالد۔ عبدالرحمٰن بن ابی خشکارہ بجلی۔ عبداللہ بن قیس خولانی۔ عبداللہ بن صلخب۔ عبدالرحمٰن بن صلخب۔ عبداللہ بن وہب۔ عثمان بن خالد جہنی۔ بشر بن سوط قابض۔ (۷) خولی بن یزید اصبحی (۸) عمر بن سعد (۹) حکیم بن طفیل طائی سنبسی (۱۰) زید بن رقاد جہنی۔ حرملہ بن کاہل اسدی۔ عمرو بن صبیح صدائی (۱۱) اور قیس بن اشعث وغیرہ۔

کوفہ کی مہم سے فراغت کے بعد مختار نے ابراہیم کو پھر ابن زیاد سے جنگ

---

(۱) طبری ج ۷، ص ۱۲۱ (۲) طبری ج ۷، ص ۱۲۱ (۳) طبری ج ۷، ص ۱۲۲ (۴) الاخبار الطوال ص ۲۸۶
(۵) طبری ج ۷، ص ۱۲۳ (۶) طبری ج ۷، ص ۱۲۴ (۷) طبری ج ۷، ص ۱۲۵ (۸) طبری ج ۷، ص ۱۲۶
(۹) طبری ج ۷، ص ۱۲۷ (۱۰) طبری ج ۷، ص ۱۲۸ (۱۱) طبری ج ۷، ص ۱۲۹ (۲) طبری ج ۷، ص ۱۳۹

کے لیے روانہ کیا۔ (۱) موصل سے پانچ فرسخ پر مقام خازر میں جنگ ہوی۔ شدید مقابلے کے بعد شام کی فوج کو شکست ہوئی اور خود ابن زیاد ابراہیم کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اس کے علاوہ حصین بن نمیر سکونی اور شرحبیل بن ذی الکلاع جو شام کے دو مشہور سردار تھے وہ بھی اس جنگ میں مارے گئے (۲) ابراہیم نے ابن زیاد کا سر کاٹ کر مختار کے پاس بھیجا اور مختار نے اُسے محمد بن حنفیہ کے پاس بھیج دیا۔ (۳) اس کے بعد ابراہیم نے موصل اور اُس کے تمام اطراف پر تسلط قائم کر کے عمال مقرر کئے اور خود نصیبین میں جا کر قیام کیا (۴) —— مختار اب کوفہ میں اکیلے رہ گئے۔

ابن زبیر کو مختار سے بنائے مخاصمت قائم ہی ہو چکی تھی اور عراق میں بصرہ پر ان کا تسلط قائم تھا۔ اس دوران میں انھوں نے بصرہ کے مقامی حاکم کو جو زیادہ ان کے نزدیک قابلِ اطمینان نہ تھا معزول کر کے اپنے بھائی مصعب بن زبیر کو بصرہ میں حاکم مقرر کیا۔ ممکن ہے اسی وقت اس کا مقصد مختار کے مقابلہ میں مہم کا سرانجام دینا ہو۔

ادھر کوفہ سے جو قاتلان امام حسینؑ مختار کے ہاتھوں بچ کر کسی طرح نکلے۔ جیسے شبث بن ربعی، محمد بن اشعث، مرہ بن منقذ عبدی، سنان بن انس اور عبد اللہ بن عروہ خثعمی وغیرہ وہ سیدھے مصعب بن زبیر کے پاس بصرہ پہنچے (۵) اور انھوں نے بھی اُس کو مختار سے جنگ پر آمادہ کیا۔ خصوصیت کے ساتھ شبث بن ربعی اور محمد بن اشعث نے بڑے مبالغہ کے ساتھ اپنی مظلومی کے غلط افسانے سنا کر لجاجت وزاری سے کام لیا اور کوفہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی (۶)

---

(۱) الاخبار الطوال ص۲۸۹ (۲) الاخبار الطوال ص۲۸۸ طبری ج ۷، ص۱۴۴ - ۱۴۵۔
(۳) الاخبار الطوال ص۲۸۸ (۴) الاخبار الطوال ص۲۸۹ (۵) طبری ج ۷، ص۱۲۴ و ۱۲۸ و ۱۲۹ و ۱۳۰ و ۱۴۶ - (۶) طبری ج ۷، ص۱۴۶ - ۱۴۷۔

دینوری کا بیان ہے کہ دس ہزار اہل کوفہ رفتہ رفتہ نکل کر بصرہ پہنچ گئے اور ان سب نے محمد بن اشعث کی سرکردگی میں مصعب کو کامیابی کا یقین دلایا (۶)

اسی دوران میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ عبداللہ بن زبیر نے مکہ معظمہ میں محمد بن حنفیہ، ان کے متعلقین اور اُن کوفہ کے آدمیوں کو جو مکہ میں تھے مقید کر دیا۔ اور ایک مدت مقرر کر دی کہ اگر اس وقت تک انھوں نے بیعت نہ کی تو وہ سب زندہ جلا دیے جائیں گے۔ محمد حنفیہ نے ایک قاصد کے ذریعہ سے اس کی اطلاع مختار کو دی۔ مختار نے کوفہ سے فوج روانہ کی جس نے مکہ جا کر محمد حنفیہ اور ان کے ساتھ والوں کو قید سے رہائی دی۔ یہ لوگ تو ابن زبیر کا خاتمہ کر دینے پر آمادگی ظاہر کر رہے تھے مگر محمد حنفیہ نے حرم میں خونریزی سے سختی کے ساتھ ممانعت کی اس لئے یہ لوگ ابن حنفیہ کو ایک محفوظ جائے پناہ تک پہنچا کر واپس گئے (۱)

بالآخر مصعب بن زبیر نے غالباً اپنے بڑے بھائی عبداللہ بن زبیر کی ہدایت ہی کی بنا پر ایک لشکر گراں کے ساتھ کوفہ پر حملہ کر دیا۔ مختار نے بھی مقابلہ کی تیاری کی مگر اب مشیت الٰہی کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ مختار اپنے مقصدِ حیات کو پورا کر چکے تھے۔ ان کی طاقت بھی اس وقت یکجا نہ تھی کیونکہ ابراہیم بن مالک اشتر نصیبین میں تھے اور اس صورت حال کی انھیں کوئی اطلاع نہ تھی مصعب کے پاس فوج بہت زیادہ تھی اور محمد بن اشعث وغیرہ رؤسائے اہل کوفہ بھی ساتھ تھے اس لیے خود کوفہ کے بہت سے لوگ جو دبے ہوئے تھے وہ بھی ان کا ساتھ دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ نیز مختار کے خلاف ایک طبقہ وارانہ سوال عرب اور غیر عرب کا اٹھا دیا گیا تھا اور یہ کہہ کر کہ مختار نے عجمیوں کو عربوں پر مسلط کر دیا ہے تمام عربوں کے جذبات کو مختار کے خلاف بھڑکا دیا گیا۔ (۲)

تاہم مختار نے اپنے پاس کے لشکر کے ساتھ کئی دن بڑی بہادری کے ساتھ مصعب سے جنگ کی جس کے دوران میں ان کے ساتھ کے کئی ممتاز سردار جیسے احمر بن شمیط اور عبداللہ بن کامل وغیرہ شہید ہو گئے۔ (۱)

اس جنگ میں فوج مخالف میں سے بھی ایک شخص جو دشمنانِ اہل بیت میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا یعنی محمد بن اشعث قتل ہوا۔ (۲)

آخر الامر مختار کے تمام باوفا ساتھی شہید، عوام الناس منتشر، اور وہ خود قلعہ کے اندر محصور ہو گئے۔ پھر چند جانبازوں کے ساتھ نکل کر انھوں نے آخری بار بڑی پامردی سے جنگ کی اور عین معرکۂ جنگ میں ۱۴ ماہ رمضان ۶۷ھ کو سرسٹھ برس کی عمر میں جان اپنی جان آفریں کے سپرد کی (۳)

عداوت اور قساوت کی حد یہ تھی کہ اُن کے بعد اُن کی بیوی عمرہ بنت نعمان بن بشیر انصاری کو بھی جنھوں نے مختار کو برا کہنے سے انکار کیا ملأ عام میں قتل کیا گیا۔ (۴)

یقیناً خوش قسمت ہے وہ انسان جو مشیت کے کسی مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بنے مختار انہی خوش قسمت انسانوں میں تھے۔ اُن کی ذات کے ساتھ قدرت نے اپنا ایک عملی نظام وابستہ کیا تھا۔ اور اس نظام کی تکمیل کے ساتھ ان کی زندگی بھی ختم ہو گئی۔ اب وہ ختم نہیں ہو گئی بلکہ جاودانی طور پر باقی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

---

(۱) طبری ج، صـ۱۴۸ و ۱۴۹ (۲) الاخبار الطوال صـ۲۹۷ طبری ج، صـ۱۵۱

(۳) طبری ج، صـ۱۵۵ و ۱۶۱ (۴) طبری ج، صـ۱۵۸ الاخبار الطوال صـ۳۰۰

چالیسواں باب

اموی حکومت کا انجام

تاریخی حقیقت ہے کہ جب کسی قوم کو اس حد تک غلبہ و اقتدار حاصل ہو جاتا ہے کہ اُس کے صاحبان حل و عقد کے لیے محض ضروریات زندگی ہی نہیں بلکہ فراوانی کے ساتھ سامانِ تعیش بھی فراہم ہو سکے تو اُس میں عیش پسندی، جاہ طلبی، کمینہ طبعی، خود غرضی، ناعاقبت اندیشی، سہل انگاری اور نتیجۃً بزدلی پیدا ہو جاتی ہے، جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ منزلِ فنا میں حقیقۃً قدم رکھ چکی جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَاذا اردنا ان نهلك قریة امرنا مترفیها ففسقوا فیها فحق علیها القول فدمرناها تدمیرا (یعنی "جب ہم کسی آبادی کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو اُس کے دولت مندوں کی تعداد میں اضافہ کر دیتے ہیں وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پھر اُن پر ہمارا قانون فطرت منطبق ہو جاتا ہے اور ہم اُس کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

رسول اللہؐ کے بعد سے دورِ یزید تک بنی اُمیہ کی مادی ترقیاں کس کو معلوم نہیں دولت و ثروت، وسعت مملکت اور حشم و خدم کے لحاظ سے وہ قیصر و کسریٰ کی ہم سری کرتے نظر آتے تھے لیکن نفس پرستی اور تن پروری کے اعتبار سے اُن سے بھی کہیں بڑھے ہوئے تھے لیکن نفس پرستی اور تن پروری کے اعتبار

چنانچہ قانون فطرت کے مطابق اُن کے انحطاط اور زوال کا وقت یوں ہی قریب آچکا تھا۔ اُس پر نا عاقبت اندیش یزید نے نشۂ سلطنت و امارت سے سرشار ہو کر امام حسینؑ کو آپ کی روحانی عظمت اور حقانیت کی ناقابلِ تسخیر طاقت کا خیال کیے بغیر شہید کر دیا۔ اس کا نتیجہ ظاہر تھا۔ اور وہ یہ کہ متزلزل اموی نظام تیزی کے ساتھ تباہی اور بربادی کے آخری درجہ تک پہنچ گیا۔

ادھر عبد اللہ بن زبیر خونِ حسینؑ کا واسطہ دلا کر کھل کر یزید کے مقابل آگئے۔ اُدھر اہلِ مدینہ جنھوں نے چپ چپاتے امام حسینؑ کو شہید ہوتے دیکھا تھا مخالف ہو گئے۔ توابین کا گروہ علیحدہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مختار نے ایک طرف علمِ مخالفت بلند کیا۔ پھر زید بن علی بن الحسینؑ بھی ۱۲۱ھ میں خونِ حسینؑ کے انتقام ہی کے طالب ہو کر اٹھے۔ (۱) اور اگرچہ شہید کر ڈالے گئے مگر ایک مستقل جماعت کی تشکیل کر گئے۔ جو ظالم حکومت کے لیے خطرہ بنی رہے۔ بنی عباس علیحدہ خونِ مظلوم کا بدلا لینے کے نام سے بنی امیہ کے مقابل میں آ ڈٹے۔ (۲)

یہ سمجھنا بالکل غلط ہو گا کہ ان تمام تحریکوں میں خلوص مضمر تھا بلکہ ان میں سے بعض میں سیاسی کروٹیں تھیں اور اسی لیے اولادِ امام حسینؑ کا ان میں ذرہ برابر ہاتھ نہ تھا۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ اولادِ امام انقلاب کنندگان سے علیحدہ رہتے ہوئے منع کرتے رہے مگر قانونِ فطرت کو پورا ہونا ضرور تھا اور وہ پورا ہو کر رہا۔

بہر طور جب ابو مسلم خراسانی نے انتقامِ خونِ حسینؑ کے اعلان کے ساتھ

---

(۱) ارشاد صفحہ ۲۸۶ (۲) اس تحریک کا آغاز محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس نے ۱۰۰ھ کے آخر یا ۱۰۱ھ کے شروع میں کیا۔ (طبری ج ۸ صفحہ ۱۳۵ - الاخبار الطوال صفحہ ۱۸۱) ۱۰۴ھ میں ابوالعباس (سفاح) عبد اللہ بن محمد بن علی کی ولادت ہوئی (طبری ج ۸ صفحہ ۱۷۶) ۱۲۷ھ میں مروان بن محمد تختِ حکومت پر بیٹھا (طبری ج ۹ صفحہ ۵) ۱۲۹ھ میں دعوت و تبلیغ اعلان کے ساتھ شروع ہوئی۔ (طبری ج ۹ صفحہ ۸۳)۔

مرو میں سیاہ جھنڈا نکالا تو ہزاروں آدمی اُس کے نیچے جمع ہو گئے اور بالآخر بنی اُمیہ کا آخری بادشاہ مروان بن محمد جنگ زاب میں مارا گیا (۱) اور اسی کے ساتھ اموی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

---

(۱) طبری ج ۹ ص ۱۳۶
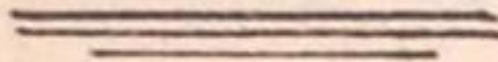
اکتالیسواں باب

بنی عباس کی سلطنت

شہادت امام حسینؑ کے کچھ عرصے کے بعد جو بنی عباس نے دعوت کا آغاز کیا اور رفتہ رفتہ اُس میں ترقی ہوی یہاں تک کہ ابو مسلم خراسانی نے خراسان میں کامیابی حاصل کی اور ایران سے عراق تک تمام مملکت اسلامی میں بنی امیہ کے خلاف حرکت پیدا ہوی تو یہ سب آل رسولؐ کی ہمدردی کے نام سے تھا۔

اگرچہ ان کی سیاہ پوشی کا شہداے کربلا کے غم سے تعلق نہ تھا بلکہ وہ اپنی اس تحریک کے بانی محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس کی وفات پر اظہار رنج و ملال (۱) اور پھر اُن کے فرزند اور اس جماعت کے سر گروہ ابراہیم بن محمد کے قتل کیے جانے پر سوگواری کا مظاہرہ تھا (۲) تاہم اکثر ناواقف یہی سمجھے رہے کہ یہ بھی غم امام حسینؑ کی علامت تھی اور اس خیال کو اس لیے اور تقویت پہنچی کہ اموی خلیفہ مروان کے قتل کے بعد کوفہ کی مسجد جامع میں جو ان کا سیاہ پوش اجتماع ہوا وہ ۱۰ محرم سنہ ۱۳۲ھ یعنی عشرے کے دن تھا (۳)

---

(۱) الاخبار الطوال صـ ۳۲۴ (۲) الاخبار الطوال صـ ۲۴۳ (۳) الاخبار الطوال صـ ۲۴۳

جو شہادت امام حسینؑ کی تاریخ ہے۔

پھر لوگوں کو اہلبیت اور عترت رسولؐ کے فضائل اور حقوق ہی کا واسطہ دے کر اس تحریک سے وابستہ کیا گیا چنانچہ اعلان دعوت کے بعد ان کے ایک خاص کارکن ابوداؤد خالد بن ابراہیم نے ایک مجمع کے سامنے جو تقریر کی وہ حسب ذیل تھی۔

"کیا تم میں کسی کو اس میں شک ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے حضرت محمد مصطفیٰؐ کو اپنی رسالت کے لیے منتخب کیا اور تمام خلق کی طرف مبعوث کیا؟ (سب نے کہا نہیں، اس میں کوئی شک نہیں) اچھا تو کیا اس میں کوئی شک ہے کہ اللہ نے ان پر اپنی کتاب نازل کی جسے جبریل امین لے کر اترے اور اس میں احکام حلال و حرام کا بیان ہے؟ (سب نے کہا بے شک) پھر کیا اس میں شک ہے کہ آپ دنیا سے جب تشریف لے گئے تو پورے طور سے رسالت کے فرض کو انجام دینے کے بعد؟ (سب نے کہا نہیں کوئی شک نہیں؟) اچھا وہ علم جو آپ پر اترا تھا کیا آپ ہی کے ساتھ اُٹھ گیا یا آپ کے بعد باقی رہا؟ (سب نے کہا ضروری باقی رہا۔) جب باقی رہا تو کیا وہ آپ کی عترت اور اہل بیت کے سوا اور کے پاس ہو سکتا ہے؟ (سب نے کہا نہیں) تو پھر اگر ایسے امکانات پیدا ہوں کہ حکومت اسلامیہ اہل بیت و عترت رسولؐ میں آجائے تو کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ وہ ان کے سوا کسی دوسرے تک پہنچ جائے؟"

(سب نے کہا نہیں۔ ہم میں سے کوئی اس کو پسند نہ کرے گا) (۱)

۱۳۰ھ میں طریدبن شقیق سلمی نے نصر بن سیار سے جنگ کی تیاری کے سلسلہ میں اپنی ایک تقریر میں کہا

---

(۱) طبری ج ۹ صـ

"قبیلۂ مضر کے لوگ آلِ رسولؐ کے قاتل اور بنی اُمیہ کے اعوان و انصار ہیں" (۱)

بیعت جو لوگوں سے لی جاتی تھی، وہ کسی خاص بادشاہ کے نام لے کر نہیں بلکہ یہ کہہ کر کہ ابایعکم علیٰ کتاب اللہ عزّ وجل وسنۃ نبیہ والطاعۃ للرضا من اھل بیت رسول اللہ۔

"میں تم سے بیعت لیتا ہوں کتاب خدا اور سنت رسولؐ اور اہل بیت رسولؐ کے رضا (پسندیدہ شخص) کی اطاعت پر" (۲) قحطبہ نے اہل خراسان کو مخاطب کر کے جو تقریر کی اس میں کہا کہ "بنی اُمیہ نے عترت رسولِ خداؐ میں سے اُن افراد کو جو نیکوکار اور پرہیزگار تھے خوف و دہشت میں مبتلا کیا۔ اب اللہ نے تمھیں مقرر کیا ہے کہ تمھارے ذریعہ بنی اُمیہ سے اُن کا انتقام لے" (۳)

۱۱ محرم ۱۳۲ھ کو عراق میں ہاشمی سلطنت کے قیام کا اعلان کیا گیا تو ابوسلمہ حفص بن سلیمان جو دوستانِ اہل بیت میں سے تھے وزیر مقرر کیے گئے۔ وہ "وزیر آلِ محمدؐ" اور ابومسلم خراسانی "امین آلِ محمدؐ" کے نام سے مشہور ہوئے۔ (۴)

بے شک اہل بیت رسولؐ میں سے ذمہ دار افراد ان اقدامات کی حقیقت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ آلِ رسولؐ کا نام صرف سیاسی مقصد براری کے لیے لیا جا رہا ہے۔ چنانچہ جب خلافت کی پیش کش پر مشتمل خط حضرت جعفر بن محمد صادقؑ کے پاس بھیجا گیا تو آپ نے اسے قاصد کے سامنے ہی چراغ کے شعلہ میں جلا کر خاک کر دیا اور فرمایا کہ اہل خراسان حقیقت میں شیعۂ علیؑ نہیں ہیں۔ ابوسلمہ

---

(۱) طبری ج ۹ ص ۹۰ (۲) طبری ج ۹ ص ۹۹ (۳) طبری ج ۹ ص ۱۰۶ (۴) طبری ج ۹ ص ۱۴۲

کو دھوکا دیا گیا ہے اور اُسے نتیجہ میں قتل کر دیا جائے گا۔ (۱)

چنانچہ واقعہ یہی سامنے آیا کہ ادھر ابو العباس سفاح عبداللہ بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کی خلافت کا اعلان ہوا اور اسی کے کچھ دن بعد ابو سلمہ کا خاتمہ کر دیا گیا۔ (۲) اور سفاح کے بعد تو آل رسولؐ کے ساتھ وقتاً فوقتاً ویسی ہی بدسلوکیاں کی گئیں جیسی بنی امیہ کے دور میں ہو چکی تھیں۔ مگر اس سے اُس تاریخی حقیقت پر کچھ اثر نہیں پڑتا کہ عوام کی ہمدردیاں بنی امیہ کے خلاف صرف اہل بیت رسولؐ اور آل محمدؐ کے نام ہی پر حاصل کی گئی تھیں اسی جذبۂ نصرت کی بنا پر جو اُنھیں شہادت امام حسینؑ کے بعد بنی اُمیہ سے پیدا ہو چکا تھا۔

---

(۱) الوزراء والکتاب ص ۵۷ (۲) الوزراء والکتاب ص ۵۸

بیالیسواں باب

تبدیلِ ذہنیت

امام حسینؑ کا مقصد جیسا کہ جا بجا اس کتاب میں بتایا گیا ہے براہِ راست یہ نہیں تھا کہ یزید یا بنی امیہ کی حکومت کو مادی حیثیت میں تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اس لئے کہ اگر آپ کو یہی منظور ہوتا تو آپ نے شروع ہی سے مادی ذرائع اختیار کیے ہوتے اور اپنے گرد مناسب حال فوجی طاقت جمع کی ہوتی بلکہ آپ حقیقتہً ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لیے کوشاں تھے اور ظاہر ہے کہ فوجی طاقت اور تلوار انسانی اجسام کو ٹکڑے ٹکڑے کیا کرتی ہے مگر اُن کی ذہنیت کو تبدیل نہیں کر سکتی لہذا آپ نے اس کی طرف پوری توجہ نہیں فرمائی بلکہ نصب العین کلی طور پر یہی رکھا کہ ان کی ذہنیت میں تبدیلی کریں۔ ایسی تبدیلی جو مستقل اور دیرپا ہو اور جس کے اثرات محو نہ ہو سکیں۔ اب دیکھنا چاہیے کہ امام حسینؑ اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے!

یہ بات ہر ایک کو معلوم ہو گی کہ مسلمانوں کی اکثریت نے خلفائے اسلام کو "اولی الامر" مانا اور اُن کی اطاعت کو اطاعت خدا و رسولؐ کی طرح فرض قرار دیا۔ اس ذیل میں کسی درجہ تک "حق تشریع" بھی ان کے لیے تسلیم کر لیا گیا۔ اس کا مقتضا تو یہ ہے کہ جو خلفا کا راستہ ہو وہ ٹھیک ہے مگر آج

شیعوں کا ذکر نہیں جو اس خلافت کو کسی حیثیت سے تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ جمہور مسلمین یعنی اہل سنت خلافت کے دو حصے قرار دیتے ہیں۔ ایک "خلافت راشدہ" اور ایک غیر راشدہ جس کو "ملک عضوض" کہا جاتا ہے۔ عام طور پر حضرت علیؑ اور پھر امام حسنؑ کی خلافت جو معاویہ سے صلح کے قبل تک رہی خلافت راشدہ کی آخری حد مانی جاتی ہے۔ معاویہ اور پھر یزید اور دیگر خلفائے بنی اُمیہ و بنی عباس سب خلفاء کہے جاتے ہیں مگر غیر راشدین۔ یہ تفریق امام حسینؑ کے بے پناہ احتجاج اور مخصوص رنگ کے جہاد ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔

آپ کی اس مقاومت کے باعث یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے صاف ہو گیا کہ خلفاء میں سے کسی کو بھی حق تشریع نہیں ہے اور جس طرح برے اعمال اگر کوئی عام انسان کرے تو وہ گناہ ہیں اسی طرح مسلمانوں کا منتخب کردہ خلیفۂ وقت ان کا ارتکاب کرے تو وہ بھی گناہ ہیں اور سب سے بڑے گناہ ہیں۔ یہ بھی کہ برسر اقتدار حاکم وقت کی اطاعت امن عام کے تحفظ کے لیے اسی وقت تک ہے جب تک مفاد خداوندی سے تصادم نہ ہو لیکن جب الٰہی قانون کا تقاضا اس حکومت کی مخالفت میں مضمر ہو تو ہر بندۂ خدا کا فرض ہے کہ وہ بمقتضائے حکم خداوندی مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے۔

اس طرح اس بھیڑیا دھسان والی کیفیت میں جو ۶۰ھ تک نظر آ رہی تھی آپ نے ایک فرض شناسی کا احساس اور حکومت جور سے محاسبہ کا ایک جذبہ پیدا کر دیا جس کی بدولت پھر کسی سلطنت کو اس کا خواب خرگوش پر کیف اور خوشگوار باقی نہ رہ سکا۔

اس کے بعد حسینؑ کا صبر و استقلال ایک دائمی مثال بن گیا جو ہر سخت موقع پر یاد کیا جاتا اور متزلزل دلوں میں استقلال پیدا کرتا رہا چنانچہ اس وقت

جب ۷۱ھ میں مصعب بن زبیر کے مقابلہ میں عبدالملک بن مروان نے لشکر کشی کی اور فوج مخالف کی کثرت سے مصعب کی فوج میں ابتری ہوگئی اور ایک عام رعب طاری ہوگیا تو مصعب نے عروہ بن مغیرہ بن شعبہ کو پکارا کہ ادھر آؤ۔ جب وہ قریب آیا تو مصعب نے کہا اس وقت حسینؑ کے حالات بیان کرو کہ انھوں نے کس طرح ابن زیاد کا حکم ماننے سے انکار کیا اور جہاد پر کمر چست باندھی عروہ نے امام حسینؑ کے حالات بیان کیے مصعب نے جوش میں اپنے گھوڑے کو تازیانہ لگایا اور یہ شعر پڑھا

فان الٰی بالطف من آلِ ہاشم   تأسوا فسنّوا للکرام التاسیا

(یعنی) "وہ جو کربلا میں ہاشمی گھرانے کی فرد یں تھیں ایک ایسی مثال قائم کر گئی ہیں جو شریفوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے ایک بہترین نمونہ ہے"

یہ کہہ کر فوج دشمن کا جان توڑ مقابلہ کیا اور جنگ کرتے ہوئے تلوار کے گھاٹ اتارے گئے۔ یہ ۱۵ جمادی الاولیٰ ۷۲ھ کا واقعہ ہے۔ (۱)

اس طرح حضرت امام حسینؑ نے جو قوت برداشت اور جرأت اظہار پیدا کر دی تھی وہ ہمیشہ ظلم و جور کی طاقتوں کے خلاف ایک خطرہ بنی رہی اور احساس انسانی کو بیداری کا جو پیغام دیا گیا تھا وہ اس وقت تک باقی ہے اور یونہی باقی رہے گا۔ جیسا کہ جوشؔ نے کہا ہے:۔

یہ آج جو اک گونج ہے آزادی کی
یہ بھی ہے حسینؑ ابن علی کی آواز

---

(۱) الاخبار الطوال ص ۳۰۱ - ۳۰۲ طبری ج، ص ۱۸۲

تینتالیسواں باب

اخلاقی نتائج

واقعۂ کربلا کی حقیقی اور لافانی افادیت اُس ردِعمل اور نیز ان انقلابات مادی سے بالکل علیحدہ اور مختلف ہے جو کہ قہری نتیجہ کے طور پر ہنگامی حیثیت سے مرتب ہوئے تھے۔ وہ اس اخلاقی قوت سے وابستہ ہے جو نوعِ بشر کی ذہنیت کی صحیح تعمیر اور رہبری کرنے کی پوری ضمانت کر سکتی ہے۔

امام حسینؑ کی ذات اور اُن کے کارنامۂ جاوید کو اُس کے حقیقی فیوض و برکات کے لحاظ سے کسی ایک گروہ میں محدود کر دینا اسلام کی اُس روح کے خلاف ہے جو خالق کائنات کو رب العالمین بنانے میں مضمر ہے۔ جب خدا کی خدائی کسی خاص گروہ سے مخصوص نہیں سمجھی جا سکتی تو حسینؑ ایسے فدیۂ راہ خدا کی قربانی کو کسی ایک گروہ میں محدود کرنا بھی سراسر غلط ہے۔ بلکہ آپ کی شہادت کا مفاد اُن تمام لوگوں سے متعلق ہے جو آپ سے انسانی زندگی کا سبق لینا چاہیں۔

ذیل میں واقعہ کربلا سے مذہب، انسانیت اور اسلام کے متعلق جو فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اُن کو سلسلہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

(۱)

مذہب اور روحانیت کی طاقت کا مظاہرہ

مادیت اور روحانیت میں جنگ ہمیشہ ہی برپا رہی اور آج بھی ہے مذہب روحانیت کا علمبردار ہے۔ اس لیے آج جب کہ دنیا روحانیت کی طرف سے منہ موڑے ہوئے ہے تو وہ مذہبی معتقدات کو اوہام کے نام سے تعبیر کر کے ان کی اہمیت کو گھٹاتی ہے مگر مذہب اپنی طاقت ہمیشہ منواتا رہا ہے۔

کربلا کی جنگ مذہبیت اور مادیت کے درمیان ایک عظیم الشان جنگ تھی۔ اُس طرف تمام مادی مظاہر تھے جو آنکھوں کے سامنے تھے اور وہ ایک انسان کو مرعوب اور متاثر بنانے کے لیے کافی تھے اور اس مرعوبیت و تاثر کا لازمی تقاضا یزید کی بیعت کے لیے سرِ تسلیم خم کر دینا تھا۔ اور ادھر وہی "نادیدہ" حقیقتیں تھیں جنھیں مذہب انسانی دماغ میں راسخ کرتا ہے۔

دنیا نے دیکھ لیا کہ تمام مادی مظاہر حضرت امام حسینؑ اور ان کے جان بازوں کو متاثر بنانے میں ناکام ہوئے اور وہ انکارِ بیعت جو غیبی طاقت پر ایمان کا نتیجہ تھا پورے جاہ جلال کے ساتھ آخر تک قائم و برقرار رہا اور نتیجہ کے اعتبار سے کامیابی حاصل کر کے دنیا کے سامنے روحانیت کی فتح کا زوال نمونہ بن گیا۔

(۲)

حقانیت اسلام کی تصدیق و اشاعت

ایک مذہب کی سچائی کا بڑا نشان ہے اُس کے بانیان کا ثبات قدم اور

استقلال کے ساتھ مصائب کو برداشت کرنا اور آخر وقت تک اپنے اصول سے منحرف نہ ہونا۔

مگر کسی مذہب کے عقیدت کیشوں میں عام افراد کا مصائب کو جھیل لینا یا اپنے کو قربانی کے لیے پیش کرنا کوئی ایسا مستند امر نہیں ہے اس لئے کہ عام افراد اکثر حقیقت حال سے بے خبر اور واقعی دھوکے اور فریب میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے لیے بالکل ممکن ہے کہ وہ سراب کو آب اور مجاز کو حقیقت خیال کر لیں اور اپنے زعم باطل کی حمایت میں جان دینے پر بھی تیار ہو جائیں لیکن خود بانی مذہب اور اس کے مخصوص واقف کار افراد اور گھر والے لوگوں کا جو اس کے اسرار زندگی اور رموز حیات اور معیار اخلاق و اوصاف سے پورے طور پر واقف ہیں اصول کی حمایت میں استقلال و ثبات قدم کے ساتھ مصائب کو برداشت کرنا اور ضرورت کے وقت جان کی قربانی پیش کرنا بے شک اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ اس اصول میں سچائی اور خلوص کا جوہر مضمر ہے۔

اسی لیے حضرت رسول ص کا طرز عمل اپنی لڑائیوں میں بھی یہی تھا کہ وہ اپنے عزیزوں کو میدان جنگ میں سب سے آگے رکھتے تھے جس کا تذکرہ حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ میں فرمایا ہے ان الفاظ میں کہ "جب خونریز جنگ کی صورت سامنے آتی تھی اور لوگوں کے قدم پیچھے ہٹتے تھے تو آپ اپنے گھرانے والوں کو آگے بڑھاتے تھے اور ان کو اپنے اصحاب کی حفاظت کا ذریعہ بناتے تھے نیزہ و شمشیر کی آنچ سے"۔ اس کا نتیجہ تھا کہ عبیدۃ بن الحارث بن عبد المطلب رسول ص کے چچا زاد بھائی شہید ہوئے جنگ بدر میں جو سب سے پہلی اسلامی لڑائی تھی اور حمزہ بن عبد المطلب جو حضرت کے چچا تھے احد میں مارے گئے اور جعفر بن ابی طالب جو رسول ص

کے دوسرے چچا زاد اور حضرت علیؑ کے حقیقی بھائی تھے موتہ کے معرکہ میں شہید ہوئے اور خود حضرت علیؑ ہر خطرہ میں موت کی طرف آگے بڑھتے نظر آئے۔

یہ طرزِ عمل رسولؐ کا بتلاتا ہے کہ خدا کا دین حضرت کو کس درجہ عزیز تھا۔ اور آپ اس کے لیے کیسی قربانیاں پیش کرنے پر تیار رہتے تھے۔ آخر میں ضرورت پڑی ایک شہید کی جو کمال مظلومیت کا نمونہ ہو۔ اس کے لیے بھی رسول کا جگر بند حسینؑ ہی آگے بڑھ آیا۔

امام حسینؑ کی قربانی کوئی خاموش قربانی نہ تھی بلکہ آپ عملی قربانی کے ساتھ ساتھ برابر اپنی زبان سے بھی حقیقی اسلام کی طرف دعوت دیتے رہے اور اپنے کردار سے بھی احکام اسلام کی عظمت دلوں میں قائم کرتے رہے۔ آپ نے کربلا میں تبلیغ حق کے پہلو کو کسی وقت نظر انداز نہیں کیا۔ اس وقت کہ جب خون کے پیاسے دشمنوں نے چاروں طرف سے امام پر راستا بند کر دیا تھا۔ اور تیس ہزار کے لشکر نے دین و مذہب بلکہ انسانیت وغیرہ کو خیرباد کہہ کر فرزند رسولؐ کے قتل پر کمر باندھ لی تھی تو حالانکہ اُن کا گمراہی سے باز آنا ممکن نہ تھا۔ اور حسینؑ اس سے پوری طرح واقف تھے پھر بھی چونکہ ایک مبلغ مذہب اور داعی حق کا فریضہ یہی ہے کہ وہ حق کی آواز بلند کرے اور تبلیغ و دعوت میں کوتاہی نہ کرے لہٰذا اس فریضہ کو امام آخر دم تک ادا کرتے رہے۔

۹ محرم کو اُس وقت جب کہ خونخوار لشکر کی یورش تھی اور حسینؑ اور اُن کی مختصر جماعت کے قتل کر دینے کے لیے حملہ کر دیا گیا تھا تو آپ نے اپنے بھائی عباس کو بھیج کر ایک شب کی مہلت مانگی صرف اس لیے کہ اس رات بھر آخری دفعہ بیدار رہ کر خدا کی عبادت کر لیں چنانچہ شب اس طرح گذاری گئی کہ لھم دوی کدوی النحل (یعنی) اس جماعت کی آوازیں ذکر

الٰہی اور تسبیح کے ساتھ اس طرح گونج رہی تھیں جیسے شہد کی مکھی کے چھتے سے آواز آتی ہے۔ اس طرح انھوں نے دکھلا دیا کہ سخت ترین مواقع پر کس طرح اصول مذہب کا خیال رکھنا چاہیے اور یہ کہ روحانی قوت عالم کی ہر قوت سے زیادہ پُر طاقت ہے۔

اس سے زیادہ سخت اور کٹھن وہ موقع تھا جب روز عاشور لڑائی شروع ہو چکی تھی حسینی جماعت کے بہت سے افراد قتل ہو چکے تھے اور نمایاں کمزوری محسوس ہونے لگی تھی۔ اور تیروں کی بارش جاری تھی۔ لیکن اس حالت میں بھی نماز ظہر بجماعت ادا کی گئی۔ اور ایسی نماز کہ جس کی نظیر عالم کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

امام رو بقبلہ اور مجاہدین کی صفیں پیچھے اور دو بہادر جاں نثار امام کے آگے سینہ سپر بنے ہوئے کہ جو تیر آئے اپنے سینے پر لیں جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نماز ختم ہوتے ہوتے اُن دو بہادروں میں سے ایک سعید بن عبداللہ حنفی زمین پر گر کر تڑپنے لگے اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔

یہ تھے حقانیت کے وہ مظاہرات اور اسلامی تعلیم کے وہ نمونے جنھوں نے ایک طرف تو دنیا کو دعوت حق کی پر زور آواز سے مملو کر دیا اور افراد اسلام کے اسلامی احساسات کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا اور دوسری طرف یزید اور ہواخواہان یزید کے ظالمانہ اقبال اور اسلام کش حرکات کا پردہ چاک کر دیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ کربلا کی جنگ میں حسینی جماعت کی ہر فرد ایک مبلغ کی حیثیت رکھتی تھی۔ بریر ہمدانی کا مباہلہ حبیب بن مظاہر کا مکالمہ زہیر بن قین کا خطبہ اور تمام انصار و اقرباء کے رجز ان سب کے ذریعہ تبلیغی اقدام کے اسباب علل نہایت تصریح کے ساتھ میدان کربلا پر بیان کر دیے گئے۔ خواہ ان کا

اثر ظاہر ہوا یا نہ ہوا کیونکہ ایک مبلغ کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ اس کی آواز پر لبیک کہنے والے زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیدا ہو جائیں بلکہ اُس کی کامیابی یہ ہے کہ وہ سخت اور کٹھن موقعوں پر اور دشوار گزار منازل میں اپنے فریضہ کو ادا کر دے اور جو دعوت و اظہار کا حق ہے اُسے پورا کر دے

یہاں تک کہ جب حسینی جماعت کے پیرو جو اس سبب داد شجاعت دے کر رخصت ہو چکے ۔ اور صرف مظلوم حسینؑ باقی رہ گئے تھے ۔ دشمنوں کا نرغہ تھا۔ دل پر مصائب کا ہجوم اور آنکھوں میں دنیا اندھیر تھی تو اس کے باوجود اپنے فریضہ سے ذرا دیر کے لیے بھی غافل نہیں ہوئے ۔ انھوں نے کوئی دقیقہ اظہار حق میں اٹھا نہیں رکھا اور آخر نفس تک اپنے فرض کو ادا کرتے رہے ۔

اُس وقت بھی جب کہ شمر کا خنجر بوسہ گاہِ مصطفٰیؐ کے قریب آ چکا تھا۔ اور خامس آل عبا کی زندگی کا چراغ گل ہو رہا تھا حسینؑ نے اپنے قاتل کے حق میں بھی تبلیغ کا فرض ادا کیا اور اپنے نانا کی حقانیت کو ثابت کر دکھایا۔ یہ فرمایا کہ اے شمر ذرا اپنے چہرے سے نقاب اٹھا۔ شمر نے نقاب ہٹائی ۔ حضرت نے فرمایا "میرے نانا رسول اللہ نے سچ کہا تھا کہ اے حسینؑ تمھارا قاتل ایک مبروص (کوڑھی) شخص ہوگا۔

روحی لک الفداء اے حسینؑ بن علیؑ آپ نے مرتے دم تک اپنے فریضہ سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ آپ نے اپنے نانا کے قول کی زیر خنجر بھی تصدیق کی آپ کے خون کا ہر قطرہ جو کربلا کی سرزمین پر گر رہا تھا اسلام کی سچائی کا ایک دائمی نشان تھا۔

اخلاقی اور تمدنی تعلیمات

کربلا کا واقعہ مرقع مصائب ہونے کے ساتھ صرف دعوت آہ و نالہ اور تحریک اشک افشانی کا سرمایہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے علاوہ وہ ایک درس گاہ تعلیم و تربیت بھی ہے جس سے انسانی رفعت کی شاہراہیں سامنے آتی ہیں۔

حالانکہ عام طور پر کسی عمل میں کوئی ایک پہلو ہوتا ہے تعلیم کا، مگر واقعہ کربلا باوجود اپنی مختصر مدت وقوع کے تمام اہم تعلیمات کا مرکز ہے۔ ذیل میں کچھ عناوین کو درج کر کے واقعات کا حوالہ دیا جاتا ہے جن سے کسی حد تک واقعہ کربلا کی ہمہ گیری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حریت

حُریت کے معنی خواہش کے مطابق مطلق العنانی کے نہیں ہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے ضمیر کے فیصلوں پر بغیر کسی رکاوٹ کے عمل پیرا ہو سکے۔ ان رکاوٹوں میں سب سے بڑھ کر خود اپنے لذائذ اور ان چیزوں سے محبت ہے جو اس ضمیر کی آواز پر عمل کرنے سے خطرہ میں پڑتی ہیں۔

اگر انسان اپنی خواہشوں اور نفس کے تقاضوں سے آزاد ہو گیا تو دنیا کا کوئی ظالم اُسے غلام نہیں بنا سکتا۔

حضرت امام حسینؑ کے سامنے ہر وہ چیز خطرہ میں تھی جو کسی انسان کو عزیز ہوتی ہے لیکن آپ نے اپنے ضمیر کے فیصلے کے مطابق عمل کر کے ایسے ہنگام میں حُریت نفس کا ثبوت دیا جس کی شدتوں کا تصور بھی عام طور پر انسان کے لرزہ بر اندام بنانے کے لیے کافی ہے۔

یہی حریت کے وہ معنی ہیں جس کے اعتبار سے آپ نے حُر بن یزید ریاحی کو جو فوج باطل کا ساتھ چھوڑ کر حق کی طرف آگئے حریت کی سند دیتے ہوئے فرمایا مانت کما سمتک امک "تم بے شک اسم با مسمی ہو"
انت حر فی الدنیا والآخرۃ "تم دنیا میں بھی حر ہو اور آخرت میں بھی"۔

یہ حریت آزادی اور غلامی کے اُس مفہوم سے بالکل الگ ہے جو آج سیاسی دنیا میں رائج ہے۔

کسی آزاد ملک کے افراد بھی حقیقت میں غلام ہیں جب وہ گنہگار جنسی توقعات کی بنا پر غلط مفادات کی راہ اختیار کئے ہوئے ہوں اور کسی "غلام" ملک کے بھی افراد آزاد ہیں۔ اگر وہ باوجود جبر و تشدد کے شکنجہ کے اپنے فرائض حق پرستی سے غافل نہ ہوں۔

استقلال

سخت اور دشوار منزلوں کے سامنے آنے پر قدم میں لغزش نہ ہونا ثبات و استقلال ہے۔ اور اس امتحان میں کربلا کے مجاہدین کا نمبر سب سے اوّل ہے۔

کون نہیں جانتا کہ گفتار اور کردار دو مختلف چیزیں ہیں۔ کہنا آسان ہے۔ لیکن عمل کرنا مشکل ہے۔

ماضی قریب کی عظیم جنگوں میں بہت سی قوموں کی آزادی سلب ہوئی جو ان میں سے کون وہ قوم تھی جس نے جنگ شروع کرتے وقت یہ علان نہ کیا ہو کہ ہم آخری قطرۂ خون گرنے تک دشمنوں کی غلامی قبول نہیں کریں گے۔

مگر وہ ملک فتح ہو گئے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت اُن میں کوئی فرد بھی قابل جنگ باقی نہ رہ گئی تھی۔ ہوتا یہی ہے کہ ان میں بہت بڑی جماعت ایسی باقی رہتی ہے جو جنگ کرنے کے قابل سمجھی جاسکے مگر مشکلات کے سامنے وہ سپر انداختہ ہو جاتی ہے۔

اس کے برخلاف اگر کربلا والوں پر نظر ڈالیے تو آپ کو وہاں کا بچہ بچہ اپنے قول کی کسوٹی پر پورا اترتا ہوا دکھائی دے گا۔ اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس فوج کے سردار اور اس کے ساتھیوں نے جو کہا اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔

حضرت امام حسینؑ نے جب یہ فرمایا تھا کہ "بیعت نہیں کروں گا" تو اس وقت اس کا صحیح مفہوم دنیا کو معلوم نہ تھا کیونکہ انسانی تخیل کے حدود اُن امکانات کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے جہاں تک واقعات کی رفتار بعد کو پہونچ گئی۔

دنیا نہیں سمجھ سکتی تھی کہ اس "نہیں" میں کتنے مشکلات کے مقابلہ کا عزم مضمر ہے لیکن حسینؑ جس وقت "نہیں" کی آواز بلند کر رہے تھے تو دل کی گہرائیوں میں اپنی قوت ارادی کا جائزہ لینے اور موقع کی نزاکت پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ شدائد اپنے امکانات کی آخری حد تک پہونچ جائیں گے لیکن میرے عزم کو نہ بدل سکیں گے۔ چنانچہ نتیجہ نے ظاہر کر دیا کہ اس "نہیں" میں کتنا وزن تھا۔

راستے میں جب حر کہتا ہوا جا رہا تھا کہ اپنے اوپر رحم کیجئے۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ قتل ہو جائیں گے۔ تو آپ نے فرمایا تھا کہ کیا اس کے آگے بھی کچھ ہے؟ جب انسان حق پر قائم ہے تو موت کے آنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

آپ کے فرزند علی اکبرؑ نے یہی کہا تھا کہ جب ہم حق پر قائم ہیں تو موت کی کوئی

پروا نہیں۔

آپ کی اس قوت عزم کا اندازہ دشمن کو بھی تھا۔ چنانچہ اس وقت کہ جب شمر ابن زیاد کا خط لیکر نویں تاریخ محرم کو آیا تھا کہ حسینؑ سے غیر مشروط طور پر اطاعت کا اقرار لو یا جنگ کرو۔ اور عمر سعد نے خط دیکھا تھا تو بجائے اس کے کہ امام حسینؑ کے پاس جاتا اور آپ کو مضمون خط سے اطلاع دیتا اس نے اپنی جگہ پر کہدیا تھا کہ "حسینؑ اس طرح پر تو اطاعت نہ کرینگے وہ اپنے باپ کا دل اپنے سینہ میں رکھتے ہیں"(۱)

نتیجہ میں سب نے دیکھ لیا کہ میدان جنگ میں ہزاروں مصائب کے سیلاب بھی آتے تھے اور اس کوہ عزم و استقلال سے ٹکرا کر واپس چلے جاتے تھے۔ گویا ان تمام مصائب کے ہجوم میں حسینؑ کی زبان پر یہ شعر جاری تھا کہ:۔

ان کان دین محمد لم یستقم الا بقتلی یا سیوف خذینی

"اگر میرے نانا کا۔ دین اس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتا جب تک کہ میری رگ حیات قطع نہ ہو جائے تو اے خون آشام تلوارو! آؤ یہ جسم حاضر ہے۔"

یہاں تک کہ اس وقت بھی کہ جب آس پاس کوئی موجود نہ رہا تھا۔ اصحاب و انصار سب شہید ہو چکے تھے۔ خود آپ پر حملے ہو رہے تھے اور زخموں سے چور چور تھے۔ اس وقت بھی آپ کی ابرو پر شکن نہ تھی۔ خود فوج عمر سعد کا ایک آدمی بیان کرتا ہے کہ "خدا کی قسم میں نے کوئی دل شکستہ و زخم رسیدہ آدمی جس کے اولاد، بھائی، اعزا و انصار سب قتل ہو گئے ہوں ایسا نہیں

(۱) ارشاد ص ۲۲۲

دیکھا جو حسینؑ سے زیادہ مطمئن، مستقل مزاج، ثابت قدم اور باہمت ہو(۱) خدا کی قسم ان سے زیادہ کیا؟ میں نے ان کے قبل اور ان کے بعد ان کے مثل بھی کوئی نہیں دیکھا۔" (۲)

جماعتی تنظیم

تنظیم اجتماعی ایک جمعیت کی وحدت خیال، وحدت قصد اور وحدت عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک شخص اگر تنہا ایک خیال پر قائم بھی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ اسے ساتھی بھی ایسے مل جائیں جو بلا استثنا سب آخر تک اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں۔ پیرودں کا ثبات واستقلال ایک علیحدہ چیز ہے جو کسی انسان کی انتہائی عظمت کے بعد بھی ضروری نہیں ہے کہ حاصل ہی ہو جائے۔

ہمارے سامنے ہیں انبیاء و مرسلین کے حالات۔ ہمیں معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ کے بنی اسرائیل پر کتنے احسانات تھے، اُن کو مظالم سے چھڑایا۔ مصر کے ملک سے بچا کر نکال لیے گئے۔ بیت المقدس کے فتح کرنے کے لیے تیار کیا مگر جب یہ لوگ عمل کی منزل سے دوچار ہوئے اور فلسطین کے قدآور آدمی دکھائی دیئے تو انھوں نے موسیٰ سے صاف کہہ دیا کہ "وہاں تو بڑے بڑے زبردست لوگ موجود ہیں۔ ہم ہرگز نہیں جائیں گے جب تک کہ وہ خارج نہ ہو جائیں۔ ہاں جب وہ نکل جائیں گے تو پھر ہم اندر داخل ہوں گے"۔ اس بڑے مجمع میں

---

(۱) ارشاد ص ۲۵۶ (۲) طبری ج ۶ ص ۲۵۹۔

جو موسیٰ کے ساتھ تھا قرآن نے شمار کر کے بتایا ہے کہ کتنے آدمی تھے جو اپنی بات پر قائم رہے۔ "صرف دو مخصوص آدمی وہ تھے جنھوں نے کہا کہ دروازہ میں داخل ہو۔ جب تم داخل ہو جاؤ گے تو تمھیں فتح حاصل ہو گی۔ اور خدا پر بھروسہ کرو اگر ایمان رکھتے ہو" مگر دوسرے لوگوں نے کوئی اثر نہیں لیا۔ اور نہایت دل شکن الفاظ میں کہا۔ "ہم ہرگز داخل نہیں ہوں گے، جب تک یہ اس میں موجود ہیں۔ ایسا ہی ہے تو آپ جائیے اور آپ کا پروردگار اور آپ دونوں مل کر جنگ کر لیجئے۔ ہم یہاں بیٹھ کر تماشا دیکھیں گے"۔

حضرت عیسیٰؑ کے شاگردوں کا تذکرہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ تھوڑے سے تو وہ لوگ ہی تھے جو آپ پر ایمان لائے تھے۔ ان میں بھی یہ عالم تھا کہ شاگردوں ہی میں سے ایک تھا جس نے اُن کے خلاف خبر رسانی کی اور اُن کو گرفتار کرا دیا۔

انجیل بتا رہی ہے کہ یسوع مسیح نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم میں سے کوئی ایسا نہ ہو گا جو میرے بارے میں ٹھوکر نہ کھائے۔ ایک بڑے مخصوص شاگرد پطرس نے کہا کہ اے میرے باپ سب ٹھوکر کھائیں میں نہیں کھاؤں گا۔ یسوع نے فرمایا کہ (صبح کو) مرغ کے اذان دینے سے پہلے تو تین مرتبہ میرا انکار کرے گا۔ انجام یہی ہوا کہ جب حضرت مسیح کو گرفتار کر کے لے چلے تو یہ شخص پیچھے پیچھے حالات دیکھنے کے لیے گیا۔ مخالف جماعت کو شک ہوا کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کا آدمی ہے۔ پوچھا تم اُن کے طرفداروں میں سے ہو؟ کہا نہیں میں اُن کو نہیں جانتا۔ دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا اور تیسری مرتبہ اس کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ کی شان میں نازیبا کلمات بھی استعمال کیے۔ اس وقت مرغ کی اذان کی آواز آئی۔ اور

اس طرح مسیح کی پیشنگوئی پوری ہوئی۔ اسی طرح باقی ساتھیوں نے بھی حضرت عیسیٰؑ کی کوئی نصرت وحمایت نہیں کی اور راہ حق پر ثابت قدم نہ رہ سکے۔

ہمارے پیغمبر کی تاریخ زندگی بھی اس طرح کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ بہت سے اس طرح کے مواقع کا تذکرہ قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔ ایک معمولی سا واقعہ یہ ہے کہ ایک افسر کی ماتحتی میں جس کا نام عبداللہ بن جبیر تھا پچاس آدمیوں کو درہ کوہ احد پر کھڑا کر دیا گیا تھا کہ چاہے ہمیں شکست ہو چاہے فتح، تم اس جگہ سے نہ ہٹنا مگر جب جنگ میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی تو باوجودیکہ افسر روکتا رہا مگر سوائے چند آدمیوں کے وہاں کوئی نہ رہ گیا اور سب مال غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فتح شکست کی صورت میں تبدیل ہو گئی اور مسلمانوں کی اکثریت صبرواستقلال سے عاری ثابت ہوئی۔

ایسے نمونے تاریخ میں بے شمار ہیں۔ لیکن کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے ساتھ جو لوگ تھے، ان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس کے قول و عمل میں اختلاف کی جھلک بھی نظر آسکے۔

اسی وجہ سے امام حسینؑ فخر کرتے تھے کہ جیسے وفادار اور جاں نثار میرے ساتھی ہیں ایسے کسی کے نہ تھے۔

عزتِ نفس

کوئی شک نہیں کہ زندگی عزیز شے ہے اور فطرت انسانی میں حیات دنیا کی محبت ودیعت کی گئی ہے۔ انسان اسی کی خاطر سخت ترین دنیا

کے مشکلات کو برداشت کرتا اور سرد و گرم عالم کا تحمل کرتا ہے۔ اور تمام وہ ممکن ذرائع جن سے اس کی ہستی کی بقا کا امکان ہو اپنے لیے حاصل کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اسلام نے بھی اس فطری رجحان کو روکنے کی وجہ نہیں پائی بلکہ لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ (اپنے نفس کو ہلاکت میں نہ ڈالو) کے حکیمانہ حکم سے حفاظت نفس کو ایک لازمی فریضہ قرار دیا۔ لیکن زمانے کے لیل و نہار میں ایسے نازک مواقع بھی پیش آجایا کرتے ہیں جب جذبات میں تلاطم اور طبعی و عقلی رجحانات میں تصادم ہوتا ہے۔ زندگی اپنی تمام دل فریبیوں کے باوجود اتنی مہیب صورت میں نظر آتی ہے کہ انسان بے اختیار اس سے آنکھیں موڑ لینا پسند کرتا ہے اور اُسی محبوب زندگی سے جس پر وہ ہر ممکن چیز قربان کر دینا پسند کرتا تھا ہاتھ دھونے میں لذت محسوس کرتا ہے۔

یہ صورت کبھی غیر شعوری، شہوانی، جاہلانہ، نا عاقبت اندیش رجحانات سے پیدا ہوتی ہے اور اس موقع پر جان دینے سے نہ عقل بڑھ کر مرحبا کہتی ہے اور نہ شرع شاباش کی آواز دیتی ہے۔ لیکن جس وقت موت سے بدتر زندگی اور زندگی سے بہتر موت میں معاملہ پڑ گیا ہو، جس وقت بقائے حیات اہم ترین مقاصد کے پامال ہو جانے پر موقوف ہو اور جس وقت عزت نفس اور فنائے وقتی کا سوال درپیش ہو۔ جب کہ میزان عقل نے صورتِ حال کے مختلف پہلوؤں کو تول کر موت کو حیات پر ترجیح بھی دی ہو تو اس وقت موت کے منہ میں جا پڑنے والے حیات دائمی کے مالک ہو جاتے ہیں۔

حسینؑ بن علیؑ نے کربلا میں اپنے فریضہ کا احساس کرتے ہوئے جو

احتیاط کیا تھا وہ اسی اصول پر مبنی تھا۔ آپ کی زبان سے نکلی ہوئی لفظیں (الموت خیر من رکوب العار) "ننگ و عار کے برداشت کرنے سے موت کا آنا بہتر ہے"۔ اور یہ کہ (الموت فی عزّ خیر من حیوۃ فی ذل) (یعنی) عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔

صحرائے کربلا میں گونج کر فنا نہیں ہو گئیں بلکہ ان کا پائدار مفہوم اب بھی غیرت دار اقوام کے صحیفۂ حیات کا سرنامہ اور دیباچۂ زندگی کا عنوان اوّل ہے۔

یہ مختصر لفظیں علوِ ہمت کی منادی اور عزتِ نفس کی ترجمان ہیں اور ان ہی کو حسینؑ نے عملی وزن کے ساتھ دنیا کے سامنے رکھا ہے۔

یہ صفت تو حضرت امام حسینؑ کے ساتھ ایسی مخصوص ہوئی کہ "سید الصابرین" (صبر کرنے والوں کے سردار) کا لقب حاصل ہو گیا۔ مصیبتوں کے ہنگامی طور پر آجانے کے بعد پھر اس کو برداشت کر لینا تو ایک مجبوری کا سوال سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر کربلا میں حق کے شیدائی مصیبتوں کا خود استقبال کرتے تھے۔

حضرت امام حسینؑ کا خود تلوار نہ اٹھانا اور تمام ساتھیوں اور عزیزوں کو اپنے سامنے رخصت کرنا قوت برداشت کا انتہائی امتحان دینا تھا۔

یہی روح آپ کے تمام ساتھیوں میں بھی کارفرما نظر آتی ہے۔

وہ عابس کا کہنا اپنے غلام سے کہ "تمہارا کیا ارادہ ہے" اور شوذب کا جواب کہ "ارادہ یہی ہے کہ آپ کے ساتھ رہ کر فرزند رسولؐ کی نصرت میں جنگ کروں اور قتل ہو جاؤں" اور پھر عابس کا کہنا کہ "شاباش! مجھے تم سے یہی امید

تھی ــــ اچھا تو پھر بڑھو آگے اور امام پر جان نثار کر دو تاکہ امام تمہاری مصیبت کو بھی اسی طرح دیکھیں جیسے اپنے دوسرے اصحاب کی دیکھی ہے۔ اور میں بھی تمہارے غم کو برداشت کر کے ثواب کا مستحق بنوں۔ یقیناً اگر اس وقت کوئی ایسا شخص میرے ساتھ ہوتا جس پر مجھے تم سے زیادہ اختیار ہوتا تو میری خوشی ہوتی کہ وہ میرے سامنے جہاد میں کام آئے۔ تاکہ میں اس کی مصیبت کو برداشت کروں کیونکہ آج تو دن ایسا ہے جس میں جتنا انسان سے ہو سکے اتنا اجر و ثواب حاصل کر لے کیونکہ آج کے دن کے بعد پھر عمل کا دفتر ختم ہے۔ اور حساب کے سوا کچھ نہیں ہے"۔ (۱)

یہ وہ الفاظ ہیں جنھیں اطمینان کے موقع پر شاعری کے طور پر ہر شخص کہہ سکتا ہے لیکن عین مصیبت کے موقع پر واقعی طور سے اُن کا کہنا بہت مشکل ہے معلوم ہوتا ہے مصائب کے اٹھانے کا ایک ولولہ اور تکالیف کے برداشت کرنے کا ایک جذبہ ہے جو خود اختیاری طور پر عملی اقدامات کا محرک ہوتا ہے۔

اسی طرح جناب ابوالفضل العباس ؑ کا قول بھی اپنے بھائیوں سے کہ "بڑھو آگے بڑھو تاکہ میں تمھیں اپنی آنکھ سے قتل ہوتے دیکھ لوں" اسی ولولہ اور جذبہ کا آئینہ بردار ہے۔

شجاعت

علم اخلاق میں طے پایا ہے کہ انسان کی تمام قوتوں کا معتدل ہونا مجموعی طور

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۵۱

پر فضائل کا سنگ بنیاد ہے۔

یہ دنیا والوں کی ناسمجھی ہے کہ وہ ہر اُس شخص کو جو محل بے محل جنگ پر آمادہ ہو جائے، بہادر اور شجاع کہہ دیتے ہیں لیکن شجاعت حقیقتہً یہ ہے کہ انسان کے لئے جس وقت قدم اٹھانا مناسب ہو اور اقدام ضروری ہو اُس وقت پر جگری کے ساتھ وہ آگے بڑھے اور وہ سب کچھ کرے جو اُس کا فرض معلوم ہوتا ہو، چاہے اس سلسلہ میں اُسے جان بھی دینا پڑے اور جس موقع پر اقدام مناسب نہ ہو بلکہ سکوت اور چشم پوشی کی ضرورت ہو۔ اُس وقت تحمل سے کام لے۔ چاہے اس میں کتنی ہی مشکلات درپیش ہوں اور ناگوار صورتوں کا مقابلہ کرنا پڑے۔

اس صورت میں خاموشی اسی طرح شجاعت کا ثبوت ہو گی جس طرح پہلی صورت میں نبرد آزمائی۔

دنیا والے عموماً ظاہر بیں ہوتے ہیں۔ وہ حقیقی اسباب و علل پر غور نہیں کرتے چنانچہ حضرت امام حسینؑ نے جس طرح اور جس موقع پر میدان کربلا میں اپنی عظیم قربانی پیش کی اس کی حقیقی اہمیت و عظمت کا احساس کرنے والے دنیا میں بہت کم ہیں مگر ہر شخص ہر موقع پر جوش پیدا کرنے کے لیے واقعۂ کربلا کی مثال ضرور پیش کرتا ہے۔ گویا ہر شخص اپنے وقت کا حسینؑ اور ہر موقع اُس کے لیے کربلا ہے مگر دنیا کو معلوم ہونا چاہیے کہ محل کا تقاضا اور اسباب کی صورت مختلف ہوا کرتی ہے۔

حسینؑ بن علیؑ کی شجاعت کا وہ صرف ایک رخ ہے جسے کربلا پیش کرتی ہے اور اُس کا دوسرا پہلو وہ ہے جسے حضرت نے دس برس تک اپنے بھائی امام حسنؑ کی صلح کا پابند رہ کر پہلے دکھلایا۔ اس دوران میں بہت سے تکلیف دہ واقعات پیش آئے مگر امام حسینؑ نے انھیں برداشت

کیا۔ اور کسی طرح مکدر فضا میں اپنی طرف سے اضطراب پیدا نہ کیا۔ بے شک جس وقت آپ کو یہ فرض معلوم ہوا کہ آپ کھڑے ہوں اور باطل سے ٹکرا جائیں تو پھر پہاڑوں کا استحکام آپ کے استقلال تک نہیں پہونچتا تھا۔

آپ کی شجاعت کا وہ رخ بھی بے نظیر تھا اور یہ رخ بھی ایسا تھا جس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی مگر چونکہ سکون سے حرکت زیادہ نمایاں چیز ہے اور نفی سے زیادہ اثبات نظروں کو متوجہ کرتا ہے۔ اسی لیے عام نگاہوں میں شجاعت کا یہ ایجابی ہی پہلو زیادہ کھپتا ہے اور دنیا اسے دیکھتی ہے تو حسینی شجاعت کا کلمہ پڑھنے لگتی ہے۔

صرف آپ ہی نہیں بلکہ آپ کے ساتھی بھی اس صفت میں بے نظیر نظر آتے ہیں۔

کربلا کی جنگ میں جو جگری کے مظاہرات سامنے آئے ہیں وہ انسان کے جسم پر رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے آج بھی کافی ہیں۔

یاد کیجئے ظہر کی نماز کو کہ کس طرح ادا کی گئی تھی امام اور آپ کے اصحاب مصلے پر نماز میں مصروف اور سعید بن عبد اللہ حنفی سامنے سپر بنے ہوئے کھڑے تھے۔ جو تیر داہنی یا بائیں طرف سے آتا تھا اسے اپنے جسم پر روکتے تھے۔ یہاں تک کہ زخموں سے چور ہو کر گر گئے تھے۔

یا ظہر سے قبل کا وہ وقت جب حملۂ اولیٰ کے بعد پچاس آدمی فوج حسینی کے ایک ساتھ شہید ہو گئے تھے اور اس سے لشکر مخالف کی ہمت بڑھ گئی تھی۔ جس پر اب اس کی کوشش تھی کہ دم کے دم میں یہ مہم سر ہو جائے مگر یہ حضرت امام حسینؑ کی بے نظیر سیاست حرب اور حسینی جماعت کی بے مثال شجاعت ہی تھی جو ہر حملہ کو ناکام بنا دیتی تھی۔ آخر جب شمرؔ نے مخصوص خیمۂ امام حسینؑ

پر حملہ کیا اور اپنا نیزہ خیمہ پر مار کر کہا تھا کہ آگ لاؤ میں اس خیمہ کو اس کے رہنے والوں سمیت جلا دوں اور خیمہ سے ایک شور رونے کا بلند ہوا تو صرف دس بہادر جاں باز تھے۔ جنھیں لے کر زہیر بن قین آگے بڑھے اور شمر کے ساتھ کی فوج کو خیموں کے پاس سے دور ہٹا دیا تھا۔

یا یہ منظر کہ عمرو بن قرظہ جنگ کرتے ہیں اور کچھ دیر تلوار چلانے کے بعد پھر امام کے سامنے آکر کھڑے ہو جاتے ہیں جو تیر آتا ہے اسے اپنے سینہ پر روکتے ہیں اور جو وار ہوتا ہے خود سپر بن جاتے ہیں۔ آخر زخموں سے چور چور ہو جاتے ہیں اور امام سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں "کیوں فرزند رسولؐ میں نے فرض ادا کیا"۔ حضرت فرماتے ہیں کہ "ہاں تم جنت میں میرے آگے جاؤ گے"۔ بہادر جانباز زخموں کی کثرت سے زمین پر گرتا ہے اور جاں بحق تسلیم ہوتا ہے۔

یا یہ عالم کہ جب عابس تلوار کھینچے ہوئے فوج دشمن پر حملہ آور ہوتے ہیں اور بزدل دشمن کی فوج پتھروں کی بارش کر دیتی ہے تو عابس زرہ اور خود و بکتر اتار کر پھینک دیتے اور تلوار نیام سے لے کر فوج مخالف پر ٹوٹ پڑتے ہیں یقیناً ان میں سے ہر منظر شجاعت کا ایک یادگار مرقع ہے اور ان سے زیادہ عظیم حسینی شجاعت کے کام میں لائے جانے کا وقت تھا جب ایک یکہ و تنہا اور بے کس کمر خمیدہ اور دل شکستہ کے سامنے ہزاروں آدمی بھاگتے نظر آتے تھے۔

تمام مجاہدین کربلا اور ان کے سالار حضرت سید الشہداء کی شجاعت نے وہ مرقع پیش کیے جن کا اثر دشمنوں کے دل پر مدت العمر رہا اور اس کا اظہار اُن کی زبان سے ہوا کیا جیسا کہ بریر ہمدانیؒ کے قاتل کعب بن جابر نے اپنے اشعار میں کہا۔

"میری آنکھوں نے نہ اس زمانہ میں اور نہ اس کے پہلے ابتدائے عمر سے

کبھی ان کی ایسی جماعت نہیں دیکھی جو اس شدت سے حرب و ضرب کرنے والی ہو۔ انھوں نے بغیر زرہ و بکتر کے جنگ میں غیر معمولی استقلال دکھلایا۔ یہ اور بات ہے کہ نتیجتہً انھیں اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا۔ (۱)

یہ آخری فقرہ اُس کی مادی ذہنیت کے لحاظ سے ہے جو کامیابی کو صرف جنگ کی ظاہری فتح میں منحصر سمجھتی تھی۔ حالانکہ مستقبل نے ثابت کر دیا کہ فتح بھی اسی بہادر جماعت کو نصیب ہوئی اور ان کی مخالف اکثریت کو وہ ابدی شکست ہوئی جو تاریخ میں مثال نہیں رکھتی۔

ایثار

مشترکہ ضرورت کے وقت دوسرے کو اپنے نفس پر مقدم کرنا ایثار ہے۔ اس صفت کا بہترین اور مکمل نمونہ امام حسینؑ اور دوسرے مجاہدین کربلا نے پیش کیا۔

امام نے تو اپنے عمل سے یہ مثال قائم کر دی کہ ضرورت کے وقت دوست کیا دشمن کو بھی اپنی ذات پر مقدم کرو۔ یہ سبق حضرت نے اس وقت دیا جب عراق کی راہ میں فوج حر کو جو سدِ راہ ہونے کے لیے آئی تھی آپ نے اپنے ساتھ کا سب پانی پلا دیا اور اپنے اور اپنے وابستگان کے مستقبل کے لیے اس کو محفوظ نہ فرمایا۔ اور کربلا میں اصحاب واقارب امام میں سے ہر فرد نے امام کے نفس کی حفاظت کو اپنے جسم و جان کے

---

(۱) طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۴

مقابلہ میں اس طرح مقدم قرار دے لیا تھا کہ وہ اپنی ہستی کو جیتے جی معدوم سمجھتے تھے۔ سعید کا امام کے مصلے کے سامنے سپر بن کر کھڑا ہونا اور تیروں کا اپنے سینہ پر روکنا نہ بھولنے والا ایثار کا مرقع ہے۔

کربلا میں قربانی پیش کرنے کے لئے ہر ایک دوسرے پر سبقت کرنا چاہتا تھا۔ اور ہر ایک کا منشا یہ تھا کہ کم از کم وقت کے لیے سہی، وہ خود اپنی جان سے گزر کر دوسروں کے تحفظ کا ذریعہ بن سکے۔ اگرچہ یہ سب کو معلوم تھا کہ بچنے والا کوئی نہیں، پھر بھی فکر یہ تھی کہ جب تک ہم ہیں دوسروں پر آنچ نہ آنے پائے۔

انھیں اپنا غم نہ تھا، اپنی فکر نہ تھی، غم تھا اگر تو حسینؑ کا، فکر تھی تو اُن کی تنہائی کی۔ چنانچہ یاد کیجئے سیفؓ بن حارثؓ و مالک بن عبد دونوں بھائیوں کا وہ امام کے پاس آ کر رونے لگنا اور امام کا فرمانا کیوں روتے ہو؟ اور اُن کا کہنا کہ ہم اپنے لیے تھوڑی روتے ہیں۔ ہمیں تو آپ کی بیکسی پر رونا آرہا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے اور یہ کہ اب ہم سے آپ کی حفاظت قرار واقعی طور پر نہ ہو سکیگی۔

اسی طرح یہ واقعہ بھی کہ بشیر بن عمرو حضرمی کو خبر پہونچتی ہے کہ ان کا فرزند عمرو رے کی سرحد میں قید ہو گیا ہے۔ امام بلاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تم میری بیعت سے آزاد ہو۔ جاؤ اور اپنے فرزند کی رہائی کی فکر کرو اور وہ باوفا مجاہد کہتا ہے کہ مجھے جیتے جی درندے کھا جائیں اگر میں آپ سے جدا ہوں۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں۔

انفرادی طور پر جان بچانے کے امکانات ٹھکرائے جا رہے تھے صرف حسینؑ کے ساتھ حق وفاداری ادا کرنے کے لیے جناب ابوالفضل العباسؑ اور ان کے بھائیوں کو دو امان نامے پہونچے ایک عبداللہ بن ابی المحل کے ذریعہ سے

جو اُن کی والدۂ گرامی ام لبنین کا بھتیجا تھا اور ایک شمر کے ذریعہ سے جو اسی خاندان سے تھا مگر دونوں رد کر دیئے گئے۔ اپنے سامنے زندگی کی راہ صاف ہونے کے باوجود دوسرے کی خاطر موت کو اختیار کرنا کوئی معمولی ایثار کا مظاہرہ نہیں ہے۔ پھر یہ بھی امام اور اس پوری جماعت کا ایثار ہی تھا۔ کہ دین و مذہب کے تحفظ اور نوع انسانی کو مظالم سے بچانے کی خاطر اپنا سب کچھ نذر کر دیا اور کسی بھی شے کو جو دنیا کے کسی شخص کو عزیز ہوتی آپ نے قطعاً عزیز نہ کیا۔

مواسات

دوسرے کو مصیبت میں مبتلا پا کر اس کا شریک اور ہمدرد بن جانے کا نام مواسات ہے۔ کربلا میں حسینؑ اور انصار حسینؑ نے باہمی مواسات کا بے مثال نمونہ پیش کیا۔

امام کی مواسات کا یہ عالم تھا کہ کوئی مصیبت انصار و اصحاب پر نہیں پڑی جس میں امام نے اُن کا ساتھ نہ دیا ہو۔ انصار اور عزیزوں کی شہادت کے عنوان مختلف تھے لیکن جب امام کی شہادت پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک عنوان کے ساتھ مخصوص نہ تھی۔ بلکہ ایک بیکس کے قتل کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں وہ اس ایک ذات میں جمع ہو گئی تھیں۔ اسی طرح اصحاب حسینؑ کی امام کے ساتھ مواسات دنیائے تاریخ میں بے نظیر ہے۔ وہ صرف اپنی جانیں نہیں دے رہے تھے بلکہ دنیا کو مواسات کا نہ بھولنے کے قابل سبق یاد کرا رہے تھے اور ایک بے نظیر مثالیہ قائم کر رہے تھے۔

حسنِ معاشرت

دوستوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیے اور اپنوں میں کس طرح مساوات مدِ نظر رہنا چاہیے اس کا بہترین سبق امام حسینؑ نے دیا ہے۔ پہلے کے واقعات کا تذکرہ جبکہ اطمینان کے لمحے اور سکون کے اوقات تھے اتنا اہم نہیں ہے کیونکہ اُن حالات میں دوسرے بھی معاشرتی حقوق کا کچھ نہ کچھ لحاظ کرتے ہیں مگر عاشورہ کے دن جب مصائب کا ہجوم تھا، امام حسینؑ نے کس طرح حقوق کا لحاظ کیا ہے اور یہ خیال رکھا ہے کہ کسی کے ساتھ جانبداری اور پاسداری ہونے نہ پائے اس کو قرار واقعی طور پر سمجھنے کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ جماعت حسینی میں عزیز بھی تھے اور غیر بھی تھے مگر آپ کا طرزِ عمل سب کے ساتھ اپنے اپنے حدود میں مساوانہ تھا اور پھر حفظ مراتب کے ساتھ۔ یہی چیز مشکل ہے۔

جنگ کے میدان میں اور خیام حسینی کے قیام کی جگہ میں کافی فاصلہ تھا۔ چنانچہ امام کے نفس کو کتنا تعب اور کتنی مشقت برداشت کرنا ہوتی ہوگی مگر چونکہ آپ کو سب کے ساتھ عزیزانہ برتاؤ کرنا ضروری تھا۔ لہٰذا جو مجاہد آتا تھا اور اجازت جہاد مانگتا تھا بغور اُسے دیکھتے تھے، اجازت جہاد دیتے تھے جب تک کہ جنگ کرتا تھا کھڑے ہو کر اُس کی جنگ کا مشاہدہ فرماتے تھے اور جب زخمی ہو کر گرتا تھا تو اُس کی لاش پر جاتے تھے۔ اُس دھوپ اور گرمی اور تمازتِ آفتاب میں ہر شہید کی لاش پر جانا اور پھر واپس آنا کتنی سخت زحمت کا باعث ہوتا ہوگا۔ مگر امام کو تو دکھانا تھا کہ ایک سردار، ایک رئیس اور ایک افسر کو اپنے ساتھیوں، ماتحتوں یا سپاہیوں

کے ساتھ کس طرح یگانگی اور مساوات کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

اُن سخت اوقات میں جبکہ ایک انسان کے ہوش و حواس بجا نہیں رہ سکتے۔ یہ امام حسینؑ ہی کا کام تھا کہ معاشرتی حقوق کی نگہداشت کامل طور پر ملحوظ رکھی۔ پھر یاد کیجیے وہ واقعہ کو جب بشر بن عمرو کو اُن کے فرزند کی گرفتاری کی خبر ملی تھی تو امام حسینؑ نے ان کو بلا کر فرمایا کہ جاؤ اور اپنے فرزند کی رہائی کی فکر کرو اور اُس مجاہد نے قطعی طور پر ساتھ چھوڑنے سے انکار کیا تھا اُس وقت قدردان امام نے ان کو پانچ قیمتی کپڑے دیے تھے جن کی قیمت ہزار اشرفی کے قریب تھی اور فرمایا تھا کہ اچھا تم نہیں جاتے ہو تو اپنے فرزند محمد کو بھیجدو تاکہ وہ ان کپڑوں کی قیمت سے لیے بھائی کی رہائی کا سامان کرے عام طور پر انسان فرائض کے پورا کرنے میں معمولی سے معمولی اعذار کے ذریعہ اپنا بچاؤ کرتا ہے اور امام حسینؑ سے بڑھ کر ظاہری طور پر اس وقت مجبور کون سمجھا جا سکتا تھا۔ آپ اپنے وطن میں نہیں بلکہ سفر میں تھے۔ یہی مجبوری اظہار معذوری کے لیے کافی تھی۔ صورت واقعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے پاس نقد روپیہ بھی موجود نہ تھا۔ پھر اس وقت محصور بھی تھے۔ بے آب و دانہ بھی تھے۔ موت کی منزل کے سامنے بھی تھے۔ اپنی اور تمام ساتھیوں کی جان کا معاملہ درپیش تھا۔ ایسی حالت میں اگر اس پریشانی پر جو آپ کے ایک ساتھی کو درپیش تھی، آپ اخلاقی طور پر صرف اظہار افسوس پر اکتفا کرتے تو اُن حالات کے لحاظ سے کوئی متنفس آپ کے طرز عمل پر حرف گیری نہیں کر سکتا تھا مگر حسینؑ اس دن کمال انسانیت کا مثالیہ قائم کر رہے تھے۔ آپ نے اُس وقت بھی جب ہر شخص آپ کو مجبور سمجھ رہا تھا اور اُن ہوش ربا

پریشانیوں کے عالم میں جو درپیش تھیں خود اپنے امکانات کا جائزہ لیا اور جو ممکن صورت امداد کی نظر آئی اس سے دریغ نہیں کیا۔

میدان کربلا میں جبکہ معرکۂ جنگ میں اکثر ساتھیوں اور عزیزوں نے مختلف طریقوں پر حسینؑ سے مدد چاہی اور کبھی یہ نہیں ہوا کہ آپ نے مدد نہ دی ہو۔ یاد کیجئے وہ موقع جب عمرو بن خالد صیداوی، مجمع بن عبداللہ اور جنادہ بن حارث وغیرہ پانچ بہادروں نے انصار امام حسینؑ میں سے فوج مخالف میں گھس کر شمشیر زنی کرنا شروع کر دی تھی اور فوج اعدا نے ان کو چاروں طرف سے گھیر کر زخمی کر دیا تھا۔ یہ دیکھنا تھا کہ امام حسینؑ نے اپنے بھائی جناب عباسؑ کو ان کی امداد کے لئے بھیجا۔ اور آپ نے تن تنہا جا کر فوج پر حملہ کیا اور بہادروں کو دشمنوں کے حلقہ سے نکال لیا تھا۔

یہ عباسؑ وہی تھے جن کی زندگی امام کو اس قدر عزیز تھی کہ جب تک ایک مجاہد بھی موجود رہا عباسؑ کو مرنے کی اجازت نہیں دی مگر ساتھیوں کی قدردانی ایسی تھی کہ ان کی خاطر ایسے اپنے عزیز بھائی کو فوج کے نرغے میں بھیج دیا اور خطرہ کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

وہ بھی ایک طرح کی امداد ہی تھی کہ جب عبداللہ بن عمیر میدان میں مصروف جہاد تھے اور ان کی وفادار بیوی ام وہب گرز ہاتھ میں لیے میدان میں نکل آئی تھی اور پکار کر کہنے لگی تھی کہ "ہاں میرے ماں باپ تم پر نثار نصرت اولاد رسولؐ میں کوتاہی نہ ہو"۔ عبداللہ سے کچھ بن نہ پڑتا تھا کہ زوجہ کو کس طرح خیمہ میں واپس کریں۔ امام نے جو یہ دیکھا آواز دی کہ "اے مومنہ خیمہ میں واپس جا عورتوں پر سے جہاد ساقط ہے"۔ حکم امام

کا وہ نہیب تھا کہ فرض شناس خاتون فوراً واپس ہوئی اور خیمہ میں چلی گئی۔

اصحاب و اعزا میں زیادہ تر جو گھوڑے سے گرتا تھا یہی آواز دیتا تھا کہ یا اباعبد اللہ ادرکنی (یعنی) اے امام میری خبر لیجئے اور آپ ہر ایک کی امداد کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ امام کی کوشش یہ تھی کہ کسی کا سر اُس کے تن سے جدا نہ کیا جا سکے۔ اور یہ ایک واقعہ ہے کہ امام کی زندگی میں سوائے بعض انصار کے جنھیں امام کو آواز دینے کا موقع بھی نہ مل سکا تھا اور کسی کا سر تن سے جدا نہیں کیا جا سکا۔

شہدا کی لاشوں کا احترام حضرت کو امکانی حد تک پیش نظر تھا۔ اصحاب کی شہادت کے موقع پر تو ساتھی اکثر موجود ہوتے تھے جو لاش کی حفاظت کا سامان کر لیتے تھے مگر جب عزیزوں کی باری آئی تو پھر زیادہ تر خود حسینؑ کو اُن کی لاشوں کے میدان سے اُٹھوانے اور خیمہ تک لانے کا اہتمام کرنا پڑا۔ علی اکبرؑ کے لیے کچھ جوانان بنی ہاشم کے ذمہ یہ خدمت کی گئی کہ اپنے بھائی کی لاش خیمہ تک پہونچاؤ اور قاسم کی لاش آپ نے خود اُٹھائی اور دوسرے بنی ہاشم کی لاشوں کے پاس پہونچائی۔ پھر بھی یہ تمنا دل میں یقینی ہو گی کہ کاش آپ ان سب کو دفن بھی کر سکتے۔ اس لیے اگر حالات نے اتنی مہلت نہ دی کہ آپ بڑی لاشوں کو دفن کر سکیں پھر بھی آپ نے اس فرض کو کلیۃً تشنۂ عمل نہیں چھوڑا چنانچہ شیر خوار علی اصغر کی چھوٹی سی لاش کو آپ نے اپنے ہاتھ سے سپرد زمین کیا۔ اور اس طرح یہ ثابت کر دیا کہ اس سخت ترین ہنگامۂ مصائب میں ایسا نہیں ہو نے

پایا کہ کوئی ایک فریضۂ اخلاقی بھی آپ کی نظر سے اوجھل اور توجہ سے محروم رہ سکے۔

انسانی ہمدردی

دوستوں کے ساتھ مراعات اور سلوک کرنا ایک معتدل فطرت انسان کا خاصۂ مزاج ہوتا ہے اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن دشمنوں کے ساتھ احسان کرنا اور اُن لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا جو اپنے سے جنگ پر تیار ہوں۔ اُن کی ضرورت پر کام آنا جو اپنے خون کے پیاسے ہوں۔ یہ ہر انسان کا کام نہیں ہے۔ یہ سبق حسینؑ نے دیا۔

اس سلسلہ میں ناظرین کو کربلا کے راستے میں منزل شراف کا واقعہ یاد ہوگا۔

کربلا میں آخر وقت تک دشمنوں کی خیر خواہانہ نصیحت سے باز نہیں آئے۔ اصحاب بھی امام کے راستے کے سالک اور آپ کے قدم بقدم تھے۔ ہر ایک نے نصیحت و دعوتِ حق کے فرض کو ادا کیا۔ زہیر بن القین کی تقریر اسی جذبۂ حق کوشی کی ترجمان تھی۔ وہ کہہ رہے تھے ؛

"دیکھو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے برادر مسلم کو خیر خواہی کے ساتھ نصیحت کرے۔ اور سچا مشورہ دے اور ہم تم ابھی تک بھائی بھائی ہیں اور ایک ہی دین اور ایک ہی ملت پر ہیں جب تک ہمارے درمیان تلوار چلنے نہ لگے۔ اُس وقت تک تم اس کے مستحق ہو کہ ہم تم کو نصیحت کریں اور نیک صلاح دیں۔"

حقیقت میں حسینؑ اپنے کسی دشمن کے بھی دشمن نہ تھے بلکہ دوست تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح نجات کے راستے پر آجائے۔

صاف بیانی

دنیا کے سیاست اندیش اور قیادت پسند افراد جب کسی تحریک
کے داعی ہوتے ہیں تو وہ ان لوگوں کو جنہیں ساتھ لینا چاہتے ہیں طرح
طرح کے مواعید سے اپنی حمایت پر آمادہ کرتے اور طرح طرح کے خوش آیند
توقعات پیدا کرا کے انہیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ فتح و ظفر کی
کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ مال و دولت اور جاہ و ثروت کے خواب
دکھائے جاتے ہیں اور اس طرح لوگوں کو اپنے گرد مجتمع کیا جاتا ہے۔

کون ہوگا جو اپنی کمزوری، مایوسیوں اور ناامیدیوں کو اُن اشخاص
پر ظاہر کردے جن سے اسے کام اپنا منظور ہے۔ یہ جائے کہ کہنا کہ تم ہمارا
ساتھ چھوڑ دو۔ ہمارے پاس سے چلے جاؤ اور ہم نہیں چاہتے کہ تم ہماری
وجہ سے جان دو۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کی سچائی، ایمان داری اور دیانت
پر بڑا حرف آتا ہے اس سے کہ وہ دوسروں کو دھوکے میں مبتلا رکھے
اور غلط توقعات قائم کرکے اپنے ساتھ لے یا کم از کم خاموش رہ کر
عرصہ تک اُن کو غلط فہمی میں مبتلا رہنے دے۔

امام حسینؑ نے شروع سے آخر تک اس بات کی کوشش کی
کہ کوئی آپ کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو اور غلط توقعات کی بناء
پر ساتھ دینے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ آپ برابر حقیقت حال اور
اپنے آخری انجام سے مطلع کرتے رہے اور اعلان فرماتے رہے کہ

آخری نتیجہ اس سفر میں موت ہے۔

اُس وقت جب کہ آپ ابھی مدینۂ منورہ سے روانہ بھی نہ ہوئے تھے اور اغیار آپ کے ساتھ نہ ہوے تھے۔ صرف اعزا تھے جو ہمراہی پر آمادہ تھے اس وقت بھی آپ ایسی باتیں کرتے تھے جن سے خود بخود موت کے استقبال کی تیاری کا پتہ چلتا تھا۔

چنانچہ ابو سعید مقبری جو رجب سنہ ۶۰ھ میں یعنی اُس زمانہ میں جب امام حسینؑ مدینۂ منورہ سے روانہ ہوے ہیں وہاں موجود تھے ناقل ہیں کہ میں نے امام حسینؑ کو دیکھا کہ آپ مسجد نبوی میں تشریف لے جارہے تھے اور آپ کی زبان پر ابن مفرغ شاعر کا یہ قول بطور تمثیل جاری تھا کہ:۔

لا ذعرت السوام فی فلق الصبح مغیرا ولا دعیت یزیدا

یوم اعطی من المھانۃ ضیما والمنایا یرصدننی ان احیدا

یعنی "یہ نہیں ہو سکتا کہ موت کے خوف سے میں ذلت کو برداشت کردں اور اُس وقت کہ جب موت میری تاک میں ہو میں ہٹ جاؤں"!

یہ کوئی تقریر نہیں تھی اور نہ کوئی خاص اعلان تھا مگر سننے والے نے سمجھ لیا اور بعد میں بیان کیا کہ ان اشعار کو سنتے ہی میں نے اپنے دل میں کہہ دیا کہ بخدا ان شعروں کا ذکر اعتبار سے خالی نہیں اور کوئی نہ کوئی خاص ہم آپ کے پیش نظر ہے۔ اس کے بعد دو دن نہ گذرے تھے کہ آپ مدینہ سے روانہ ہو گئے۔(۱)

اب وہ وقت آیا کہ آپ مکۂ معظمہ سے روانہ ہونے والے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے کہ لوگوں کو بہت خوش آئند توقعات آپ کے متعلق قائم ہو چکے ہیں اس لیے کہ کوفہ عراق کا پایۂ تخت اور بڑا مرکز ہے۔ حضرت علیؑ کا دارالسلطنت رہ چکا ہے

---

(۱) طبری ج ۶ ۱۹۱

لوگوں کی غلط خیالی انھیں اس دھوکے میں مبتلا کیے ہوئے ہے کہ کوفہ علیؑ اور اولادِ علیؑ کے دوستوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہاں سے بارہ سو خط بھی آچکے ہیں کہ آپ آئیے اور ہم آپ کی نصرت میں اپنا خون پسینہ کی طرح بہانے کے لیے تیار ہیں۔ ان خطوط کے بعد حضرت مسلم روانہ کیے جا چکے ہیں اور اُن کا بھی خط آچکا ہے کہ اٹھارہ ہزار آدمیوں نے آپ کی بیعت کرلی ہے۔ اس سب کے بعد امامِ حسینؑ کوفہ کی طرف روانہ ہو رہے ہیں تو عام افراد کا خیال اس کے متعلق یہی ہے کہ آپ ایک ایسی جگہ جا رہے ہیں جہاں تاج و تخت کے مالک ہوں گے اور بادشاہ تسلیم کئے جائیں گے اس لیے فطرۃً بہت سے لوگوں کو آپ کے ساتھ اس خیال سے ہو جانا چاہیے تھا کہ وہاں جاکر آپ کی سلطنت سے فائدہ اُٹھائیں گے اور نیز چونکہ آپ زرخیز خطۂ زمین کی طرف جا رہے ہیں اس لیے وہاں جاکر مالی منافع بھی حاصل کریں گے۔ اس طرح یقیناً آپ جو کوفہ کی طرف تشریف لے جاتے تو ایک کثیر جماعت ایک کثیر جماعت جو ایک لشکر کی حیثیت رکھتی ہوئی آپ کے ساتھ ہوتی۔ لیکن یہ آپ کو منظور نہ تھا۔ آپ نے ضرورت محسوس کی کہ عام لوگوں کے سامنے حقیقت کو واضح فرما دیں اور سب پر آشکارا کر دیں کہ اُن کی خوش آیند توقعات سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ آپ نے مکہ معظمہ سے روانگی کے ایک دن قبل حمد و صلوٰۃ کے بعد یہ تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا کہ:-

"موت اولادِ آدم کے گلے کا ہار ہے۔ میں اپنے اسلاف کی ملاقات کا مشتاق ہوں اُتنا کہ جتنا یعقوبؑ یوسفؑ کی ملاقات کے مشتاق تھے۔ میرے لئے بہتر ہے وہ جگہ جہاں میں قتل کر کے گرایا جاؤں گا۔ میرے پیش نظر ہے وہ منظر جب میرے جوڑ بند وحشی درندے قطع کر رہے ہوں گے۔ میرے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے ہوں گے۔ اور اپنی حسرتیں میرے خون سے نکال رہے ہوں گے۔ کوئی چارہ کار

نہیں ہے۔ کوئی مفر نہیں ہے اُس دن سے جو قلم تقدیر نے لکھ دیا ہے۔ جو خدا
کی مرضی ہو۔ اُسی میں ہم اہلبیت کی مرضی ہے۔ ہم اُس کی آزمائش پر صبر کرتے ہیں
اور جو صابرین کا اجر ہے اُس کو پورا پورا حاصل کرتے ہیں۔ رسولؐ خدا سے اُن کے
جگر کے ٹکڑے دور نہیں ہو سکتے بلکہ وہ بارگاہِ قدس میں جنت اعلیٰ میں ان کے پاس
جمع ہونے والے ہیں جن سے اُن کی آنکھیں خنک ہوں گی اور اُن کا وعدہ
پورا ہوگا۔

جو اپنی جان میرے ساتھ فدا کرنا چاہتا ہو اور موت پر کمر باندھے ہوئے ہو
وہ میرے ساتھ چلے۔ میں صبح کو انشاء اللہ روانہ ہو جاؤں گا۔"

دیکھئے کن الفاظ میں لوگوں کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی جا رہی ہے!
کیا اس سے بڑھ کر دنیا میں حقانیت اور سچائی کا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کیا
اس سے بڑھ کر صاف گوئی اور پاکبازی کا مظاہرہ ہو سکتا ہے؟ اب ساتھ
چلنے والے وہی لوگ تھے جو جان دینے پر تیار تھے۔ جو حقیقۃً استقلال
اور ثابت قدمی رکھتے تھے جن کو دنیا کی توقع اور راحت دنیا کا کوئی خیال
بھی طرف متوجہ نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ وہ مجاز کے پردوں کو چاک کر کے حقیقت
کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اس حقیقت پرور تقریر کے بعد وہی لوگ آپ کے ساتھ ہوئے جو دنیا
کے مال و دولت اور جاہ و حشم کو ہیچ سمجھتے تھے۔ جو حقیقی زندگی کے طالب
تھے اور اُسے موت کا نتیجہ سمجھتے تھے۔

یہ تقریر مکہ معظمہ میں کی گئی تھی جس نے ہر قسم کی غلط فہمی کے پردہ کو چاک
کر دیا اور حقیقت حال واضح کر دی مگر مکہ معظمہ سے روانگی کے بعد راستے
کے اعراب، بادیہ نشین قبائل اور دوسرے بے خبر اشخاص اما لو دیکھتے ہیں کہ ایک

جمعیت کے ساتھ ایک قافلہ کی صورت میں جا رہے ہیں دریافت کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے عراق کا ارادہ ہے، وہاں سے طلبی ہوئی ہے۔ زیادہ تر جو سنتا ہے اُسے خیال ہوتا ہے کہ ہم بھی آپ کے ساتھ ہو رہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ معظمہ سے ساتھ چلنے والی جماعت گو مختصر تھی مگر راستے میں طرح طرح کے لوگ شریک ہوتے گئے اور اس طرح وہ جمعیت جو اس کے قبل ایک قافلہ کی حیثیت رکھتی تھی ایک لشکر کی صورت اختیار کر گئی۔

کوئی اور ہوتا تو اس ناخواندہ اژدہام کو غنیمت سمجھتا اور اس کے اپنے ساتھ ہو جانے کو بہترین اتفاق خیال کرتا۔ وہ چاہتا کہ کسی طرح انھیں گرویدہ بنائے رکھے اور اپنی گرفت سے نکلنے نہ دے مگر امام حسینؑ نے دم بھر تک اس صورت حال کو برداشت نہ کیا۔ بلکہ۔ اُس وقت جب مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کے قتل ہونے کی خبر پہونچی اور عبداللہ بن یقطر جو آپ کے قاصد تھے اُن کے بھی شہید ہونے کی اطلاع آ گئی تو منزل زبالہ پر آپ نے قیام فرمایا اور ایک تحریر جسے سرکاری بیان کہنا چاہیے آپ نے تمام اہل قافلہ کے مجمع میں پڑھ کر سنائی جس کا مضمون یہ تھا کہ:-

"ہمیں یہ دردناک خبر پہونچی ہے کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ اور عبداللہ بن یقطر شہید کر ڈالے گئے اور ان لوگوں نے جو ہماری دوستی کا دعوے کرتے تھے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس صورت حال کے بعد جو شخص تم میں سے واپس جانا چاہے وہ واپس چلا جائے۔ ہماری طرف سے اُس پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی"

حضرت کی اس تقریر کے بعد لوگ متفرق ہونے لگے یہاں تک کہ بس وہی منتخب جماعت رہ گئی جو آپ کے ساتھ مدینہ منورہ سے آئی تھی۔

یوں سمجھنا چاہیئے کہ مجمع چھٹ جانے کے بعد صرف وہی لوگ رہ گئے
جو آپ کی مکہ معظمہ والی تقریر کو سن چکے تھے اور حقیقۃً موت پر آمادہ تھے۔
اس کے بعد کربلا پہونچ کر دسویں محرم کی شب کو جب کہ صلح کی گفتگو
ختم ہو چکی تھی اور صرف ایک رات کی مہلت بمشکل مانگنے سے ملی تھی اور ساتھ
گنتی کے منتخب افراد رہ گئے تھے جو موت کے یقینی ہونے کا ذکر کئی بار سن
بھی چکے تھے مگر حضرت نے چاہا کہ خطرہ کے بالکل سامنے آنے کے بعد بھی
ساتھ والوں کو موقع دے دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے ایک مبسوط اور یادگار
خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں صاف طور سے کہہ دیا کہ کل کا دن ہمارا ان دشمنوں
کے ساتھ تاریخی ہوگا۔ میں نے تمہارے متعلق غور کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا
ہوں کہ تم سب اس وقت چلے جاؤ اور میری اجازت سے میرا ساتھ چھوڑ
دو۔ تم پر میری طرف سے کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔ دیکھو رات کا پردہ
پڑ گیا ہے۔ اسے تم اپنے لئے غنیمت سمجھو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ۔
تم اپنے لیے غنیمت سمجھو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ تم خود بھی جاؤ اور اتنا
اور بھی کرو کہ ہر ایک تم میں سے میرے ایک ایک عزیز کا ہاتھ پکڑ لے اور اسے
اپنے ساتھ لیتا جائے۔ اس کے بعد اپنے دیہات اور شہروں میں متفرق
ہو جاؤ تاوقتیکہ تمہیں کشائش ہو اور بنی امیہ کی سلطنت سے نجات حاصل
ہو یہ لوگ تو صرف میرے طالب ہیں۔ جب میں انھیں مل جاؤں گا اور مجھے
قتل کر ڈالیں گے تو پھر انھیں کسی دوسرے کی فکر نہ ہوگی۔

یہ آخری اتمام حجت تھی لیکن ایسی جماعت کے سامنے جس میں کی
کوئی فرد حقیقت حال سے بے خبر ہو کر یا کسی لالچ سے ساتھ نہیں آئی تھی لہذا
ایک طرف اعزا کھڑے ہو گئے اور دوسری طرف اصحاب اور سب نے

امام کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کیا۔

امام حسینؑ نے اس طرزِ عمل سے یہ سبق دیا کہ دنیا میں حقانیت، ضمیر کی صفائی اور امانت کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ کسی غلط فہمی سے فائدہ اٹھا کر اپنا مقصد نہ نکالے کبھی غلط توقعات قائم کر کے اپنی کار برآری نہ کرے۔ غلط فہمی کا سد باب کر کے جو حقیقی جاں نثار ہوں بس اُن کی ہی ہمدردی قبول کرے اور کسی کی غلط اندیشی اور فریب خوردگی سے فائدہ نہ اٹھائے۔

امن پسندی اور رواداری

یہ اسلام کا ایک بنیادی اصول ہے۔

امن و امان یعنی "جیو اور جینے دو" اس کی طرف خود اسلام کا نام تک اشارہ رکھتا ہے۔ "اسلام مشتق ہے "سلم" سے اور اس کے معنی ہیں "صلح پسندی" — اور ایمان جو ایک بلند مرتبہ ہے وہ مشتق ہے "امن" سے — ایک سچے مسلم اور مومن کی شان یہ ہے کہ اُس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے افراد محفوظ رہیں۔ تمہارے ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ تم بلاوجہ کسی سے برسرِ پیکار نہ ہو۔ کبھی فتنہ و فساد کے باعث نہ ہو لیکن اس کے ساتھ ایک اہم اصول اور ہے۔ وہ یہ کہ باطل کی حمایت کبھی نہ کرو اور تمہارے عمل سے حق پامال نہ ہونے پائے۔

یہ دو عنصر امن پسندی مگر حمایت باطل سے علٰحدگی ہی وہ ہوتے ہیں جن کے لیے اکثر صبر و سکون اور کبھی قیام و اقدام دونوں ہی باتوں کی ضرورت ہوتی ہے اس طرح کہ جب تک اپنے اوپر حمایت باطل کا الزام

نہ آتا ہو اُس وقت تک چاہے جتنے بھی نقصانات برداشت کرنا پڑیں اور
ناگوار طبع حالات سے گزرنا پڑے ، امن پسندی اور خاموشی قائم رہے
مگر جب وقت خاموشی سے حق کا دامن تار تار ہوتا ہو اور باطل کو تقویت دینے
کی ذمہ داری اپنے اوپر آتی ہو اُسی وقت سے خاموشی کی مہر ٹوٹ جائے اور جس حد تک
اقدام ضروری ہو اور آگے بڑھنا باطل سے پوری طرح دامن بچانے کیلئے لازم ہو اس میں دریغ نہ کیا جائے چاہے اپنے
اوپر اس سے جو بھی مظالم ہو جائیں ۔

یہی چیز ہم کو پیغمبر اسلام کی سیرت میں نظر آتی ہے ، یہی امیر المومنین
حضرت علیؑ کے یہاں ، یہی حضرت امام حسن مجتبیٰ کے یہاں اور یہی حضرت
امام حسینؑ کے واقعات زندگی اور قدم قدم کی رفتار میں صاف نمایاں ۔

کتاب کے ابتدائی حصوں میں پیغمبر خداؐ کے صلح حدیبیہ پھر حضرت علی
بن ابی طالب کے دور حیات اور پھر صلح امام حسنؑ کے حالات میں مثالیں
کافی وضاحت کے ساتھ درج ہوئی ہیں ۔ اُن پر ضروری تبصرہ بھی کیا گیا ہے ۔

امام حسینؑ نے صلح حسنؑ کے بعد دس برس تک امام حسنؑ کی زندگی میں
اور دس برس امام حسنؑ کے بعد رواداری اور خاموشی کی زندگی بسر کی حالانکہ
اس مدت میں کیسے صبر آزما مراحل پیش آئے ۔ امام حسنؑ کی وفات اور رسولؐ
کے روضہ میں دفن سے ممانعت یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا مگر حسینؑ جن کی
شجاعت و جرأت کا واقعہ کربلا نے دنیا سے کلمہ پڑھوا دیا ایسے موقع پر خاموش
رہے ۔ یہ رواداری نہ تھی تو کیا تھا ؟

یزید کی بالکل غیر آئینی خلافت کے سلسلہ میں امیر شام نے جو صورتیں
اختیار کیں ، جلسے کیے ممالک اسلامیہ میں پیغام روانہ کیے ، لوگوں کو بیعت
پر مجبور کیا مگر امام حسینؑ کی طرف سے اس کے خلاف کوئی اس طرح کا ۔

اقدام نہیں ہوا کہ آپ اسلامی بلاد میں خطوط بھیجتے، احتجاجی جلسے کرتے۔ تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ سے مسلمانوں کو مخالفت پر آمادہ کرتے۔ ایسا نہیں ہوا۔ آپ کا ابتدائی اور انتہائی اقدام ان موقعوں پر بھی انکار تھا کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔ آپ جانتے تھے کہ اگر مسلمانوں میں سوچنے سمجھنے کی کچھ بھی صلاحیت باقی ہے تو یہ میرا انکار ہی حق پر سے پردہ ہٹانے کے لیے کافی ہے۔ اور اگر ان کی قوت شعور (امتیاز) بالکل ختم ہی ہوگئی ہے تو کم از کم ہم تو تائید باطل کے ذمہ دار نہ ہوں گے ہمیں دنیا سے مطلب نہیں ہے وہ جسے چاہے خلیفہ اور بادشاہ بنائے اور جو کرنا ہو کرے مگر ہم سے تعرض نہ کرے، ہم سے بیعت کی خواہاں نہ ہو ——— یہ اصول تھا جس پر امام حسینؑ اوّل سے قائم تھے اور آخر تک قائم رہے اور اسی لیے معاویہ نے اپنی آزمودہ کاری اور جہاں دیدگی سے آپ کے خلاف کوئی سخت عملی قدم نہیں اٹھایا کیونکہ وہ سمجھتے تھے۔ بلکہ حسینؑ امن دامان کے حامی ہیں۔ جب تک ہم خود انھیں مجبور نہ کریں گے وہ امن پسندی سے علیحدہ نہ ہوں گے۔

لیکن اس کے بعد معاویہ کا انتقال ہوگیا اور یزید تخت خلافت پر بیٹھا باپ بیٹے میں نمایاں تفرقہ تھا۔

یزید، حسینؑ سے بجبر بیعت کا طالب ہوا اور مدینہ کے گورنر نے بیعت کا مطالبہ حسینؑ کے سامنے سختی کے ساتھ پیش کیا۔

یہ معلوم ہے کہ جب ایک بادشاہ دنیا سے جاتا ہے تو لوگوں میں خاص

طور سے انتشار ہوتا ہے اور نظام حکومت بھی انتہائی کمزور ہو جاتا ہے۔ اگر
حسینؑ چاہتے تو چونکہ اس وقت مدینہ میں ولید کے پاس کوئی خاص فوج
بھی موجود نہ تھی، ولید کو قتل کر دیتے اور مروان کا بھی کام تمام کر دیتے
اور اس طرح وقتی حیثیت سے مدینہ میں آپ کی سلطنت قائم ہو جاتی
اور پھر آپ کو موقع ہوتا کہ اطراف و جوانب میں خطوط لکھ کر اپنے زیر اثر ایک
بڑا لشکر فراہم کر لیں مگر اس صورت میں ایک طویل سلسلۂ حرب و ضرب
کے آغاز کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی جس کا نتیجہ بھی بہر حال مشکوک تھا۔
آپ نے خونریزی سے بچنے کے لیے مدینہ چھوڑنا گوارا کیا اور مکہ معظمہ
تشریف لے گئے جہاں آپ کا جانا اس بات کا عملی ثبوت پیش کرتا تھا
کہ آپ کا حقیقی مقصد صرف حمایت باطل سے الگ رہتے ہوئے اپنی اور
اپنے متعلقین کی زندگی کو خطرہ سے محفوظ رکھنا ہے اسلیے کہ مکۂ معظمہ وہ
جگہ ہے جس کو (امن الناس) تمام انسانوں کے لیے محل امن قرار دیا گیا
ہے۔

یہاں آنے کے بعد دنیا کی کوئی تاریخ اس بات کا پتہ نہیں دیتی کہ آپ
نے لوگوں کو مکہ معظمہ کے اندر اپنی طرف دعوت دی یا کچھ لوگوں کو باہر سے
بلایا ہو اور لشکر کی فراہمی میں کسی قسم کا کوئی قدم اٹھایا ہو۔
ظاہر ہے کہ رسول اللہ سے جو نسبت آپ کو تھی اور مکہ والوں کو جتنی آپ کی ہستی
عزیز ہو سکتی تھی اتنی عبداللہ بن زبیر کی نہیں تھی چنانچہ تاریخ بتلاتی ہے کہ امام حسینؑ
کے مکہ میں وارد ہونے سے پہلے لوگ عبداللہ بن زبیر کے گرد آ کر بیٹھا کرتے تھے
لیکن جب سے آپ تشریف لے آئے تھے تمام لوگوں نے عبداللہ کو چھوڑ دیا تھا اور
امام کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے تھے۔ پھر جب عبداللہ کے لیے کہیں یہ ممکن ہو سکا کہ وہ اپنا

مضبوط جنگی محاذ قائم کرلیں اور ایک عرصہ تک حکومت شام سے برسر پیکار رہیں تو امام حسین کے لیے یہ بدرجۂ اولیٰ ممکن ہوتا مگر آپ نے مکہ معظمہ میں خاموشی کے ساتھ قیام کرکے عملی طور پر اعلان کر دیا کہ ہم دنیا میں امن کے خواہاں ہیں چاہتے ہیں کہ دنیا میں سکون رہے مگر ہم کبھی اپنے اُس حق کے ساتھ جس پر ہم ہیں قائم رہیں امن وامان میں خلل بھی نہ پڑنے اور باطل کی حمایت بھی نہ ہونے پائے۔

جب عراق والوں کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ امام حسینؑ نے اس طرح بیعت سے انکار کیا ہے تو اُنھوں نے خطوط لکھنا شروع کیے جن کی تعداد سیکڑوں تک پہونچی ان خطوط میں سے بعض میں یہ بھی درج تھا کہ اگر آپ آجائیں تو ہم نعمانؓ کو باہر نکال دیں اور آپ کو حاکم بنا دیں مگر امام حسینؑ نے ان خطوط کے جواب میں جو کچھ لکھا اُس میں یہ تاریخی فقرات بھی درج کیے کہ "امام کے معنی صرف یہ ہیں کہ کتاب خدا پر عامل ہو۔ انصاف کا پابند ہو۔ حق کو اپنا اصول زندگی قرار دے اور اپنی ذات کو خدا کی خوشنودی کے لیے وقف رکھے"

اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ یہ نہ سمجھنا کہ میں جو آرہا ہوں وہ اس لیے کہ کسی کے خلاف تلوار اُٹھاؤں گا یا تخت سلطنت پر قبضہ کروں گا بلکہ مجھے ہدایت خلق منظور ہے اور کتاب الٰہی وسنت رسالت پناہی کا اجراء مقصود ہے۔

خط میں اس کا اشارہ تک نہیں کہ ہمارے سفیر کے پہونچتے ہی کوفہ کے حاکم کو باہر نکال دینا اور ہمارے فرستادہ کو نظم حکومت سپرد کردینا۔ اس وقت میرے آنے کی اُمید کرنا۔

اسی لیے حضرت مسلم نے بھی جو آپ کی تحریر کے مطابق آپ کے معتمد خاص اور قابل اعتبار بھتے اور آپ کی ہدایت سے یک سرِ مو انحراف کرنے والے نہ بھتے جہاں تک حالات ساتھ دیتے رہے اپنے عمل سے اسی کا ثبوت دیا۔

وہ علیؑ کا بھتیجا اور حسینؑ کا سفیر تھا جو فقیرانہ لباس میں بغیر کسی سابقہ اطلاع یا تزک و احتشام کے کوفہ میں داخل ہوا۔ نعمان بن بشیر دار الامارہ لے اندر تخت و تاج کا مالک اور حضرتِ مسلم کو اس سے نہ کوئی مطلب نہ تعرض۔ آپ جاتے ہیں اور ایک معمولی زمیندار مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے مکان میں فروکش ہو جاتے ہیں۔ وہاں اجتماع ہوتا ہے تو امام کا خط پڑھ کر سنا دیتے ہیں اور بس۔ لوگ امام کی اطاعت و وفا کا عہد و پیمان کرتے ہیں اور آپ اُن سے بیعت لیتے ہیں یہ بیعت اس کی دلیل نہیں ہے کہ آپ کوئی بغاوت برپا کرنا چاہتے بھتے یا کسی سلطنت کی بنیاد قائم کر رہے بھتے بلکہ یہ صرف اس قرارداد کی پہچان تھی کہ ہم حضرت امام حسینؑ کی پیروی اور اتباع پر آمادہ ہیں اور حضرت کی حمایت و حفاظت میں بجان و دل کوشاں رہیں گے۔ اسی لیے جب اٹھارہ ہزار کوفیوں نے بیعت کر لی تھی تب بھی انھوں لے کوئی قدم حکومت کے خلاف نہیں اٹھایا۔ پھر بھی وہ اسی مختار کے گھر میں مقیم رہے اور نعمان بن بشیر کو اسی طرح تختِ حکومت پر رہنے دیا۔ خود نعمان کو اس کا احساس تھا کہ جناب مسلم کا طرزِ عمل معاندانہ نہیں ہے چنانچہ جب لوگوں نے کہا کہ مسلم بیعت لے رہے ہیں اور تم خاموش بیٹھے ہو۔

تو نعمان نے جواب دیا "میں بس اس شخص سے جنگ کروں گا۔ جو مجھ سے جنگ کرے اور اس پر حملہ کروں گا جو مجھ پر حملہ آور ہو مگر میں بدگمانیوں پر عمل نہیں کرتا۔" (۱)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نعمان بھی اس بات کا احساس رکھتا تھا کہ مسلم کوئی بغاوت کا قدم نہیں اٹھا رہے ہیں۔

اس کے بعد ان اسباب کی بنا پر جن کا تذکرہ اپنے محل پر ہو چکا ہے نعمان بن بشیر کو معزول کیا گیا اور عبید اللہ بن زیاد کوفہ کا گورنر مقرر ہوا اور برامن و صلح پسند خاموش و گوشہ گیر مسلم بن عقیل کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔

ابھی مسلمؑ کے متعلق کوئی اطلاع آنے نہیں پائی تھی کہ امام حسینؑ نے مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی۔ اس فوری اور بظاہر بے موقع روانگی ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مکہ میں حسینؑ کو اپنے لیے خطرہ کتنا نزدیک نظر آ رہا تھا۔ جس ہستی کو عبادت الٰہی کا اتنا شوق ہو کہ مرتے مرتے عبادت کے لیے ایک شب کی مہلت مانگی ہو وہ حج کے عین موقع پر حج کو ترک کر دے۔ یقیناً آپ کو قوی اندیشہ تھا کہ اگر آپ مکۂ معظمہ میں قیام کریں گے تو بہت جلد آپ خفیہ طریقہ پر قتل کر دیے جائیں گے۔ اس صورت حال سے مطمئن ہونے کے لیے ایک طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہیں تحفظی تدابیر اختیار کیے جاتے مگر اس حالت میں تصادم کے امکانات بہت قریب ہوئے جاتے تھے۔ لہٰذا جس طرح مدینہ سے نکل کر آپ نے ثابت کر دیا تھا کہ مجھے جنگ کرنا منظور

(۱) الاخبار الطوال ص ۲۳۲

نہیں ہے۔ اُسی طرح قیام مکہ کو سالانہ حج سے صرف ایک دن پہلے جبکہ مسلمان تمام خطوں سے حج کے لیے جمع ہو رہے تھے ترک کیا۔

امام حسینؑ کوفہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ کیا آپ نے کوئی تیاری کی ہے؟ سامان جنگ ساتھ لیا ہے؟ نہیں بلکہ اس کے خلاف اہل حرم مع اطفال خورد سال آپ کے ساتھ ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ امن و سلامتی کی زندگی بسر کرنے کے خواہاں ہیں اور اپنی طرف سے جنگ کے امکانات پیدا ہونے دینا نہیں چاہتے۔

اس کے بعد جب کوفہ کے راستے میں بھی خوں ریزی کے آثار معلوم ہوئے اور حُر کا لشکر آتا نظر آیا تو آپ نے راستہ بدل دیا اور داہنی طرف کا رُخ کر کے ذو حسم پہاڑ کے دامن میں جا کر قیام کیا۔ مگر یہ آنے والی فوج خود تشدد پر آمادہ اور صلح پسندی سے علیحدہ تھی۔ اس لیے جدھر آپ کو متوجہ دیکھا اسی طرف یہ لشکر بھی متوجہ ہو گیا۔ اس وقت ان واقعات کا تفصیل سے ذکر نا مقصود نہیں ہے۔ وہ پہلے بیان ہو چکے ہیں صرف جہاں تک کردار اور صلح پسندی کے ثبوت کا تعلق ہے۔ اجمالاً یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔

حضرت کا سب سے پہلے حر کے لشکر کو سیراب کر دینا بھی بڑا ثبوت اس کا تھا کہ آپ جنگجوئی کے طریقوں پر عمل نہیں فرما رہے تھے۔ ظہر کی نماز کے وقت حضرت امام حسینؑ نے ایک تقریر میں ارشاد فرمایا تھا کہ:۔

"میں نے اس وقت تک تمہاری جانب آنے کا خیال نہیں کیا جب تک کہ تمہارے خطوط اور قاصد میرے پاس نہیں پہونچے اس مضمون پر مشتمل کہ ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ آپ آ جائیے۔ شاید آپ کی وجہ سے ہم حق پر مجتمع ہو جائیں۔ اب اگر تم اس بات پر قائم ہو تو مجھ سے عہد و پیمان کرو اور میں تمہارے ساتھ کوفہ چلنے پر تیار ہوں اور اگر تمہیں یہ منظور نہیں ہے اور میرا

آنا گوارا ہے تو میں جہاں سے آیا ہوں وہاں واپس چلا جاؤں" (۱)

کیا وضعداری کا اس سے بڑھ کر مظاہرہ ہو سکتا ہے؟

عصر کی نماز کے وقت پھر آپ نے تقریر فرمائی اور یہی کہا کہ اگر تمہیں میرا آنا ناپسند ہو تو میں واپس چلا جاؤں مگر حُر نے اسے نہ مانا اور آخر طے یہ ہوا کہ آپ نہ تو کوفہ کی طرف جائیں اور نہ مدینہ کی طرف بلکہ ایسا راستہ اختیار کریں جو کوفہ اور مدینہ کے علاوہ کسی دوسری طرف کو گیا ہو اور اسی قرارداد کے مطابق آپ روانہ ہوئے (۲) ——— مگر کربلا کی زمین کے قریب پہونچ کر ابن زیاد کا وہ انتہائی تشدد آمیز خط حُر کے پاس آیا کہ "حسینؑ کے ساتھ سختی سے کام لو اور حسینؑ کو اُترنے پر مجبور کرو ایک خشک زمین پر جہاں کوئی پناہ لینے کا ٹھکانا اور پینے کے لیے پانی نہ موجود ہو ———"

اس خط کے بعد حر نے اتنی سختی برتی کہ قرب وجوار کے قصبے جو بہت نزدیک تھے جیسے نینوا، غاضریہ، شفیہ کسی میں قیام کرنے کی اجازت نہ دی اور کہا مجھے حکم یہی ہے کہ میں آپ کو کسی آباد مقام پر نہیں بلکہ چٹیل میدان میں اُترنے پر مجبور کروں جہاں پانی بھی قریب نہ ہو ——— اس وقت اصحاب نے امام حسینؑ سے کہا کہ دشمن کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے آپ جنگ کریں لیکن حسینؑ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا میں کسی صورت میں بھی ابتدا کرنا نہیں چاہتا (۳) پھر عمر سعد کے کربلا پہونچنے کے بعد آپ نے کئی دن تک اُس کے ساتھ مفاہمت کی گفت و شنید

---

(۱) ارشاد ص ۲۳۵ (۲) ارشاد ص ۲۳۶ (۳) ارشاد ص ۲۳۸ - ۲۳۹

جاری رکھی۔

جب عمر سعد آپ سے ملاقات کے لیئے رات کے وقت اُس خیمہ کی طرف چلا جو دونوں لشکروں کے درمیان اسی مقصد کے لیے نصب کیا گیا تھا تو اُس نے بیس۲۰ سوار اپنے ساتھ لے لیے شاید اس لیے کہ مخالف کا سامنا ہے۔ معلوم نہیں صورت حال کیا پیش آئے مگر جب امام حسینؑ تشریف لائے اور آپ کے ساتھ آپ کے اصحاب بھی ہو لیئے تاکہ حضرت تنہا نہ رہیں تو آپ نے اصحاب کو علیحدہ ہو جانے کا حکم دیا اور فرمایا میں عمر سعد سے تنہا ملاقات کروں گا۔ اس طرح یہ ثابت کرنا تھا کہ خلوص اور نیک نیتی اور صبر و سکون کے ساتھ گفتگو کرنا ہے جس کے لیے کسی جمعیت کی ضرورت نہیں۔

جب عمر بن سعد نے یہ دیکھا کہ امام تنہا رہ گئے ہیں تو اُس نے بھی ساتھیوں کو واپس کر دیا۔ امام حسینؑ کی گفتگو سراسر صلح پسندی پر مبنی تھی۔ آپ نے یہ کہا کہ میں مدینہ واپس چلا جاؤں گا۔ یہ کہا کہ مجھے ملک عرب سے باہر چلا جانے دو اور دور ترین سرحدوں میں زندگی گزارنے دو۔

مختصر یہ کہ امن عامہ کو قائم رکھنے کے لیے آپ اپنی ذات پر ہر تکلیف برداشت کرنے کے لیے تیار تھے مگر یزید کو جائز خلیفۂ رسول یا اسلام کا سچا نمائندہ تسلیم کرنے پر آپ کسی طرح تیار نہ تھے۔

آپ کا رویہ تحفظ امن کے بارے میں اتنا واضح تھا کہ فوج یزیدی کے افسر عمر سعد نے اپنے حاکم عبید اللہ بن زیاد کو خط لکھا کہ وہ مبارک ہو خدا نے فتنہ کی آگ کو بجھا دیا اور مسلمانوں کے شیرازہ کو مجتمع کیا اور امت اسلامی کے امر کی اصلاح کی حسینؑ صلح پر آمادہ ہیں اور اُن کے شرائط

ایسے میں جنھیں قبول کرنے میں ہم کو عذر نہ ہونا چاہیے۔"

ابن زیاد بھی مصالحت کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ صرف شمرؔ کی مفسدانہ دراندازی وہ تھی جس کی وجہ سے ابن زیاد نے اس آخری رشتہ کو توقعات امن کے قطع کر دیا۔ اور ابن سعد کو خط لکھا کہ ہم نے تم کو گفت و شنید اور مصالحت کے شرائط طے کرنے کے لیے نہیں بھیجا ہے بلکہ تم حسینؑ کے سامنے صرف غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ پیش کرو۔ اور اور اگر وہ منظور نہ کریں تو پھر اُن سے جنگ کرو۔ (۱) اس خط کا پہونچنا تھا کہ بس عمر سعد نے پوری فوج کو حسینؑ اور اصحاب حسینؑ پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دے دیا۔ پھر بھی امام حسینؑ نے ایک رات کے لئے خونریزی کو اور روکا۔

صبح ہوئی عاشور کی قیامت خیز صبح۔ پیمانہ لبریز اور پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے اور کوئی اُمید صلح کی باقی نہیں ہے مگر حسینؑ اب بھی امن پسندی کا ثبوت دے رہے ہیں کہ میں اپنی طرف سے جنگ کرنا نہیں چاہتا۔

صبح عاشور اُس وقت کہ جب امام خاموشی کے ساتھ اپنے خیمہ کے دروازے پر کھڑے تھے اور خیمہ کے پشت پر خندق میں آگ بھڑک رہی تھی شمرؔ نے آکر نہایت سخت جملہ کہا کہ "آخرت کی آگ سے پہلے دنیا ہی میں تم نے آگ کا سامان کر لیا!" یہ اتنا اشتعال انگیز فقرہ تھا کہ ضعیف العمر مسلم بن عوسجہ کو بھی تاب نہ رہی اور امام سے اجازت مانگی کہ اُسے تیر کا نشانہ بنائیں۔ (۲) مگر حضرتؑ نے فرمایا کہ "نہیں ایسا نہ کرو میں جنگ میں ابتدا نہیں کرنا چاہتا"

---

(۱) ارشاد صفحہ ۲۲۶ (۲) ارشاد صفحہ ۲۲۸

اتمامِ حجت کی تمام منزلیں امام حسینؑ کی طرف سے طے کی جارہی ہیں جنھیں اپنی جان کا کوئی خوف نہیں ہے۔ جو موت کو اپنی آخری منزل سمجھ چکے ہیں اس کا بالتکرار اعلان فرماتے رہے ہیں۔ جو موت کا استقبال کشادہ پیشانی کے ساتھ کرنے پر تیار ہوں اس کے بعد یہ امن پسندی، یہ صلح جوئی، یہ اشتعال سے علیحدگی، یہ جذبات کی روک تھام یہ ساتھیوں کے ولولوں کی نگہداشت۔ یقیناً امام حسینؑ اُس دن جہاد بالسیف سے پہلے جہاد بالنفس کی منزل طے کر رہے تھے اور "جہادِ اصغر" کیساتھ "جہادِ اکبر" کا فرض ادا کر رہے تھے۔

امام حسینؑ نے صبح کی میدانِ جنگ میں۔ تمام اشتعال انگیز صورتیں پیدا ہو چکی تھیں مگر اس کے بعد بھی آپ کی جانب سے جنگ کی تیاری کا مظاہرہ نہیں ہوا۔ آپ گھوڑے پر سوار بھی نہیں ہوئے جو جنگ کا مرکب ہوتا ہے بلکہ ناقہ پر سوار ہوئے جو امن کی نشانی ہے اور اس کے بعد وہ تاریخی خطبہ پڑھا جس میں اپنے نام و نسب کا تعارف کرایا، اپنی بے گناہی کا بدلائل ثبوت پیش کیا اور اس کے آخر میں آپ نے پورے مجمع کے سامنے یہ اعلان کیا کہ اگر تم لوگوں کو میرا آنا پسند نہیں ہے تو جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس جانے دو۔ یہی وہ بات تھی جو آپ نے حُر کے سامنے پیش کی تھی اور وہی اب پورے لشکر کے سامنے پیش کی جا رہی تھی۔ یہ درحقیقت امن پسندی کے مظاہرات تھے جنھوں نے حُر کو فوجِ یزید کا ساتھ چھوڑ دینے پر مجبور کیا جس کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے۔ اس کے بعد جنگ چھڑ گئی۔ دنیا میں جنگ کا قاعدہ تھا کہ بڑے سے بڑے بہادر بھی جنگ میں زرہ پہنتے تھے مگر کربلا میں حسینؑ۔ صرف ایک کرتہ پہنے ہوئے تھے خز کا جو ایک نہایت باریک

کپڑا ہوتا ہے اور سر پر عمامہ باندھے تھے (۱) اسے دیکھ کر ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ کیا جنگ کی تیاری یونہی ہوتی ہے اور جس کو لڑنا منظور ہوتا ہے وہ یونہی میدانِ جنگ میں آتا ہے؟

قربانی

حسینؑ کی قربانی ایک منظم حیثیت رکھتی تھی۔ اگر وہ اپنی شہادت کے مرحلہ کو سب سے پہلے طے کر لیتے تو یہ کہنے کو ہوتا کہ مصائب سے گھبرا کر اپنی جان دے دی لیکن آپ نے آہستہ آہستہ قربانی کے منازل کو طے کر کے یہ ثابت کر دیا کہ آپ کا اقدام کسی وقتی جذبہ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ معاملہ فہمی اور فرض شناسی پر مبنی تھا۔

آپ کا مقصد یہ تھا کہ اپنی طرف نسبت رکھنے والی ہر عزیز شے کو خود اپنے ہاتھ سے قربان کریں اور جب اپنے نفس کے سوا کچھ باقی نہ رہ جائے تو اس متاع گراں مایہ کو قربانی کے میدان میں پیش کر دیں۔

آپ نے روز عاشور سب سے پہلے اپنے محبوب ترین اعوان و انصار اور ساتھ کے کھیلے ہوئے احباب کو قربان کیا۔ یہاں تک کہ عزیزوں کی باری آئی تو آپ نے ایک ایک کر کے ان سب کو میدانِ قربانی میں بھیجا۔ اپنے دل کی قوت، آنکھوں کی روشنی اور پیری کے سہارے علیؑ اکبر کے ایسے فرزند، قاسم و عبد اللہ ایسے بھتیجے۔ ابو الفضل العباسؑ ایسے وفادار بھائی۔ سب کو فدیۂ راہ حق ہونے دیا اور سب کے بعد باغ امید کی آخری کونپل اور غنچۂ ناشگفتہ۔ علیؑ اصغر کو خود اپنے ہاتھوں پر نشانۂ تیر ستم ہوتے دیکھ لیا ابھی تک دل کے ٹکڑوں کی قربانی ہو رہی تھی۔ اب اعضائے بدن

---

(۱) طبری ج ۶ ص ۲۵۹

تک نوبت پہونچی۔ سطح جسم کا چپہ چپہ اور خون کا ہر ہر قطرہ قربان کیا۔ یہانتک کہ تن اقدس پر تیروں کو جگہ نہ ملتی تھی اور دشمنوں کی تلواروں اور نیزوں کو جستجو کے بعد بھی کوئی خالی گوشہ دستیاب نہوتا تھا۔ جب جسم کا ہر حصّہ اور دل کا ہر ٹکڑا قربان ہو چکا تو اب حسینؑ کے لیے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ کوئی قربانی کے قابل شئے باقی نہیں رہی تھی۔ صرف ایک رشتۂ حیات تھا جو روح و بدن کے اندر پوری کشمکش حیات کے باوجود قائم تھا اور سر و گردن کا ارتباط تھا جس میں اب تک جدائی نہ ہوئی تھی۔ ایسے باہمت مجاہد کے لیے گزشتہ تمام قربانیوں کے مرحلے طے کر چکنے کے بعد، یہ منزل بالکل آسان تھی۔ عصر کے ہوتے ہوتے حسینؑ اس قربانی میں بھی کامیاب ہو گئے اور خنجر شمر سے کچھ دیر راز و نیاز کے بعد ایک طرف نفس کی آمد و شد کا سلسلہ اور جسم و روح کا ظاہری اتصال قطع ہوا اور دوسری طرف سر و گردن کے باہمی ارتباط میں جدائی پیدا ہوئی۔ آسمان لاکھوں برس گردش کرے، زمانہ کے ورق ہزاروں بار الٹے جائیں۔ لیکن اتنی شاندار، مکمل، منظم اور مرتب قربانی کی مثال پیدا نہیں ہو سکتی۔

بعض متفرق تعلیمات

واقعۂ کربلا کی یہ خاص خصوصیت ہے کہ اتنے ہنگامہ خیز ماحول میں حضرت امام حسینؑ نے فرائض کے ایسے جزئیات تک کو پورا کیا ہے جنھیں عام انسان نسبتہً بالکل معمولی اور خفیف اضطراب کے موقع پر بھی ترک کر دیتے ہیں یا کم از کم ملتوی کرتے ہیں یا فرض کی پابندی میں کم از کم خفت پیدا کرتے ہیں مگر حضرت امام حسینؑ نے سخت سے سخت اوقات میں فرائض کی پابندی

اُتنی ہی سختی کے ساتھ کی جتنی کہ عام حالات میں ہو سکتی تھی۔ مثلاً چند چیزیں درج ذیل ہیں :۔

پردہ یہ شریعت اسلامیہ کا ایک قانون ہے کہ مرد اور عورت کے فرائض، طرز زندگی اور نظام معاشرت جدا ہے۔ مرد پر جب موقع آئے تلوار لے کر جہاد واجب ہے مگر عورت پر سے جہاد ساقط ہے۔ مرد میدان میں نظر آنا چاہیے اور عورت گھر کی چہار دیواری کے اندر۔ پردہ عورت کے لیے ایک لازمی فریضہ ہے اور اُس کی پابندی تاحد امکان ضروری ہے۔

خاندان رسول کی شان جس طرح تمام عبادات وواجبات کے ادا کرنے میں امتیازی درجہ رکھتی تھی اُسی طرح پردہ کے بارے میں بھی اس گھرانے کا اہتمام خصوصی امتیاز رکھتا تھا۔

دختر رسول حضرت فاطمہ زہراؑ اس گھرانے کی مقدس خواتین کے لیے مورث اعلیٰ کی حیثیت رکھتی تھیں جنھیں پردہ کا اتنا خیال تھا کہ مرنے کے بعد جنازہ پر بھی نامحرم کی نگاہ پڑنا گوارا نہ تھی۔

کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے ساتھ اس گھرانے کی تقریباً تمام مقدس خواتین موجود تھیں۔ پیغمبر خداؐ کی نواسیاں زینب وام کلثوم حضرت علیؑ کی بیٹیاں فاطمہؑ اور رقیہ۔ بہویں:۔ بیوۂ امام حسنؑ اور خود آپ کی ازواج لیلےٰ اور رباب۔ صاحبزادیاں فاطمہؑ وسکینہؑ اور دیگر عزیز خواتین۔ ان کے علاوہ کنیزیں تھیں۔ بعض اصحاب بھی اپنے متعلقین کے ساتھ آئے تھے جیسے مسلم بن عوسجہ۔ عبداللہ بن عمیر اور جنادہ بن کعب وغیرہ۔

حضرت امام حسینؑ نے اپنے اہل حرم کی پردہ داری کا اہتمام ہر لمحہ پیش

نظر رکھا راستے میں جب فوج حر آتے دکھائی دی تھی تو آپ نے ذوحسم پہاڑی اسی لیے منتخب کی تھی کہ اُسے پشت پر قرار دے کر خیام اہل بیت برپا کیے جائیں چنانچہ یہ کام اتنی تیزی سے عمل میں لایا گیا کہ خیمے برپا ہو چکے اور اہل حرم خیموں میں فروکش ہو چکے اُس وقت حر کا لشکر وہاں پہونچ سکا۔

کربلا میں بھی حضرت نے جائے قیام کے لیے ریگستانی ٹیلوں کا ایک سلسلہ منتخب کیا تھا۔ پھر شب عاشور خیموں کی طنابوں کو ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ کر دیا تھا کہ کسی ایک خیمہ کی طنابیں کاٹ کر گرانا غیر ممکن ہو گیا تھا۔ اور خیموں کے گرد خندق کھدائی تھی اور اُس شدید گرمی میں اُس کے اندر آگ روشن کرائی تھی اسی لیے کہ پشت پر سے دشمن خیموں کی جانب نہ آسکے۔

یہ تمام انتظامات صبح عاشور آغاز جہاد سے پہلے ہی مکمل ہو چکے تھے۔ بیبیاں خیموں کے اندر اور اعزا میدان جہاد میں باہر تھے۔ کیا اس موقع پر اہل حرم کے دلوں میں اضطراب کی جو کیفیت تھی اُس کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔ جب کہ تیروں کی مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ زمین گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے سے لرز رہی تھی، چاروں طرف غبار سے تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ فوجوں کا سیلاب بار بار صف حسینی کے کوہ استقلال سے ٹکرا کر شور کرتا ہوا واپس ہوتا تھا اور ہر مرتبہ بہنیں بھائیوں کے لیے۔ مائیں بچوں کے لیے۔ بیویاں شوہروں کے لئے فطرۃً مضطرب ہو جاتی ہوں گی مگر کیا ممکن تھا کہ انمیں سے کسی کا قدم خیمہ کے باہر نکلا ہو۔

وہ موقع اس سے زیادہ سخت تھا کہ ایک ماں کو خبر پہونچتی ہے کہ اسکا بیٹا مصروف جہاد ہے۔ یا ایک بہن کو یہ کہ بھائی لڑ رہا ہے۔ یا ایک خاتون

کو یہ کہ اُس کا شوہر دشمن کی فوج میں گھر گیا ہے۔ اس موقع پر ایک شریف اور باعزّت خاتون کے لیے اور وہ بھی عرب کی خاتون جو خود فطری شجاعت کا خون رگوں میں رکھتی ہو اور وہ بھی خاندان بنی ہاشم کی خواتین جن کو شجاعت حیدری ورثہ میں ملی ہو کتنا دشوار ہے کہ وہ صبر و سکون کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھی رہیں جبکہ کوسوں کی مسافت نہیں، پہاڑوں کا اوٹ نہیں بلکہ صرف خیمہ کا پردہ اور میدان جنگ کی وسعت درمیان میں ہے۔

اُس سے زیادہ سخت وقت وہ تھا جب خبر ہوتی ہے کہ بیٹا، بھائی یا شوہر زخمی ہو کر گر گیا ہے اور اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے اور پھر اُس کی فریاد کی آواز آتی ہے کہ یا ابا عبد اللہ ادرکنی اور جب امام اُس کی آواز پر جاتے دکھلائی دیتے ہیں۔ یہ موقع دل کی دنیا میں زلزلہ پیدا کر دینے والا اور صبر و تحمّل کی کشتی کو طوفانی بنا دینے والا ہے۔

ایسے موقعوں پر بعض اصحاب کی عورتیں نصرت حسینؑ کے شوق میں بے چین ہو کر میدان جہاد میں نکل آئیں جیسے عبداللہ بن عمیر کی زوجہ۔ اور عمرو بن جنادہ کی ماں تو امام حسینؑ نے اُن کو فرض اسلامی کی طرف توجہ دلائی۔ فرمایا کہ عورتوں پر سے جہاد ساقط ہے اور اُنھیں خیموں کی طرف واپس کر دیا۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ زوجہ عبد اللہ بن عمیر اور مادر عمرو بن جنادہ میں جرأت و شجاعت کا جوہر حضرت زینب و حضرت کلثوم سے زیادہ تھا، جن کی رگوں میں علیؑ بن ابی طالب کا خون گردش کر رہا تھا۔ ہرگز نہیں مگر یہ ان کے احساس فرائض کی پختگی تھی کہ انھوں نے کسی وقت بھی اپنی حد سے قدم آگے نہیں بڑھایا۔

بہت زیادہ سخت موقع وہ تھا جب خود امام حسینؑ نیزہ و شمشیر و تبر
کا نشانہ بنے ہوئے تھے پھر سب سے بڑھ کر وہ وقت جب آپ گھوڑے سے
زمین گرم پر تشریف لا چکے تھے ــــ مگر کیا اندازہ ہو سکتا ہے اُن برگزیدہ
خواتین کے احساس فرائض کا جنھوں نے اس موقع پر بھی اصول شریعت
کا احترام ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

جس وقت عبداللہ بن الحسن نے خیمہ سے تڑپ کر باہر نکلنا چاہا تھا
اور حضرت ام کلثوم نے دامن پکڑ لیا تھا کہ کہاں جاتے ہو مگر بچہ یہ کہتا ہوا
کہ اس عالم میں میں اپنے چچا کو تنہا نہ چھوڑونگا۔ دامن ہاتھ سے چھڑا کر
روانہ ہوگیا۔ بس اب ام کلثوم بے بس ہوگئی تھیں اور ایسا نہیں ہوا کہ آپ
بچہ کے ساتھ میدان میں آجاتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک خیمہ کے حدود
تھے وہاں تک ام کلثوم چلی آئیں اور جہاں سے بچہ اُس سے آگے بڑھ گیا
بس شاہزادی کے قدم رُک گئے۔

کربلا میں حفظ مراتب کے اصول برتے جا رہے تھے۔ وہاں ہر ادنیٰ
اعلیٰ پر قربان ہو رہا تھا۔ اصحاب اعزا پر قربان ہوئے اور اعزا امام پر قربان
ہوئے اور امام دین خدا پر قربان ہوئے۔ اگر آئین اسلام کے حدود میں کچھ
بھی گنجائش ہوتی تو اُس وقت جب حسینؑ زخمی ہو چکے تھے اور قریب تھا
کہ آپ کے جسم و روح میں مفارقت ہو جائے، تمام خاندان بنی ہاشم کی خواتین
تلواریں لے کر میدان جہاد میں آجاتیں اور حسینؑ کے گرد ایک مرتبہ دشمن پر
حملہ کر دیتیں تو یہ کوئی معمولی بات نہ ہوتی بلکہ یقین سمجھنا چاہئے کہ کافی وقت
تک حسینؑ کی حفاظت کی جا سکتی تھی۔ اور ضرور واقعہ کربلا میں ایک نئی
نوعیت پیدا ہو جاتی، مگر نہ امام حسینؑ اس طرح کی قربانی کو اپنے نظام

عمل میں جگہ دے سکتے تھے اور نہ وہ مخدرات عصمت خون کے انتہائی جوش اور دل کے انتہائی تلاطم کے باوجود کوئی ایک قدم بھی حسینؑ کے مرتب کردہ نقشۂ جنگ کے خلاف اٹھانے کے لیے تیار تھیں اس لیے حسینؑ کی تنہائی بھی دیکھی دشمن کے حملوں کا خروش بھی سنا، فتح کے باجوں کی آوازیں بھی آئیں اور قتل الحسین کی جگر خراش صدا بھی گوش زد ہوئی مگر وہ جہاں حسینؑ بٹھا گئے تھے وہیں بیٹھی رہیں اُس وقت تک جب تک وہ جگہ باقی رہی ——— ہاں جب خیموں میں آگ کے شعلے بلند تھے، اُس وقت مجبور ہو کر امام وقت حضرت زین العابدین کے شرعی حکم کے ماتحت میدان میں نکلیں اور پھر بھی اختیار کی رفتار کے ساتھ پردہ کا احساس قائم رہا ——— جب تک چادریں رہیں، چادروں کا پردہ رکھا ——— چادریں نہ رہیں تو بالوں سے منھ چھپائے ——— دربار میں کنیزوں کے حلقہ میں اپنے کو مخفی کیا ——— اور جب یزید کے دربار میں تقریر کی ضرورت محسوس ہوئی تو عزیزوں کے تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کیے جانے سے زیادہ دردناک الفاظ میں اس مصیبت کا شکوہ کیا کہ تو نے اپنی عورتوں اور کنیزوں کو پردہ میں بٹھایا ہے اور خاندان رسول کی خواتین کو اس طرح دربدر پھرا رہا ہے کہ اُن کے چہروں پر اپنے پرائے ہر ایک کی نگاہ پڑ رہی ہے۔

ایسے صبر آزما مواقع پر اس فریضۂ اسلامی کی اتنی مکمل نگہداشت کی گئی ہے جو ہمیشہ کے واسطے مسلمانوں کے سامنے ایک زریں مثال کی حیثیت سے قائم رہے گی۔

وصیت

شریعت اسلامی میں وصیت کا پورا کرنا ایک اہم فریضہ ہے۔ بعض وصیتیں انسان کے ذاتی جذبات و نفسیات کے خلاف ہوتی ہیں مگر مرنے والے انسان کا احترام اُس کی وصیت کی تعمیل پر مجبور کرتا ہے۔ بعض وصیتیں بعد کے پیدا شدہ حالات میں دشوار یا عام نگاہوں میں خلاف مصلحت بھی ہوتی ہیں مگر فرض شناس انسان کو وصیت کی پابندی موجودہ حالات کے تقاضے پر مقدم محسوس ہوتی ہے۔

حضرت امام حسینؑ نے اپنے بزرگوں کی وصیت کا جس طرح ادا جن جن موقعوں پر لحاظ کیا ہے وہ ایک نہ بھولنے کے قابل سبق ہے۔

رسول اللہ کی وفات کے وقت امام حسینؑ بہت کم سن تھے مگر مذہبی روایات متفقہ طور پر یہ بتلاتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے اپنے اس بچہ کی صلاحیتوں کا کم سنی ہی میں اندازہ کر کے اُسے اپنے مذہب اسلام کی مستقبل میں حفاظت کرتے رہنے کی وصیت کی تھی۔ اگر اسے لفظی طور پر کوئی نہ بھی مانے تو اس میں تو کوئی شبہہ نہیں کہ رسول اللہ کا برتاؤ حسینؑ کے ساتھ اور اسلام کے مفاد پر پیغمبرؐ کا ہر قربانی کے لئے آمادہ رہنا یہ ہر لمحہ حسینؑ کے نزدیک اس وصیت کی حیثیت رکھتا تھا کہ جب اسلام پر کوئی وقت پڑے تو اپنی جان عزیز نہ کرنا۔ تمھیں اسی دن کے لیے اس محبت وشفقت کی گود میں پالا جا رہا ہے۔ حسینؑ نے اس وصیت کو مرتے دم تک یاد رکھا اور کربلا کا پورا واقعہ اسی وصیت کی تعمیل تھا۔

حضرت علیؑ ابن ابی طالب نے اپنی وفات کے قبل امام حسنؑ

کو جانشین بناتے ہوئے حسینؑ کو اُن کی پیروی کی ہدایت کر دی تھی۔ حسینؑ نے بے نظیر طریقہ پر اس فرض کو بھی انجام دیا۔

امام حسنؑ کی وصیّت تھی کہ میرے تابوت کو میرے جد بزرگوار رسول اللہؐ کے مزار کی طرف وداع کے لیے لے جانا لیکن اگر مزاحمت ہو تو ایک قطرۂ خون گرنے نہ پائے بغیر کسی جنگ و مقاومت کے میرے جنازہ کو واپس لانا اور بقیع میں دفن کر دینا۔ حسینؑ حسب وصیّت بھائی کا جنازہ روضۂ رسولؐ پر لے گئے مگر جیسا کہ امام حسنؑ کو اندیشہ تھا وہی ہوا۔ ام المومنین عائشہ اور مروان وغیرہ نے مخالفت کی۔ نوبت یہ پہونچی کہ مخالفت جماعت نے تیروں کی بارش کر دی اور کچھ تیر جنازۂ امام حسنؑ تک پہونچے۔ بنی ہاشم کے اشتعال کی انتہا نہ تھی مگر وہ فرض شناس حسینؑ تھے جنھوں نے بھائی کی وصیّت کے مقابلہ میں اپنے تمام جوش، ولولہ اور طبیعت کے تقاضوں کا خون کر دیا —— اُنھوں نے صبر اور خاموشی کے ساتھ دشمن کی مخالفت کو برداشت کیا اور امام حسنؑ کا تابوت واپس لے جا کر جنۃ البقیع میں دفن کر دیا

اپنے مرحوم بھائی امام حسنؑ کی وصیّت کے احترام ہی کی بنا پر کربلا میں اپنے عزیز بھتیجے قاسم بن الحسنؑ کو اجازتِ جہاد دی جب کہ آپ خود اس لیے اذنِ جہاد میں تامل فرما رہے تھے کہ ابھی قاسم حد بلوغ کو نہ پہونچے تھے اور جہاد کی تکلیف عائد نہ تھی۔

اپنی نامزد لڑکی کا عقد امام حسنؑ کے ساتھ عقد کر دینا بھی اپنے بھائی کی وصیّت کی تعمیل ہی میں تھا۔

جب ہی تو حضرت امام حسینؑ کی زیارت میں اس صفت کا خاص

تذکرہ ہے کہ "والی وصیتہ اخیک صدیا۔ عا" (یعنی) اپنے بھائی کی وصیت کے پورا کرنے میں آپ نے بڑی تعجیل کی کہ کہیں وقت نکل نہ جائے اور وصیت کی تعمیل رہ نہ جائے۔

تلقینِ صبر

بلند مرتبہ ہستیوں کے مصائب کے تذکرہ پر اشکبار ہونا حقیقۃً اُن بلند اوصاف کی قدر و قیمت کا اظہار ہے جو ان ہستیوں کے ساتھ اُٹھ گئے اور اسی لیے یہ آنسو سچائی کی شرط کے ساتھ بڑی قدر و قیمت کے حامل ہیں مگر کسی انسان کا خواہ وہ کتنا ہی بلند مرتبہ ہو خود اپنی مصیبت پر بے تاب ہونا اور بالخصوص جبکہ دشمنوں کو مضحکہ کا موقع ملے۔ اُس انسان کی عظمت نفس کے خلاف ہے۔

راہِ حق میں انسان کو خود اگر مصیبت سے دوچار ہونا پڑے تو اُسے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرنا شان ثبات و استقلال ہے جو مرتبہ کی رفعت کا سبب ہوتی ہے۔

حضرت امام حسینؑ کربلا میں خود صاحب مصیبت تھے۔ اور آپ کی شہادت کے بعد آپ کے اہل حرم اور بالخصوص زینب و کلثوم صاحب مصیبت تھیں۔ حضرت زینب کو محبت بھی اپنے بھائی کے ساتھ غیر معمولی تھی۔ وہ ایک مرتبہ صرف حسینؑ کی زبان سے اُن کی شہادت کی خبر کے طور کچھ اشعار سن کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ امام حسینؑ کو یہ فکر تھی کہ کہیں میرے غم میں میرے اہل حرم اور بالخصوص میری بہن زیادہ اپنا حال تباہ نہ کریں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا فطری اضطراب دشمنوں کے طعن و تشنیع کا ذریعہ بن جائے۔ اس لیے آپ نے اپنی بہن کو بڑے مؤثر انداز میں یہ وصیت فرمائی کہ میرے غم میں گریبان نہ پھاڑنا، منہ پر طمانچے نہ مارنا اور

واویلاہ واثبوراہ کھلے نوحہ نہ کرنا (۱) یقیناً حسینؑ کی سی بلند مرتبہ ہستی کے غم میں یہ تمام باتیں روا تھیں مگر اپنی بہن زینبؑ کو حسینؑ خود صاحب مصیبت ہونے کے اعتبار سے اسیری کے ہولناک ماحول اور دشمنوں کے محاصرہ میں ایسے صبر و سکون کا مرقع بنانا چاہتے تھے جو دنیا کے صاحبان مصیبت کے لیے ایک اسوۂ حسنہ ہو سکے اور حضرت زینب نے اس پر ایسے بہترین طریقہ پر عمل کیا کہ خود بے تاب ہونا کیسا دہ کوفہ کی طرف روانگی کے موقع پر اور مقتل شہدا میں سے ہو کر گزرنے کے وقت اپنے بھتیجے امام زین العابدینؑ کو دلاسا دے رہی تھیں جبکہ وہ اپنے باپ کے لاشے کو .... زمین گرم پر بے دفن دیکھ کر اتنا متاثر ہوئے تھے کہ قریب تھا روح جسم سے مفارقت کر جائے۔

شعائر الٰہیہ کا احترام

امام حسینؑ نے کعبہ کے احترام کو مدنظر رکھنے کے لیے حج کو ترک کیا اور مسافرت گوارا کی چنانچہ خود فرمایا میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے خانۂ کعبہ کی حرمت برباد ہو۔

اسلاف کی یاد حسینؑ کسی وقت اپنے بزرگوں کو نہیں بھولے۔ جب مدینہ سے روانگی قطعی ہو گئی تھی تو آپ نے آخری شب اپنے بزرگوں کے مزارات کی زیارت کے لیے مخصوص کی تھی۔

---

(۱) ارشاد ص ۲۴۳

مکہ سے چلتے وقت جو خطبہ پڑھا تھا اُس میں بھی فرمایا تھا کہ میں اپنے بزرگوں کی ملاقات کا اتنا مشتاق ہوں جتنا یعقوب یوسف سے ملاقات کے مشتاق تھے۔

نہم محرم کی عصر کو جس وقت حملہ ہوا ہے تو آپ پر غنودگی طاری تھی۔ جناب زینب نے بیدار کیا تو فرمایا میں نے اپنے نانا کو خواب میں دیکھا وہ فرما رہے تھے کہ اب تم میرے پاس آنے والے ہو (۱)

عاشور کے دن آپ نے اپنے جوان فرزند علی اکبر کو اذن جہاد دینے کے بعد خدا کی بارگاہ میں ہاتھ اُٹھائے اور کہا خداوندا گواہ رہنا کہ وہ جوان جا رہا ہے جو صورت و سیرت و رفتار و گفتار میں تیرے رسول سے مشابہ ہے جب ہم مشتاق تیرے رسول کی زیارت کے ہوتے تھے تو اُس کے چہرہ پر نظر ڈال لیتے تھے، اس طرح آپ نے علی اکبر کے غم میں اپنے شدید تاثر کا سبب بھی ظاہر کر دیا۔ بقول عالم نقوی :۔

شہ کو غم تھا شبیہہ احمد کا ۔۔۔ کب وہ روتے تھے اپنے اکبر کو

خودداری

عام انسان ذرا سا سخت موقع آئے تو گڑگڑانے لگتا ہے اور بہت سی [illegible] صورتیں اختیار کرتا ہے جو ایک خوددار انسان کے شایان شان نہیں ہوتیں۔

حضرت امام حسین نے شروع سے آخر [illegible] ایسا طرز عمل اختیار نہیں کیا جو غیرت نفس کے خلاف [illegible]

اُس وقت جب آپ مدینہ سے روانہ [illegible] بہی خواہوں نے کہا تھا

---

(۱) ارشاد ص۲۴۳

بلا خوف تردید پوری دُنیائے اسلام میں اس صدی میں کسی ایک عالم نے واقعہ کربلا اور امام حسین علیہ السلام کی سیرت اور کارناموں پر اتنا زیادہ اور اتنا عظیم کام پیش نہیں کیا ہے جتنا آیتہ اللہ العظمیٰ سید العلما مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ نے انجام دیا ہے۔ سید العلما نے مختلف اقوام و ملل کو نہ صرف مصائب سید الشہدا بلکہ مقاصد امام حسین علیہ السلام سے بھی آگاہ کیا۔ سرکار مرحوم نے حسینیت پر اتنا لٹریچر فراہم کر دیا جو بہت سے ادارے مل کر نہ کر سکے۔ آئندہ حسینیت کا جو بھی مطالعہ کرنا چاہے گا وہ سید العلما کی تحریروں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

سید العلماء اکادمی

سید العلماء اکادمی کا قیام ۱۰ شوال ۱۴۰۸ھ کو سرکار سید العلماء کی رحلت کے دس روز بعد عمل میں آیا۔ اس کا اصل مقصد سید العلما کی حیات اور کارناموں کے متعلق مطالعات، ان کی ضخیم کتابوں کی اشاعت اور نشر اسلام و نشر حسینیت کے سلسلے میں سرکار سید العلماء کے مقاصد کی تکمیل ہے۔